سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعہ عثمانیہ

نشان (۳۷۲)

تاریخ ہند

(عہد جدید)

از سنہ ۱۷۶۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

تالیف

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۶۷ھ م سنہ ۱۳۵۷ف م سنہ ۱۹۴۸ء

مطبوعہ

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تاریخ ہند

(عہد جدید)

اہلِ یورپ کی بیداری چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ کی قوموں میں زندگی اور بیداری کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس بیداری کی بدولت کلیسا اور مملکت کے اصول اور زندگی کے عام نقطۂ نظر میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی جس کی مثال یورپ کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ عالمگیر بادشاہی اور عالمگیر کلیسا کے تصورات کی جگہ قومی حکومت اور انفرادی ضمیر کی آزادی کے اصول کا چرچا ہوا۔ سند اور روایت کی بجائے تنقید اور تحقیق کا

سہارا تلاش کیا جانے لگا کہ ان ہی کے بطن سے نئی زندگی نے جنم لیا تھا۔ یونان و روما کے قدیم علوم کے احیاء کی کوشش اس واسطے کی گئی کہ ان میں ازمنۂ وسطیٰ کے نکلا علوم کی اندھی تقلید اور روایت پرستی کے مقابلے میں تنقید اور آزادیٔ فکر کے اصول کی زیادہ گنجایش نظر آئی۔ غرض کہ اس نئے دور کی خصوصیت خاصہ آزادی، ایجاد اور تسخیر کے عام اصول تھے جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا زندگی کی ان نئی قوتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسی عہد میں فن طباعت اور کاغذ کے استعمال سے لوگ واقف ہوئے۔ بارود کے پوشیدہ خواص سے واقفیت ہوئی۔ قطب نما ایجاد ہوا جس کی مدد سے سمندر پار کے نئے نئے ملکوں کی دریافت کا شوق اہل یورپ کے دلوں کو گدگدانے لگا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ نظام بطلیموسی کی جگہ کوپرنیکس کے نظام شمسی کو تسلیم کیا گیا جس کی بدولت علوم طبعی اور سائنس کی بنا پڑی۔ یہ ذہنی تحریک جس نے یورپ میں ان زبردست تغیرات کو پیدا کیا نشاۃ جدیدہ (رینے سانس) کہلاتی ہے۔

نشاۃ جدیدہ کی تحریک کے کچھ بعد یورپ میں اصلاح مذہبی (ریفارمیشن) کا غلغلہ بلند ہوا۔ لوگوں کے دلوں میں توہمات کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی خواہش پیدا ہوئی جن کی وجہ سے قوائے عملیہ شل ہو گئے تھے۔ یہ زندگی کے پرانے اور فرسودہ اصول کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اسی واسطے اس کو پروٹسٹانٹزم کہتے ہیں۔ لوتھر، کالون اور دوسرے مصلحوں نے پاپائیت کے عالمگیر اثر کو ختم کرنے اور مذہبی معاملات میں ضمیر انسانی کو فیصلے کا آخری حق دلوانے کا بیڑا اٹھایا۔ انجیل کی نئے طرز پر توجیہ کی گئی تاکہ ہر فرد بشر بغیر کسی واسطے کے اپنے مالک حقیقی سے تعلق قائم کر سکے۔ اس کے لیے پاپا اور اس کے عملے کی وساطت درکار نہ ہو۔ مذہب کے اس نئے نقطۂ نظر کی بدولت عمل و تسخیر کی بے پناہ قوتیں جاگ اٹھیں جنھوں نے اہل یورپ کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے اکسایا اور ساری دنیا میں ان کا سکہ بٹھایا۔

تاریخ یورپ کے محققوں کا خیال ہے کہ نشاۃ جدیدہ اور اصلاح مذہبی کی تحریکیں خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں بلکہ ان کا وجود اسلامی تہذیب و تمدن کے اصول کا

ریں منت ہے۔ جن کا چرچا اس زمانے میں یورپ میں ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں سوائے اسپین کے یورپ میں کوئی ملک نہ تھا جہاں علم و تحقیق کو توہمات کے غلاف میں لپیٹ کر نہ رکھ دیا گیا ہو۔ پندرھویں صدی تک یورپ کے کسی بڑے مصنف کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا جس نے عرب مصنفوں سے استفادہ نہ کیا ہو۔ یونانی اور لاطینی سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر اہل یورپ کی تحقیق کا تمام تر دار و مدار تھا۔ عرب محققوں کے طریقۂ تحقیق کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تجربے اور مشاہدے سے اپنے نتائج اخذ کرتے تھے۔ تجربی طریقے کی بدولت ان کی تحقیق میں صحت اور جدت پیدا ہو گئی جس کی مثال یورپین مصنفوں کے یہاں نہیں ملتی جو تجریدی مباحث اور صرف اپنے پیشرووں کی رایوں کو بار بار دہرانے ہی کو تحقیق خیال کرتے تھے۔ تجربے اور مشاہدے کو تحقیقات علمی کی بنا قرار دینا اسلامی مفکروں کا زبردست کارنامہ ہے کہ بغیر اس کے اسباب و حوادث کا ٹھیک ٹھیک کھوج لگانا ممکن نہیں۔ یہی اصول جدید سائنس کی بنا ہے جسے اہل یورپ نے اپنے عرب استادوں سے سیکھا۔ انھوں نے انسانی آزادی کا سبق بھی اسپین کی جامعات میں پڑھا تھا جس کی انھوں نے سارے یورپ میں اشاعت کی۔ اس کی بدولت نئے ذہنی اور اخلاقی تصورات نے جنم لیا، اور قومی اور بین الاقوامی سیاست کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ عالمگیر سلطنت کی بجائے قوموں کی انفرادیت وجود میں آئی۔

اب تک یورپ کے بیشتر لوگ بحیرۂ روم کے ملکوں کے علاوہ دوسرے ملکوں سے واقف نہ تھے۔ صلیبی جنگوں کے بعد اہل یورپ کی واقفیت میں تھوڑا بہت اور اضافہ ہوا۔ اور اسلامی ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ اٹلی کے شہروں میں وینس اور جنوا تجارت کے بڑے مرکز بن گئے۔ مشرقی ملکوں کا سامان عرب تاجروں کے ذریعے سے ان شہروں تک پہنچتا اور وہاں سے وسط اور شمالی یورپ کے بازاروں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ مشرقی تجارت کی بدولت وینس اور جنوا یورپ کے سب سے زیادہ دولتمند شہر بن گئے۔

خلفائے عباسیہ نے شہر بصرہ کو ترقی دی تاکہ خلیج فارس میں ہندوستان اور مشرق بعید سے جو سامان آتا تھا وہ شام میں خشکی کے راستے سے اور پھر

جہازوں میں یورپ کے ملکوں تک پہنچایا جائے۔ اسی طرح بحر احمر کے عرب جہاز راں مشرق سے سامان اپنے جہازوں پر لاتے، وہاں سے اسکندریہ تک خشکی کے راستے اور پھر جہازوں کے ذریعے اٹلی کے شہروں تک اسے پہنچاتے تھے۔ حکومت مصر اور وینس کی جمہوری حکومت میں تجارتی اغراض کے لیے معاہدہ ہوگیا تھا جس کی منظوری پاپائے روما نے بھی دے دی تھی۔ مصر کے فاطمی خلفا اور مملوک سلاطین کے عہد میں ہندوستان کی تجارت کے محاصل کی بدولت حکومت مصر کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ محققوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد اہل یورپ کی ضروریات میں جو اضافہ ہوا اس کو پورا کرنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ مشرقی ممالک سے تجارت کو فروغ دیا جائے۔ ہندوستان اور مشرق بعید کے ملکوں کا سامان بحر احمر تک عرب جہاز راں لاتے تھے اور اس کے بعد اسکندریہ سے اطالوی جہاز راں وینس اور جینوا کے تجارتی مرکزوں کو یا یورپ کے دوسرے ملکوں کو لے جاتے تھے۔ چنانچہ اطالوی جہاز رود بار انگلستان اور بالٹک کے ساحل تک جاتے اور مشرقی ممالک کے سامان کو شمالی یورپ کی مختلف منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ لیکن پندرہویں صدی کے وسط میں یورپ کے شمالی ممالک میں بھی اولوالعزمی پیدا ہوئی اور وہ اپنے جہاز اطالوی شہروں کو مشرقی ممالک کا سامان خریدنے کے لیے بھیجنے لگے۔

قطب نما کی ایجاد سے یورپ کے مختلف ملکوں کے حوصلہ مند جہاز راں نئے نئے ملک دریافت کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ خاص طور پر لاطینی ملکوں میں بحری سفر کا شوق بہت بڑھ گیا۔ اس بحری مہم جوئی کی بدولت اہل یورپ کو ایسے تجارتی مواقع حاصل ہوگئے جن کے سامنے بحر روم کی محدود تجارت ہیچ ہوگئی۔ اس ضمن میں اسپین اور پرتگال نے دوسرے ملکوں پر سبقت کی۔ اہل پرتگال کو خاص طور پر اطالوی شہروں کی دولتمندی پر رشک ہونے لگا اور انھوں نے کوشش شروع کی کہ ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارت کو براہِ راست سمندر کے راستے سے اپنے ملک کی طرف کھینچ لیا جائے تاکہ عرب اور اطالوی تاجروں کا واسطہ باقی نہ رہے۔ پرتگال کے جہاز راں کئی سال اس فکر میں لگے رہے کہ افریقہ کے گرد ہو کر ہندوستان پہنچیں۔

اسی طرح اسپین کے جہاز راں مغرب کی طرف سے اٹلانٹک کو پار کر کے ہندوستان پہنچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ان مساعی کی بدولت حیرت انگیز انکشافات ہوئے اور دنیا کے جغرافیے کا صحیح علم حاصل ہوا۔

بحری سفر اسپین کے حکمراں فرڈیننڈ اور ازابلا نے ایک اطالوی جہاز راں کرسٹوفر کولمبس کو جو جنیوا کا رہنے والا تھا ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لیے سنہ ۱۴۹۲ء میں روانہ کیا۔ کولمبس یورپ کے ان جہاز رانوں میں سے تھا جنھوں نے قطب نما کو سب سے پہلے اپنے بحری سفر میں استعمال کیا۔ مارکوپولو اور دوسرے سیاحوں کے بیانات سے کولمبس کو یقین تھا کہ بحر اٹلانٹک کے مغرب میں جانے سے ایشیا کے براعظم تک پہنچنا ممکن ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس منصوبے میں کامیابی ہوگئی تو مشرق کی ساری تجارت عربوں کے ہاتھ سے نکل کر اہل یورپ کے تصرف میں آجائے گی۔ اس کے یہ خیالات دنیا کے جغرافیے کے متعلق اس قدر انقلاب انگیز تھے کہ اس کو کئی سال تک کوشش کرنی پڑی کہ یورپ کی کوئی حکومت اس کے بحری سفر کے اخراجات برداشت کرنے اور اس کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ بالآخر حکومت اسپین نے کولمبس کی حوصلہ افزائی کی اور نئی دنیا کے معلوم کرانے کا سہرا اسی کے سر رہا۔ کولمبس جب جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) پہنچا تو اس کو یقین ہوگیا کہ یہ ہندوستان کے مشرق کے جزیرے ہیں جن کا ذکر وہ سن چکا تھا۔ غرضکہ اس طرح ویسٹ انڈیز اور جنوبی امریکہ کے انکشافات سے اہل یورپ کو پتا چلا کہ بحر اٹلانٹک کے مغرب میں بھی زمین واقع ہے جس سے وہ اب تک بے خبر تھے۔ اسپین نے جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے علاوہ پیرو اور میکسیکو میں بھی اپنی نوآبادیاں قائم کریں۔ شاہ انگلستان ہنری ہفتم کے عہد حکومت میں، انگلستان میں بھی بحری جد و جہد کا آغاز ہوا۔ جس کے نتائج نہایت دوررس نکلے۔ سنہ ۱۴۹۷ء میں جان کیبٹ جو جنیوا کا رہنے والا تھا انگریزی بیڑے کو لے کر اٹلانٹک کے شمال کی طرف بڑھا اور نیوفاونڈ لینڈ پہنچ گیا۔ اس طرح انگریزوں نے امریکہ کے شمال مغربی ساحل پر اسی طرح اپنے حقوق قائم کر لیے جس طرح اسپین نے جنوبی امریکہ میں چند سال قبل اپنے حقوق قائم کر لیے تھے۔ بعد میں ملکہ الزبتھ

کے عہدِ حکومت میں وسیع پیمانے پر انگریزی نوآبادیاں شمالی امریکہ میں جگہ جگہ قائم ہو گئیں اور تجارت اور نوآبادکاری کے سلسلے میں انگریزوں اور اسپین والوں کی سیاسی رقابت بڑھ گئی۔

اہلِ پرتگال کی ہندوستان میں آمد

لیکن اہلِ پرتگال نے بحری سفر کرنے میں بڑے استقلال اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ پرتگالی شاہی خاندان میں ہنری نے (۱۳۹۴ء تا ۱۴۶۰ء) جو جہازراں کے لقب سے مشہور تھا پوری قوم کی توجہ کو بحری جدوجہد کی طرف مبذول کر دیا۔ ہر صاحبِ ہمت شخص نے اپنا یہ فرض قرار دیا کہ نئے اور غیر معلوم مقامات کا سفر اختیار کرے۔ وہ خود جہازرانی کے فن سے خاص لگاؤ رکھتا تھا، اور اپنے جہازرانوں کو ہدایات دے کر روانہ کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نئی شہنشاہی کی بنا ڈالنا اور مسیحی مذہب کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ذاتی مثال اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگالی جہازراں افریقہ کے مغربی ساحل کے ممالک تک جانے لگے اور انہوں نے خطِ استوا کو عبور کر لیا۔ ۱۴۸۶ء میں بارتھولومیو دیاز راس امید تک ہو آیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکو دی گاما ایک عرب جہازراں احمد بن ماجد کی رہبری میں راس امید ہوتا ہوا مالابار کے ساحل پر کالی کٹ پہنچا۔ اور وہاں کے حکمراں زمورن کو بادشاہِ پرتگال کا خط پیش کیا۔ زمورن نے اس کی آؤ بھگت کی اور پرتگالی تاجروں کے لیے خاص رعایتیں منظور کیں۔

پوپ الگزنڈر ششم نے ۱۴۹۳ء میں اس زمانے کی معلوم دنیا کو شمالی جنوبی خط کے ذریعہ جو کیپ ورڈ سے گزرتا تھا مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ افریقہ اور ایشیا پرتگال کے حصے میں آئے اور امریکا اسپین کے حصے میں۔ بعد میں اسپین اور پرتگال کی حکومتوں نے پوپ کے اس فرمان کے بموجب ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے دونوں ملکوں کے مفاد کے تصادم کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ یورپ کے کیتھولک ممالک میں ابھی پوپ کے فرامین کی اہمیت باقی تھی۔ اس فرمان کے شائع ہونے کے سو سال بعد پروٹسٹنٹ لوگوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور ہالینڈ اور انگلستان کے جہازرانوں نے اپنے ملکوں کی

تجارت کو ترقی دینے کے لیے بحری سفر اختیار کیے۔

اس زمانے میں مالابار کے ساحل پر عربوں کی تجارتی نو آبادیاں موجود تھیں۔ مصری تاجر زیادہ تر مسالوں کی تجارت کرتے تھے اور ہندوستان اور مشرق بعید سے جہاز لاد کر بحر احمر تک لے جاتے تھے۔ واسکوڈی گاما نے اپنے سفر کے دوران میں دیکھا کہ ٹنڈکا سکر سے لے کر آبنائے ملاکا تک تقریباً سارے بحر ہند کی تجارت عرب تاجروں کے قبضے میں ہے۔ یہ لوگ سماترا اور جاوا سے مختلف مسالے اور سونا اور چاندی لاتے تھے اور مالابار سے مسالے، مرچ، ہاتھی دانت، مونگا، ریشم، تانبا اور جست لے جاتے تھے۔ عرب اور ایران سے گھوڑے اور چین سے ریشمی کپڑے خریدتے اور جس ملک میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی وہاں ان کی نکاسی کرتے تھے۔ مصری تاجروں کے گماشتے بحر احمر میں جدے میں اور ساحل مالابار پر کالی کٹ میں رہا کرتے تھے۔ جدے میں اسی قیمت پر مرچ فروخت ہوتی تھی جس قیمت پر کالی کٹ میں۔ مصری حکومت کا حکم تھا کہ ہندوستان سے جو سامان آئے اس میں لازمی طور پر ۱/۳ مقدار مرچ کی ضرور ہو جس کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ اگر کوئی تاجر اتنی مقدار مرچ کی نہ لے جاتا تو وہ جدے میں خرید کر کمی پوری کر لیتا تھا۔ جدے سے سامان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوئز جاتا اور وہاں سے اونٹوں پر لد لد کر قاہرہ پہنچتا تھا۔ قاہرہ سے اسکندریہ اور پھر وہاں سے اطالوی جہازوں کے ذریعے بحر روم اور شمالی یورپ کی بندرگاہوں میں فروخت ہوتا تھا۔ اس ساری تجارت میں مختلف محصولوں کے ذریعے مصری حکومت کی خوب آمدنی ہو گئی تھی۔ اندازاً ہر بحری سفر میں سامان کی مالیت کا ۱/۳ حصہ مصری حکومت کو مل جاتا تھا۔[۱] غرضکہ ہندوستان کی تجارت کا اصلی منافع مصری حکومت اور عرب تاجروں کو ملتا تھا۔ اطالوی تاجروں کا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اسکندریہ سے مشرقی سامان کو اپنے جہازوں میں لے جائیں اور یورپ کی مختلف منڈیوں میں تقسیم کر کے تھوڑا بہت نفع کمائیں۔

Rise of Portuguese Power in India, PP.7,8–By R.S.Whiteway

پرتگالیوں کی یہ دلی خواہش تھی اور یہی اصل محرک تھا جو انھیں مشرقی ملکوں کی طرف کھینچ لایا کہ کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارت میں حصہ بنا لیں۔ واسکوڈی گاما کو کالی کٹ میں عرب تاجروں کا مقابلہ کرنا پڑا جو ظاہر ہے اس قدر آسانی سے اپنی بحر ہند کی وسیع تجارت کو پرتگالیوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ ساحل مالابار پر عربوں کی مستقل نوآبادیاں بس گئی تھیں اور ان کے تعلقات یہاں کے حکمراں زمورن سے نہایت خوشگوار تھے۔ زمورن نے شروع میں تو پرتگالیوں کی آؤ بھگت کی اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ ان کی وجہ سے اس کے علاقے کی تجارت کو اور فروغ ہوگا۔ لیکن بہت جلد وہ ان سے بیزار ہو گیا اور ان کے مقابلے میں عرب تاجروں کی حمایت کرنے لگا۔ چنانچہ واسکوڈی گاما یہاں کوئی مستقل اثر قائم نہ کر سکا اور اگست ۱۴۹۹ء میں لسبن واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے دوسرے سال پرتگال کے بادشاہ نے پیدرو الوارس کبرال کی سرکردگی میں تیرہ جہازوں کا بیڑا روانہ کیا۔ اس کے ساتھ بارہ سو مسلح سپاہی بھی تھے۔ کبرال نے کالی کٹ میں ایک تجارتی کوٹھی قائم کی اور واپسی پر کنانور اور کوچین سے جہاں کے حکمرانوں سے پرتگالیوں کے تعلقات نسبتاً بہتر تھے۔ مسالوں کے علاوہ دوسرا بہت سا مال اپنے جہازوں پر لاد کر پرتگال روانہ ہو گیا۔ اب براہ راست پرتگالیوں کا تجارتی تعلق جنوبی ہند سے قائم ہو گیا۔ جوں جوں پرتگالی تجارت جنوبی ہند میں بڑھتی گئی اتنا ہی عربوں کی تجارت کو نقصان ہونے لگا۔ اب پرتگالی بغیر عرب اور اطالوی تاجروں کے واسطے کے مشرقی ملکوں کا سامان یورپ کی مختلف تجارتی منڈیوں کو لے جانے لگے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عربوں اور پرتگالیوں میں سخت رقابت اور کشیدگی پیدا ہو گئی۔ پرتگالیوں نے مالابار میں اپنے قدم جمانے کے بعد کھلم کھلا یہ کوشش شروع کر دی کہ عربوں کی بحر احمر اور خلیج فارس کی تجارت کو نقصان پہنچایا جائے۔ انھوں نے عربوں کے جہازوں کو بحر ہند میں لوٹنا شروع کر دیا۔ واسکوڈی گاما دوبارہ سنہ ۱۵۰۲ء میں بیس جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان آیا۔ اس کے حکم سے حاجیوں کا ایک جہاز جس میں عورتیں بچے بھی شامل تھے مال و اسباب لوٹ لینے کے بعد بحر ہند میں آگ لگا کر غرق کرا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس خونیں منظر کو اپنے جہاز

میں دور سے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا تھا۔ واسکوڈی گاما نے زموَرن کو مجبور کرنا چاہا کہ وہ اپنے علاقے میں عرب تاجروں کی آمد ورفت کو حکماً بند کر دے تاکہ آئندہ ان کے جہاز ساحل مالابار پر نہ آسکیں لیکن زموَرن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پرتگالیوں سے بہت بیزار ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے قدم اس کے ملک میں نہ جمنے پائیں۔ چنانچہ اس کے حکم سے پرتگالیوں کو کالی کٹ کی کوٹھی بند کرنی پڑی جس کا انھوں نے سخت انتقام لیا۔ زموَرن کے اس طرزِ عمل پر واسکوڈی گاما کو بڑا طیش آیا اور اس نے زموَرن کی رعایا اور خاص کر عربوں پر ایسے وحشیانہ مظالم کیے کہ جن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان مظالم کی نسبت خود پرتگالی مورخین نے بھی ذکر کیا ہے۔ واسکوڈی گاما نے کوچین اور کنانور کے رئیسوں کو جو زموَرن کے مخالف تھے اپنے ساتھ ملا لیا اور کالی کٹ پر سمندر کے راستے سے حملہ کر دیا۔ راستے میں چند چھوٹی کشتیوں کو پکڑ لیا جن میں پندرہ آدمی تھے۔ ان آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اور اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ساحل پر پھینک دیے گئے تاکہ زموَرن کو عبرت ہو جائے۔ واسکوڈی گاما کے حکم سے کالی کٹ پر سخت گولہ باری کی گئی اور خود زموَرن کا محل گولوں کا نشانہ بنا۔ زموَرن کے بیڑے نے مقابلے کی کوشش کی لیکن وہ زیادہ عرصے تک پرتگالی بیڑے کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ واسکوڈی گاما کی واپسی پر زموَرن نے عرب تاجروں کی مدد سے کوچین پر حملہ کر دیا لیکن اس کو مٹھی بھر پرتگالیوں سے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پرتگالیوں کی اس کامیابی سے ان کی فوجی اور تنظیمی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۵۰۵ء میں المائدا پہلا پرتگالی وائسرائے مقرر ہو کر جنوبی ہند آیا اور چار سال تک رہا۔ اس کے عہد میں زموَرن نے عرب تاجروں کے علاوہ گجرات اور بیجاپور کے سلاطین سے طے کیا کہ وہ سب مل کر پرتگالیوں کو ملک سے نکال دیں گے۔ پرتگالیوں کے خلاف اس معاہدے میں مصر کے مملوک حکمراں کو بھی شریک کر لیا گیا جس کے محاصل کی آمدنی پرتگالیوں کی تجارت کے باعث بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ۱۵۰۸ء میں جدے کے گورنر امیر حسین کی سرکردگی میں مصری بیڑہ اور پرتگالی بیڑے میں بحرِ ہند میں زبردست بحری جنگ ہوئی۔ گجرات کا بیڑا جو ناگڑھ اور دیو کے

فوجدار ملک عیاض کی سرکردگی میں مصری بیڑے کے ساتھ شریک تھا۔ اس بحری جنگ میں پرتگالی بیڑے کو سخت شکست کھانی پڑی اور المیڈا کا بیٹا بھی اس میں مارا گیا۔

پرتگالی وائسرائے المیڈا نے اس شکست کے بعد ایک سال تک خوب تیاری کی اور جس قدر پرتگالی جہاز موجود تھے انھیں مسلح کر کے وہ امیر حسین اور ملک عیاض کے بیڑے کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ڈیو کے قریب دونوں بیڑوں میں زبردست جنگ ہوئی جس میں پرتگالیوں کو کامیابی ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے جتنے قیدی گرفتار کیے انھیں قتل کرا دیا گیا۔ اس کامیابی نے پرتگالیوں کی بحری قوت کا سکہ مشرق میں بٹھا دیا۔ اور بحر ہند میں آئندہ تقریباً سو سال تک کوئی دوسری قوم ان کے مقابلے پر نہ آسکی۔(1)

المیڈا کے بحری مہم کے روانہ ہونے سے قبل ۱۵۰۸ء میں البوقرق کنانور پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ پرتگال نے اس کو المیڈا کا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن المیڈا نے اس کو اس وقت تک اپنے عہدے کا جائزہ دینے سے انکار کیا جب تک کہ وہ اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام نہ لے لے۔ ڈیو کی بحری جنگ کے بعد اس نے کنانور واپس ہو کر البوقرق کو جائزہ دیا اور پرتگال واپس روانہ ہو گیا۔ راس امید میں اس کو کسی جھگڑے کے سلسلے میں ایک حبشی نے قتل کر دیا۔

البوقرق پرتگالی قوم کے ملک گیری کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس نے ۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ والیٔ بیجاپور کی فوج کو شکست دے کر گوا پر قبضہ کر لیا اور وہاں قلعہ بنا کر دیسی لوگوں کو قواعد پریڈ سکھا کر اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس کے عہد میں گوا کی تجارتی اہمیت اور آبادی بہت بڑھ گئی چین اور ہندوستان کے درمیان گوا پرتگالیوں کا سب سے بڑا تجارتی اور فوجی مرکز بن گیا۔ ملاکا پر پرتگالی قبضہ ہو جانے سے مشرق بعید کی تجارت بھی عربوں

(1) Rise of the portuguese power in India, P115, 116;
Danvers-The Portuguese in India, P, 129, 130.

کے ہاتھ سے نکل گئی اور پرتگالی اس پر قابض ہو گئے۔ پرتگالیوں نے لنکا، ساحل مالابار، ایران اور ہرمز میں اپنی قلعہ بند کوٹھیاں قائم کرلیں۔ ان مقامات سے پرتگالیوں نے پورے بحر ہند پر قابو حاصل کر لیا۔ عرب تاجر بالکل بیدخل کر دیے گئے۔ البوقرق نے پرتگالیوں کی نوآبادیاں قائم کرنے کی کوشش کی۔ پرتگالیوں نے دیسی باشندوں کی عورتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے جس طرح اس سے قبل عربوں نے کیے تھے تاکہ ان کی جڑیں مشرق میں مضبوط ہو جائیں۔ لیکن نوآبادیاں قائم کرنے کا یہ طریقہ انھیں راس نہ آیا۔ اور ان کی قومی نسل بہت جلد بگڑ گئی۔

البوقرق ایک متعصب شخص تھا۔ اس نے عیسائیت کی اشاعت تلوار کے زور سے کرنا چاہی اور اس ضمن میں دیسی لوگوں پر بڑے وحشیانہ ظلم ڈھائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ البوقرق نے اہل ہند کی سیاسی کمزوری اور ان کی آپس کی عداوتوں کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ وہ ہندوستان میں چھ سال تک متواتر رہا اور اس عرصے میں وہ جنوبی ہند پر پرتگالی حکومت قائم کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے مقبوضات کے باشندوں کو جبری طور پر عیسائی بنانے کی کوشش کی تو اہل پرتگال کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور ان کی تجارت کو نقصان پہنچا۔ بہت جلد ان کے عہدہ دار راشی ہو گئے۔ پرتگالیوں نے ہندوستانی حکمرانوں اور اس ملک کی رعایا سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا رویہ رعایا کے ساتھ اس قدر جابرانہ تھا کہ عام طور پر لوگ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان ان کے دشمن ہو گئے اور انھیں نفرت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پرتگالیوں کے بے رحم بادشاہ جان سوم نے حکم دے دیا تھا کہ پرتگالی مقبوضات میں جو لوگ بھی آباد ہیں انھیں عیسوی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے اور اگر کوئی عیسائی مذہب اختیار کرنے کے بعد پھر جائے اس کو زندہ جلا دیا جائے۔ ۱۵۶۰ عیسوی میں گوا میں محکمۂ احتساب قائم کیا گیا اور مذہب کے نام پر سخت مظالم کیے گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پرتگالی حکومت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی بنا ایسے غلط اصولوں پر

رکھی گئی تھی جو انسانیت کے خلاف تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مشرقی ملکوں میں جہاں جہاں بھی پرتگالیوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں وہاں انھیں کبھی بھی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اور جب ولندیزی اور انگریز ان کے مقابلے پر آئے تو ہر جگہ پرتگالیوں کو چھوڑ کر رعایا نے ان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ اس طرح پرتگالی تجارت کا خاتمہ ہو گیا اور ان کے ملک گیری کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

گوا پر پرتگالی قبضہ ہو جانے سے دکن کی عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کو پرتگالیوں کی طرف سے خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۵۶۹ء میں علی عادل شاہ اول، مرتضیٰ نظام شاہ اور کالی کٹ کے راجا نے مل کر گوا پر حملہ کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ گوا کو فتح کرنے کے بعد ساحل مالابار پر پرتگالیوں کی جتنی کوٹھیاں ہیں ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن اس منصوبے میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ دس مہینے تک متحدہ افواج نے گوا کا محاصرہ جاری رکھا لیکن پرتگالیوں کی قلعہ بند فوج کو جو تعداد میں بہت ہی کم تھی زیر نہیں کیا جا سکا۔ اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ وہ جدید اسلحہ اور جنگ کے جدید سائنٹفک طریقوں سے واقف تھے۔ یہی ان کی قوت کا راز تھا۔ بالآخر عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں نے پرتگالیوں سے صلحنامے کر لیے اور ان کے ساحلی مقبوضات کو تسلیم کر لیا۔

گجرات میں دیو، دامن اور بسین پر پرتگالیوں نے قلعہ بندی کر لی تھی۔ اکبر اعظم نے جب ۱۵۷۳ء میں حملہ کیا تو اس نے پرتگالی بندرگاہوں کو چھوڑ کر باقی کل کاٹھیاواڑ پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے کہ اکبر ان سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر سال ہزاروں ہندی مسلمان حج کی غرض سے جاتے ہیں۔ اگر پرتگالیوں سے بگاڑ ہو گیا تو وہ حاجیوں کے جہازوں کو لوٹیں گے اور انھیں گرفتار کریں گے۔ بحری تجارت سے مغل سلطنت کی جو آمدنی ہوتی تھی اس کے کم ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ پرتگالیوں نے بھی بڑی دانشمندی سے کام لیا۔ گجرات کے حکمران نے اکبر اعظم کے خلاف جب پرتگالیوں کی مدد طلب کی تو انھوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا اس واسطے کہ وہ جانتے تھے کہ اکبر کی مخالفت مول لینا انھیں بڑی دشواریوں میں

پیش کرے گا۔ جب اکبر سورت پہنچا تو پرتگالیوں نے اپنی سفارت اس کی خدمت میں روانہ کی اور بعد میں تین مرتبہ آگرہ ان کی سفارتیں گئیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطنت مغلیہ اور سلاطین دکن کے انتہائی عروج کے زمانے میں ہندوستان کے حکمرانوں نے بحری قوت کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ بحر عرب میں پرتگالی بیڑہ پوری طرح حاوی تھا۔ پرتگالیوں کے اجازت ناموں کے بغیر کوئی جہاز بحر عرب میں نہیں جاسکتا تھا۔ بحری قوت اور سائنٹفک علم کی طرف سے لاپروائی کا خمیازہ اہل ہند کو بعد میں بھگتنا پڑا۔ اسی سبب سے مٹھی بھر یورپینوں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس خیال کرتے تھے جس کی بیسیوں مثالیں ہماری اس عہد کی تاریخ میں ملتی ہیں۔

البوقرق کے بعد پرتگالیوں نے مدراس کے قریب سینٹ تھومے اور بنگال میں ہگلی پر اپنی کوٹھیاں قائم کیں۔ گوا کی طرح ڈیو کی بندرگاہ پر بھی انھوں نے زبردست قلعہ بندی کی تھی تاکہ اگر ترکی کے حکمران کبھی ان کی تجارت میں رکاوٹ ڈالنا چاہیں تو وہ ان کا مقابلہ کرسکیں۔ ہگلی میں جب انھوں نے وہی طرزِعمل اختیار کیا جو جنوبی ہند کے مقبوضات میں اختیار کیا تھا اور خودمختار حکومت کی شان ظاہر کرنی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے انھیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ ان کے جہازرانوں نے خلیج بنگال میں بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کرکے بعض دشوارگزار ساحلی مقامات میں اپنے اڈے بنالیے جن کے سبب سے بنگال کے مغل صوبہ دار کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ان پر قابو حاصل کرلیا گیا۔ بنگال میں آئندہ پھر کبھی پرتگالیوں کی تجارت کو فروغ حاصل نہ ہوسکا۔

سولھویں صدی کے آخری زمانے میں یورپ میں بعض ایسے سیاسی واقعات پیش آئے جن کا اثر ہندوستان کی تاریخ پر بھی پڑا۔ ۱۵۸۰ء میں پرتگال کے سارے ملک پر اسپین کے حکمراں فلپ دوم نے قبضہ کرلیا۔ اگرچہ اس نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ مشرقی ملکوں سے پرتگالیوں کی جو تجارت تھی وہ پرتگالی جہازوں ہی کے ذریعے سے ہوا کرے گی اور پرتگالیوں کو مشرقی ملکوں میں حسب سابق

حقوق حاصل رہیں گے، لیکن اس واقعے سے پرتگالی تجارت کو سخت نقصان پہنچا۔ یورپ کی وہ سب قومیں جو اسپین کی دشمن تھیں اب پرتگال کی بھی دشمن بن گئیں اس واسطے کہ وہ اب اسپین کا جزو بن گیا تھا۔ مشرقی ملکوں میں پرتگالی نوآبادیوں کو ان کی قومی حکومت سے جو امداد ملا کرتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ بعد میں اگرچہ تقریباً نصف صدی کے بعد پرتگال پھر اسپین سے علیحدہ ہو گیا لیکن اس عرصے میں دوسرے یورپین حریف ایشیائی سمندروں میں پہنچ چکے تھے اور پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی حیثیت مضبوط کر چکے تھے۔ ان حالات میں پرتگالی قوم کی حوصلہ مندی کو سخت ٹھیس لگی اور اس کی تجارت و قوت کو پہلا سا فروغ آئندہ کبھی نصیب نہ ہوا۔

۱۵۸۵ء میں اسپین اور انگلستان کے سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے اس واسطے کہ ملکہ الزبتھ نے ہالینڈ کی بغاوت میں جو اسپین کی حکومت کے خلاف ہوئی تھی باغیوں کی کھلم کھلا امداد کی تھی۔ اس زمانے میں ہالینڈ اور انگلستان سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے، اور مذہبی اعتبار سے بھی چونکہ یہ دونوں ملک پروٹسٹنٹ تھے اس لیے دونوں اس کے درپے ہوئے کہ اپنے کیتھولک حریف اسپین کو یورپ کی سیاست میں نیچا دکھایا جائے۔ ہالینڈ اور انگلستان دونوں نے اسپین اور پرتگال کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جو پاپائے روم کے فرمان کی رو سے ان دونوں ملکوں کو اپنی تجارت کو ترقی دینے اور نوآبادیاں قائم کرنے کے ضمن میں حاصل ہوا تھا۔ سو برس تک پرتگال اور اسپین دنیا کے سمندروں پر حاوی رہے لیکن اب ہالینڈ اور انگلستان نے ان کے اس تفوق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان دونوں ملکوں نے سمندروں کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ حکومت اسپین کی ممانعت کے باوجود ڈریک نے سمندر کے راستے سے دنیا کا چکر لگایا۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے بیڑے (آرمیڈا) کی جو تباہی ہوئی اس سے اسپین کا رعب دلوں سے اٹھ گیا۔ اس واقعے کے تین برس بعد کپتان لنکاسٹر جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر راس کماری ہوتا ہوا ملایا پہنچا اور پرتگالی جہاز ران اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ اسپین اور پرتگال ۔۔۔ یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں میں اس بری طرح سے الجھے ہوئے

بھتے کہ ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ مشرقی ملکوں کو اپنا بیڑا بھیج سکیں۔ پھر اسپین اور پرتگال کی مالی حالت بھی ویسی نہیں رہی تھی جیسی کہ کچھ عرصہ قبل تھی۔ اسپین کے جبر و استبداد سے تنگ آکر نیدرلینڈ (ہالینڈ) آزاد ہو چکا تھا۔ ہالینڈ والوں نے اپنے سابق ہسپانوی حکمرانوں کا بدلہ پرتگال سے کے مشرقی مقبوضات میں لینے کی کوشش کی۔ ان کے جہاز ران مشرقی سمندروں میں پہنچ چکے تھے اور آہستہ آہستہ پرتگالی تجارت پر تصرف حاصل کر رہے تھے۔ ہندوستان کی دولت اور مغل دربار کی شان و شوکت کی شہرت اس وقت یورپ کے ہر ملک میں پہنچ چکی تھی۔ اسپین اور پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہالینڈ اور انگلستان کے تاجروں نے ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنے ملکوں کی دولت میں تجارت کے ذریعے اضافہ کیا جائے۔

ولندیزوں کی ہندوستان سے تجارت

ہالینڈ اسپین کے جوئے سے ابھی حال ہی میں آزاد ہوا تھا اس ملک کے باشندوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ مہم جوئی کے لیے بیتاب تھے۔ فن جہاز رانی کو اس ملک میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ دراصل ولندیزیوں کی نوآبادیوں کا باعث ان کی خود مختاری کی وہ طویل جنگ تھی جو اسپین کے خلاف پیش آئی اور جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب پرتگال اور اس کی نوآبادیاں ۱۵۸۰ء میں اسپین میں ضم ہو گئیں تو ولندیزی لوگ پرتگالی نوآبادیوں کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ولندیزی تجارت اور ان کی نوآبادیوں کا مرکز مشرقی بحر ہند میں ہے جہاں کبھی پرتگالیوں کا طوطی بولتا تھا۔ ہالینڈ کے بعض اولوالعزم تاجروں نے ۱۵۹۲ء میں ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے تجارت کرنے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کی طرف سے ہاؤٹ مان لسبن گیا تاکہ وہاں جاکر ہندوستان کے متعلق ضروری معلومات جمع کرے اور پتا چلائے کہ کن اشیا کی تجارت میں زیادہ فائدہ ہوگا۔ ہاؤٹ مان نے لسبن میں ضروری معلومات جمع کیں اور اس کے تین سال بعد وہ راس امید سے ہو کر جاوا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ عام طور پر پرتگالی تاجروں سے بیزاری کے آثار

پائے جاتے تھے۔ لوگ دوسرے یورپین تاجروں سے لین دین کرنے کو آمادہ تھے۔ ہاوٹ مان کا یہ سفر کامیاب رہا اور ہالینڈ والوں کے لیے مشرق کی تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ ہالینڈ میں مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کے لیے متعدد کمپنیاں قائم ہوگئیں جن میں آپس میں رقابت رہنے لگی جس سے قومی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ حکومت کی دخل اندازی سے ۱۶۰۲ء میں ان سب کمپنیوں کو ملا کر ایک کمپنی بنادی گئی جس کو حکومت نے مشرقی ممالک سے تجارت کا اجارہ بذریعۂ منشور دے دیا۔ ۱۶۱۰ء میں حکومت گولکنڈہ نے ولندیزوں (ڈچ) کو مسولی پٹم میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد پیٹاپولی اور پلی کٹ میں ان کی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ یہ مقامات بھی گولکنڈے کے ماتحت تھے۔ حکومت گولکنڈہ سے یہ طے ہوا کہ ان بندرگاہوں میں درآمد و برآمد پر چار فی صدی محصول ولندیزی کمپنی ادا کیا کرے گی۔ جنجی کے نائک نے دیوناپٹنم میں ولندیزوں کو کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ چونکہ ولندیزی کمپنی کی زیادہ تر تجارت جزائر شرق الہند سے تھی اس واسطے اس نے ہندوستان میں مالابار کے بجائے کارومنڈل کے ساحل پر اپنی کوٹھیاں قائم کیں تاکہ اپنے مرکز سے قریب رہیں۔ ولندیزی کمپنی کی شروع ہی سے ہالینڈ کی حکومت نے سرپرستی کی بلکہ اس کے نظم و نسق میں مداخلت بھی کی تاکہ مشرقی ملکوں کی تجارت سے پوری ولندیزی قوم نفع اندوزی کر سکے۔

ولندیزوں کی بحری قوت میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا وہ پرتگالیوں کی تجارت پر تصرف حاصل کرتے گئے اور ان کے تجارتی مرکزوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ کچھ عرصے میں انھوں نے جزائر شرق الہند (ایسٹ انڈیز)، و ملایا سے پرتگالیوں کو بالکل بے دخل کر دیا۔ اور جاوا میں بٹے ویا ان کا زبردست فوجی اور تجارتی مرکز بن گیا۔ ہندوستان میں ہگلی، چنسورہ اور مسولی پٹم کی کوٹھیوں میں ان کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ وہ ہندوستان سے نیل، چاول اور کپڑا جزائر شرق الہند کو لے جاتے تھے اور اس کے بدلے میں ہالینڈ کا بنا ہوا مال یہاں فروخت کرتے تھے۔ جزائر شرق الہند سے مسالے یورپ بھیجے جاتے

بنے۔ اسٹرڈم اور انٹ ورپ مشرقی تجارت کے زبردست مرکز بن گئے جہاں سے شمالی اور وسط یورپ کو سامان بھیجا جاتا تھا۔

پرتگالیوں کی طرح ولندیزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعہ بند کر لیا تھا ولندیزی کمپنی کو حکومت ہالینڈ نے دیسی حکمرانوں کے ساتھ جن سے ان کا واسطہ پڑے صلح اور جنگ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ مشرق بعید سے پرتگالیوں کو بالکل بے دخل کرنے کے بعد ولندیزی بیڑے نے ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ سیلون اور مالابار میں پرتگالیوں کی جس قدر تجارت تھی وہ آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ میں آگئی۔ پرتگال کے جہازوں کی آمد و رفت مشرقی سمندروں میں بہت کم ہو گئی۔ اس واسطے کہ ولندیزی جہاز والے انھیں لوٹ لیتے اور غرق کر دیتے تھے۔ بالآخر جزائر شرق الہند کی طرح سیلون اور مالابار کے ساحل پر کنانور اور کوچین پر بھی ولندیزوں کا قبضہ ہو گیا اور گوا کی مؤثر ناکہ بندی کر دی گئی۔ لیکن ولندیزوں نے ساحل مالابار کی طرف کبھی بھی زیادہ کاروبار پھیلانے کی کوشش نہیں کی اس لیے کہ انھیں مسالے اور مرچ جزائر شرق الہند میں مالابار کے مقابلے میں زیادہ سستی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ مالابار میں انگریز اور ہندوستانی تاجروں سے انھیں مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جنوبی ہند کے حکمرانوں نے مسالوں اور مرچ کی تجارت کا ٹھیکا معاہدوں کے ذریعے ولندیزوں کو نہیں دیا جس طرح مشرق بعید میں انھیں مل گیا تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر ولندیزی کمپنی نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس اثنا میں ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی مشرقی ملکوں کی تجارت سے خوب مالدار ہو چکی تھی اور اس کے پاس زبردست سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ کمپنی حکومت کے تحت آ گئی تھی اور اس کے تقررات اور حکمت عملی کا تعلق براہ راست حکومت سے ہو گیا تھا۔ حکومت ہی اس کے حسابات کی تنقیح کرتی اور منافع تقسیم کرتی تھی۔ اس کو مشرقی حکمرانوں سے صلح اور جنگ کرنے، قلعے تعمیر کرانے، سکے بنانے اور دوسری یورپین قوموں سے تجارتی مقابلے کے لیے تدابیر اختیار کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ ولندیزی لوگوں نے اسپین کے جوئے سے چھٹکارا حاصل کی تھی

اور ان میں جو سیاسی اولوالعزمی اور شعور پیدا ہوا تھا اس کا اظہار سب سے زیادہ تجارت کے میدان میں ہوا۔ ان کے سابق حکمران اسپین اور پرتگال کو جو تجارتی اجارے حاصل تھے انھیں توڑنے اور خود ان کی جگہ لینے کے لیے انھوں نے کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں ہالینڈ کی مرفہ الحالی اور قومی دولت میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ اور وہ یورپ کے سب سے زیادہ مال دار ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ ولندیزوں نے پرتگالیوں کی طرح مشرق میں مسیحی مذہب کی اشاعت کو اپنا مقصد کبھی نہیں بنایا بلکہ انھوں نے صرف تجارت اور معاشی نفع اندوزی تک دینی مسائل کو محدود رکھا لیکن اپنے مقبوضات میں انھوں نے جو نظام حکومت نافذ کیا وہ جابرانہ تھا اور دیسی لوگوں کی ترقی کا اس میں مطلق خیال نہیں رکھا گیا تھا۔

ولندیزوں کی طرح انگریز بھی پرتگال کے مشرقی ملکوں کی اجارہ داری کے خلاف تھے۔ انھوں نے بھی پرتگال کی مشرقی تجارت پر کاری ضرب لگائی ان کے مشہور جہاز راں ڈریک نے دنیا کا چکر لگایا اور انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا کہ سمندروں پر کسی کی حکومت نہیں ہے۔ جو ملک چاہے آزادی سے جہاز رانی کر سکتا تھا۔ پوپ نے دنیا کو پرتگال اور اسپین کے درمیان جو تقسیم کیا تھا اسے ہالینڈ کی طرح انگلستان نے بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے بیڑے (آرمیڈا) کی تباہی سے انگریز جہاز رانوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور ان میں مہم جوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ اسپین اور پرتگال نے بحری مہم جوئی کی ابتدا کی تھی لیکن انگریز بھی فن جہاز رانی میں اپنے آپ کو یورپ کی کسی دوسری قوم سے ہیٹا نہیں سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں اسپین اور پرتگال کے جہاز راں نئے نئے سمندروں کا کھوج لگا رہے تھے، انگریز بھی اس دھن میں تھے کہ شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے جہاز رانوں نے کیبٹ کی رہبری میں نیو فاؤنڈلینڈ دریافت کیا اور شمالی امریکہ

Camden, History of Elizabeth. P. 35. لے

اپنا حق نوآبادکاری ختم کر لیا۔ رالف فچ پہلا انگریز ہے جو ۱۵۸۳ء میں خشکی کے راستے سے ہندوستان آیا۔ اس نے انگلستان واپس جا کر پرتگالی تجارت کی وسعت اور ہندوستان کی دولت کے قصے اپنے ہم وطنوں کو سنائے۔ ۱۵۹۱ء میں کپتان لنکاسٹر راس امید ہوتا ہوا راس کماری پہنچا اور پھر وہاں سے نکوبار ہوتا ہوا ملایا چلا گیا۔ ان سمندری سفروں سے انگریزوں کو مشرقی ممالک کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مشرق میں اپنی تجارت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ انگریز تاجر مشرقی ممالک کی طرف اس لیے اور بھی متوجہ ہوئے کہ بحر روم میں جو ان کی تجارتی کمپنی کاروبار کر رہی تھی اس کو اسپین کی مخالفت کے باعث بہت نقصان ہو رہا تھا۔ اور آبنائے جبرالٹر انگریزی جہازوں کے لیے بند کر دی گئی تھی۔

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی لندن کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں مشرقی ملکوں سے تجارت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور ملکہ الزبتھ نے اس کمپنی کو منشور عطا کیا۔ اس کمپنی کا انتظام ایک گورنر اور چوبیس ارکان کے سپرد کیا گیا جن کا انتخاب حصہ دار ہر سال کرتے تھے اس کمپنی کو بحر اٹلانٹک اور بحر ہند میں تجارت کا ٹھیکا حاصل ہو گیا۔ اس زمانے کی تجارت مسلح نوعیت کی تھی اور بغیر حکومت کی سرپرستی کے کسی قوم کے لیے ناممکن تھا کہ وہ دور دراز کے ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کرے۔ پھر انگریزوں کے سامنے ولندیزی کمپنی کی مثال موجود تھی جو اپنی حکومت کی سرپرستی کی بدولت خوب نفع حاصل کر رہی تھی۔ چنانچہ شروع ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت نے سرپرستی کی۔ لیکن ولندیزی کمپنی کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بالکل حکومت کے تحت نہ تھی۔ انگریزی کمپنی کا سرمایہ بھی ولندیزی کمپنی کے مقابلے میں کم تھا۔ پھر ایک بڑی خرابی اس کے کاروبار میں یہ بھی کہ ہر تیسری سفر کے لیے علیحدہ سرمایہ جمع کیا جاتا تھا۔ جس کے سبب سے کمپنی کے کاروبار کو عرصے تک استحکام نصیب نہ ہو سکا۔

انگریزی تاجروں نے دیکھا کہ جزائر شرق الہند میں وہ ولندیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو شروع ہی سے انھوں نے ہندوستان کے مغل حکمرانوں سے تجارتی مراعات حاصل کرنے کی فکر شروع کر دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کپتان ہاکنس ۱۶۰۸ء میں جہانگیر کے دربار میں آیا اور ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ لیکن اس زمانے میں مغل دربار میں پرتگالیوں کا اچھا خاصہ اثر تھا۔ ان کی کوشش اور سازش سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ شہزادہ خرم پرتگالیوں کی تائید میں تھا۔ ۱۶۱۲ء میں ٹامس بسٹ انگریزی بیڑے کو لے کر ہندوستان پہنچ گیا تاکہ پرتگالیوں کو جنھوں نے مغل دربار میں انگریزوں کی مخالفت کی تھی دکھا دیں اور چین سے تجارت نہ کرنے دے۔ اس نے دریائے تاپتی کے دہانے کے قریب پرتگالی بیڑے کو شکست دی۔ اور مغل دربار پر واضح [illegible] طرح پرتگالی بحری قوت رکھتے ہیں تو انگریز بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ ۱۶۱۵ء میں ٹامس الیڈ ورتھ کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوسری سفارت جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس دفعہ انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی جو اس زمانے میں مشرق کی نہایت بارونق بندرگاہ تھا۔ بعد میں اس کی شاخیں برہان پور، احمد آباد، اجمیر اور آگرہ میں قائم ہوئیں۔ جو ہندوستان کے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ اب انگریزوں کے لیے ہندوستان کی تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ ۱۶۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول نے سر ٹامس رو کو بہت سے تحائف دے کر بحیثیت سفیر ہندوستان بھیجا۔ جہانگیر سر ٹامس رو سے بڑے اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا اور اپنے خلوت کے جلسوں میں بھی اسے شرف باریابی بخشا۔ سر ٹامس رو سے بادشاہ نے جس اعزاز و اکرام کا سلوک کیا اس سے درباریوں کی نظر میں انگریزی قوم کی وقعت بڑھ گئی اور وہ انھیں پرتگالیوں اور ولندیزوں کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے لیکن بہت دنوں تک انگریزوں کی تجارت ولندیزوں کی تجارت کے مقابلے میں کمزور تھی۔ بقول ہنٹر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ الزبتھ کی

بڑھاپے کی اولاد تھی جیمس کی تلون مزاج حکمت عملی نے اور زیادہ نکما بنا دیا تھا، برخلاف اس کے ولندیزی کمپنی نے ایک نئی قوم کے جو کھم میں جنم لیا تھا۔ جنہیں ہسپانوی جابروں سے نجات پانے کے لیے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا کر دیا[1]

سر ٹامس رو نے سلطنت مغلیہ کی قوت کا صحیح اندازہ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ تجارت میں سیاست کو نہ لائیں اور پرتگالیوں کے حالات سے عبرت حاصل کریں۔ اس نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "پرتگال نے ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے فائدہ نہیں اٹھایا اس واسطے کہ اس کو فوجی حفاظت کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود دولتمند علاقوں اور ملکوں پر تصرف رکھنے کے ملک پرتگال کنگال کا کنگال رہا۔ اس کی فوج جو حقیر سی ہے اس کی ساری آمدنی کو کھا جاتی ہے۔ ہمیں اس مثال سے سبق لینا چاہیئے۔ ولندیزوں نے بھی یہی غلطی کی کہ تلوار کے زور سے انھوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کیں جن میں غلاموں سے کاشت کرائی جاتی ہے ...... ہمیں یہ قاعدہ بنا لینا چاہیئے کہ ہم سوائے پُر امن بحری تجارت کے اور کسی ذریعے سے نفع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ہندوستان کی سرزمین پر فوجیں رکھنا اور جنگ بڑی بھاری غلطی ہوگی۔"[2] سر ٹامس رو کے اس مشورے پر بہت کافی عرصے تک کمپنی نے عمل کیا اور ہندوستان کی تجارت سے نفع کمایا لیکن بعد میں اورنگ زیب کے عہد میں کمپنی کی حکمت عملی بدلی جس کے سبب سے اس کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

شروع شروع میں پرتگالیوں کا مشرق میں زور توڑنے کے لیے ہالینڈ اور انگلستان میں اتحاد ہو گیا تھا۔ ان کے اتحاد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان

---

[1] Hunter, A History of British India, Vol.I, P, 351.

[2] The Embassy of Sir Thomas Roe, ed. by W. Foster (Hakluyt Society), Vol.II, P.344.

دونوں ملکوں نے پوپ کے اقتدار سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا چنانچہ جب پرتگال کی قوت کمزور ہوگئی تو ان دونوں ملکوں میں رقابت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ولندیزی بیڑے نے پرتگالی بیڑے کو شکست دے کر جزائر شرق الہند میں مسالے کی تجارت پر قبضہ کر لیا اور وہاں بڑے زبردست فوجی اور تجارتی مرکز قائم کر لیے۔ انگریزوں نے بھی پرتگالیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جزائر شرق الہند میں اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہا لیکن ولندیزی تاجروں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انگریزوں نے جب ولندیزوں کے مقابلے کی کوشش کی تو بڑی ناخوشگوار صورت حالات پیدا ہوگئی۔ اس واسطے کہ ولندیزی کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی یورپین قوت مشرق بعید میں ان کی مدمقابل بنے۔ بڑی مشکل سے انگریز تاجروں کو جزائر شرق الہند کی ایک تہائی تجارت کی اجازت معاہدے کے ذریعے سے حاصل ہوئی لیکن باوجود انگریزوں کی تجارت محدود ہو جانے کے ولندیزوں اور انگریزوں میں تعلقات کی صفائی نہیں ہوئی۔ ولندیزوں کی دشمنی کا سب سے مشہور واقعہ ۱۶۲۳ء کا ’’امبوئے نا‘‘ کا قتل ہے۔ یہ مقام ملایا میں ہے۔ ولندیزوں نے اٹھارہ انگریزوں کو ولندیزی حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا اور سرسری تحقیقات کے بعد انھیں قتل کرا دیا گیا۔ چند جاپانی ملاحوں کو سخت بیدردانہ اذیتیں دے کر اقبال کرایا گیا۔ اور ان انگریزوں کے جرم کی مصنوعی طور پر شہادت فراہم کی گئی۔ ولندیزوں کے گورنر کوئن نے انگریزوں کی بنٹم (جاوا) کی کوٹھی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ غرضکہ ان حالات میں انگریزوں نے مجبور ہو کر جزائر شرق الہند سے تجارت ختم کر دی اور آئندہ اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کی تجارت کی طرف مبذول کر دی۔

انگلستان میں بادشاہ چارلس اور پارلیمنٹ کے درمیان جو جھگڑا شروع ہوا اس میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ دنگوں کی جماعت کمپنی کو شاہ پرست خیال کرتی تھی اور خود بادشاہ اس سے ناخوش تھا۔ چنانچہ چارلس نے ۱۶۳۵ء میں منشور کے ذریعے نئی کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کمپنی کا سرغنہ

سر ولیم کورٹین تھا اسی لیے اس نئی کمپنی کو کورٹین ایسوسی ایشن بھی کہتے ہیں۔ اس نئی کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان میں جن مقامات پر پرانی کمپنی کی کوٹھیاں ہوں گی وہاں وہ اپنی شاخیں نہیں قائم کرے گی۔ لیکن اس وعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ دونوں کمپنیوں کے درمیان ۱۶۵۷ء تک مقابلہ جاری رہا جبکہ کرامول نے دونوں کو ملا کر ایک کر کے مشترک سرمایے کے اصول پر اس کے کاروبار کی تنظیم کا حکم دے دیا اور کمپنی کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ خود شاہی کے بعد بھی کمپنی کے کاروبار کو خوب ترقی ہوئی۔ اس واسطے کہ اس کو کچھ عرصے کے لیے اپنے یورپین حریفوں کے مقابلے سے امن مل گیا اور اس کے سرمایے میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ بہت دنوں تک انگریزوں نے اپنے آپ کو ولندیزی حریفوں کے مقابلے میں بے بس محسوس کیا۔ لیکن بالآخر اسٹورٹ خاندان کے خاتمے پر کرامول بر سر اقتدار ہوا تو اس نے حکومت ہالینڈ سے دس ہزار پونڈ کا ہرجانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو "امبوئے نا" کے قتل کے سلسلے میں دلوایا اور ساڑھے تین ہزار پونڈ مقتولوں کے وارثوں کو دلوائے۔ انگریزوں کو جزائر شرق الہند سے بے دخل کرنے کے بعد ولندیزوں نے وہاں جو نظام حکومت قائم کیا وہ جبر واستبداد پر مبنی تھا۔ پرتگالیوں کے وحشیانہ مظالم غیر مسیحیوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے ہوتے تھے لیکن ہالینڈ کے مظالم کا محرک ان کا مادی مفاد تھا۔

اس زمانے میں جس طرح ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی اس طرح مشرق بعید میں کوئی منظم حکومت موجود نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولندیزوں نے جزائر شرق الہند میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نفع اندوزی کی حکمت عملی کے تحت دروبست کے مالک بن گئے۔ انھوں نے تجارت کے ساتھ محاصل اور مالگزاری سے اپنی حیثیت کو خوب مستحکم کر لیا۔ ان کے مشہور گورنر کوئن نے ولندیزی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ پرتگالیوں کی طرح ولندیزوں نے افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں سے غلاموں کو خرید کر مشرق بعید کے مقبوضات میں آباد کیا اور زرعی استحصال کی دوسری تدابیر بھی اختیار کیں۔ ان کا خیال تھا کہ گرم ملکوں میں زراعت کے لیے یورپ کے سفید فام لوگوں کو لا کر آباد کرنا سخت غلطی

ہے اس لیے کہ وہ یہاں زیادہ محنت نہیں کر سکیں گے۔ ولندیزوں نے گرم مسالوں کی کاشت بھی وسیع پیمانے پر شروع کر دی اور گرم مسالوں کی تجارت تو پہلے سے انہیں کے ہاتھ میں تھی اس طرح ان کی نفع اندوزی دگنی ہو گئی۔

اب تک انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے حدود میں کہیں بھی اپنی کوٹھیوں کو قلعہ بند کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس زمانے میں جنوبی ہند میں ابھی خاصی انتشار پھیلی ہوئی تھی۔ وجیا نگر کے زوال کے بعد یہاں کے مقامی رئیس خود مختار ہو گئے تھے۔ انگریزوں کو کارومنڈل ساحل پر ۱۶۳۲ء میں مسولی پٹم میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حکومت گولکنڈہ سے مل گئی۔ اس کوٹھی کے قیام سے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر انگریز اپنے ولندیزی حریفوں کا خوب مقابلہ کر رہے تھے۔ مسولی پٹم (مچھلی پٹم) کی کونسل کے ایک رکن فرانسس ڈے نے ولندیزوں کی کوٹھی واقع پلی کٹ سے ۳۰ میل جنوب میں مقامی رئیس سری رنگا رائے سے تھوڑی سی زمین چناپٹم (مدراس پٹم) کے گاؤں میں بطور معافی حاصل کر لی انگریزوں نے یہاں قلعہ بندی کر لی جس کی اجازت انہیں مغلوں کے علاقے میں اب تک کہیں نہ ملی تھی۔ مدراس کے پاس سینٹ تھومے میں پرتگالیوں کی آبادی پہلے سے موجود تھی جن کے ساتھ انگریز تاجروں نے دوستانہ تعلقات قائم کیے اس واسطے کہ اب وہ ان کے مد مقابل نہ رہے تھے۔

فرانسس ڈے نے مدراس کی کوٹھی کمپنی کی مجلس نظما کی اجازت کے بغیر بہ امید منظوری قائم کر لی تھی۔ وہ ولندیزوں کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ یہاں بھی وہ پیش قدمی کر کے اپنا کارخانہ قائم کر لیں۔ کمپنی کی مجلس نظما نے سورت کی کونسل پر چھوڑ دیا کہ اگر وہ اپنے تجارتی اغراض کے لیے مناسب خیال کرے تو مدراس میں کوٹھی قائم کرنے میں روپیہ صرف کرے۔ مدراس کا جائے وقوع خلیج بنگال میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس واسطے سورت کونسل نے یہاں قلعہ بند

Talboy Wheeler, Madras in the olden times, compiled from the official Records, Vol, 1. P, 25.　　ا؎

کوٹھی بنانے کی تائید کی جس کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا گیا کوٹھی کی تعمیر
سینٹ جارجس ڈے پر ختم ہوئی۔ اس قلعہ بند مرکز سے انگریز ولندیزوں کا
کارومنڈل کے ساحل پر مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ بہت جلد مدراس کی مرفہ الحالی
میں اضافہ ہوا۔ چھپی ہوئی سوتی چھینٹ یہاں تیار ہوتی تھی جس کی انگلستان میں
بہت مانگ تھی۔ سنہ ۱۶۵۲ء میں مدراس ایجنسی کو علیحدہ پریسیڈنسی بنا دیا گیا اور سنہ ۱۶۵۹ء
میں کارومنڈل ساحل اور بنگال کی سب کوٹھیاں اسی کے ماتحت کر دی گئیں۔
مدراس کے پاس جو زمین انگریزوں نے بطور معافی حاصل کی تھی وہ ہندوستان
کی سرزمین پر ان کی پہلی ملکیت تھی۔ انھوں نے سنہ ۱۶۳۹ء میں گولکنڈے کے حکمران
سے اس معافی کی باضابطہ توثیق حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے گولکنڈے میں اپنا
ایک مستقل ایجنٹ رکھنا شروع کر دیا تاکہ وہ ان کے حقوق و مفاد کی نگرانی کر سکے۔
والیٔ گولکنڈہ نے بھی انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ ایسٹ انڈیا
کمپنی کی تجارت میں خود اپنا سرمایہ بھی لگانے کی خواہش ظاہر کی جسے کمپنی کے ارباب کار نے
بڑی ہوشمندی سے ٹال دیا۔

شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولندیزی کمپنی سے مل کر ہندوستان کے
مغربی ساحل پر پرتگالی تجارت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انگریزوں
اور ولندیزوں کے جہاز مل کر بحر ہند میں پرتگالی تجارتی جہازوں کو لوٹا کرتے تھے
لیکن جب پرتگال کی تجارت کو زوال آیا اور ولندیزی لوگ مشرقی ملکوں کی
تجارت کو اپنے تصرف میں لانے کے درپے ہوئے تو مجبوراً انگریزوں نے
پرتگالیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر
پرتگال کی رہی سہی حکومت کے ساتھ انھوں نے اتحاد کر لیا۔ پرتگالیوں نے انگریزوں کو
گوا میں رہ کر تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ سنہ ۱۶۶۱ء میں انگلستان کے
بادشاہ چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی کیتھرائن برگنزا کے ساتھ ہوئی۔

---

۱ Madras Government Manual of Administration, 1,P, 109; Bruce's Annals ,1, P,418

تو بمبئی کا جزیرہ جو حکومت پرتگال کے تحت تھا جہیز میں چارلس دوم کو دیا گیا۔ اس نے اس جزیرے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک سو پچاس روپے سالانہ کے معاوضے میں دوامی ٹھیکے پر دے دیا۔ انگریز تاجروں نے یہاں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کر لی اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے ڈر سے اس کو قلعہ بند کر لیا۔ بمبئی کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے انگریزوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر تجارتی اغراض کے لیے بڑی سہولتیں حاصل کر لیں اور وہ گوا اور سورت دونوں سے بے نیاز ہو گئے۔ سنہ ۱۶۸۷ء میں بجائے سورت کے بمبئی مغربی ساحل کی ریذیڈنسی کا مرکز بنا دیا گیا۔ اس وقت جبکہ نہر سوئز موجود نہیں تھی دور اندیش انگریزوں نے محسوس کیا کہ بمبئی کی جغرافی حیثیت ایسی ہے کہ بہت جلد وہ انگلستان اور ہندوستان کی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ باوجود ولندیزوں اور مرہٹوں کے حملوں کے بمبئی کی روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ سورت کے ریذیڈنٹ سر جارج آکسن ڈن اور اس کے جانشین جیرلڈ آن جیر نے تاجر لوگوں کو خاص رعایتیں دیں تاکہ وہ بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کریں۔ اس کی آبادی بیس ہزار سے بڑھ کر جو پرتگالیوں کے زمانے میں تھی بارہ سال میں ساٹھ ہزار ہو گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں اپنی پہلی کوٹھی سنہ ۱۶۳۳ء میں بالاسور میں قائم کی تھی۔ بعد میں سنہ ۱۶۵۱ء میں ہگلی میں دوسری کوٹھی قائم کرنے کی انھیں اجازت مل گئی۔ ان کوٹھیوں کے تحت قاسم بازار اور پٹنے میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تجارتی اغراض کے لیے قائم کر لی گئیں۔ سنہ ۱۶۴۵ء میں سورت سے ایک انگریزی ڈاکٹر جس کا نام گیبرئیل باؤٹن تھا شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا کے علاج کے لیے آگرے بلایا گیا۔ اس نے اپنی قابلیت سے علاج میں کامیابی حاصل کی اور اپنے اثر اور رسوخ سے بادشاہ سے فرمان حاصل کر لیا کہ کمپنی کے مال پر بنگال میں شاہی محصول معاف کر دیا جائے۔ اس کی یہ درخواست منظور ہوئی اور شاہی فرمان جاری کر دیا گیا کہ کمپنی کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس وقت بنگال میں شہزادہ شاہ شجاع صوبہ دار تھا۔ ڈاکٹر باؤٹن جب شاہی فرمان بنگال لے گیا تو شاہ شجاع سے مل کر اس کا فوراً نفاذ کرا دیا بشرطیکہ کمپنی پیشکش کے طور پر تین ہزار

روپے سالانہ بنگال کے صوبہ دار کو ادا کیا کرے۔ اس زمانے میں کمپنی ریشم، شکر اور شورے کی تجارت وسیع پیمانے پر کرتی تھی۔ شورے کی خاص طور پر انگلستان میں بہت مانگ تھی۔ اس واسطے کہ وہ بارود بنانے میں کام آتا تھا۔ کمپنی سالانہ تین ہزار روپے یکمشت شاہ شجاع کو ادا کرنے لگی۔ اس رقم کے علاوہ اس کو کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔

اورنگ زیب کے برسر اقتدار ہونے کے بعد پہلے میر جملہ اور پھر شایستہ خاں بنگال کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان دونوں نے انگریزی کمپنی کے مال پر قیمت کے لحاظ سے محصول عاید کر دیے۔ شایستہ خاں نے اس فرمان کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا جو کمپنی نے شاہجہاں سے حاصل کیا تھا اور کہا کہ اس کا نفاذ ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ بنگال میں جن اشیا کی تجارت کمپنی کرتی تھی ان کی مانگ بڑھتی گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہگلی کی کوٹھی کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ سنہ ۱۶۸۱ء میں کمپنی کی مجلس نظما کے حکم سے ہگلی میں ایک گورنر مقرر ہوا اور بنگال کی کوٹھیوں کو مدراس کی ماتحتی سے نکال کر ان کی جدید تنظیم عمل میں لائی گئی۔ لیکن جب کمپنی نے قلعہ بندی کرنے کی کوشش کی تو شایستہ خاں نے مخالفت کی اور اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ محصولوں کی بابت بھی کمپنی کے حکام اور صوبہ دار میں اختلاف بڑھتا گیا۔ اب تک کمپنی نے ہندوستان میں سر ٹامس رو کے مقرر کیے ہوئے اصول پر عمل کیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے سلطنت مغلیہ سے بگاڑ نہ کیا جائے بلکہ دوستانہ تعلقات اور موافقت سے کام نکالنے کی کوشش کی جائے۔ اس زمانے میں سر جوشیا چائلڈ کمپنی کی مجلس نظما کا صدر تھا۔ وہ ہندوستان میں قلعہ بند تجارت اور ملک گیری کی حکمتِ عملی کا حامی تھا اور چاہتا تھا کہ کمپنی اتنی قوت حاصل کر لے کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ مغلیہ سلطنت کا بھی مقابلہ کر سکے۔ سنہ ۱۶۸۶ء کے بعد سے مجلس نظما کی خط و کتابت میں بار بار اس کا ذکر ملتا ہے کہ تجارتی نفع کے ساتھ کمپنی کے کارکنوں کو چاہیے کہ گرد و نواح کے علاقوں پر تصرف حاصل کر کے مالگزاری اور محاصل سے اپنی آمدنی میں اضافہ کریں تاکہ بڑھتے ہوئے اخراجات کی پابجائی ہو سکے۔

سر جوشیا چائلڈ کے منشا کے مطابق مدراس میں محاصل کی آمدنی بڑھانے کے لیے ایک بلدیہ قائم کیا گیا۔ مجلس نظما نے مدراس کونسل کو اس ضمن میں جو ہدایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "نظمائے کمپنی خاص طور پر مدراس کونسل سے توقع رکھتے ہیں کہ سول اور فوجی قوت کی ایسی ہیئت سیاسیہ وجود میں لانی چاہیے اور محاصل و مالگزاری کی آمدنی کو اس قدر بڑھا لینا چاہیے کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں انگریزی قلمرو (ڈومینین) کی مضبوط بنیادیں قائم ہو جائیں[1]۔"

سر جوشیا چائلڈ اور اس کے ہم خیال ارکان مجلس نظما چاہتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی کوٹھیوں کی تنظیم انھیں اصول پر عمل میں لائی جائے جن اصول پر ولندیزوں نے جزائر شرق الہند میں اپنی کوٹھیاں قائم کی تھیں جو بعد میں ان کے مقبوضات کے مرکز بن گئیں۔ چنانچہ اس زمانے میں مجلس نظما کی خط و کتابت دیکھنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کمپنی کے ارباب کار کو بار بار ولندیزی نمونے کی تقلید کی دعوت دی گئی۔ ۱۶۸۹ء میں مجلس نظما نے بمبئی کی کونسل کو اس جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

"ہمیں جس قدر فکر اپنی تجارت کو ترقی دینے کی ہے اسی قدر اس کی بھی فکر ہے کہ ہمارے محاصل کی آمدنی (ریونیوز) میں اضافہ ہو۔ ہماری طرح اس کی فکر آپ لوگوں کو بھی ہونی چاہیے اس طور پر ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ ہندوستان میں اپنی قوت کو برقرار رکھ سکیں۔ چاہے ہماری تجارت بیسیوں قسم کے حوادث کا شکار ہی کیوں نہ ہوتی رہے۔ اس طرح ہم ہندوستان میں ایک قوم بن سکیں گے۔ بغیر اس کے ہماری حیثیت اس ملک میں خواہ مخواہ کی مداخلت کرنے والوں سے زیادہ نہ ہوگی جنھیں ہز مجسٹی کے منشور شاہی نے ایک جگہ جمع کر دیا ہو اور ہم صرف اس وقت وہاں تجارت کر سکیں جب تک دوسری قوت کی مرضی ہو۔ انھیں حالات کے سبب سے دانشمند ولندیزوں کے یہاں آپ یہ دیکھیں گے کہ جہاں

[1] Letters to Fort St. George; dated 12 December; 1687. (India office Records).

دس پیراگراف حکومت، سول اور فوجی حکمت عملی، جنگ، اور محاصل و آمدنی میں اضافے کی تدابیر کے متعلق ہوتے ہیں تو صرف ایک پیراگراف تجارت کے متعلق ملتا ہے۔ واضح رہے کہ محاصل و آمدنی میں اضافہ اصل مقصد ہے جس پر تمام دوسرے امور کا انحصار ہے۔ ان محاصل کے بغیر ولندیزی قوت باوجود مسالے کے جزیروں اور جاپان پر تصرف رکھنے اور مرچ کی پوری تجارت اپنے قابو میں کر لینے کے معرض خطر میں پڑ جاتی ہے[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دروبست میں سر جوشیا چائلڈ کا بے حد اثر تھا۔ اس سے پہلے مجلس نظما کا کوئی اور صدر اتنا بااثر نہیں ہوا تھا۔ حکومت میں بھی اس کو رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ کمپنی کی نئی استعماری حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت انگلستان سے مدد لی گئی۔ جیمس دوم کمپنی کا حصہ دار ہونے کی حیثیت سے اس کے معاملات میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ نظمائے کمپنی نے بالآخر یہ ٹھان لی کہ سلطنت مغلیہ سے قوت آزمائی کرنی چاہیے۔ شایستہ خاں نے بنگال کے محصولوں کے معاملے میں جو سختی برتی تھی اور کمپنی کے مال کو ملکی محاصل سے مستثنیٰ کرنے سے جو انکار کیا تھا اس سے کمپنی کے منافع پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ پھر مغربی ساحل پر جنجیرہ کے سدی نے جو مغل حکومت کا عہدہ دار تھا انگریزوں کے خلاف کئی سال جنگ جاری رکھی جس سے انگریزی تجارت بری طرح متاثر ہوئی اس واسطے کہ بمبئی کے بالکل ہی قریب اس نے اپنے بحری مرکز بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں کپتان نکلسن کی سرکردگی میں دس مسلح جنگی جہازوں کا بیڑا انگلستان سے روانہ کیا گیا جن میں سے بعض پر دس اور بعض پر ستر توپیں تھیں اور

---

[1] Dispatch of the Court of Directors to our Generall of India and our President and Council of India residing at Bombay, dated 11 September 1689 (India office Records) Quoted by Hunter in "A History of British India", Vol, II, P.274.

۱۶۰۰ انگریزی سپاہ ساتھ تھی۔ مدراس میں ۴۰۰ سپاہ اور شامل ہونے والی تھی۔ کپتان نکلسن کو حکم دیا گیا تھا کہ چاٹگانگ کے بندرگاہ پر قبضہ کرلو تاکہ وہاں سے انگریزی جہاز خلیج بنگال کے شمال مشرقی ساحل کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیں مغل سلطنت کے خلاف اعلان جنگ کرکے بحری آمدورفت کو بالکل بند کردیا جائے تاکہ بنگال کے محاصل متاثر ہوں۔ چاٹگانگ کو مرکز بناکر انگریزی فوجیں خشکی کے راستے سے آگے بڑھ کر ڈھاکے پر قبضہ کرلیں۔ اور صوبہ دار کو مجبور کیا جائے کہ وہ انگریزوں کے شرائط کو تسلیم کرے۔[1] ۱۶۸۶ء میں جب کپتان نکلسن ہگلی پہنچا تاکہ وہاں سے کمپنی کے ملازموں کو اپنے ساتھ چاٹگانگ لے جائے تو صوبہ دار بنگال نے پہلے ہی سے ہگلی کا محاصرہ کرلیا تھا۔ بڑی مشکل سے انگریزی جہاز ۲۷ میل جنوب میں سوتانتی کے گاؤں میں لنگر انداز ہوئے جہاں موجودہ کلکتہ آباد ہے۔ پھر یہاں سے شارناک جو ہگلی کی کوٹھی کا صدر تھا مع اپنے ساتھیوں کے ۵۰ میل جنوب میں ہجلی کے مقام پر پناہ گزیں ہوا۔ یہاں سخت ملیریا تھا۔ کمپنی کے ملازموں میں سے ۲۰۰ ملیریا کے نذر ہوگئے اور چالیس عہدہ داروں میں سے صرف پانچ بچے۔ اس پر مصیبت یہ کہ صوبہ دار کی فوج پیچھا کرتی ہوئی ہجلی پہنچ گئی۔ مجبوراً شارناک اور اس کے ساتھیوں نے سمندر کی راہ سے فرار ہوکر مدراس میں پناہ لی۔ دوسرے سال کپتان نکلسن کی مہم کی ناکامی کے بعد کپتان ہیڈ کو کمک دے کر انگلستان سے روانہ کیا گیا تاکہ چاٹگانگ میں انگریزی مرکز قائم کرے لیکن یہ مہم بھی ناکام رہی۔ کپتان ہیڈ نے جب بنگال میں کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو ۱۶۸۸ء میں مدراس چلا آیا اور بنگال سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہاتھ دھو بیٹھی۔ شاہی حکم کے بموجب انگریزوں کی دوسری کوٹھیاں جو پٹنہ۔ قاسم بازار، مسولی پٹم اور ویزیگاپٹم میں واقع تھیں ضبط کرلی گئیں اور کمپنی کے ملازم گرفتار کرلیے گئے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر سورت کی کوٹھی ضبط کرلی گئی، جنجیرہ کے

---

[1] Bruce', Annals, II; P.561; Hedge's Diary; II .P.52 ed. by Sir Henry Yule.

سدّی نے بمبئی کے اردگرد کے انگریزی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور سورت کے گورنر سر جان چائلڈ[1] کو بمبئی کے قلعے میں محصور کر دیا۔ بمبئی میں انگریزی جہازوں کی آمدورفت بند ہو گئی اور انگریزوں کی مغربی ساحل کی تجارت کا خاتمہ ہو گیا۔ سر جان چائلڈ نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی درخواست کی۔ اس زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن کی مہم میں مشغول تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے ہگلی کے واقعے کو اتنی اہمیت نہیں دی ہوگی جتنی کہ انگریز مورخ دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بنگال کے اس نامعلوم اور غیر مشہور مقام کا نقشہ صوبہ دار بنگال سے طلب کیا تاکہ اس کی جغرافی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے[2]۔ بالآخر سر جان چائلڈ نے ۱۶۹۰ء میں سورت کونسل کے دو ارکان ولڈن اور نووارد کو بطور وکیل اورنگ زیب کی خدمت میں روانہ کیا جنھوں نے انتہائی عجز و ندامت کے ساتھ کمپنی کی جانب سے معذرت پیش کی اور ایک لاکھ پچاس ہزار روپے جرمانہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر کمپنی کا قصور معاف کر دیا گیا اور اس کو سلطنت مغلیہ میں تجارت کی اجازت دے دی گئی بشرطیکہ وہ متعلقہ صوبہ داروں کی اطاعت کرے اور ملکی محاصل کو باضابطہ ادا کیا کرے۔ اس اجازت نامے کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ بمبئی کا گورنر سر جان چائلڈ کمپنی کی ملازمت سے برطرف کر دیا جائے اس واسطے کہ اس کے حکم سے حاجیوں کے جہازوں کو نقصان پہنچایا گیا تھا اور "آئندہ ایسے شرمناک طرز عمل سے احتراز کیا جائے گا"[3]۔ لیکن اس اثناء میں سر جان چائلڈ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے اجازت نامہ کی اس شرط پر عمل کی نوبت نہ آئی۔ اس اجازت نامہ کی ایک نقل صوبہ دار بنگال کو روانہ کر دی گئی اور انگریزوں کی کوٹھیاں اعتیں

---

[1] سر جان چائلڈ اور سر جوشیا چائلڈ علیحدہ علیحدہ اشخاص ہیں۔ نام کی مشابہت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دونوں قرابت دار ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔

[2] Hedge's Diary: II P 63,64.

[3] Bruce's Annals: II; P. 639; 640

واپس کر دی گئیں۔ شارناک ہگلی کی کوٹھی پر واپس آیا۔ اس اثنا میں شایستہ خاں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ابراہیم خاں بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا جو امن پسند شخص تھا۔ بہت بوڑھا ہونے کے سبب سے اس میں قوت عمل موجود نہ تھی۔ وہ ہر چیز کو چاہتا تھا کہ جیسی چل رہی ہے ویسی ہی چلتی رہے اس نے انگریزی کمپنی سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور اس کے کاروبار میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

کمپنی اور سلطنت مغلیہ میں صلح ہو جانے کے بعد شارناک مدراس سے ہگلی واپس آ گیا۔ سنہ ۱۶۹۰ء میں مدراس سے واپسی پر اس نے سوتانٹی کے گاؤں میں جہاں اب کلکتہ آباد ہے ابراہیم خاں صوبہ دار بنگال سے ایک کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پانچ سال بعد اس کوٹھی کے اردگرد چار دیواری کی اجازت بھی مل گئی اور اس کا نام فورٹ سینٹ ولیم رکھا گیا۔ چند سال ہی میں فورٹ ولیم کی تجارتی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ بنگال اور بہار کے زرخیز علاقوں کی تجارت سے کمپنی خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ چنانچہ اس کی اہمیت کے مدنظر سنہ ۱۷۰۰ء میں فورٹ ولیم کو مدراس کی ماتحتی سے نکال کر علیحدہ پریسیڈنسی قائم کر دی گئی۔ سنہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات پر ملک میں جو عام ابتری اور بدامنی پھیلی اس سے فائدہ اٹھا کر فورٹ ولیم کے استحکامات میں مزید اضافہ کر لیا گیا۔[1]

اب ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات کی حیثیت ایسی ہو گئی تھی کہ بجائے مقامی حکومتوں کے کمپنی دہلی کی مرکزی حکومت سے تعلقات قائم کرنا چاہتی تھی۔ مدراس کے گورنر پٹ کو یہ خیال ہوا تھا کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جانشینی کے جھگڑے کے سلسلے میں جب بہادر شاہ اول دکن آیا تھا تو اس کی خدمت میں اپنا ایلچی روانہ کرے لیکن چونکہ وہ فوراً ہی شمالی ہند واپس چلا گیا۔ اس لیے اس خیال کو حکومت مدراس عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ لیکن کمپنی نے سنہ ۱۷۱۵ء میں

---

[1] Wilson's Early Annals of the English in Bengal, Vol. I P. 283

مختلف پریسیڈنسیوں کے استصواب کے بعد جان سرمن کی سرکردگی میں فرخ سیر کی خدمت میں دہلی سفارت روانہ کی۔ بادشاہ کے لیے جو تحفے بھیجے گئے ان کی قیمت ۳۰ ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے۔ سرمن کے ساتھ ولیم ہملٹن بھی تھا جو بہت اچھا ڈاکٹر تھا اس نے فرخ سیر کا علاج کیا جس سے اس کو بہت فائدہ ہوا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر کمپنی کو تین فرامین عطا کیے۔ ایک صوبہ دار دکن کے نام، دوسرا صوبہ دار گجرات کے نام اور تیسرا صوبہ دار بنگال کے نام۔ جنوبی ہند میں انگریزوں کو جو تجارتی مراعات حاصل تھیں ان کی توثیق کی گئی، اور کمپنی کے مال کو محصولوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا سوائے اس پٹے کے لگان کے جو کمپنی مدراس اور اس پاس کے علاقوں کا ادا کیا کرتی تھی۔ مدراس کے قریب اور چند گاؤں بھی کمپنی کو پٹے پر لینے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح وزیگاپٹم کے قریب کی زمین خریدنے کی کمپنی کو اجازت دے دی گئی۔ گجرات میں کمپنی کو مال کی قیمت پر دو فی صدی چنگی کے علاوہ دس ہزار روپے سالانہ سرکاری خزانے کو ادا کرنے پر دوسرے محصولات سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ بمبئی میں کمپنی جو سکے ڈھالتی تھی انھیں سلطنت مغلیہ میں چلانے کی اجازت دے دی گئی۔ بنگال میں شاہ شجاع کی صوبہ داری میں تین ہزار روپے سالانہ کی رقم کا جو تعین کیا گیا تھا اس کو برقرار رکھا گیا۔ اس رقم کو ادا کر کے کمپنی اور دوسرے تمام محصولوں سے مستثنیٰ تصور کی جائے گی۔ فورٹ ولیم کے آس پاس کی زمینوں کو پٹے پر لینے کا کمپنی کو حق حاصل ہو گیا جہاں کمپنی اپنی بستیاں بسا سکتی تھی۔ سرمن کی سفارت کو کمپنی کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ شاہی فرامین کی بدولت کمپنی کی قانونی حیثیت اور اس کے حقوق و مراعات کا باضابطہ استقرار عمل میں آیا۔[1]

بنگال کے صوبہ دار نواب مرشد قلی خاں (جعفر خاں) نے باوجود بادشاہ فرخ سیر کے فرمان کے فورٹ ولیم کے قریب کے اڑتیس گاؤں کمپنی کو

لے — C. R. Wilson's Early Annals of The English in Bengal, II, p. I lvii

بیچ پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن کمپنی نے دوسرے لوگوں کو بیچ میں ڈال کر حیلے حوالے سے یہ زمینیں حاصل کرلیں۔ لیکن یہ زمینیں باقاعدہ ۱۷۵۷ء میں کمپنی کی ملکیت میں آئیں جبکہ کلائیو نے ان کے متعلق سراج الدولہ سے معاہدہ کیا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم (کلکتہ) نے بے حد ترقی کی۔ پچاس سال کے عرصے میں اس کی آبادی پندرہ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئی تھی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر آئے دن مرہٹوں کے حملوں سے جو اندرونی خلفشار پیدا ہوا اس کی وجہ سے بہت سے لوگ فورٹ ولیم میں آکر آباد ہوگئے کہ یہ مقابلۃً محفوظ جگہ تھی۔ پھر تجارت کی گرم بازاری سے یہاں دولت اُبل پڑی ۱۷۴۰ء میں جب علی وردی خاں بنگال کا نواب ہوا تو اس نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کی، اور انھیں ہر قسم کی مراعات عطا کیں۔ مرہٹوں کے حملوں کے باعث نواب نے انگریزوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو فورٹ ولیم کے گرد خندق کھود لیں جسے "مرہٹہ ڈیچ" (مرہٹوں کی خندق) کہتے ہیں۔

سترہویں صدی کے آخر میں کمپنی کو عود شاہی (رسٹوریشن) کے بعد اپنے ہندوستانی مقبوضات میں فوج رکھنے، عدالت کا انتظام کرنے، قلعے بنانے اور سکے ڈھالنے کے حقوق حاصل ہوگئے تھے۔ انگلستان کے بادشاہوں نے خاص کر چارلس دوم اور جیمس دوم نے کمپنی کی بڑی فراخ دلی سے مدد کی۔ ولندیزوں کے مقابلے کے لیے جب کبھی کمپنی کو شاہی فوج یا بیڑے کی ضرورت ہوئی تو اعانت سے دریغ نہیں کیا گیا۔ لیکن سر جوشیا چائلڈ کی جارحانہ حکمت عملی کے باعث کمپنی کو سلطنت مغلیہ سے جو لڑائی مول لینی پڑی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی مالی حالت خراب ہوگئی اور انگلستان میں پہلے سے جو اس کے مخالف موجود تھے انھیں اس کی مخالفت کرنے کا اور موقع مل گیا۔ انگریز سرمایہ داروں کی ایک جماعت جو کمپنی کی نفع اندوزی سے خود محروم تھی چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے کاروبار سے فائدہ حاصل کر سکے۔ پھر خود سر جوشیا چائلڈ صدر مجلس نظما کا رویہ ایسا مطلق العنانہ تھا جس کی وجہ سے بھی کمپنی کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے تھے۔

خاص کر وِگوں کا آزاد خیال طبقہ کمپنی کے تجارتی اجارے کا سخت مخالف تھا اور اس کے مخصوص حقوق کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ہنوور خاندان کے برسر اقتدار ہونے پر وِگوں کا زور انگلستان کی سیاست میں بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۹۱ء میں پارلیمنٹ نے مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کے لیے ایک نئی کمپنی قائم کرنے کی اجازت دے دی جس کے زیادہ تر سرپرست وِگ پارٹی کے ارکان تھے۔ لیکن سر جوشیا چائلڈ نے باوجود نئی کمپنی کے قائم ہو جانے کے پرانی کمپنی کے لیے براہِ راست بادشاہ سے منشور حاصل کر لیا۔ اس پر پارلیمنٹ میں بادشاہ کے اس حق پر اعتراض کیا گیا کہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے کوئی اجارہ نہیں قائم کیا جا سکتا سنہ ۱۶۹۴ء میں پارلیمنٹ نے صاف صاف ہدایت کر دی کہ "انگلستان کے سب باشندوں کو مساوی طور پر ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کا حق حاصل ہے۔ جب تک کہ پارلیمنٹ میں منظور شدہ قانون کے ذریعے اس کی ممانعت نہ کر دی گئی ہو" نئی کمپنی کا نام اسکاٹش ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا لیکن پرانی کمپنی کے سرمایہ داروں نے یہ بڑی ہوشیاری کی کہ نئی کمپنی کا سرمایہ جب جمع ہونے لگا تو اس کے ایک چوتھائی حصے خود خرید لیے۔ غرضکہ دونوں کمپنیوں کا ہندوستان سے کاروبار ہونے لگا اور مقابلے میں دونوں ہی کا نقصان ہوا دونوں کے ملازموں میں ہندوستان میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ اگر ولندیزی تجارت اس وقت ہندوستان میں کمزور نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً انگریزوں کو بڑا زبردست نقصان اٹھانا پڑتا[لہ]۔ بالآخر سنہ ۱۷۰۸ء میں پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون منظور ہوا جس کی رُو سے دونوں کمپنیاں ضم کر دی گئیں اور متحدہ کمپنی کا نام یونائیٹیڈ ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا۔ دونوں کمپنیوں کے اتحاد سے انگریزی تجارت ہندوستان میں سنبھل گئی اور سلطنتِ مغلیہ سے جنگ اور دونوں کمپنیوں کے آپس کے اختلافات کے باعث جو تجارتی پستی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سر جوشیا چائلڈ کی ملک گیری کی حکمتِ عملی میں انگریزوں کو

لہ The Cambridge History of India Vol. V. p. 97

جو ناکامی ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ کچھ عرصے کے لیے کمپنی نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے قطعاً احتراز کیا جب تک کہ اس کے نئے حریف فرانسیسیوں نے اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہ کر دیا۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی

ہندوستان سے تجارت کرنے کی جانب بمقابلہ دوسری یورپین اقوام کے فرانسیسی بہت بعد میں متوجہ ہوئے۔ ان کے تاجروں کو ولندیزوں اور انگریزوں کی دولت پر جو انھوں نے مشرقی ملکوں سے تجارت کر کے حاصل کی تھی رشک آتا تھا۔ لیکن وہ مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوئے جب تک کہ ان کے بادشاہ لوئی چہاردہم اور اس کے وزیر کولبیر نے ذاتی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کولبیر کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس کی مجلس نظما اکیس ارکان پر مشتمل تھی جن میں بارہ پیرس کے سرمایہ داروں میں سے تھے اور نو صوبہ جاتی مرکزوں کی طرف سے۔ اس کمپنی کو ہندوستان اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کا پچاس سال کا ٹھیکا حکومت فرانس نے عطا کیا۔ لوئی چہاردہم نے وعدہ کیا کہ کمپنی کی تجارت کی حفاظت کے لیے اگر جنگی جہازوں کی ضرورت ہوگی تو مہیا کیے جائیں گے۔ کمپنی کو صلح اور جنگ کرنے کے اختیارات بھی دیے گئے۔ فرانسیسی کمپنی کی پہلی کوٹھی ۱۶۶۸ء میں سورت میں قائم ہوئی۔ مغل حکومت نے اس کو وہی مراعات دیں جو ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے لیے منظور کی گئی تھیں۔ فرانسیسی کمپنی کی اگرچہ حکومت فرانس نے بڑی حوصلہ افزائی کی لیکن پبلک نے اس کا سرمایہ جمع کرنے میں کسی قسم کی گرمجوشی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہالینڈ اور انگلستان کی کمپنیاں وہاں کے معاشی حالات کا فطری نتیجہ تھیں اس طرح فرانس کی کمپنی کی جڑیں ملک کی معاشی زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ نہ تھیں۔ انگلستان اور ہالینڈ میں پبلک ان کمپنیوں کی اجارہ داری کے اس لیے خلاف تھی کہ اس کو براہ راست مشرقی ملکوں کی تجارت سے نفع اندوزی کا موقع نہیں ملتا تھا لیکن فرانس میں پبلک کو اس قسم کا کوئی احساس نہ تھا جس سے پتا چلتا ہے کہ بیرونی تجارت کی ضرورت اس ملک کے لیے اتنی

شدید نہیں تھی کہ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کے لیے تھی۔ فرانسیسی کمپنی نے شروع میں میڈاگاسکر میں اپنا بہت کچھ سرمایہ کھپا دیا اور اس کی قوت بہت کچھ وہاں فضول صرف ہو گئی۔ لوئی چہاردہم اور کولبیر کی خوشنودی کے لیے بہت لوگوں نے کمپنی میں حصے خرید لیے تھے لیکن بعد میں اکثر حصہ داروں نے باوجود سرمایے کی ابتدائی قسطیں ادا کرنے کے باقی قسطیں ادا نہیں کیں اور حکومت فرانس کو کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے بہت کافی سرمایہ لگانا پڑا۔

سنہ ۱۶۷۴ء میں مدراس سے ۸۵ میل جنوب میں فرانسوا مارتین نے بیجاپور کے مقامی حاکم شیر خاں لودھی سے زمین خریدی اور پانڈی چری کی بنا ڈالی۔ بعد میں اس کے گرد قلعہ بندی کر دی گئی۔ اس زمانے میں ولندیزوں اور فرانسیسیوں میں یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی دونوں قوموں کے نمایندے ایک دوسرے کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ سنہ ۱۶۹۳ء میں ولندیزوں نے بحری حملہ کر کے پانڈی چری پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سنہ ۱۶۹۷ء میں صلح نامۂ رزوک کی رو سے پانڈی چری فرانسیسیوں کو واپس دے دیا گیا۔ مارتین اب ہندوستان میں فرانسیسی کوٹھیوں کا ناظم اعلیٰ (ڈایرکٹر جنرل) مقرر کر دیا گیا۔ اس نے پانڈی چری کی ترقی کے اسباب فراہم کیے اور یہ شہر ہندوستان میں فرانسیسیوں کا صدر مقام بن گیا۔ چندر نگر اور ماہی کی کوٹھیاں اس کے ماتحت کر دی گئیں۔ اگرچہ پانڈی چری کو اس زمانے میں خوب ترقی ہوئی اور وہ بڑا بارونق شہر بن گیا لیکن فرانسیسی تجارت کے دوسرے مرکز زوال کی حالت میں تھے۔ بنگال میں چندر نگر فورٹ ولیم کے مقابلے میں بہت کم درجے پر تھا۔ سورت اور مسولی پٹم میں فرانسیسیوں کی جو کوٹھیاں تھیں ان میں بھی کچھ ایسا زیادہ کاروبار نہیں ہو رہا تھا۔ لوئی چہاردہم نے کمپنی کو جو پچاس سال کا اجارہ دیا تھا وہ اب ختم ہو رہا تھا۔ کمپنی کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں کمپنی کی نئی تنظیم عمل میں آئی اور لے نوار کو فرانس کے ہندوستانی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے فرانسیسی ساکھ کو سنبھالنے کی بہت کچھ کوشش کی اور اس کی مساعی سے کمپنی کی تجارت کو اچھا خاصہ فروغ ہوا۔ پانڈی چری کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ اس کے جانشین دیوما نے بھی اپنے پیش رو کی طرح فرانسیسی ساکھ کو

بڑھانے اور فرانسیسی کمپنی کی تجارت کو ترقی دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ اس نے فرانسیسی کمپنی کے تعلقات دیسی والیان ملک کے ساتھ قائم کیے تاکہ سیاسی اثر سے تجارت کو فروغ ہو۔ خاص کر نواب کرناٹک سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے پہلی مرتبہ فرانسیسیوں نے ۱۷۳۹ء میں تنجور کی راج گدی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور طرفین میں سے ایک کی مدد کے عوض میں کاری کال پر قبضہ حاصل کیا جو ساحل کارومنڈل پر کول رَدن دریا کے دہانے پر واقع ہے اور جغرافی لحاظ سے باموقع تجارتی مقام تھا۔[1] پھر ۱۷۴۱ء میں جب کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اول دہلی میں تشریف رکھتے تھے رگھوجی بھونسلا نے کرناٹک پر حملہ کر دیا اور خوب ہی لوٹ مار مچائی۔ نواب دوست علی نے مقابلہ کیا۔ لیکن وہ جنگ میں کام آیا۔ اس کا بیٹا صفدر علی نواب ہوا۔ اس نے اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے افراد کو مع خزائن و جواہرات وغیرہ کے فرانسیسی گورنر ڈیوما کی پناہ میں پانڈی چری بھیج دیا۔ رگھوجی بھونسلا نے ڈیوما کو دھمکی دی کہ وہ نواب سے کوئی سروکار نہ رکھے اور اس کو چوتھ ادا کرنا قبول کرے۔ سابق نواب کے داماد چندا صاحب کو مرہٹوں نے گرفتار کر لیا تھا اس کے بیوی بچوں نے بھی پانڈی چری میں آکر پناہ لی سابق نواب کے وزیر میر اسد کے ذریعے سے مرہٹوں نے نواب صفدر علی سے معاہدہ کر لیا جس کی رو سے نواب نے ایک کروڑ روپیہ بہ اقساط مرہٹوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ اب رگھوجی پانڈی چری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ڈیوما کو متعدد خطوط لکھے اور کارومنڈل ساحل کی تمام بندرگاہوں پر ۶۰ لاکھ بقایا محاصل کا مطالبہ پیش کیا اور نواب کرناٹک کے خزانے اور جواہرات بھی واپس طلب کیے ڈیوما نے اس عرصے میں خوب تیاری کر لی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات فرانسیسی قوم کی شرافت کے خلاف ہے کہ جن غریب الوطن مستورات اور بچوں نے ان کے ہاں پناہ لی ہے انھیں کسی دوسرے کے حوالے کر دیں یا ان کی ملکیت پر کسی طرح کی

[1] Guyon, Historiesdes Indes Orientales, Vol. III, P. 21; Memoire particuliere sur lácquisition de Karikal.

آپ نے دیں[1] دیوما نے رگھوجی کی دھمکیوں کا جواب ان الفاظ میں دیا۔
"ہمارے وطن فرانس میں نہ تو سونا پیدا ہوتا ہے اور نہ چاندی۔ ہم سامان خریدنے کے لیے اپنے ساتھ جو سونا چاندی لاتے ہیں وہ ہمیں دوسرے ملکوں کی تجارت سے ملتا ہے۔ ہمارے ملک میں صرف لوہا اور سپاہی پیدا ہوتے ہیں اور ہم اول الذکر کو ان کے خلاف استعمال کرنا بھی جانتے ہیں جو ہمیں غیر منصفانہ طور پر پریشان کریں[2]" اس جواب کا رگھوجی بھونسلا پر معلوم ہوتا ہے خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کو ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر پانڈی چیری پر حملہ کرے۔ اس کے بعد وہ کرناٹک سے واپس چلا گیا۔ دیوما کے اس شریفانہ سلوک سے رئیس کرناٹک کا خاندان فرانسیسیوں کا مرہون منت ہو گیا اور اس کے ساتھ ان کی بہادری اور جرأت کی سارے جنوبی ہند اور دکن میں شہرت ہو گئی۔ جب اس واقعے کی اطلاع دہلی پہنچی تو نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے جو اس زمانے میں دہلی میں وکیل مطلق کی حیثیت سے تشریف فرما تھے دیوما کو شاہی دربار کی طرف سے خلعت روانہ کیا اور اپنے خط میں اس کی بہادری اور شرافت کی تعریف کی[3]۔

فرانسیسیوں کے اسی بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر انگریزوں کو رشک پیدا ہوا اور وہ ان کا توڑ کرنے لگے۔ دونوں قوموں میں رقابت بڑھنے لگی۔ جہاں تک تجارتی کاروبار کا تعلق تھا فرانسیسی کمپنی انگریزی کمپنی کے مقابلے میں بہت پیچھے تھی لیکن دیوما اور اس کے قابل اور حوصلہ مند جانشین دوپلے کی سیاست نے انگریزوں کو بھڑکا دیا اور بالآخر دونوں قوموں میں جنوبی ہند میں سخت کشمکش شروع ہو گئی۔ دلندیزوں نے

1 Malleson, The rise of The French Powers in India p. 88.

2. Martineau, Dupleix et l'Inde Francaise, Vol. II p 22.

3. Correspondance du Conseil Superieur de Pondichery, Vol. III, p. 242, Guyon Histoire de Indes Orientales. Vol. III, p. 322-33

اب اپنی تمام تر توجہ جزائر شرق الہند کی تجارت کی طرف کر دی تھی ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے مدمقابل بن گئے اور دونوں ملک کی عام سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر ملک گیری کے خواب دیکھنے لگے۔

ڈنمارک ۔ آسٹریا ۔ سویڈن اور فلنڈرس والوں کی کمپنیاں

ہندوستان میں تجارت کرنے کے لیے انگلستان، ہالینڈ اور فرانس کے علاوہ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی تجارتی کمپنیاں قائم کی گئی تھیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

انگریزی اور ولندیزی تجارت کے فروغ کو دیکھ کر ڈنمارک میں ۱۶۱۶ء میں ایک کمپنی قائم کی گئی جس نے مسولی پٹم میں اپنا تجارتی کارخانہ قائم کیا اور بعد میں بنگال میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ بنگال میں سیرام پور کی کوٹھی کچھ دن پھلی پھولی۔ ٹنکوبار اور مالابار میں بھی ڈینش کمپنی کی شاخیں تھیں۔ ڈینش کمپنی ہندوستان سے جو مال لے جاتی تھی وہ چھپے چوری انگریز تاجروں سے خرید کر انگلستان کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ خاص طور پر یہ کمپنی چین سے جو چائے لاتی تھی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائی ہوئی چائے کے مقابلے میں لندن میں بہت سستی بکتی تھی۔ اس چھپے چوری کی تجارت سے انگریزی کمپنی کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۰۱ء میں جب ڈنمارک اور انگلستان میں جنگ چھڑ گئی تو سیرام پور اور ٹرنکوبار کی کوٹھیوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا لیکن صلح نامہ ہو جانے کے بعد یہ دونوں کوٹھیاں ڈینش کمپنی کو واپس کر دی گئیں۔ لیکن اس کے بعد سے ڈینش کمپنی کی مالی حالت سقیم ہوتی گئی اور اس کی مشرقی تجارت تقریباً ختم ہو گئی۔ ۱۸۴۵ء میں سیرام پور، ٹرنکوبار اور بالاسور کی کوٹھیوں اور متعلقہ زمینوں کو ڈینش کمپنی نے ساڑھے بارہ لاکھ روپے کے عوض میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

۱۷۲۱ء میں آسٹریا میں آسٹرین ایسٹ انڈیا کمپنی اور ۱۷۳۱ء میں سویڈن میں

سوئیڈش ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔ لیکن دونوں چند سال کاروبار کرنے کے بعد دیوالیہ ہوکر ختم ہوگئیں۔

۱۷۲۲ء میں فلنڈرس کے تاجروں نے آسٹنڈ کمپنی قائم کی جرمن شہنشاہ نے انگلستان اور ہالینڈ کی حکومتوں کے احتجاج کرنے کے باوجود آسٹنڈ کمپنی کو مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کی اجازت بذریعہ منشور عطا کردی۔ اس کمپنی نے بہت جلد اپنے کاروبار کو ترقی دی۔ چونکہ آسٹنڈ انگلستان کے ساحل کے بالکل قریب واقع ہے اس لیے اس کمپنی کا مال چوری چھپے لیکن کافی وسیع پیمانے پر انگلستان پہنچتا رہتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نرخوں کے مقابلے میں سستا فروخت ہوتا تھا۔ خود لندن کے بعض تاجروں نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے خلاف تھے آسٹنڈ کمپنی کے کاروبار کو چمکانے میں حتی المقدور امداد کی۔ آسٹنڈ کمپنی کا چوری چھپے سے اس قدر مال انگلستان پہنچنے لگا کہ بالآخر پارلیمنٹ کو اس کی روک تھام کے لیے متعدد قوانین وضع کرنے پڑے اور ان تاجروں اور سرمایہ داروں کو سخت سزاؤں کی دھمکی دی گئی جو آسٹنڈ کمپنی کے مال کو انگلستان میں فروخت کریں گے۔ لیکن باوجود ان قوانین کے آسٹنڈ کمپنی کا مال انگلستان آتا رہا اور بکتا رہا۔ کئی سال تک آسٹنڈ کمپنی کے مسئلے نے یورپین سیاست میں خاصی نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔ اس واسطے کہ اس کی پشت پناہی پر جرمن شہنشاہ کا منشور موجود تھا۔

آسٹنڈ کمپنی کے کاروبار کو ترقی اس وجہ سے اور بھی ہوئی کہ ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے بعض تجربے کار عہدہ داروں نے جو اپنی اپنی کمپنیوں سے غیر مطمئن تھے اس کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ یہ لوگ مشرقی ملکوں کے تجارتی حالات سے خوب واقف تھے اور اپنے تجربے سے آسٹنڈ کمپنی کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ آسٹنڈ کمپنی نے بنگال پر بانکی بازار میں اور مدراس کے قریب کولاکانگ میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کیے۔ ہر سال اس کمپنی کے تجارتی جہازوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جو یورپ سے مال لاتے اور واپسی پر ہندوستان کا مال یورپ لے جاتے اور بعض اوقات ہندوستان اور جزائر شرق الہند کے درمیان کاروبار

کرتے تھے۔ بالآخر ولندیزوں اور انگریزوں نے مجبور ہو کر آسٹنڈ کمپنی کے جہازوں پر سمندر میں دھاوے کرنا اور سامان کا مال و اسباب لوٹنا شروع کر دیا۔ بانکی بازار کی کوٹھی پر مقامی مغل فوجدار کو ملا کر انگریزوں اور ولندیزوں نے حملہ کر دیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ کولانگ کی کوٹھی خود بخود بیٹھ گئی۔ اس طرح چند سال کے کاروبار کے بعد آسٹنڈ کمپنی کا خاتمہ ہو گیا اس واسطے کہ اس کی حمایت پر کوئی جنگی بیڑا موجود نہ تھا جو اس کے تجارتی جہازوں کی حفاظت کر سکتا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں ولندیزوں کی ہندوستانی تجارت بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ اب ان کی تجارت کا یہاں وہ زور شور باقی نہ رہا جو سترہویں صدی میں تھا۔ اصل میں ہالینڈ کی طاقت ایسی زبردست نہ تھی اور نہ اس کے وسائل اتنے وسیع تھے کہ جزائر شرق الہند اور ہندوستان دونوں جگہ کاروبار کی سرگرمی باقی رکھی جا سکتی۔ ان کے مقابلے پر انگریز اور فرانسیسی تھے جنھیں اس زمانے میں بہت وسیع سیاسی وسائل حاصل تھے اور ان دونوں ملکوں کی یورپ میں خاص حیثیت تھی۔ چنانچہ ولندیزوں نے بڑی دانشمندی سے اپنے تمام تر وسائل کو جزائر شرق الہند میں محدود کر دیا، اور وہاں اس قدر استحکام حاصل کر لیا کہ یورپ کی دوسری اقوام مشکل ہی سے وہاں ان کی بنیادوں کو ہلا سکتی تھیں۔ اب ہندوستان میں انگریز اور فرانسیسی باقی رہ گئے۔ ان دونوں قوموں نے تجارت کے ساتھ ہندوستان میں ملک گیری کے منصوبے باندھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کئی سال کے تصادم کے بعد انگریزوں نے اپنے فرانسیسی حریفوں پر غلبہ پا کر ہندوستان میں سیاسی تفوق حاصل کیا۔

دوسرا باب

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش
اور
انگریزوں کی کامیابی

جس زمانے میں نواب نظام الملک آصف جاہ اول بادشاہ محمد شاہ کی دعوت پر دہلی میں تشریف رکھتے تھے تو کرناٹک میں بڑی سخت بدانتظامی پھیل گئی اور بعض حالات ایسے پیش آئے جن کا اثر تاریخ ہند میں بہت دور رس ثابت ہوا۔ کرناٹک کے نواب صفدر علی میں نظم و نسق کی صلاحیت نہ تھی۔ ترچناپلی پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں آہستہ آہستہ وہ پورے کرناٹک کو اپنے زیر نگیں نہ لے آئیں۔ پھر نواب صفدر علی کے خلاف خود اس کے خاندان والے سازشیں کر رہے تھے جن کے باعث حکومت کی ساکھ اور بھی گر گئی تھی۔ نواب صفدر علی کے

چچازاد بھائی مرتضیٰ علی نے ساز باز کرکے اس کو زہر دلوا دیا اور خود کرناٹک کی نوابی کا دعوے دار بنا۔ لیکن فوج نے اس کے خلاف بغاوت کردی اور ۱۷۴۲ء میں نواب صفدر علی کے نوعمر لڑکے کو جس کا نام سعید محمد خاں تھا، کرناٹک کا نواب تسلیم کیا۔ سعید محمد خاں نے سینٹ فورٹ جارج کے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرلیے اور انھیں ان کے حسب منشا سینٹ فورٹ جارج کے قریب پانچ گاؤں بطور انعام عطا کیے اور انھیں اپنی ٹکسال قائم کرنے اور ارکاٹ کا روپیہ بنانے کی اجازت بھی دے دی۔[1]

جب نواب نظام الملک دہلی سے دکن واپس ہوئے تو کرناٹک کی انتظامی ابتری کو دور کرنے کی غرض سے ۱۷۴۳ء میں دورے پر تشریف لے گئے تاکہ تمام حالات بچشم خود ملاحظہ فرمائیں۔ انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہر فوجدار اپنے آپ کو نواب کہنے لگا ہے۔ نواب نظام الملک نے حکم دے دیا کہ آئندہ سے کرناٹک میں صرف ایک نواب ہوگا جو صوبہ دار دکن کا نائب ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر کسی نے نواب ہونے کا دعویٰ کیا تو اس کو سزا دی جائے گی۔[2] نواب نظام الملک نے اپنے ایک سردار خواجہ عبداللہ خاں کو کرناٹک کا انتظام سپرد کیا لیکن اس کے ناگہانی انتقال کے باعث اپنے ایک دوسرے افسر انوارالدین خاں گوپاموی کو اس کی جگہ مقرر کرکے اس کو نواب صفدر علی کے لڑکے سعید محمد خاں کا نگراں مقرر کیا۔[3] کرناٹک کے انتظامات درست کرنے کے بعد نواب نظام الملک آصف جاہ اول اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں بعد سعید محمد خاں کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو انوارالدین خاں کو کرناٹک کا نواب مقرر کردیا گیا اور اس طرح والاجاہی خاندان کی بنا پڑی۔

---

1 Love, Vestiges of Old Madras, II, p 284.

2 Orme, The Military Transactions of The British Nation in Indostan, I, p. 51.

3 Ibid, p. 51.

جب نواب نظام الملک کرناٹک کے دورے پر تشریف لے گئے تھے تو انگریز اور فرانسیسی ان کی خوشنودی کے لیے ساعی رہے۔ دونوں طرف سے سفارتیں اور تحفے تحائف بھیجے گئے۔ انگریزی سفارت کے سرگروہ مسٹر آئیری کو فورٹ سینٹ جارج کے صدر نے ہدایت کی تھی کہ "اگر ہماری تجارت اور مراعات کے متعلق کوئی سوال دریافت کیا جائے تو جس قدر بھی تمھارا جواب گول مول اور مبہم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ ہماری تجارت کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنا بہت روپیہ اس ملک میں لگاتے ہیں اور ہم اس رقم کے علاوہ اس ملک سے باہر نہیں لے جاتے جو ہم اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اگر ہمیں ان علاقوں میں تجارت کے اور مواقع حاصل ہو جائیں تو اس سے بھی کم رقم ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہمیں (کرناٹک میں) جو تجارتی مراعات ملی ہیں وہ ذوالفقار خاں اور دوسرے حاکموں نے عطا کی ہیں جن کی توثیق مغل شہنشاہ فرخ سیر نے کی تھی۔ اب ہمیں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے جن مزید مراعات کی ضرورت ہے ان کے لیے ہم جناب والا کے لطف و کرم کے امیدوار ہیں۔"[1]

لیکن باوجود اس سفارت اور ان تحفے تحائف کے جو سینٹ فورٹ جارج سے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کی خدمت میں بھیجے گئے انگریزوں کو کوئی خاص مراعات حاصل نہ ہو سکیں۔ اور سعید محمد خاں نے سینٹ فورٹ جارج میں ٹکسال قائم کرنے اور ارکاٹ کا روپیہ بنانے کی جو اجازت دے دی تھی اس کی توثیق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن انگریزوں نے چوری چھپے سے سکہ سازی جاری رکھی[2]۔ جس وقت سے گورنر ڈیوما نے رگھوجی بھونسلا کی دھمکیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا اس وقت سے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے دل میں فرانسیسی قوم کی عزت پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے اسی وجہ سے فرانسیسیوں کو بعض ایسی مراعات دی تھیں جن سے انگریزوں کو محروم

1. Diary and Consultation Book, 1743 (Records of Fort St. George).

2. Ibid.

رکھا گیا تھا۔ چنانچہ انھیں ٹکسال قائم کرنے اور سکہ سازی کرنے کی اجازت بذریعۂ پروانہ عطا کردی تھی اور ان کا روپیہ بنگال تک چلتا تھا لیکن نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ کا رجحان اور ہمدردی زیادہ تر انگریزوں کی جانب تھی جس کے سبب سے آئندہ نہایت اہم تاریخی واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے نمایندے صوبہ دار دکن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس واسطے اور بھی کوشاں تھے کہ یورپ سے خبریں پہنچ رہی تھیں کہ آسٹریا کی جانشینی کی جنگ کے سلسلے میں انگریزی اور فرانسیسی حکومتیں بھی ایک دوسرے سے الجھنے والی ہیں۔ چنانچہ ۱۷۴۴ء کے آخر میں ان دونوں قوموں کے درمیان اعلان جنگ ہوگیا۔ چونکہ اس زمانے میں ساحل کارومنڈل پر فرانسیسیوں کی بحری قوت بہت کم تھی اس واسطے فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے کوشش کی کہ باوجود یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ جانے کے ہندوستان میں دونوں قوموں میں صلح و امن برقرار رہے۔ وہ جانتا تھا کہ انگلستان سے کموڈور بارنٹ کی سرکردگی میں جنگی بیڑا ہندوستان کے لیے روانہ ہو چکا ہے تاکہ فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ انگریز اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح قائم رہی تو اس سے فائدہ فرانسیسیوں کو ہوگا جو بحری قوت میں کمزور ہیں جب ڈوپلے کی یہ تدبیر نہ چلی تو اس نے نواب انورالدین خاں سے درخواست کی کہ وہ اپنے کسی علاقے میں انگریزوں کو اس کی اجازت نہ دیں کہ وہ فرانسیسیوں پر حملہ کریں چنانچہ نواب انورالدین خاں نے مدراس کے گورنر مسٹر مورس کو لکھا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ میں سلطنت مغلیہ کی غیر جانبداری کسی طرح سے متاثر نہیں ہونی چاہیے۔ جب یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو اگر انگریزوں نے نواب کرناٹک کے

1. Martineau, Lettres et Conventions, p. 106—109. (Poudichery Archives)

کسی علاقے میں فرانسیسیوں کو نقصان پہنچایا تو وہ ذمہ دار ٹھہریں گے اور اس طرح سے اگر فرانسیسی انگریزوں کو نواب کرناٹک کے کسی علاقے میں نقصان پہنچائیں گے تو ان سے بازپرس کی جائے گی۔ یہ دراصل ڈیوپلے کی تدبیر کی کامیابی تھی۔ ظاہر ہے کہ گورنر مدراس نواب کرناٹک کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا۔ اور خاص کر ایسے وقت میں جبکہ اس کی قوم جنگ میں مبتلا تھی۔ غرض کہ اس طرح ڈیوپلے عارضی طور پر انگریزوں کے حملے سے بچ گیا۔ کموڈور بارنٹ کی سربراہی میں جو بیڑا انگلستان سے روانہ ہوا تھا وہ ۱۷۴۵ء میں ساحل کارومنڈل پر پہنچ گیا اور پانڈی چری پر حملے کی تیاری شروع ہوگئی لیکن گورنر مدراس نے نواب انورالدین خاں کے خطرے کے سبب سے پانڈی چری پر حملہ ملتوی کرا دیا۔ بارنٹ اپنا بیڑا آبنائے ملاکا کی طرف لے گیا تاکہ وہاں فرانسیسی تجارتی جہازوں کو راستے میں گرفتار کرے اور لوٹے۔ غرض کہ اب سمندر کی طرف سے بھی فرانسیسیوں کو کوئی خطرہ نہ رہا۔

اسی اثنا میں ڈیوپلے نے ماریشس کے گورنر لابورڈونے سے خط و کتابت کی اور بحری امداد طلب کی۔ لابورڈونے جون ۱۷۴۶ء میں اپنے جنگی بیڑے کو لے کر ساحل کارومنڈل کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب بارنٹ کو لابورڈونے کے روانہ ہونے کی خبر پہنچی تو وہ فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں لنگر انداز ہوگیا اور وہیں تھوڑے دنوں بیمار رہ کر مرگیا۔ پےٹن اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے لابورڈونے کو لنکا کے قریب روکنے کی کوشش کی لیکن لابورڈونے کے بیڑے نے پےٹن کے انگریزی بیڑے کو مار بھگایا۔ لابورڈونے نے سیدھا مدراس کا رخ کیا۔ مدراس تک اس کی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ مدراس کے گورنر مورس نے نواب انورالدین خاں سے امداد طلب کی لیکن نواب نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ لابورڈونے کا بیڑا ۳ ستمبر ۱۷۴۶ء مدراس کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور مدراس پر گولہ باری شروع کر دی۔

چند روز تک گولہ باری کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر مدراس کے گورنر نے اپنے ایلچی بھیجے اور صلح کی درخواست کی۔ ان ایلچیوں نے ایک مشروط معاہدہ کر لیا اور ۱۰ ستمبر ۱۷۴۶ء مدراس کو لابورڈونے کے حوالے کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے

تمام انگریزوں نے بلا مقابلہ اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا۔ لابوردونے نے معاہدے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ شہر مدراس کو زر رستگاری وصول کر کے انگریزی حکومت کو واپس کر دے گا۔ مدراس میں جس قدر سامان جنگ ملا اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا۔

جب نواب انوارالدین خاں کو انگریزوں سے اطلاع ملی کہ مدراس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا ہے تو اس نے دیوپلے سے جواب طلب کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میرے کہنے پر انگریزی بیڑے نے پانڈی چری پر گولہ باری نہیں کی لیکن جب فرانسیسیوں کو موقع ملا تو انھوں نے مدراس پر گولہ باری کر کے قبضہ کر لیا۔ دیوپلے نے اس کے جواب میں اپنے ایجنٹ کو جوار کاٹ میں رہتا تھا لکھا کہ مدراس انگریزوں سے چھین کر نواب کرناٹک کو واپس کر دیا جائے گا۔ لیکن نواب انوارالدین خاں دیوپلے کی اس چال بازی کو بھانپ گیا اور فرانسیسیوں کے خلاف اپنے بڑے بیٹے محفوظ خاں کی سرکردگی میں دس ہزار کا لشکر روانہ کر دیا۔ نواب کرناٹک کی فوج نے مدراس کو گھیر کر سامان رسد بند کر دیا۔ فرانسیسیوں نے محفوظ خاں سے گفت وشنید کرنے کے لیے دو ایلچی بھیجے جنھیں گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ پارادی کے تحت تھوڑی سی فرانسیسی فوج نے نواب کے لشکر پر اچانک حملہ کر دیا اور سینٹ تھومے کی طرف ہٹا دیا۔ اسی اثنا میں پانڈی چری سے مزید کمک آگئی اور پارادی کی فوج میں شامل ہوگئی۔ دریائے ادیار کے کنارے پر محفوظ خاں سے جم کر مقابلہ ہوا اور فرانسیسی فوج کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ دراصل پہلی کامیابی تھی جو اہل یورپ کو کسی ہندوستانی والیٔ ملک کے مقابلے میں حاصل ہوئی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اہل یورپ اپنے جدید سائنٹفک طریق جنگ کے باعث تھوڑی سی تعداد سے اہل ہند کے بڑے سے بڑے لشکر کو نیچا دکھا سکتے ہیں جو جنگ کرنے کے فرسودہ اصول پر عمل پیرا تھا۔

لابوردونے اور دیوپلے میں مدراس کے انتظام کے متعلق سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ لابوردونے چاہتا تھا کہ زر رستگاری وصول کر کے شہر مدراس انگریزوں کو واپس دے دے۔ لیکن دیوپلے اس کے خلاف تھا۔ وہ مدراس پر

مستقل قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ دیوپلے نے بہ حیثیت گورنر لابورڈونے کو بنی مائے کا پابند کرانے کی کوشش کی لیکن اس نے دیوپلے کی ایک نہ سنی اور کہلا بھیجا کہ میں سرزمین ہند میں بھی گورنر پانڈی چری کا ماتحت نہیں ہوں۔ چنانچہ اس نے گورنر مدراس سے گفت و شنید کر کے چار لاکھ چالیس ہزار روپے (گیارہ لاکھ پگوڈا) کے عوض مدراس کو واپس کر دیا۔ اس رقم کی قسط وار ادائیگی کا انتظام یورپین ہنڈیوں کے ذریعے کیا جانا طے ہوا[1]۔ اس ضمن میں دیوپلے اور لابورڈونے میں جو خط و کتابت ہوئی اس میں بہت تلخی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس تو تو میں میں کے متعلق دیوپلے کے سکرٹری انندا رنگا پلے نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ "یورپین لوگ جو ہمیشہ اتحاد و اتفاق سے کام کیا کرتے تھے اب بظاہر ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح ہوتے جاتے ہیں[2]"۔

دیوپلے نے پانڈی چری سے اپنی کونسل کے بعض ارکان کو مدراس بھیجا تاکہ وہ شہر کے نظم و نسق کا جائزہ لے سکیں لیکن لابورڈونے نے ان کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دیوپلے برابر اس پر اصرار کرتا رہا۔ مدراس کے مستقبل کے متعلق کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک پانڈی چری کا گورنر اور اس کی کونسل قطعی رائے قائم نہ کر لے۔ لابورڈونے کا کہنا تھا کہ فرانس کے وزیر بحریہ نے اس کو جو اختیارات دیئے ہیں ان کی نسبت فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار بھی دخل دینے کا مجاز نہیں ہے۔ پھر اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ وزیر بحریہ نے اس کو انگریزی بندرگاہوں پر حملہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی اجازت دی ہے نہ کہ مستقل طور پر قبضہ کر لینے کی۔ غرض کہ اس قانونی بحث اور کج بحثی میں نہ صرف ناخوشگوار صورت حالات پیدا ہو گئی بلکہ فرانسیسی مفاد و مقاصد کو بہت نقصان پہنچا۔

لابورڈونے مدراس کو انگریزی گورنر کے حوالے کر کے پیرس واپس چلا گیا۔ اس کے واپس جاتے ہی دیوپلے نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا

---

[1] Malleson, History of the French in India, P. 158.

[2] The Private Diary of Ananda Ranga Pillai, 11, P 395.

جو گورنر مدراس اور لا بورڈونے کے درمیان ہوا تھا اور مدراس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور جتنے انگریز وہاں موجود تھے انھیں گرفتار کر کے پانڈی چیری بھیج دیا۔ اس کے بعد ڈوپلے نے سینٹ فورٹ ڈیوڈ پر چار مرتبہ پے در پے حملے کیے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لارنس نے نہایت قابلیت اور بہادری سے فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ نواب انورالدین خاں نے بھی جو اب فرانسیسیوں سے سخت ناراض ہو گئے تھے لارنس کی مدد کے لیے سینٹ فورٹ ڈیوڈ فوج بھیج دی۔ اسی اثنا میں انگریزوں کا جنگی بیڑا اڈمیرل باسکوین کی سرکردگی میں جولائی ۱۷۴۸ء میں ساحل کارومنڈل پر پہنچ گیا اور پانڈی چیری کی ناکہ بندی کر دی۔ دو مہینے تک فرانسیسیوں نے بڑی بہادری سے پانڈی چیری کی مدافعت کی اور باسکوین نے جب خشکی پر فوج اتارنے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انھوں نے مدافعتی حملے کر کے پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس موقع پر مشہور فرانسیسی انجینئر پارادی نے بڑی ہوشیاری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ حملہ کرتے ہوئے اس کے زخم لگا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ پارادی کے مرنے کے بعد پانڈی چیری کی مدافعت کا سارا بار خود ڈوپلے پر پڑ گیا جیسا کہ خود اس نے کہا ہے "ریاضی اور قلعوں کی تعمیر کے متعلق میں نے ابتدائی عمر میں جو علم حاصل کیا تھا اور جس کی نسبت میرے والد ہمیشہ مجھے تاکید کیا کرتے تھے اس موقع پر میرے کام آیا۔"[1] غرضکہ باسکوین کو نو مہینے کی ناکہ بندی کے بعد بارش کا موسم شروع ہو جانے کے باعث پانڈی چیری کی فتح سے دست بردار ہونا پڑا جو ڈوپلے کی زبردست کامیابی تھی۔ باسکوین فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں بارش کے موسم کے ختم ہونے کا انتظار کرتا ہوا کئی مہینے بیکار پڑا رہا۔ ڈوپلے کا دستور تھا کہ اپنی کامیابیوں کو ہندوستانی والیان ملک کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرواتا تھا تاکہ انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسی قوم کی عزت ان کے دلوں میں قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جبکہ باسکوین کا زبردست بیڑا ناکام ہوا تو اس نے اس کی اطلاع ارکاٹ، حیدرآباد اور دہلی کو بھجوا دی۔[2]

۱۔ Memoire pour Duplerx.

۲۔ Malleson, History of the French India, P. 237.

جب یورپ میں فرانس اور انگلستان میں صلح ہو گئی اور ۱۷۴۸ء میں صلح نامہ ایکس لا شاپل پر دستخط ہو گئے تو ہندوستان میں بھی دونوں قوموں کی لڑائی ختم ہو گئی۔ ۱۷۴۹ء میں اس صلح نامے کی نقلیں انگریزی اور فرانسیسی کمپنی کے گورنروں کو ہندوستان پہنچیں۔ اس صلح نامے کی رو سے مدراس انگریزوں کو اور لوئی برگ شمالی امریکہ میں فرانس کو واپس دے دیے گئے، اور دونوں طرف سے سب قیدی رہا کر دیے گئے۔ باسکوون انگلستان واپس چلا گیا۔ آسٹریا کی جانشینی کی لڑائی کے خاتمے پر ہندوستان میں فرانسیسیوں کا ایک خاص وقار قائم ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آئندہ حیثیت کا دار و مدار اُن حالات کے تابع تھا جو یورپ میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ فرانس یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں میں روز بروز زیادہ الجھتا گیا جس کے باعث وہ اپنی نوآبادیات اور مشرقی مقبوضات کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکا۔

۱۷۴۸ء جنوبی ہند اور دکن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال حضرت نظام الملک آصف جاہ اول کا انتقال ہوا۔ آنند رنگا پلے کی پیشین گوئی[۱] بالکل صحیح نکلی کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اول اگر نہ رہے تو دکن اور جنوبی ہند سخت بدنظمی اور خلفشار میں مبتلا ہو جائے گا۔ نواب مغفرت مآب کی شخصیت اور اقبال کی بدولت بہت سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ جب وہ نہ رہے تو سوتے ہوئے فتنے جاگ اٹھے اور بدنظمی کی بجھی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں جنھوں نے آئندہ کئی سال تک دکن اور جنوبی ہند کے خرمن امن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اگلے سال نواب انور الدین خاں والیِ کرناٹک جنگ امبور میں مارے گئے۔ چنانچہ دونوں جگہ جانشینی کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے جن میں اہلِ یورپ کو براہ راست دخل دینے کا موقع مل گیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے سب سے بڑے صاحبزادے غازی الدین خاں فیروز جنگ دہلی میں امیر الامرا کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں نظام الملک کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ نے دکن کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے نواسے مظفر جنگ (ہدایت محی الدین خاں) جو

۱۔ *Diary of Ananda Ranga Pillai*

بیجاپور اور ادھونی کے حاکم تھے صوبہ داری کے مدعی ہوئے دونوں دعوے داروں نے مغل بادشاہ کی سندیں اپنی اپنی تائید میں پیش کیں۔ بعض فرانسیسی مورخوں نے مظفر جنگ کی سند کے اصلی ہونے کے متعلق مفصل بحث کی ہے[1]۔ لیکن ہمعصر مورخوں یا اس زمانے کی دستاویزوں سے ان کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ مظفر جنگ نے ڈوپلے کی امداد طلب کی تاکہ خود کو دکن کا صوبہ دار اور چنداصاحب کو کرناٹک کا نواب بنوانے میں فرانسیسی قوم کے وسائل کو استعمال کیا جا سکے۔ فرانسیسیوں کی دیکھادیکھی انگریزوں نے بھی اپنے آپ کو نئے سیاسی حالات سے بے تعلق رکھنا پسند نہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۷۵۰ء میں مدراس کونسل نے فیصلہ کیا کہ ناصر جنگ سے خط وکتابت کی جائے۔ ناصر جنگ نے انگریزوں کو مراعات کی امید دلائی اور انھیں لکھا کہ پانڈی چری کو گھیر کر رسد بند کرنے کی کوشش کی جائے[2]۔

چونکہ صوبہ دار دکن اصولی طور پر کرناٹک کا بھی حکمران تھا اس لیے ضرور تھا کہ کرناٹک میں اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے انگریز اور فرانسیسی دونوں دکن کی صوبہ داری کے معاملے میں دلچسپی لیں۔ انھوں نے اس موقع پر اپنے مفاد کو ترقی دینے کے لیے سیاست وتدبر کے سارے وسائل استعمال کیے۔ جنوبی ہند اور دکن کے حکمرانوں نے پچھلے دنوں اہل یورپ کی جنگی قابلیت اور جدید سائنٹفک طریق جنگ کے مظاہرے دیکھ لیے تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اب ان کی کوشش یہی تھی کہ یورپین ماہروں کو اپنی ملازمت میں لیں اور انھیں اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنائیں لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب یورپین لوگ ان کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے آلۂ کار بنیں گے تو ملک کی عام سیاست میں ان کی مداخلت لازمی ہوگی۔ سیاست ہمیشہ قوت وتدبیر کے تابع ہوتی ہے۔ قوت وتدبیر سے جو اپنی مرضی کو موثر بنا سکتا ہے وہی حقیقت میں سیاست کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ گزشتہ

---

[1] Martineau, Dupleuxet l'Inde Francaice, III, P.83

[2] Martineau, La politique de Dupleix d' apres sa letter a Saunders.

تجربے سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ سمندر پر جو حکومت رکھتا ہے اس کے لیے خشکی پر اقتدار قائم کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں خصوصاً ایسی ابتری اور افراتفری کے زمانے میں جو ۱۷۴۰ء اور ۱۷۶۳ء میں جنوبی ہند اور دکن میں پھیلی ہوئی تھی پچھلی جنگ کے بعد انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کے پاس کافی دیسی سپاہ جمع ہو گئی تھی جس کو یورپین طرز کی قواعد پریڈ اور طریق جنگ سکھایا گیا تھا اور جس کی تنخواہ کا بار دونوں کمپنیوں پر پڑ رہا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے سوچا کہ اگر ہندوستانی والیان ملک کے آپس کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے اس سپاہ کو استعمال کیا گیا تو اس کی تنخواہ کا بار ان پر ڈالا جا سکتا ہے۔ باوجود صلح نامہ ہو جانے کے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ایک دوسرے پر مطلق اعتماد نہیں تھا۔ دونوں قوموں کو اندیشہ تھا کہ دکن اور کرناٹک میں جو خلفشار پیدا ہوا ہے اس سے دوسرا فائدہ اٹھائے گا۔ ان حالات میں بھلا ان کے لیے کیسے ممکن تھا کہ مقامی حالات سے بے تعلق رہ کر صرف اپنی تجارت کو ترقی دینے کی تدابیر اختیار کریں۔ خود تجارت سیاست کے تابع ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر عرصے تک کرناٹک اور دکن میں بدامنی رہتی تو دونوں قوموں کی تجارتی نفع اندازی کو سخت ٹھیس لگتی۔ چنانچہ انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کی یہ خواہش بالکل قدرتی تھی کہ جن علاقوں میں ان کی تجارت ہے وہاں امن و امان قائم رہے اور ایسے حکمران کے ذریعے سے قائم رہے جو ان کے قابو کا ہو تاکہ انھیں مراعات حاصل ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان حالات میں ڈوپلے جیسے منچلے شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں فرانسیسی سلطنت کی داغ بیل ڈالے تو یہ کچھ ایسا اوچھا خیال نہ تھا۔ مٹھی بھر آدمیوں سے نواب انورالدین خاں کی زبردست فوج کو شکست دے کر اس قسم کا خیال پیدا ہونا اس کے لیے قدرتی امر تھا لیکن اس نے اپنے حریف انگریزوں کے وسایل کا غلط اندازہ لگایا جس کے باعث اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے انورالدین خاں کو جب کرناٹک کا نواب مقرر کیا تو کرناٹک کے سابق نواب کے خاندان کی طرف سے تھوڑی بہت

مخالفت ہوئی تھی لیکن انورالدین خاں نے اپنی قابلیت اور حسن انتظام سے بہت سے مخالفوں کو رام کرلیا تھا۔ پھر نواب نظام الملک کا اقبال ایسا تھا کہ ان کے کسی انتظام کو درہم برہم کرنا آسان نہ تھا۔ ان کی آنکھیں بچتے ہی کرناٹک میں انورالدین خاں کی نوابی خطرے میں پڑگئی۔ کرناٹک کے سابق حکمراں خاندان میں تو کوئی شخص ایسا اولوالعزم نہیں تھا جو انورالدین خاں کے مقابلے پر آتا۔ لیکن اس خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک شخص جس کا نام حسین دوست خاں اور عرف چندا صاحب تھا انورالدین خاں کے خلاف کرناٹک کی نوابی کا دعوے دار بنا۔ چندا صاحب نواب صفدر علی کا بہنوئی تھا۔ مرہٹوں نے جب ۱۷۴۱ء میں ترچناپلی پر حملہ کیا تو چندا صاحب نے ان کا جان توڑ مقابلہ کیا اور گرفتار ہوا۔ مرہٹے اس کو پکڑ کر ستارہ لے گئے اور آٹھ سال تک اس کو قید رکھا اس واسطے کہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر چندا صاحب کو رہا کردیا گیا تو وہ کرناٹک میں مرہٹوں کے قدم نہ جمنے دے گا۔ چندا صاحب نے قید کے زمانے میں دوپلے سے خفیہ طور پر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کو انگریزوں کے مقابلے میں کرناٹک میں مراعات کا وعدہ کیا۔ چنانچہ دوپلے کی متواتر کئی سال کی کوشش سے مرہٹوں نے ۱۷۴۸ء میں چندا صاحب کو سات لاکھ روپئے کے معاوضے میں رہا کردیا۔ چندا صاحب نے رہا ہونے کے بعد ادھر ادھر سے کچھ قرض لے کر تھوڑی سی فوج جمع کرلی اور مظفر جنگ کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اس نے مظفر جنگ کو دکن کا صوبہ دار مان لیا بشرطیکہ وہ اسے کرناٹک کا نواب تسلیم کرلیں۔ دونوں نے اپنے تئیں ایک دوسرے کے مقاصد سے وابستہ کرلیا اور یہ طے ہوا کہ پہلے کرناٹک کے معاملے کا فیصلہ ہو جائے اور انورالدین خاں کو وہاں کی نوابی سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرانسیسی مدد لے کر دکن کی طرف توجہ کی جائے گی۔ اگرچہ نظری طور پر کرناٹک، دکن کے ماتحت تھا اور وہاں کے نوابوں کا تقرر صوبہ دار دکن کرتا تھا لیکن دکن میں نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد جو ابتری پھیلی اس کے

باعث کرناٹک کی نوابی کا مسئلہ بجائے دکن کے خود کرناٹک میں طے ہونا تھا۔ چندا صاحب نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کرناٹک کی نوابی کا فیصلہ اب صوبہ دار دکن پر اتنا منحصر نہیں جتنا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں پر جنھوں نے اس زمانے میں کرناٹک میں اپنے قدم اچھی طرح سے جما لیے تھے۔ چندا صاحب اور مظفر جنگ نے بیجاپور اور ادھونی کے قرب و جوار میں زبردست لشکر جمع کر لیا اور دیوپلے سے امداد طلب کی۔ چندا صاحب کا بیٹا رضا صاحب دیوپلے کے پاس اپنے باپ کی طرف سے ایلچی بن کر آیا اور درخواست کی کہ جتنی مدد ہو سکے فوراً بھیجی جائے۔ چندا صاحب کو فوجی مدد اور مالی مدد دونوں کی ضرورت تھی۔ چندا صاحب نے رضا صاحب کے ہاتھ دیوپلے کو ایک پروانہ بھیجا جس میں صراحت سے مذکور تھا کہ ارکاٹ کے ہونے والے نواب نے ویلنور اور اس کے آس پاس کے چالیس گاؤں فرانسیسی کمپنی کو بطور انعام عطا کر دیے جن پر فرانسیسی کمپنی کو دائمی حقوق حاصل رہیں گے۔ چنانچہ اس پروانے کے پہنچنے کے بعد دیوپلے نے اپنی کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ کونسل نے فیصلہ کیا کہ "چندا صاحب کی شکر گزاری کے لیے گورنر (دیوپلے) کو مجاز کیا جاتا ہے کہ وہ ہر مناسب طریقے پر جو ہمارے بس میں ہے اس وقت تک اس کی مدد کرے جب تک وہ اطمینان سے مسند نشین نہ ہو جائے اور اپنی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔"[۱] چنانچہ دیوپلے نے رضا صاحب کے ساتھ فرانسیسی فوج اور اس کے ضروری اخراجات کی پابجائی کے لیے چندا صاحب کے حساب میں ۹۰ ہزار چھ سو اکاون روپے روانہ کیے۔ ارکاٹ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر فرانسیسی فوج چندا صاحب اور مظفر جنگ سے جا کر مل گئی اور امبور کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا جہاں انور الدین خاں پہلے سے بارہ ہزار سوار،

۱۔ Martineau Dupleix et l'Inde Francaise, III, P.86

چھ ہزار پیدل، دو سو مبیں ہاتھی، اور ۲۶ توپوں سے آراستہ چندا صاحب اور مظفر جنگ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ امبور کا قلعہ کرنا ٹک میں اپنے محل وقوع کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ یہ ایک پہاڑ پر واقع تھا۔ اس پہاڑ اور قریب کی جھیل کے درمیان جو درہ ہے اس پر اگر کوئی فوج قبضہ کرلے تو کرناٹک کی سب راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی۔ اس درے پر نواب انوار الدین خاں نے اپنی توپیں آراستہ کر رکھی تھیں اور درے اور جھیل کے درمیان جو راستہ باقی رہ گیا تھا اس کو زیر آب کر دیا گیا تھا تاکہ فوج اس پر سے نہ گزر سکے[1]۔ فرانسیسی کمانڈان موسیو دوتی نے نواب انور الدین خاں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ دوتی کے تحت موسیو بسی بھی اس لڑائی میں شریک تھا جس نے بعد میں دکن میں قوت اور شہرت حاصل کی۔ نواب انور الدین خاں نے مظفر جنگ سے گفت و شنید شروع کی اور جنگ سے باز رہنے کی درخواست کی[2]۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نواب انور الدین خان نے باوجود بڑھاپے کے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا۔ اس کا بڑا بیٹا محفوظ خاں گرفتار ہوا اور چھوٹے بیٹے محمد علی نے بھاگ کر ترچناپلی کے قلعے میں پناہ لی۔ اس لڑائی میں چندا صاحب اور مظفر جنگ کو بہت سامان جنگ ہاتھ آیا۔ فرانسیسی افسروں اور سپاہ کو انعام و اکرام سے نہال کر دیا گیا۔ امبور کی فتح کے بعد مظفر جنگ اور چندا صاحب ارکاٹ روانہ ہوئے۔ ارکاٹ پر بلا کسی مزاحمت کے قبضہ ہو گیا۔ یہاں مظفر جنگ نے صوبہ دار دکن کے تمام ظاہری فرائض، انجام دینے شروع کر دیے اور چندا صاحب کے نواب کرناٹک ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا[3]۔ چند روز فتح کے جشن منانے کے بعد مظفر جنگ اور چندا صاحب پانڈی چری روانہ ہو گئے تاکہ دوپلے سے ملاقات کریں۔ پہلے چندا صاحب اور

[1] Orme, Military transaction of the British Nation in Indostan, I, P. 127.

[2] برہان توزک والاجاہی حصہ اول قلمی کتب خانۂ آصفیہ نمبر ۲۰۲

[3] Orme, Ibid, P. 129.

دو روز بعد مظفر جنگ پانڈی چری پہنچے۔ ڈوپلے نے اپنے دونوں مہمانوں کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مظفر جنگ نے ولینا نور کے انعام کی توثیق کر دی اور اس کے ساتھ باہور کے ۳۶ گاؤں کے انعام کا اور اضافہ کر دیا۔ شہر مسولی پٹم (مچھلی بندر) اور جزیرہ ڈیوی بھی فرانسیسیوں کے تصرف میں دے دیا جن کی آمدنی ۴ لاکھ روپے سالانہ تھی[1]۔ ڈوپلے نے مظفر جنگ اور چندا صاحب سے وعدہ کیا کہ ان کی ہر ممکن طور پر امداد کرے گا۔ اس نے ان کے ساتھ ۸۰۰ فرانسیسی سپاہ ۳۰۰۔ افسر، ۲۰۰۰ دیسی فوج اور توپ خانہ کر دیا تاکہ وہ محمد علی کو ترچنا پلی سے بے دخل کر دیں پیشتر اس کے کہ ناصر جنگ دکن سے کرناٹک پہنچ جائیں۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب نے تنجور کے محاصرے پر بہت وقت صرف کر دیا۔ چندا صاحب پہلے تنجور کے راجا سے نبٹنا چاہتا تھا جس نے ۱۷۴۰ء میں مرہٹوں کو کرناٹک پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چندا صاحب کو ترچنا پلی اور مدورا کی حکومت سے محروم ہونا پڑا اور آٹھ سال قید میں بسر کرنے پڑے۔ راجا تنجور نے جب چندا صاحب کے کرناٹک پہنچنے کی خبر سنی تو جھٹ سے اس نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور دیوکوٹہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی والیان ملک کے معاملات میں فرانسیسیوں کی دخل اندازی انھیں پسند نہ تھی لیکن چونکہ تنجور کے راجا نے انھوں نے خود معاملہ کیا تھا اس واسطے وہ کس منھ سے ڈوپلے کے معاملات پر زبان کھولتے۔ پھر شروع میں انگریز حسب معمول کھلم کھلا مظفر جنگ اور چندا صاحب سے بگاڑ کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے مظفر جنگ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا اور چندا صاحب کو امبور کی کامیابی پر ایک طرف تو مبارکباد کا خط اور دوسری طرف محمد علی کو اس کے والد کے مارے جانے پر تعزیت نامہ روانہ کیا۔ لیکن جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کو کرناٹک میں خاص حقوق

---

[1] Martineau, Ibid 111, P. 98.

دیے ہیں تو وہ اپنے مستقبل کے متعلق متردد ہوئے۔ مظفر جنگ نے ڈوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں جو اپنا نائب مقرر کیا تھا اس کا یہ مطلب تھا کہ فرانسیسی من مانے طور پر انگریزی تجارت کو ختم کرنے کی تدابیر اختیار کر سکتے تھے۔ اور ان کے کرناٹک کے مقبوضات کی تجارتی اور سیاسی اہمیت کو گھٹا سکتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس وقت خاموشی اختیار کی گئی تو فرانسیسی دکن اور کرناٹک میں پوری طرح حاوی ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب انھوں نے محمد علی کی مدد کرنی شروع کی اور اپنے مفاد کو اس کے مقاصد سے وابستہ کر لیا۔[۱] ۱۷۴۹ء میں مدراس کونسل نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کو چاہیے کہ اپنی بہترین فوج کپتان کوپ کے تحت محمد علی کی امداد کے لیے فوراً ترچناپلی روانہ کر دیں تاکہ مظفر جنگ، چندا صاحب اور ان کے حامی فرانسیسیوں کا مقابلہ ممکن ہو سکے۔[۲] محمد علی نے سینٹ فورٹ ڈیوڈ کے قریب انگریزوں کو دو گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ انگریزی فوج کے سہارے محمد علی ترچناپلی کے قلعے میں مع اپنے خاندان اور خزانے کے جو اس کے باپ نواب انورالدین خاں نے چھوڑے تھے قلعہ بند ہو کر مظفر جنگ اور چندا صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب نے باوجود ڈوپلے کی تاکید کے تنجور کے محاصرے میں بہت وقت ضائع کر دیا۔ ڈوپلے اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب تک ترچناپلی فتح نہ ہوگا اس وقت تک چندا صاحب کی کرناٹک کی نوابی معرضِ خطر میں رہے گی راجۂ تنجور نے چندا صاحب سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر کے کئی مہینے اور ضائع کرا دیے۔ چندا صاحب نے اس سے چار کروڑ روپے کا مطالبہ کیا تھا لیکن راجا ادائگی پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے محمد علی سے کمک طلب کی۔ محمد علی نے تھوڑی بہت مدد کی اور ناصر جنگ کے حملے سے کرناٹک کے حالات کے بدلنے کی امید دلائی۔ بالآخر چندا صاحب کے ساتھ موسیو دیولین کی سرکردگی میں

۱۔ Country Correspondence, 1749.

۲۔ Fort St, David Consultations, October, 2, 1749.

جو فرانسیسی فوج تھی وہ پچھلے کئی ماہ کی بیکاری اور بدانتظامی سے بیزار ہوگئی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پانڈی چری واپس نہ چلی جائے۔ بالآخر فرانسیسی فوج کی مدد سے چندا صاحب نے تنجور کے قلعے کی سخت گولا باری کی اور راجا کو مجبور کیا کہ وہ جلد معاملات طے کرے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے چندا صاحب کو ۷۰ لاکھ روپیے دینے کا وعدہ کیا اور اس کو کرناٹک کا نواب تسلیم کیا جس کو آئندہ وہ پابندی سے محاصل کی رقم ادا کیا کرے گا۔ راجا نے فرانسیسی فوج کو دو لاکھ روپیے نقد ادا کیے اور فرانسیسیوں کو کاریکال کے قریب ۸۱ گاؤں بطور معافی عطا کیے۔ چندا صاحب سے یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ ۵۰ لاکھ کی رقم بااقساط ادا کی جائے گی۔ ادھر چندا صاحب راجۂ تنجور سے معاملات طے کر رہا تھا اور ادھر ڈوپلے کو ناصر جنگ کے اورنگ آباد سے روانہ ہونے کی خبریں مل رہی تھیں جن کے سبب سے وہ سخت پریشان تھا۔ اس نے چندا صاحب کو پے در پے خطوط لکھے کہ تنجور کے قضیے کو جلد سے جلد ختم کرکے ترچنا پلی پر چڑھائی کر دو۔ لیکن ان تمام معاملات میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ ناصر جنگ اپنے زبردست لشکر سمیت کرناٹک میں داخل ہوگیا۔ ڈوپلے نے فوراً مظفر جنگ اور چندا صاحب کو لکھا کہ بلد تنجور کے قلعے پر قبضے کی کوشش کی جائے تاکہ بعد میں وہ ناصر جنگ کے مقابلے میں کام آسکے۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب ناصر جنگ کے قریب پہنچ جانے کی خبر سے ایسے بدحواس ہوئے کہ مع فوج کے پانڈی چری روانہ ہوگئے۔

اس عرصے میں انگریز اور نواب محمد علی خاں ناصر جنگ کو لکھتے رہے کہ کرناٹک پر یہی وقت حملے کا ہے تاکہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے اپنا اقتدار تسلیم کرانے سے پیشتر ہی ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا جائے۔ ورنہ اگر ایک مرتبہ چندا صاحب نے کرناٹک کے تمام فوجداروں اور زمینداروں سے اپنی حیثیت منوالی تو اس کو بے دخل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا محمد علی نے بھی اصرار سے ناصر جنگ کو فوراً کرناٹک کی طرف توجہ کرنے کے لیے لکھا۔ چنانچہ ناصر جنگ نے جنوری ۱۷۵۰ء میں کرشنا کو پار کیا اور کرناٹک کے تمام فوجداروں اور زمینداروں کو مطلع کر دیا کہ وہ اپنی اپنی مقامی فوج کو

تیار رکھیں اور راستے میں ان سے آکر مل جائیں۔ مراری راؤ اور دوسرے مرہٹہ سردار بھی ناصر جنگ کی کرناٹک کی مہم میں ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مراری راؤ نے چدم برم کے قریب مظفر جنگ کی فرانسیسی فوج کو آلیا جب کہ وہ تنجور سے پانڈی چری واپس ہو رہی تھی لیکن فرانسیسیوں کے پاس زبردست توپ خانہ تھا ان کے گولہ اندازوں نے مرہٹوں کو پاس پھٹکنے نہ دیا۔ چندا صاحب پہلے پانڈی چری پہنچے۔ ڈوپلے نے اس کو ۵۰ ہزار پونڈ کی رقم کمپنی کے خزانے سے قرض دی اور تازہ دم دو ہزار فرانسیسی فوج موسیو دوتی کی سرکردگی میں اسکے ساتھ دے کر ولیانلور روانہ کر دیا جہاں مظفر جنگ کی فوج پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔

کرناٹک پہنچ کر ناصر جنگ نے محمد علی کو مشورے کے لیے ترچناپلی سے بلا بھیجا اور انگریزوں کو کمک کے لیے لکھا۔ کرناٹک کے ان فوجداروں کو جو اب تک ان سے آکر نہیں ملے تھے ہدایت کی گئی کہ جنجی کے پاس آکر سب جمع ہو جائیں۔ ناصر جنگ کی کل فوج کی تعداد ۳ لاکھ تک پہنچ گئی تھی جن میں سے نصف سوار تھے اور نصف پیدل، ۸۰۰ توپیں تھیں اور تیرہ سو ہاتھی[1]۔ انگریزوں نے صرف ۳۰۰ آدمیوں کی کمک بھیجی جو ولنڈالور کے مقام پر ناصر جنگ سے مل گئی یہاں لارنس ڈالٹن کی سفارت ناصر جنگ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ضروریات اور مفاد کے متعلق اپنے معروضات پیش کیے جن کی نسبت کوئی قطعی جواب ناصر جنگ کی جانب سے نہیں دیا گیا۔ لارنس نے ناصر جنگ کو مشورہ دیا کہ پانڈی چری پر چڑھائی کر دی جائے۔ لیکن ناصر جنگ اور ان کے مشیروں کی رائے ہوئی کہ مقابلے کے لیے ولیانلور کی طرف بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ یہاں مظفر جنگ اور چندا صاحب مع فرانسیسی فوج ۴ اپریل ۱۷۵۰ء ناصر جنگ کے مقابلے پر آئے۔ دونوں طرف سے گولہ اندازی ہوئی۔ فرانسیسی فوج میں کچھ ایسی بد دلی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے پیر اکھڑ گئے۔ ناصر جنگ کی فوج نے پانڈی چری تک فرانسیسیوں کا پیچھا کیا۔ اس ہڑبونگ میں فرانسیسی

[1] Orme, Ibid, Vol. 1, P. 138.

مظفر جنگ کو پیچھے چھوڑ گئے جنھیں ناصر جنگ کی فوج نے گرفتار کر لیا۔ مظفر جنگ نے ناصر جنگ کی اطاعت قبول کر لی اور وفاداری کے عہد و پیمان پر ان کی جاں بخشی کی گئی۔ اس موقع پر فرانسیسی فوج میں بددلی کا اصلی سبب یہ تھا کہ تھوڑے سے جو فرانسیسی افسر اور سپاہ پانڈی چری آئی تھی وہ خوب انعام و اکرام سے لدی پھندی آئی تھی۔ ڈیوپلے نے ان کی بجائے دوسری سپاہ اور دوسرے افسر موسیو دوتی کی سرکردگی میں ناصر جنگ کے مقابلے کے لیے روانہ کیے۔ انھیں ڈیوپلے سے شکایت تھی کہ جان دینے کے لیے ہم لوگوں کو بھیجا گیا اور انعام و اکرام کے لیے دوسروں کو بھیجا گیا۔ چنانچہ جس وقت ناصر جنگ سے مقابلہ ہوا تو ۱۳ افسروں نے اپنے کمیشن واپس کر دیے۔ عین معرکے کے وقت جب موسیو دوتی نے دیکھا کہ فرانسیسی فوج کا دل لڑائی میں نہیں ہے تو اس نے پانڈی چری واپس جانے کا حکم دے دیا۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کو اگرچہ فرانسیسی افسروں اور سپاہ کی بددلی کا علم تھا لیکن انھیں یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ انھیں اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلتی بنے گی۔ انھوں نے دوتی کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا کہ باقی جو فوج ہے اس سے ناصر جنگ کا مقابلہ کرے لیکن اس کی ہمت نہ بندھی اور اس نے راتوں رات پیچھے ہٹ کر پانڈی چری میں پناہ لینے کا تہیہ کر لیا۔[له]

ناصر جنگ نے ونڈالور کے مقام پر جب پڑاو ڈالا تھا تو اس وقت سے ان کے اور مظفر جنگ کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دونوں طرف سے ایلچی آنے جانے لگے تھے۔ ناصر جنگ نے وعدہ کیا کہ بیجاپور اور ادھونی میں مظفر جنگ کے جو حقوق ہیں وہ ان پر بحال کر دیے جائیں گے اور ان کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیا جائے گا۔ لیکن مظفر جنگ کو اپنے فرانسیسی ساتھیوں پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ مصالحت کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ لیکن عین معرکے کے وقت فرانسیسی فوج کے پانڈی چری چلے جانے پر انھوں نے اپنے تئیں ناصر جنگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چندا صاحب کی طرح اگر وہ چاہتے تو فرانسیسی فوج کے ساتھ

له۔ Orme, Ibid 1, P 140, Wilk's Historical Sketches of the South of India 1 · P 263

[illegible] پانڈی چیری چلے جاتے۔ لیکن غالباً ناصر جنگ کے زبردست لشکر اور
ان کی تیاریوں کو دیکھ کر وہ مرعوب ہو گئے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ فرانسیسی
ناصر جنگ کو شکست نہیں دے سکیں گے۔

ناصر جنگ کے مقابلے سے اس طرح راتوں رات فرار ہو جانے سے
فرانسیسیوں اور خاص طور پر دیوپلے کی بہت سبکی ہوئی۔ لیکن دیوپلے کا مزاج کچھ اس قسم کا
تھا کہ جس قدر سخت پریشانیوں کا اس کو سامنا کرنا پڑتا تھا اسی قدر اس کی سیاست کاری
اور تدبر کے جوہر نکھرتے تھے۔ اس نے فوراً ناصر جنگ سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع
کر دیا اور انھیں سمجھا کہ میں نے فرانسیسی سپاہ کو واپس بلا لیا ہے تاکہ ہمارے اور آپ کے
درمیان صلح وصفائی ہو جائے اور کرناٹک کے متعلق کوئی قطعی تصفیہ کرنے میں
سہولت ہو۔ خود ناصر جنگ کے دربار میں بعض ایسے امرا موجود تھے جو چاہتے تھے کہ
فرانسیسیوں سے سمجھوتہ ہو جائے اور مظفر جنگ کو ان کی سابق خدمت پر بحال کر دیا جائے
ان لوگوں کی کوشش سے ناصر جنگ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ فرانسیسی سفارت کو
شرف باریابی بخشیں چنانچہ آزی دے لارش اور موسیو دیوتوے پانڈی چیری سے
ناصر جنگ کے لشکر میں گفت وشنید کے لیے آئے۔ موسیو دیوتوے فارسی زبان پر
پوری قدرت رکھتا تھا اور اچھی طرح گفتگو کر سکتا تھا۔ جب نواب نظام الملک
آصف جاہ اول ۱۷۴۳ء میں کرناٹک تشریف لے گئے تو وہ فرانسیسی سفارت کا
بحیثیت ترجمان رکن تھا۔ سفارت نے مظفر جنگ کے لیے ادھونی اور چندا صاحب
کے لیے ارکاٹ کی نوابی کا مطالبہ کیا۔ فرانسیسی سفارت نے ناصر جنگ سے گفت وشنید
کے دوران میں کڑپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں سے خاص تعلقات پیدا کر لیے اور
ناصر جنگ کے دربار میں جو مختلف پارٹیاں تھیں ان کے اثر کا صحیح اندازہ کر لیا۔ یہ
تینوں نواب ناصر جنگ کے سلوک سے مطمئن نہیں تھے۔ اس گفت وشنید کے ذریعے
دیوپلے نے ناصر جنگ کے لشکر میں اک گونہ اطمینان کی کیفیت پیدا کر دی اور

۱۔ Lettres edifiantes et curieuses (ed, Aimé Martin) Vol. 11, P. 735

اس کے ساتھ حملے کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ لاتوش کی سرکردگی میں رات کے وقت ایک دم سے فرانسیسیوں نے ناصر جنگ کے لشکر پر ہلہ بول دیا۔ یہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ناصر جنگ کے تمام لشکر میں حیرانی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ناصر جنگ پیچھے ہٹ کر ارکاٹ میں خیمہ زن ہو گئے تاکہ موسم گرما وہاں گزاریں۔ اگرچہ فرانسیسیوں کے اس حملے سے کوئی اہم نتیجہ نہ نکلا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ان کی سپاہ نے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیا۔

اب تک انگریزوں نے ناصر جنگ کو جو امداد بھیجی تھی وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ناصر جنگ پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوا۔ پھر انگریز اس تھوڑی سی مدد کے بہانے کرناٹک میں جو خاص مراعات ناصر جنگ سے چاہتے تھے وہ بھی انہیں حاصل نہ ہو سکیں۔ لارنس نے ہرچند کوشش کی کہ محمد علی نے مدراس اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے قریب جو علاقے انگریزوں کو عطا کیے ہیں ان کی توثیق ناصر جنگ سے حاصل کر لیں لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ناصر جنگ کے دیوان صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے ان کی اس کوشش کو بارآور نہیں ہونے دیا۔ اور کہا کہ یہ درخواست اس وقت منظور ہو گی جب کہ انگریزی فوج ناصر جنگ کے ساتھ ارکاٹ میں اس وقت تک رہے جب تک کہ کرناٹک کی نوابی کا کوئی قطعی تصفیہ نہ ہو جائے۔ لارنس یہ بھی چاہتا تھا کہ ناصر جنگ مدراس کونسل کے ریذیڈنٹ کو خلعت و خطاب سے سرفراز کریں جس طرح مظفر جنگ نے ڈیوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں اپنا نائب مقرر کرتے وقت صفدر جنگ کا خطاب دیا تھا۔ اور اس عزت افزائی کے ضمن میں کرناٹک میں کچھ اور علاقے عطا کیے جائیں تاکہ اہل ہند کی نظروں میں انگریزی قوم کے وقار میں اضافہ ہو اور ناصر جنگ کو مدد دینے کے سلسلے میں جو فوجی خرچ ہوا اس کی پابجائی ہو سکے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ناصر جنگ کی خدمت میں جو تحفے تحائف پیش کیے گئے ان کی قیمت سات ہزار پونڈ (تقریباً ۱۰ ہزار پگوڈا) بتائی جاتی ہے[1]۔

شاہنواز خاں کی خلل اندازی کی وجہ سے لارنس کی کوششیں جب ناکام رہیں

---

[1] Fort St. David Consultations, March 3, 1750.

اور اس کو ناصر جنگ سے کوئی خاص توقع باقی نہیں رہی تو اس نے انگریزی فوج کو فورٹ سینٹ ڈیوڈ واپس جانے کا حکم دے دیا۔ لارنس کا بیان ہے کہ ناصر جنگ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگریزی فوج کا خرچہ برداشت کریں گے۔ لیکن چونکہ ناصر جنگ نے ایسا کرنے کی بجائے حیلے حوالے شروع کر دیے اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ انگریزی فوج انکی مدد کے لیے ان کے ساتھ رہے۔[1] اس ضمن میں یہ عجیب بات ہے کہ انگریز سمجھتے تھے کہ ناصر جنگ کے دیوان شاہ نواز خاں ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانسیسی یہ خیال کرتے تھے کہ وہ انگریزوں کے حامی ہیں۔[2]

ارکاٹ پہنچ کر ناصر جنگ نے اپنا وقت عیش و عشرت میں ضائع کیا حالانکہ چندا صاحب اور فرانسیسی برابر اپنی تیاریوں اور جوڑ توڑ میں مشغول رہے۔ ناصر جنگ کے حکم کے بموجب فرانسیسیوں کی مسولی پٹم اور ینام کی کوٹھیاں ضبط کر لی گئیں اور ان کے ملازموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ دیو پلے نے لاتور کے تحت پانڈی چری سے دو سو پیادہ روانہ کیے جس نے مسولی پٹم پر قبضہ کر لیا۔ دیو پلے نے مظفر جنگ کی عطا کے بموجب جیدم برم۔ تروتی۔ ولیانور اور باہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان مقامات پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے سے محمد علی کو پریشانی شروع ہوئی کہ کہیں اسی طرح آہستہ آہستہ فرانسیسیوں اور چندا صاحب کا قبضہ و تصرف مختلف مقامات پر قائم ہو گیا تو بعد میں انھیں بے دخل کرنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ انگریزوں نے بے تعلقی کا جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ ان کے مفاد کے خلاف تھا اور اس میں ان کا سخت نقصان تھا کہ وہ فوری فائدے کو دیکھیں اور دور اندیشی سے کام نہ لیں۔ محمد علی نے بڑی کوشش سے انگریزوں کو آمادہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کے خلاف اس کی مدد کریں۔ اس نے انگریزی فوج کے سب اخراجات برداشت کرنے کا

---

[1] Lawrence's Narrative of the War on the Coast of Coromandal, P. 10, (ed. by Cambridge)

[2] *Memoire pour le Sieur Dupleix*, P 55, *Fort St David Consultations*, April 24, 1750.

وعدہ کیا۔ چنانچہ کپتان کوپ کے تحت ... ۲ گورے اور ایک توپ خانہ محمد علی کی مدد کیلیے
فورٹ سینٹ ڈیوڈ سے بھیجے گئے۔ اس کے مقابلے کے لیے فرانسیسی افسر لا توش
تھا جس کے ساتھ ... ۵ گورا فوج تھی۔ دونوں فوجوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی ہیں
لیکن کوئی فیصلہ کن لڑائی کی نوبت نہیں آنے پائی۔ کپتان کوپ نے جب محمد علی سے
اپنی فوج کی تنخواہ طلب کی تو اس سے ادا نہ ہو سکی۔ اس پر میجر لارنس محمد علی سے بہت
ناراض ہوا اور کپتان کوپ کو انگریزی فوج سمیت فورٹ سینٹ ڈیوڈ واپس بلا لیا
انگریزی فوج کے واپس جاتے ہی دوپلے نے ترتی وادی کے قریب فوج جمع کر کے
محمد علی پر پے در پے حملے کیے اور اس کی ساری توپیں چھین لیں۔ اب دوپلے نے بسی
اور دوسری کو مزید فوج دے کر جنجی کی طرف روانہ کیا جہاں محمد علی کی بارہ ہزار فوج قلعہ بند
ہو گئی تھی۔ فرانسیسی فوج نے بسی کی سرکردگی میں جنجی کے قلعے کو راتوں رات سیڑھیوں
سے چڑھ کر فتح کر لیا۔ یہ قلعہ جنوبی ہند کا نہایت ہی مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا
تھا۔ اس کامیابی سے انگریزوں اور ناصر جنگ کو تشویش پیدا ہوئی۔ ناصر جنگ
نے سوچا کہ اب معاملات کی یکسوئی ہو جانی چاہیے۔ یا تو فرانسیسیوں سے صلح کر لی جائے
یا انھیں نیچا دکھایا جائے۔ ناصر جنگ کا لشکر ارکاٹ کے جنوب میں جنجی کے قلعے
کی طرف بڑھنے لگا تاکہ اس کو تسخیر کیا جائے۔ راستے میں بارش سخت ہوئی۔ دریا
چڑھ گئے۔ فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان پہلے ہی سے کم تھا۔ اس طوفانی
بارش میں کہیں سے فوج کے لیے مزید رسد فراہم کرنا ممکن نہ تھا۔ جنجی کے قریب
جہاں ناصر جنگ کی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا وہاں بارش کے سبب سے وہ دو مہینے
یوں ہی بیکار پڑی رہی۔ اس عرصے میں دربار کے بعض امرا کے اثر سے دونوں
جانب سے ایلچیوں کی آمد و رفت پھر شروع ہو گئی۔ ان دو مہینوں میں دوپلے نے ناصر جنگ
کے بعض امرا اور درباریوں کو توڑ لیا۔ خاص طور پر کڑپہ کرنول اور سادنور کے
نوابوں سے دوپلے نے خفیہ طور پر خوب تعلقات بڑھا لیے۔ ان سے دوپلے
نے یہ طے کر لیا کہ اگر ناصر جنگ فرانسیسیوں کی شرطوں کو تسلیم کرنے سے انکار
کریں اور جنگ کی نوبت آئے تو وہ عین معرکے میں فرانسیسیوں سے مل جائیں
اس تمام کارروائی کی تفصیلات طے ہو گئیں یہاں تک کہ ایک فرانسیسی سفیر

جھنڈا بھی نوابوں کو خفیہ طور پر پہنچا دیا گیا جسے وہ لڑائی میں ناصر جنگ سے الگ ہو کر ایک ہاتھی پر بلند کر دیں[1]۔ ان نوابوں نے مظفر جنگ سے ساز باز کر لیا جو ناصر جنگ کے لشکر کے ساتھ قید میں تھا۔ اور ان میں یہ طے کر لیا کہ ناصر جنگ کا خزانہ نصف نصف نوابوں اور اس کے درمیان تقسیم کر لیا جائے گا۔ رام داس پنڈت اور صف شکن خاں میر آتش بھی اس سازش میں شریک تھے۔

فرانسیسیوں اور ناصر جنگ کی فوجیں تقریباً دو مہینے ایک دوسرے کے قریب پڑی رہیں۔ جب موسم ذرا بہتر ہوا تو اقدام اور فیصلے کا وقت آ پہنچا۔ ناصر جنگ نے بالآخر ایلچیوں سے دوپلے کو کہلا بھیجا کہ اب وہ اس کی تمام شرطیں ماننے کو تیار ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ مظفر جنگ کو رہا کر دیں گے، مسولی پٹم فرانسیسیوں کے حوالے کر دیں گے اور چندا صاحب کو نواب ارکاٹ تسلیم کر لیں گے[2]۔ ناصر جنگ کا ایلچی دوپلے کے پاس ابھی پہنچا ہی تھا کہ لاتوش نے ۱۶ دسمبر ۱۷۵۰ء کی صبح تڑکے ناصر جنگ کے لشکر پر ہلّہ بول دیا۔ کڑپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں کی فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی اور جب ناصر جنگ کی فوج میں سراسیمگی پھیلی تو انہوں نے فرانسیسی جھنڈا بلند کر دیا۔ بقول سرو آزاد جب ناصر جنگ کا ہاتھی ہمت خاں نواب کرنول کے ہاتھی کے پاس تھا تو ناصر جنگ نے عماری سے بلند ہو کر اپنی سپاہ کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمت خاں اور اس کے ساتھیوں نے اس وقت کئی فیر کیے جو ناصر جنگ کے سینے پر پڑے۔ ناصر جنگ کے شہید ہونے کی خبر سے جو رسالہ دار اور بخشی اب تک

---

1. Cultru, Dupleix, ses idées, sa politique et sa chute, p. 251

2. Martineau, Dupleix et l'Inde Française, III, p. 142, 143

3. سرو آزاد، ص ۱۰۹ [illegible]۔ یہی واقعات کم و بیش دوسری ہمعصر کتب مثلاً خزانۂ عامرہ، تذکرۃ الامرا اور تاریخ [illegible] میں بھی ملتے ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے مصنف میر غلام علی آزاد بلگرامی، شاہنواز خاں صمصام الدولہ اور [illegible] ان تمام واقعات کے عینی شاہد تھے۔

مقابلہ کر رہے تھے، ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ مظفر جنگ کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا
گیا۔ یہاں سے مظفر جنگ سیدھے پانڈی چری روانہ ہوئے جہاں بڑے تزک و احتشام
سے ان کا استقبال کیا گیا۔ بڑی دھوم دھام سے مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ کئی روز
تک عیش و نشاط کی محفلیں گرم رہیں۔ مظفر جنگ نے فرانسیسی افسروں اور سپاہ کو خوب
دل کھول کر انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ جب مظفر جنگ پانڈی چری میں داخل ہوئے
تو ناصر جنگ کا سارا خزانہ ان کے ساتھ تھا۔ اٹھارہ صندوق جواہرات کے اور
ایک کروڑ روپیہ نقد تھا۔ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کے اعلیٰ افسروں سے لے کر
ادنیٰ سپاہیوں تک کو اتنا دیا جتنا ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ڈیوپلے کو
دریائے کرشنا سے لے کر راس کماری تک کے تمام علاقے کا نائب مقرر کیا گیا اور
چندا صاحب کو بھی اس کے تحت ارکاٹ کا نواب تسلیم کیا گیا۔ ڈیوپلے کو
ہفت ہزاری منصب اور ماہی مراتب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی بیوی کو
جہاں آرا بیگم کا خطاب ملا۔ ڈیوپلے کو اس موقع پر جو خلعت دیا گیا تھا اس کو
زیب تن کر کے وہ مغل امرا کی صورت بنا کر مظفر جنگ کے دربار میں حاضر ہوا اور
سر جھکا کر مجرا بجا لاتا تھا۔ پانڈی چری کی ٹکسال میں جو فرانسیسی روپیہ بنایا جاتا تھا اسکا
رواج سارے کرناٹک میں منظور کیا گیا۔ فرانسیسی کمپنی کو اس موقع پر ساڑھے تین لاکھ
روپئے سالانہ آمدنی کا علاقہ کرناٹک میں عطا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے لیے
یہ تمام انتظام سخت نقصان رساں تھے اس واسطے کہ جن علاقوں میں ان کی تجارت
تھی ان میں سے بعض فرانسیسیوں کے تحت آ گئے تھے۔ اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ
چاروں طرف سے فرانسیسی علاقوں سے گھر گیا تھا۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ کی کپڑے
کی تجارت کا دار و مدار ان کپڑا بننے والوں پر تھا جو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے نواح
میں ہر طرف آباد تھے۔ ان علاقوں کے فرانسیسیوں کے تحت آ جانے کا یہ مطلب تھا کہ
فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے انگریزوں کی کپڑے کی تجارت ختم ہو جائے گی۔ غرضکہ
ان حالات میں یہاں اب انھیں وہ مراعات اور سہولتیں حاصل نہیں رہیں گی جو
پہلے حاصل تھیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ دریائے کرشنا کے جنوب میں تمام علاقوں کی
مالگزاری ڈیوپلے کے توسط سے صوبہ دار دکن کو ادا کی جائے گی۔ یہ بات کہ

کرنول اور ساونور کے نوابوں کو بہت ناگوار گزری۔ اس واسطے کہ وہ تو اس امید میں تھے کہ نئے انتظام کے تحت ان کی حیثیت کچھ بلند ہو جائے گی۔ لیکن ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ پھر ان کے ساتھ ڈیوپلے اور مظفر جنگ نے جو وعدے کیے تھے وہ بھی پورے نہیں کیے گئے۔

ڈیوپلے سے عہد و پیمان پکا کرنے کے بعد مظفر جنگ پانڈی چری سے دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ تین سو فرانسیسی گورا فوج اور دس ہزار قواعد داں دیسی فوج تھی اور ڈیڑھ سو توپیں تھیں۔ موسیو بسی کو ڈیوپلے نے اس فوج کا اعلیٰ افسر اور مظفر جنگ کا مشیر مقرر کیا جس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ملے یا اس نے حاصل کر لیے۔ مظفر جنگ نے موسیو بسی کو سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب، ہفت ہزاری منصب مع علم و نقارہ، اور ماہی مراتب عطا کیا۔ ڈیوپلے نے اس موقع پر مظفر جنگ کو راستے کے خرچ کے لیے ایک کروڑ روپیہ قرض دے کر اس کے بدلے میں قیمتی جواہرات کے صندوق اپنے پاس رکھ لیے۔ موسیو بسی کو تین لاکھ روپے بطور انعام دیے گئے، اور جو فرانسیسی سپاہ اس کے ساتھ مظفر جنگ کی حفاظت کے لیے روانہ کی گئی تھی۔ اس کے ہر سپاہی کو تین مہینے کی تنخواہ پیشگی اور حیثیت کے موافق انعام و اکرام بھی دیا گیا[1] یہ بھی طے ہوا تھا کہ بسی مظفر جنگ کے ہمراہ حیدر آباد تک جائے اور وہاں سے مسولی پٹم چلا جائے۔

ڈیوپلے نے کڑپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں کے ساتھ ساز باز کیا تھا تو ان سے وعدہ کیا تھا کہ ناصر جنگ کی دولت میں سے انھیں بھی حصہ ملے گا۔ لیکن مظفر جنگ کی صوبہ داری کے اعلان کے بعد ان نوابوں کو ڈیوپلے نے کچھ بھی نہیں دیا۔ اس پر ظاہر ہے کہ وہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ سب کچھ تو ہم نے کیا لیکن فائدہ دوسروں نے اٹھایا۔ مظفر جنگ کی وعدہ خلافی سے خاص طور پر وہ بہت ناراض تھے اور انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ ڈیوپلے کی

---

[1] Cultru, Dupleix, ses idées, sa politique et sa chute, p. 261.

یہ غلطی بھی کہ وہ سمجھا کہ باوجود غیر مطمئن ہونے کے وہ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے لیکن انھوں نے مظفر جنگ سے اپنا بدلہ لے لیا۔ مظفر جنگ جب نواب کڑپہ کے علاقے میں داخل ہوئے تو ان کے خلاف بھی اس نے اسی طرح سازش کی جس طرح ان کے ماموں ناصر جنگ کے خلاف کی تھی۔ مظفر جنگ پر اچانک حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس سے سارے لشکر میں ہل چل پڑ گئی۔ مظفر جنگ کی بیوی نے اپنے نو عمر فرزند کو فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اسے باپ کا جانشین بنا دیا جائے۔ لیکن بسی نے سوچا کہ اگر اس کو جانشین بنا دیا گیا تو بڑی سخت سازشیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس نے نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کے تیسرے بڑے بیٹے آصف الدولہ صلابت جنگ کو شاہ نواز خاں کے مشورے سے مسند نشین کر دیا۔ فوج کو بھی یہ انتظام پسند آیا۔ ڈوپلے کو جب اس تمام واقعے کی اطلاع ہوئی تو اس نے بسی کے اس انتظام کی تعریف کی اور توقع ظاہر کی کہ نیا صوبہ دار ان تمام مراعات کی توثیق کر دے گا جو مظفر جنگ نے منظور کیے تھے۔ صلابت جنگ نے مسند نشین ہونے کے بعد راجا رام داس کو جسے مظفر جنگ نے راجا رگھوناتھ داس کا خطاب دیا تھا اپنا دیوان مقرر کیا راجا رگھوناتھ داس فرانسیسیوں کا خاص شخص تھا جس پر بسی کو بہت زیادہ اعتماد تھا۔ اس نے بھی اپنے سرپرست فرانسیسی افسروں کی خوشنودی کی پوری کوشش کی۔ موسیو بسی نے صلابت جنگ کے ساتھ دریائے کرشنا کو پار کیا تو مرہٹوں کو لڑائی کے لیے تیار پایا جو صلابت جنگ کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے بسی اگرچاہتا تو مرہٹوں سے لڑ کر انھیں نیچا دکھاتا لیکن پیشتر اس کے کہ دکن میں فرانسیسی اثر و رسوخ مستحکم ہو جائے لڑائی میں خواہ مخواہ پڑنے سے فرانسیسی قوم کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا ان حالات میں صلابت جنگ نے بسی سے خواہش ظاہر کی کہ ابھی تھوڑے دنوں وہ اور اس کی حفاظت کیلئے دکن میں رہے۔ صلابت جنگ محسوس کرتے تھے کہ فرانسیسی امداد کے بغیر وہ اپنے دربار کی سازشوں اور مرہٹوں کے آئے دن کے زغوں سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ پھر انھیں اپنے سب سے بڑے بھائی

غازی الدین فیروز جنگ کا بھی ڈر لگا ہوا تھا جو اگرچہ اس وقت دہلی میں تھے لیکن اس کا قوی امکان تھا کہ وہ دکن کی طرف رُخ کرنے کا ارادہ کرلیں۔

چند ہفتے حیدرآباد میں مقام کرنے کے بعد صلابت جنگ فرانسیسی فوج سمیت اورنگ آباد روانہ ہوئے اور ۱۸ رجون ۱۷۵۱ء کو وہاں پہنچے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے انتقال کے بعد تین سال سے دکن کی صوبہ داری کا مسئلہ معرضِ بحث میں پڑا ہوا تھا۔ اس موقع پر دور دور سے لوگ اورنگ آباد میں جمع ہوگئے تھے تاکہ نئے صوبہ دار سے اظہار اطاعت و وفاداری کریں اور دارالسلطنت کے جشن و جلوس میں شرکت کریں۔ مسندنشینی کی جب تمام رسوم پوری ہوچکیں تو بسی نے پھر صلابت جنگ سے خواہش ظاہر کی کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو پانڈیچری جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش کبھی منظور نہ ہوگی۔ اس طرح دراصل وہ صلابت جنگ کے دربار میں اپنی وقعت اور اہمیت کو بڑھانا چاہتا تھا اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا۔ صلابت جنگ کی اس بے بسی کے احساس نے اس کو امورِ مملکت میں بااختیار بنا دیا اور فرانسیسی قوم کا اثر کئی سال تک کے لئے دکن کی سیاست میں مستحکم ہوگیا۔

مظفر جنگ نے جب دوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں اپنا نائب مقرر کیا تھا تو اس کے اختیارات کی پوری طرح وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ نہ اس بات کا تعین کیا گیا تھا کہ وہ دربارِ دکن کو کیا ادا کرے گا اور نہ یہ طے ہوا تھا کہ دربارِ دکن سے اس کو کیا ملے گا۔ اب جب کہ صلابت جنگ بخیر و عافیت اورنگ آباد پہنچ گئے اور موسیو بسی نے ان کے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو دوپلے نے پانڈیچری سے اس کو لکھا کہ جنوبی ہند اور دکن میں فرانسیسی فوج رکھنے کے جو اخراجات عاید ہوتے ہیں ان کی پابجائی کے لیے ایک لاکھ روپے ماہوار دربارِ دکن سے ملنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس نے کرشنا کے جنوب میں مالگزاری وصول کرنے کے لیے اپنے نائب مختلف علاقوں میں مقرر کر دیے تھے جو اس کے احکام کا نفاذ عمل میں

لاتے تھے[1]۔ بسی کی کوشش سے صلابت جنگ نے بہ ذریعۂ فرمان ڈیوپلے کو صراحت کے ساتھ ارکاٹ، ترچنا پلی اور مدورا کی مالگزاری وصول کرنے کے حقوق عطا کیے۔ چنانچہ ڈیوپلے نے اپنی کمپنی کو اس کی نسبت اس طرح لکھا تھا۔ "ان تمام واقعات میں سب سے اہم واقعہ آپ کو یہ ملے گا کہ ترچنا پلی، ارکاٹ اور مدورا میں ہمیں مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے ان مراعات کی توقع نہ تھی لیکن یہ سب کچھ موسیو بسی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کی بدولت ارکاٹ میں فرانسیسی اقتدار قائم ہو جائے گا اور فرانس کے شاہی خزانے کو ہمیں سالانہ جو رقم ادا کرنی چاہیے اس کا تعین عمل میں آ جائے گا۔ یہ مراعات فرانسیسی قوم کے لیے نہایت اہم ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کی نسبت غور و خوض کیا جائے۔ ان کی بدولت یہ ہوگا کہ فرانسیسی کمپنی ہندوستان میں تجارت کے لیے جو سرمایہ بھیجا کرتی ہے اس کی ضرورت آئندہ باقی نہ رہے گی[2]۔"

۱۷۵۲ء کے شروع میں بالاجی راؤ نے دکن پر حملہ کر دیا۔ بسی اور اس کی فرانسیسی فوج نے اس کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ بالاجی راؤ نے ایک لاکھ کا معاوضہ لے کر صلح کر لی۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب صلابت جنگ کے بڑے بھائی غازی الدین خاں فیروز جنگ نے دکن پر چڑھائی کی تو بالاجی راؤ اور رگھوجی بھونسلا نے اس کی امداد کا وعدہ کیا۔ بسی کو اس سے پریشانی ہوئی اور اس نے ارادہ کیا کہ صلابت جنگ کو ساتھ لے کر مسولی پٹم چلا جائے۔ لیکن اسی اثنا میں اس کو ڈیوپلے کا خط ملا جس سے اس کو معلوم ہوا کہ پانڈی چری سے کمک روانہ کر دی گئی ہے۔ ڈیوپلے نے بسی کو یہ بھی لکھا کہ اگر کوئی اور صورت کارگر نہ ہو تو غازی الدین خاں فیروز جنگ سے گفت و شنید کر کے صلابت جنگ کو

---

[1] Cultru, p: 268, 269,

[2] Archires de Colonies, Dupleix to the Company, quoted by Dodwell, Dupleix and Clive, p. 87

کم سے کم اس کا نائب ہی تسلیم کرا لینا۔ بشرطیکہ غازی الدین خاں ان سب مراعات کی توثیق کرنے پر آمادہ ہوں جو فرانسیسی قوم کو جنوبی ہند میں اس عرصے میں حاصل ہو گئی ہیں۔[۱] بسی صلابت جنگ کو ساتھ لے کر بیدر چلا گیا اور حالات کا انتظار کرنے لگا۔ غازی الدین خاں سے گفت و شنید کی نوبت نہیں آئی اس واسطے کہ ان کو اورنگ آباد میں زہر دے دیا گیا اور صلابت جنگ کے اقتدار کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ لیکن بسی کو راگھوجی بھونسلا سے ابھی نبٹنا باقی تھا جو اپنی فوج سمیت غازی الدین خاں کی مدد کو دکن کا رخ کر چکا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ غازی الدین خاں نے اس کی فوج کے اخراجات کی بابجائی کے لیے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرنا چاہیے۔ اس نے بسی کے پاس اپنے وکیل روانہ کیے۔ بالآخر اس شرط پر مصالحت ہو گئی کہ راگھوجی بھونسلا کو برار میں جاگیر عطا کر دی جائے۔ غازی الدین خاں نے ۶۰ لاکھ روپیے نقد کا جو وعدہ کیا تھا اس کا پورا کرنا صلابت جنگ کے لیے ناممکن تھا چنانچہ اس مطالبے سے راگھوجی بھونسلا دست بردار ہو گیا۔

بسی اپنے مزاج کی ناسازی کے باعث کچھ عرصے کے لیے مسولی پٹم چلا گیا اور گوپل اس کی جگہ صلابت جنگ کے دربار میں افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ بسی نے اس قدر دولت جمع کر لی تھی کہ اب وہ اطمینان سے فرانس جا کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن ڈوپلے نے اس کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس واسطے کہ اس کی نظر میں اور کوئی فرانسیسی افسر اس وقت ہندوستان میں ایسا موجود نہ تھا جو دکن میں فرانسیسی اثر و رسوخ کو برقرار رکھ سکتا۔ بسی کی غیر موجودگی میں صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسیوں کے اثر کے خلاف سازش شروع ہو گئی۔ امرا اور عہدہ داروں کی ایک جماعت فرانسیسی اثر کو بری نظر سے دیکھتی تھی۔ سید لشکر خاں نے فرانسیسی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے تنخواہیں دلوانے میں

---

[۱] Hamont: Dupleix d'apres sa correspondence inedite. p. 227.

چار ماہ کی تاخیر کرا دی تاکہ ان میں بے چینی اور بددلی پیدا ہو جائے۔ جب بسی کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو وہ دکن واپس آیا اور دیسی ساہوکاروں سے قرض لے کر اپنی سپاہ کی تنخواہیں دلوائیں۔ اب بسی نے سوچا کہ جب تک فوجی مطالبات کی پابجائی کے لیے مستقل علاقے حاصل نہ کر لیے جائیں جو فرانسیسیوں کے تصرف میں رہیں اس وقت تک یہی بدانتظامی جاری رہے گی۔ چنانچہ اس نے صلابت جنگ سے سیکاکول، ایلور، راجمندری اور کنڈاپلی چار سرکاروں کا مطالبہ کیا جن کی مجموعی آمدنی ۳۱ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ صلابت جنگ نے اس مطالبہ کو منظور کر لیا اور شمالی سرکاروں پر فرانسیسی تصرف و اقتدار قائم ہو گیا۔ یہ چاروں سرکاریں بسی کو شخصی طور پر عطا کی گئی تھیں نہ کہ فرانسیسی کمپنی کو لیکن بسی نے انہیں کمپنی سے متعلق کر کے انکی آمدنی حاصل کرنیکا مجاز کر دیا۔ یہ دکن میں فرانسیسی اثر کی ترقی کا انتہائی نقطہ تھا۔ بسی کے خلاف نظام علی خاں اور شاہنواز خاں نے جو ترکیبیں کی ان کا اس نے بڑی کامیابی سے کاٹ کیا اور صلابت جنگ پر پہلے سے بھی زیادہ اثر قائم کر لیا۔ لیکن عنقریب کرناٹک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اسکی بدولت فرانسیسی زیادہ عرصے تک دکن میں اپنا اثر ورسوخ قائم نہ رکھ سکے۔

انگریز اب زیادہ عرصہ تک اہل فرانس کی ترقی کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تیسرا باب

جنوبی ہند اور دکن میں فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی کامیابی

اب انگریزوں کے دل میں اپنے مستقبل کی طرف سے دغدغہ پیدا ہوا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دکن کی صوبہ داری کے لیے فرانسیسیوں نے اپنے امیدوار کو کامیاب کرا کے خود نہایت اہم مراعات حاصل کرلی ہیں جن سے انگریزی مفاد کو براہ راست ٹھیس لگنا لازمی ہے۔ اب اگر کرناٹک میں چندا صاحب کی نوابی مضبوط بنیادوں پر قایم ہو گئی تو جنوبی ہند میں بھی ان کی تجارت ختم ہو جائے گی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دریائے کرشنا کے جنوب میں دوپلے کو صلابت جنگ نے اپنا نائب مقرر کر دیا ہے۔ بالآخر مدراس کونسل کے نئے صدر مسٹر سانڈرس نے ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے جو انگریزوں کے لیے آئے دن پیدا ہو رہے تھے محمد علی کو تاکید کر دی کہ وہ دوپلے کے جنوبی ہند کے انتظامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ اسلئے

محمد علی کو کافی مدد دینے اور انگریزی کمپنی کو اس کے مفاد سے وابستہ کرنے کا وعدہ کیا۔
سانڈرس نہایت قابل، معاملہ فہم اور دور اندیش شخص تھا۔ اس نے خیال کیا کہ
کرناٹک میں انگریزوں کے رہے سہے اثر کو برقرار رکھنے کی صرف یہ صورت ہے
کہ محمد علی کو ترچناپلی میں اتنی کمک بھیجدی جائے کہ وہ چندا صاحب اور اس کے
فرانسیسی حامیوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ فروری ۱۷۵۱ء میں انگریزی فوج ترچناپلی
پہنچ گئی۔ پیشتر اس کے کہ چندا صاحب وہاں پہنچے جیسا کہ سانڈرس کا خیال تھا
چندا صاحب نے ارکاٹ سے روانہ ہو کر ۱۲ ہزار سوار اور ۵ ہزار پیدل سے
ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی مدد کے لیے فرانسیسی فوج دوتنی کی سرگردگی میں
موجود تھی۔ ترچناپلی کے آس پاس کے تمام علاقوں پر جو محمد علی کے تحت تھے
چندا صاحب نے قبضہ کر لیا اور محمد علی کی آمدنی کے کل ذریعوں کو ختم کر دیا۔ محمد علی
اور انگریزی فوج ترچناپلی میں بری طرح سے گھری پڑی تھی۔ نوجوان کلائیو نے
سانڈرس کو ایک تدبیر سمجھائی تاکہ ترچناپلی کے محاصرے کی طرف سے چندا صاحب
کی توجہ کچھ ہٹ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ترچناپلی کے محاصرے میں چندا صاحب
اور اس کے فرانسیسی حامیوں کو حسب دلخواہ کامیابی ہو گئی تو انگریزوں کی کرناٹک
میں کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ کلائیو کی تجویز یہ تھی کہ فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں
انگریزوں کی جتنی سپاہ موجود تھی اس سے ارکاٹ پر پیشقدمی کر دی جائے۔ اس
فوج کے آٹھ افسروں میں سے چھ ایسے تھے جنھوں نے اب تک کسی جنگ میں
حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف تین توپیں تھیں۔ اس ساز و سامان کے
ساتھ کلائیو نے ۲۶ اگست ۱۷۵۱ء کو مدراس سے کوچ کیا اور ۳۱ دسمبر ۱۷۵۱ء
ارکاٹ کے قریب دس میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالدیا۔ راستے میں اپنے نوسکھ
سپاہیوں کو قواعد پریڈ بھی سکھاتا گیا تاکہ معرکے میں کام آئے۔ ارکاٹ کے قلعے
میں اگرچہ فوج کی تعداد کافی تھی لیکن اس کی کیفیت بے قاعدہ فوج کی سی تھی۔
کلائیو کے وہاں پہنچنے سے قلعے میں ایسی بدحواسی پیدا ہوئی کہ فوج قلعہ
چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئی۔ یہ حال دیکھ کر کلائیو نے بلا کسی مزاحمت کے ارکاٹ
کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور قلعہ بند ہو کر اپنی چھوٹی سی فوج کی حفاظت کی تدابیر میں

مشغول ہو گیا ۔ اس کا اصلی مقصد تو حاصل ہو گیا ۔ ارکاٹ کے فتح ہو جانے کی خبر جب چندا صاحب کو ہوئی تو اسنے وہی کیا جو کلائیو کے پیش نظر تھا ۔ اس نے ترچنا پلی کا محاصرہ کرنے والی فوج میں سے چار ہزار سپاہ اپنے بیٹے رضا صاحب کے تحت ارکاٹ روانہ کر دی ۔ کلائیو کو ارکاٹ کے قلعہ میں کافی سامان جنگ و رسد مل گیا تھا ۔ اس کو پورا بھروسہ تھا کہ چندا صاحب کی فوج اس کو قلعے سے بے دخل نہیں کر سکے گی ۔ رضا صاحب نے ارکاٹ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا ۔ کئی دن تک دونوں طرف سے گولہ باری جاری رہی ۔ اس اثنا میں سانڈرس نے کلائیو کو مزید کمک روانہ کر دی ۔ مرہٹی راؤ حاکم گوٹی نے بھی جسے اب انگریزوں نے محمد علی کی مدد پر آمادہ کر لیا تھا کلائیو کو وقت پر مدد بھیجدی ۔ اس کمک کو دیکھکر رضا صاحب ہمت ہار گیا ۔ اور پریشانی کے عالم میں قلعہ ارکاٹ کا محاصرہ اٹھا لینے کا حکم دے دیا ۔ کلائیو کی اس حیرت انگیز کامیابی نے کرناٹک کی سیاست کا پانسہ پلٹ دیا ۔

کلائیو نے ارکاٹ کے قلعے میں اپنے ایک افسر کرک پیٹرک کو چھوڑا اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پہنچکر ترچنا پلی کی مہم کی کوئی تدبیر کرے ۔ اب لارنس بھی انگلستان سے واپس آ چکا تھا ۔ سانڈرس نے کلائیو کو لارنس کی سرکردگی میں ترچنا پلی کی محاصرہ کرنے والی فوج پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا ۔ ڈیو پلے کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے لا کو جو ترچنا پلی کا محاصرہ کرنے والی فرانسیسی فوج کا اعلیٰ افسر تھا لکھا کہ لارنس اور کلائیو کے تحت سانڈرس نے جو کمک روانہ کی ہے اس سے راستہ ہی میں مقابلہ کیا جائے بیشتر اس کے کہ وہ ترچنا پلی پہنچے ۔ اس غرض کے لیے ڈیو پلے نے پانڈی چری سے تازہ دم سپاہ کی کمک بھیج دی ۔ چنانچہ لا اور چندا صاحب نے ترچنا پلی سے ۲۰ میل آگے توپ خانہ اور سپاہ روانہ کر دی ۔ لیکن لارنس اور کلائیو راستہ کترا کر دوسرے راستے سے مع اپنے ساز و سامان کے ترچنا پلی سے دس میل پر پہنچ گئے ۔ یہ جگہ دریائے کولیرون اور کاویری کے درمیان واقع تھی جو جزیرہ سیرنگم کہلاتا تھا ۔ یہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی ۔ دونوں طرف سے توپ خانوں نے آگ برسانی شروع کر دی ۔ لارنس نے کلائیو کو اس ڈویژن کا کمانڈر مقرر کر دیا جو پانڈی چری کی طرف سے آنے والی

فرانسیسی فوج کو راستے میں روکنے کے لیے روانہ کی گئی تھی۔ کلائیو نے اپنے رسل و رسایل کو لارنس کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے فرانسیسیوں کی فوج کا مقابلہ کیا جو دوتینی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی۔ اس موقع پر بھی کلائیو نے اسی طرح جوانمردی اور اولوالعزمی سے کام لیا جس طرح اس نے ارکاٹ میں کام لیا تھا۔ اس نے لا کے راستے کو گھیر لیا تاکہ دوتینی کے ساتھ جو فوج آرہی تھی وہ اس سے نہ مل سکے۔ دوتینی کی فوج نے جب آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اس نے بڑھنے نہ دیا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح لا نے جب دوتینی کی فوج سے ملنے کی کوشش کی تو نتیجے میں کلائیو اور اس کی سپاہ کو پایا۔ کلائیو کی اس تدبیر جنگ سے لا بیحد پریشان ہوا اور مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔ چندا صاحب کے متعلق لا نے راجا تنجور سے یہ طے کر لیا کہ وہ اس کو کاریکال حفاظت سے پہنچا دینے کا ذمہ لیتا ہے۔ اس وقت راجا تنجور انگریزوں کے ساتھ تھا۔ اس نے لا کو یقین دلایا کہ اگر فوراً چندا صاحب کو اسکے حوالے کر دیا گیا تو وہ اس کو اس طور پر کاریکال بھجوا دے گا کہ انگریزوں کو خبر تک نہ ہوگی۔ چنانچہ لا نے اس کی بات پر اعتبار کر کے چندا صاحب کو راجا کے حوالے کر دیا اور اس نے اس کو پرانی دشمنی کے بدلے میں قتل کرا دیا۔ غرضکہ اس طرح انگریزی فوج نے اپنے دوست اور حلیف محمد علی کو ترچناپلی کے محاصرے سے نکالا اور محمد علی کی نوابی کا اعلان کر دیا۔

باوجود اس سخت ناکامی کے جو ترچناپلی کے محاصرے میں ڈوپلے کو اٹھانی پڑی وہ اپنے منصوبوں سے باز نہ آیا۔ جون ۱۷۵۲ء میں کرناٹک کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ محمد علی کی نوابی عام طور پر تسلیم کر لی گئی تھی اور انگریزوں نے اپنے حریف فرانسیسیوں کو کلائیو کی حوصلہ مندی کی اور تدبر کی بدولت نیچا دکھا دیا تھا۔ لیکن ڈوپلے اپنے جوڑ توڑ اور ساز باز میں برابر مصروف رہا۔ اس نے مرارئی راؤ اور حاکم گوٹی کو نہ معلوم کیا سبز باغ دکھا کر اپنا طرفدار کر لیا اور چندا صاحب کے بیٹے رضا صاحب کو محمد علی کے مقابلہ میں کرناٹک کی نوابی کے لیے پیش کر دیا۔ ڈوپلے نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ چونکہ صوبہ دار دکن نے اس کو دریائے کرشنا

کے جنوب کے تمام علاقوں کا نواب مقرر کیا ہے اس لیے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کرناٹک کا انتظام اپنے صوابدید کے مطابق چلے کرے۔ سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ اس نے اپنی فوجی تیاری بھی بڑے زور شور سے جاری رکھی تاکہ کوئی مناسب موقع آنے پر پھر انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ وہ جس موقع کی تاک میں تھا وہ بہت جلد آپہنچا۔ انگریزوں کو اپنی کامیابی پر کچھ ایسا بھروسہ سا ہوگیا کہ انھوں نے ترچناپلی میں بہت کم فوج رکھی۔ چنانچہ اس کی اطلاع پاتے ہی ڈوپلے نے مراری راؤ کی مدد سے ۱۷۵۳ء کے شروع میں دوبارہ ترچناپلی کا محاصرہ کرلیا۔ اس دفعہ فرانسیسی فوج کا کمانڈر مین ویل تھا جس کے ساتھ ڈوپلے نے بہت کافی جنگی ساز و سامان کر دیا تھا۔ راستے میں فرانسیسیوں نے کڈلور کے قریب تروادی کے مقام پر محمد علی کی فوج کو پسپا کر دیا جس کے سبب سے ان کی ہمت بڑھ گئی۔ ترچناپلی پر مین ویل نے بڑی بے جگری سے نومبر ۱۷۵۳ء میں حملہ کیا اور قلعے کی بیرونی فصیل توڑ دی۔ قلعہ کے اندر لارنس تھوڑی سی انگریزی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے باوجود فصیل میں رخنہ پڑ جانے کے فرانسیسیوں کو اندر نہیں گھسنے دیا۔ مین ویل نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن لارنس کی قابل رہبری میں حصاری فوج نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اب ڈوپلے کو باوجود اپنی حوصلہ مندی کے احساس ہوا کہ انگریزوں کو نیچا دکھانا آسان نہیں۔ چنانچہ ترچناپلی کا محاصرہ جاری رکھتے ہوئے اسنے گورنر مدراس سانڈرس سے گفت و شنید شروع کر دی اور مصالحت کے لیے آمادگی کا اظہار کیا۔ ادھر فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظماء ڈوپلے کی ناکامیوں کے باعث اس کے خلاف ہوگئی تھی اور اس کی حکمت عملی کو ہندوستان میں فرانسیسی تجارت کے زوال کا اصلی سبب قرار دیا تھا۔ گفت و شنید کے لیے دونوں طرف سے کمشنر مقرر کیے گئے اور ولندیزی مقبوضہ سدرس میں جنوری ۱۷۵۴ء میں دونوں طرف سے کمشنر جمع ہوگئے۔ لیکن چونکہ خیالات و تصورات میں بنیادی اختلاف تھا اس واسطے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہ تھا۔ انگریزوں کا اصرار تھا کہ گفت و شنید شروع کرنے سے قبل یہ بات

اصولاً مان لی جائے کہ محمد علی کرناٹک کا جایز نواب ہے اور فرانسیسیوں کا اصرار تھا کہ اصولاً یہ تسلیم کیا جائے کہ صلابت جنگ دکن کی صوبہ دار ہیں اور انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کرناٹک میں اپنی صوابدید سے جو چاہیں سیاسی انتظام کریں۔ اس ضمن میں ان سندوں کو پیش کیا گیا جو صلابت جنگ نے فرانسیسیوں کو عطا کی تھیں اور جن میں دوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب کا نواب تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو کے لیے جو ابتدائی شرطیں پیش کی تھیں وہ طرفین کے لئے قابل قبول نہ تھیں۔

غرض کہ مدراس کی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ادھر ترچناپلی میں نہ تو محمد علی اور انگریزوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ باہر نکل کر فرانسیسیوں کا مقابلہ کریں اور انھیں مار بھگائیں اور نہ فرانسیسیوں میں اتنی سکت تھی کہ وہ دھاوا کر کے قلعہ پر قبضہ کرسکیں۔ ان حالات میں فرانس سے پانڈیچری یہ اطلاع پہنچی کہ کمپنی نے اپنے ایک ناظم موسیو گودیو کو روانہ کردیا ہے تاکہ وہ ہندوستان پہنچ کر انگریزوں سے فوراً مصالحت کرلے اور فرانسیسی کمپنی کے تجارتی زوال وپستی کے متعلق تحقیقات کرے۔ گودیو کو سربمہر ایک حکمنامہ دیا گیا تھا جس میں مندرج تھا کہ اگر دوپلے اس کی اطاعت سے انکار کرے تو اس کو گرفتار کر کے فرانس واپس بھیج دیا جائے۔ گودیو اگست ۱۷۵۴ء میں پانڈیچری پہنچا اس کے حکم سے تین ول کو ترچناپلی کا محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ دوپلے کو فرانس واپس کردیا گیا۔ کمپنی اس کی مقروض تھی لیکن گودیو نے اس قرض کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ دوپلے کو صرف فرانس جانے کے لیے سفرخرچ دیا گیا۔ دلدادر کی دس ہزار پونڈ سالانہ کی شخصی آمدنی کو گودیو نے دوپلے کے لیے تسلیم کیا۔ دوپلے کا کمپنی پر جو قرض واجب الادا تھا اسے سب باقی تصور کیا گیا۔ لیکن کمپنی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس پورے معاملے پر غور کر کے آخری تصفیہ کردے اور اگر مناسب سمجھے تو دوپلے کو کچھ دے دلا دے۔

اس زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح تھی۔

اس لیے دونوں ملکوں کی تجارتی کمپنیاں چاہتی تھیں کہ ان کے کارندے ہندوستان میں امن و صلح سے رہیں۔ گودیو کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان پہنچنے کے بعد فوراً انگریزوں سے مصالحت کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان پہنچتے ہی گورنر مدراس سانڈرس سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر دیا اور جنوری ۱۷۵۵ء میں معاہدہ پانڈی چری پر دستخط ہوئے جس کی رو سے دونوں قوموں کے نمایندوں نے اقرار کیا کہ آیندہ وہ ہندوستانی والیان ملک کے آپس کے جھگڑوں میں دخل نہ دیں گے اور اگر والیان ملک کی طرف سے انھیں خطاب یا عہدے دیے جائیں گے تو وہ قبول نہیں کریں گے۔ لیکن بسی نے دربار دکن میں جو حقوق حاصل کر لیے ہیں انھیں یوں ہی رکھا جائے گا۔ اسی طرح دیوی کوٹہ پر انگریزوں کا اور کاریکال پر فرانسیسیوں کا قبضہ حسب سابق تسلیم کیا جائے گا۔ طرفین کے دوسرے مقبوضات بھی اس معاہدے میں تسلیم کیے گئے۔ چنانچہ انگریزوں کے پاس اس وقت ایک لاکھ پونڈ سالانہ آمدنی کے اور فرانسیسیوں کے پاس آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ آمدنی کے علاقے تھے جن کی اس معاہدہ میں ضمانت کر دی گئی۔ فرانسیسیوں نے انگریزوں کو شمالی سرکار میں مسولی پٹم دینے کا وعدہ کیا اس واسطے کہ پہلے سے وہاں انگریزوں کی تجارت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔

ڈوپلے نے بعد میں اپنی صفائی پیش کرنے کے سلسلے میں گودیو پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے معاہدہ پانڈی چری کے ذریعہ فرانسیسی قوم کے مفاد اور وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور اس نے انگریزوں سے اس وقت دب کر مصالحت کی جب کہ کرناٹک کی سیاسی صورت حال فرانسیسیوں کے موافق تھی۔ مالسن کا خیال ہے کہ اگر گودیو نے ڈوپلے کے مشورے پر عمل کیا ہوتا اور انگریزوں سے دب کر مصالحت کرنے کے بجائے ان کے خلاف جنگ جاری رکھی ہوتی تو فرانسیسی قوم اس وقت ایسی گئی گزری حالت میں نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ گودیو نے بڑی غلطی کی کہ ڈوپلے کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا جو اس نے کئی سال کی محنت کے بعد بنائے تھے اور جن کے روبہ عمل لانے سے

فرانسیسی قوم کی کامیابی اور ترقی لازمی تھی (۱)۔ کلتروجیسے محتاط مورخ کا یہی خیال ہے (۲) لیکن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں تھا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ فرانسیسی فوج کو کئی ماہ سے تنخواہ تک نہیں ملی تھی اور اس میں سرکشی اور نافرمانی کے جذبات پرورش پا رہے تھے جس کے مظاہرے بھی برابر ہوتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں فرانسیسیوں کے لئے جنگ کا جاری رکھنا نفع بخش نہیں ہو سکتا تھا۔ خود گودیو کے ساتھ جو تازہ دم فوج فرانس سے بھیجی گئی تھی وہ بالکل غیر تربیت یافتہ اور ناتجربہ کار تھی جس کے متعلق ڈیوپلے نے یہ غلط رائے قائم کی کہ اگر اس کو ترچناپلی کے محاصرہ میں لگا دیا جاتا تو فرانسیسیوں کی کامیابی یقینی تھی۔ خود پانڈی چری کونسل کی کچھ بعد کی روداد سے پتا چلتا ہے کہ ڈیوپلے کے ماسوا اکثر ارکان کونسل صلح کو جنگ پر ترجیح دیتے تھے اس واسطے کہ کمپنی کا خزانہ خالی تھا۔ چنانچہ کونسل نے مجلس نظماء کو اس ضمن میں جو مراسلہ لکھا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کے مقابلے میں کرناٹک میں اپنی حیثیت اتنی مضبوط کر لی ہے کہ اگر ہم ان سے صلح کرنا چاہیں گے تو وہ مشکل ہی سے آمادہ ہوں گے اس واسطے کہ صلح نہ کرنے ہی میں ان کا زیادہ فائدہ ہے (۳)۔ پھر کمپنی کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک انگریزوں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن ڈیوپلے کو اپنی کامیابی کا ایسا زعم تھا کہ وہ کسی دوسرے کی رائے کو سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اور چونکہ اس کی شخصیت ایسی زبردست اور حاوی تھی کہ کسی کو صاف طور پر اس سے اختلاف کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود رائے تھا اور اسے اپنے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنی ناکامی کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ گودیو کی مصالحت پسندانہ حکمت عملی کے باعث فرانسیسیوں کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ

۱۔ History of French in India, p. 224.

۲۔ Dupleix, ses idees.sapolitique et sa chute, p. 335.

۳۔ Memoire a consulter pour Le Sieur Godeheu 1760, p. 85, 86

اپنی فوج کی تنظیم عمل میں لائیں اور شمالی سرکار میں ان کی جو حیثیت تسلیم کرلی گئی تھی اور وہاں کے محاصل وصول کرنے کا جو اختیار حاصل ہو گیا تھا اس سے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ لیکن انھیں یہ مہلت زیادہ نہ ملی اس واسطے کہ جنگ ہفت سالہ شروع ہو گئی جس میں انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے پھر حریف بن گئے معاہدۂ پانڈی چری کا نفاذ دونوں کمپنیوں کی توثیق پر منحصر ٹھہرایا گیا تھا لیکن پیشتر اس کے کہ توثیق کی نوبت آتی ۱۷۵۶ء میں یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے چھڑ جانے کے باعث ہندوستان میں بھی دونوں قوموں میں اعلان جنگ ہو گیا۔

دیوپلے کے فرانس روانہ ہو جانے کے بعد گودیو نے دے لرت کو پانڈی چری کا گورنر مقرر کر دیا اور خود فرانس روانہ ہو گیا۔ دے لرت کو جب جنگ ہفت سالہ کے شروع ہونے کی اطلاع کئی ماہ بعد وصول ہوئی تو اس نے فرانسیسی فوج ترچناپلی پر حملہ کرنے کے لیے بھیجدی۔ لیکن انگریزوں نے اس کو شکست دے کر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد فرانسیسیوں اور انگریزوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس اثنا میں حکومت فرانس نے کونت دے لالی کو ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کی حفاظت کے لیئے وسیع اختیارات دے کر بھیج دیا۔ وہ اپریل ۱۷۵۸ء میں پانڈی چری پہنچا۔ اس زمانے میں انگریزی فوج کا بیشتر حصہ کلائیو کے تحت تھا اور کرناٹک میں فرانسیسیوں کا پلہ بھاری تھا۔ لیکن کلائیو نے بنگال میں انگریزی قوم کے لیے جو غلبہ حاصل کر لیا تھا اس سے کرناٹک کی جنگ میں بڑی مدد ملی اور بالآخر انگریزوں نے فرانسیسیوں کو وہاں بھی نیچا دکھا دیا۔

کونت دے لالی اگرچہ بہادر اور تجربہ کار افسر تھا لیکن بلا کا تند مزاج، خود رائے اور جلد باز تھا۔ اس نے شروع میں اگرچہ بعض جگہ انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی لیکن بہت جلد وہ اس کے ماتحت افسر اس سے بگڑ گئے

ہوئے اور پانڈی چری کونسل بھی اس کے خلاف ہو گئی۔ چنانچہ آپس کے ان اختلافات کے باعث بجائے اس کے کہ کونت دے لالی کو اپنے ہم قوموں سے مدد ملتی الٹی اس کی مخالفت ہونے لگی۔ لالی نے کڈلور، فورٹ سینٹ ڈیوڈ اور دیوی کوٹہ پر انگریزی فوجوں کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ اس کی ان ابتدائی کامیابیوں سے کرناٹک میں معلوم ہوتا تھا کہ پھر سے شاید فرانسیسیوں کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ مدراس کے گورنر پگٹ نے کلائیو سے مدد طلب کی اور اس کو شمالی سرکار پر حملہ کرنے کی دعوت دی تاکہ فرانسیسیوں کی توجہ کچھ بٹ جائے۔ لالی اپنی کامیابی کے نشہ میں سرشار مدراس پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا۔ لیکن گورنر نے رت اور پانڈی چری کونسل اس کے منصوبہ کے خلاف تھی۔ انھوں نے اس مہم کے اخراجات کی پابجائی سے انکار کر دیا۔ پھر بیڑے کے افسر اعلیٰ موسیو داکے بھی مدراس پر حملہ کرنے کے خلاف تھا اس نے لالی کو صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اس میں اس کے ساتھ تعاون عمل نہیں کروں گا۔ چنانچہ لالی نے مجبور ہو کر مدراس کے حملہ کا ارادہ فسخ کر دیا اور تنجور کی طرف پیش قدمی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث اس کو بہت جلد پانڈی چری لوٹ آنا پڑا۔

اسی اثناء میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑہ میں متعدد بحری لڑائیاں ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی لڑائی بھی فیصلہ کن نہیں ثابت ہوئی۔ فرانسیسی بیڑہ کے افسر اعلیٰ موسیو داکے نے کچھ ان اختلافات کی وجہ سے جو اس کے اور لالی کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ انگریزی بیڑہ کے مقابلہ میں اس کو کامیابی کی امید بہت کم تھی ماریشس جانے کا ارادہ کر لیا۔ پانڈی چری کے گورنر نے رت اور کونت دے لالی نے اس کے اس ارادے سے اختلاف کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی اور کہا کہ میں تمھارے تحت نہیں ہوں بلکہ فرانس کی بحری وزارت کے ماتحت ہوں اس لئے مجھے حق ہے کہ اپنے صوابدید پر جو چاہوں فیصلہ کروں چنانچہ وہ ماریشس روانہ ہو گیا۔ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر انگریزی بیڑہ پوری

طرح سے حاوی ہو گیا اور سمندر کے راستے سے بنگال سے کرناٹک ہر قسم کی مدد پہنچنے میں کوئی چیز حارج نہیں رہی۔

لالی نے ایک بڑی زبردست غلطی یہ کی کہ دکن سے موسیو بسی کو اور شمالی سرکار سے موسیو مورا کین کو کرناٹک بلا لیا اور انہیں حکم بھیج دیا کہ اپنے ساتھ جتنی بھی فرانسیسی فوج لا سکتے ہیں فوراً لے آئیں، اس واسطے کہ کرناٹک ہی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان آخری فیصلہ ہوگا۔ لیکن لالی یہ بھول گیا کہ انگریزوں نے کرناٹک سے کہیں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ دولت مند علاقوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا جن کی بمبئی اور فورٹ سینٹ ولیم (کلکتہ) کی کوٹھیاں مدراس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیوپار کرتی تھیں اور ان کی سیاسی اہمیت بھی کسی طرح کرناٹک سے کم نہ تھی۔ لالی نے اگرچہ ارکاٹ پر قبضہ کر کے چندا صاحب کے لڑکے رضا صاحب کو نواب کرناٹک بنا دیا تھا لیکن وہ جس بنیاد پر اپنی تعمیر کھڑی کر رہا تھا وہ بودی تھی جیسی ارکاٹ میں لالی سے آ کر مل گیا۔ شمالی سرکار کی فرانسیسی فوج بھی کرناٹک آ گئی۔ لیکن لالی کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اور اس کی سپاہ میں قدرتی طور پر بددلی پھیل رہی تھی۔ لالی اور بسی میں شروع ہی سے اختلافات شروع ہو گئے اور ان دونوں میں تعاون عمل ناممکن ہو گیا۔ لالی کو پانڈی چری کونسل سے جیسی مالی امداد ملنی چاہیے تھی وہ نہ ملی۔ غرضکہ لالی کے معاملات بگڑنا شروع ہوئے اور بالآخر ایسے بگڑے کہ سنبھالے نہ سنبھلے۔

شمالی سرکار میں میدان خالی دیکھ کر وزیاگرم کے راجہ انند راج نے فرانسیسی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور کلائیو کو مدد کے لئے لکھا اور اپیل کی کہ اگر اس وقت بنگال سے مدد آ گئی تو سب کچھ ممکن ہے لیکن اگر تاخیر کی گئی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ادھر مدراس کے گورنر پگٹ نے کلائیو کو بار بار شمالی سرکار پر حملہ کرنے کے لئے لکھا۔ چنانچہ کلائیو نے باوجود فورٹ سینٹ ولیم (کلکتہ) کی کونسل کے اختلاف کے جو پلاسی کی لڑائی کے بعد جنگ کی مزید ذمہ داری اپنے اوپر لینے سے ہچکچاتی تھی کرنل فورڈ کی سرکردگی میں سمندر کے

راستے سے دسمبر ۱۷۵۸ء میں شمالی سرکار پر حملہ کرنے کے لیے فوج روانہ کر دی۔ اپریل ۱۷۵۹ء میں فورڈ نے مسولی پٹم پر گولے برسائے اور اپنی فوج اتار دی۔ کنڈور کے مقام پر بچی کھچی فرانسیسی فوج کو کرنل فورڈ نے شکست دی۔ فرانسیسی کمانڈر کونفلان فرار ہو گیا۔ انگریزی فوج نے ہرچند اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ فورڈ نے اس کے راہ فرار اختیار کرنے کے متعلق کلائیو کو اس طرح اپنے خط میں لکھا ہے۔ "وہ (کونفلان) ارادہ کر چکا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ ہاتھ نہیں آئے گا سوائے کسی شکاری کتے کے۔ جس شب کورن پڑا تھا اسی شب اس نے راجمندری میں جا کر ناشتہ کیا جو مقام جنگ سے کم از کم پچاس میل فاصلہ پر ہے" لیکن ہتھیار ڈالنے سے قبل کونفلان نے صوبیدار دکن صلابت جنگ کو لکھا تھا کہ راجہ وزیانگرم کے خلاف وہ کمک لے کر مسولی پٹم جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کریں۔ صلابت جنگ جب مسولی پٹم سے ۱۵ میل پر پہنچے تھے کہ انھیں کنڈور میں فرانسیسی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور مسولی پٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کی اطلاع ملی اور مجبوراً انہوں نے کرنل فورڈ سے مصالحت کی گفت و شنید شروع کر دی۔ کنڈور کی فتح انگریزوں کی زبردست کامیابی تھی جس کی بدولت فرانسیسیوں کے ہاتھ سے شمالی سرکار ہمیشہ کے لیے نکل گیا اور صلابت جنگ کو ان پر جو غیر معمولی اعتماد تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ صلابت جنگ نے کرنل فورڈ سے معاہدہ کر لیا۔ جس کی رو سے انھوں نے فرانسیسی فوج کو اپنے ہاں برطرف کرنے اور مسولی پٹم کا بندرگاہ اور شمالی سرکار کے علاقے جو لمبائی میں سمندر کے کنارے ۸۰ میل اور چوڑائی میں کم و بیش تیس میل ہے لے کر سو میل تک انگریزوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کر لیا اس علاقے کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپے تھی صلابت جنگ نے شمالی سرکار میں انگریزوں کے وہی حقوق تسلیم کئے جو فرانسیسیوں کو حاصل تھے (۱) جب کلائیو نے ۱۷۶۵ء میں بادشاہ شاہ عالم سے بنگال بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی حاصل کی تو شمالی

Orme Vol I P 336 and Vol, II P. 398 ؎۱

سرکار پر انگریزی قبضے کی توثیق بھی حاصل کر لی۔

اس طرح شمالی سرکار ہمیشہ کے لیے فرانسیسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بسی کے دکن سے کرناٹک جانے سے فرانسیسی مفاد کو مطلق کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس واسطے کہ لالی اور بسی میں شروع ہی سے اختلافات شروع ہو گئے۔ بسی چاہتا تھا کہ سیاست کاری اور تدبر سے فرانسیسی اثر کو ہندوستان میں قائم کرے۔ برخلاف اس کے لالی اندھا دھند طور پر انگریزوں سے نبرد آزما ہو کر ان کے سب مقبوضات پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا تاکہ فرانسیسی اقتدار کے لیے ہندوستان میں راستہ صاف ہو جائے۔ وہ سیاست کاری کے طریقوں کو ذلیل سمجھتا تھا جو ایک سپاہی منش آدمی کے لیے نازیبا ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ سیاست کاری کے میدان میں فرانسیسی انگریزوں کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکیں گے۔ اگر انھیں شکست دی جا سکتی ہے اور ہندوستان سے بے دخل کیا جا سکتا ہے تو صرف تلوار کے ذریعے۔ لالی اور بسی کے اصول اور ان کے مزاج ایسے مختلف تھے کہ ان میں تعاون عمل ہونا کسی صورت میں ممکن نہ تھا جس کی وجہ سے فرانسیسی مفاد کو اس ملک میں سخت نقصان پہنچا۔ لالی نے اپنے اصول عمل کا اظہار ایک خط میں کیا ہے جو اس نے بسی کو ۱۳ جون ۱۷۵۸ء کو لکھا تھا۔ "بادشاہ اور کمپنی نے مجھے ہندوستان اس واسطے بھیجا ہے کہ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک سے بیدخل کر دوں ... مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ فلاں نواب اور فلاں راجہ اپنے حق کے لیے جھگڑ رہے ہیں (۱)۔

کرنل فورڈ نے کندور کے مقام پر فرانسیسیوں کو جو شکست دی اس سے صرف چند روز قبل لالی نے دسمبر ۱۷۵۸ء میں مدراس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ یہ محاصرہ تقریباً تین ماہ تک جاری رہا لیکن اس کو کامیابی

۱۔ Lawrence's account of the War in India, p. 213

نہیں ہوئی۔ پانڈی چری سے رسد بالکل نہیں پہنچ رہی تھی۔ جب سپاہ میں بد دلی پھیلنے لگی تو لالی نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس نے محاصرہ اس واسطے بھی اٹھا لیا کہ انگریزی بیڑہ مدراس کی محاصرہ شدہ انگریزی فوج کی مدد کو عین وقت پر پہنچ گیا۔ فرانسیسی بیڑہ ماریشیس جا چکا تھا اس لیے سمندر میں انگریز پوری طرح حاوی تھے۔ انگریزی بیڑہ کے مدراس پہنچ جانے سے لالی بالکل ناامید ہوگیا اور پانڈی چری جانے کا حکم دیدیا۔ مدراس کی مدافعت لارنس اور گورنر پگٹ نے بڑی قابلیت اور خوش تدبیری سے کی۔ ادھر شمالی سرکار میں کلائیو کی بروقت امداد اور کامیابی سے جو صورت حال پیدا ہوگئی وہ فرانسیسیوں کے لیے حد درجہ حوصلہ شکن تھی۔

آیندہ دو سال میں لالی نے کرناٹک میں انگریزوں سے جو لڑائیاں لڑیں ان میں پہلا سا وہ جوش اور ولولہ نہ تھا بلکہ ان کی نوعیت بڑی حد تک مدافعانہ تھی۔ اس کو خود اپنے اوپر اور اپنے وسایل پر اعتماد باقی نہیں رہا تھا جو شروع شروع میں ہندوستان کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے اس میں موجود تھا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی مخالفت اور سپاہ کی نافرمانی سے تنگ آ گیا تھا۔ فرانس سے بھی اس کو کسی قسم کی فوجی یا مالی امداد نہیں پہنچی اور نہ آئندہ اس کی توقع تھی۔ وندیواش کے مقام پر جنوری ۱۷۶۰ء میں سر آیر کوٹ نے لالی کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں بسی کو انگریزی فوج نے گرفتار کرلیا اور فرانسیسیوں کا بہت نقصان ہوا۔ اس کامیابی کے بعد سر آیر کوٹ نے چیت پیٹ اور ارکاٹ پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ لالی پانڈی چری میں جا کر قلعہ بند ہوگیا۔ انگریزی فوج نے جنجی پر قبضہ کر کے پانڈی چری کے رسد کے تمام راستوں کو بند کر دیا۔ لالی نے بڑی بہادری سے کئی مہینے تک مقابلہ کیا لیکن بالآخر جنوری ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے پانڈی چری فتح کرلیا اور لالی کو گرفتار کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے اس سے یہ قول لے کر کہ وہ آیندہ انگریزی قوم کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گا رہا کر دیا اور وہ فرانس واپس چلا گیا۔

حکومت فرانس نے اس پر غداری کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا اور اور اس کو سزائے موت دے دی گئی۔ انگریزوں نے پانڈی چری کے قلعے اور تمام مدافعتی اہمیت کے مقامات کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ شہر پانڈی چری کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ ۱۷۶۳ء میں جب معاہدہ پیرس ہوا اور جنگ ہفت سالہ ختم ہوئی تو فرانس کو اس کے جنوبی ہند کے سب مقبوضات واپس کردیے گئے۔ لیکن شمالی سرکار پر انگریزی اقتدار تسلیم کرلیا گیا۔ فرانسیسی مقبوضات کے سب قلعے مسمار کردئے گئے اور فوج کی تعداد مقرر کردی گئی جو فرانسیسی حکومت ساحل کارومنڈل پر اپنے مختلف مقبوضات میں رکھ سکتی تھی۔ معاہدۂ پیرس کی وجہ سے صلابت جنگ کو دکن کا صوبہ دار اور محمد علی کو کرناٹک کا نواب تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن معاہدہ پیرس پر دستخط ہونے سے پہلے ہی نواب نظام علی خان دکن کے دروبست کے مالک ہو چکے تھے اور صلابت جنگ کو انھوں نے نظر بند کردیا تھا۔ دربار دکن میں فرانسیسی اثر کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے ہوگیا۔ آئندہ اہل فرانس کی طرف سے صوبہ دار دکن کے دربار میں اثر قائم کرنے کی جو کوششیں ہوئیں وہ کمزور اور بے نتیجہ رہیں۔ جنگ ہفت سالہ کے بعد ہندوستان میں فرانس کے سیاسی منصوبے تقریباً ختم ہوگئے۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی نے آئندہ ہندوستان میں سوائے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے دوسرے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ لیکن فرانسیسی کمپنی کی تجارت انگریزی کمپنی کی تجارت کے مقابلے میں ہمیشہ ہیٹی رہی۔

انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی ناکامی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ڈوپلے کو شروع شروع میں اپنے سیاسی منصوبوں میں کامیابی ہوئی اور حکومت فرانس نے اس کی فتوحات کے صلہ میں اس کو مارکوئس کا خطاب عطا کیا لیکن بعد میں اس کی سیاست کاری فرانسیسی قوم کے لیے عذاب جان بن گئی۔ باوجود شمالی سرکار پر فرانسیسی قبضہ ہو جانے کے فرانسیسیوں کی مالی

حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ان کی تجارت جو پہلے ہی سے انگریزی کمپنی کے مقابلے میں کم تھی کرناٹک کی متواتر لڑائیوں کے باعث بالکل بیٹھ گئی۔ ایک ہمعصر مورخ کے بیان کے بموجب ۱۷۳۶ء سے ۱۷۵۶ء کے بیس سال کے عرصے میں ہندوستان سے ایک کروڑ چودہ لاکھ پچاس ہزار پونڈ کا مال فرانس گیا۔ برخلاف اس کے اسی عرصے میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے ۴ کروڑ بارہ لاکھ پونڈ کا مال انگلستان گیا (۱)

اگرچہ دوپلے کو فرانسیسی کمپنی کی مالی حالت کی خرابی کا احساس نہ تھا لیکن بسی کو اس کا اچھی طرح احساس تھا جیسا کہ اس نے ایک موقع پر کہا تھا "فتوحات اور جنگی کامیابیوں میں بھی تجارتی کمپنی اپنا حساب اور تخمینہ لگاتی رہتی ہے۔ یہ فتوحات یقیناً ناپسندیدہ ہیں اگر ان کی بدولت اخراجات آمدنی سے زیادہ ہوجائیں اور پیداوار صرف کے برابر ہو" (۲) انگریزوں نے اس اصول پر عمل کیا جس کی نسبت بسی نے اشارہ کیا تھا۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی حالت قابل اطمینان تھی۔ جنگ کے زمانے میں بھی اس کی تجارت برابر جاری رہتی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت انگلستان آڑے وقت میں ہمیشہ کمپنی کا ساتھ اور قرض دیتی رہتی تھی۔ دوپلے مالیات کے انتظام میں کوئی خاص قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی فضول خرچی کے سبب سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی فوج کو ماہ بماہ تنخواہ نہیں ادا کر سکتا تھا۔ پھر اس نے کمپنی کی مالی حالت کو نظماء سے چھپانے کی کوشش کی اور انہیں برابر یہ باور کرایا کہ فرانسیسی تجارت کی ترقی ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پانڈیچری اور نظماء میں بے اعتمادی بڑھتی گئی جس کی بناء پر بالآخر نظماء نے گودیو کو ہندوستان بھیجا۔ لیکن یہ اس وقت کیا گیا جب کہ حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ اگر جنگ ہفت سالہ فوراً نہ شروع

(1) Reports of the House of Common, Vol. IV,

(2) *Memoire pour le Sieur de Bussy*. p. 28

ہو جاتی تو ممکن تھا کہ فرانسیسی اپنی حالت ہندوستان میں سنبھال لیتے لیکن ان کو ایسا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ پھر انگریزوں نے جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر جو سیاسی غلبہ حاصل کر لیا تھا اس سے انھیں بڑا فائدہ پہنچا اور وہ اس قابل ہوئے کہ بنگال کے وسایل کو اپنے حریف کے خلاف کرناٹک میں استعمال کریں۔ چنانچہ کرنل فورڈ اور سر آئرکوٹ نے بنگال کے خزانوں کو فرانسیسیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے دریغ صرف کیا اگر بنگال سے اس وقت مدد نہ پہنچ جاتی تو انگریزوں کے کرناٹک کے وسایل اتنے نہ تھے کہ ان سے وہ فرانسیسیوں کو نیچا دکھا سکتے۔ فرانسیسیوں نے اپنی تمام تر توجہ جنوبی ہند کی جانب مبذول رکھی اس لیے ان کے وسایل انگریزوں کے مقابلے میں بہت محدود رہے۔

انگریزوں کی بحری قوت بھی فرانسیسیوں کی بحری قوت کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر تھی۔ چنانچہ سمندر کے راستے سے بنگال سے کرناٹک اور شمالی سرکار کو انھوں نے مدد بھیجی اور فرانسیسی انھیں ایسا کرنے سے اس واسطے نہ روک سکے کہ ان کی بحری قوت مقابلے میں تھی ہی نہیں۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے معاملات میں بڑی حد تک آزاد تھی۔ برخلاف اس کے فرانسیسی تجارتی کمپنی کے معاملات میں حکومت کو بہت دخل حاصل تھا جس کی وجہ سے اس کی تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی حکومت فرانس فرانسیسی کمپنی کے معاملات میں دخل اندازی کرتی رہتی تھی لیکن آڑے وقت میں جیسی مدد کرنی چاہیے ویسی مدد نہیں کرتی تھی۔ ان اسباب کے علاوہ یہ سبب بھی قابل لحاظ ہے کہ انگریزی افسروں میں آپس میں اتحاد اور یک جہتی پائی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی ان میں آپس کے رشک سے اختلاف پیدا ہو جاتا تھا لیکن وہ ایک معین حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا اور ڈسپلن کی حدود کا احترام کبھی پس پشت نہ ڈالا جاتا تھا۔ مثلاً جب لارنس نے ترچنا پلی کے محاصرہ والی مہم میں کلائیو کو لا کے خلاف فوج کے ایک حصہ کا

کمانڈر مقرر کر دیا تھا تو بعض پرانے افسروں کو یہ ناگوار گزرا تھا لیکن یہ معاملہ بہت جلد رفع دفع ہو گیا اور کلائیو کی قابلیت اور جرات سے مخالفوں کے منہ خود بخود بند ہو گئے۔ برخلاف اس کے فرانسیسی افسر ایک دوسرے سے بغض رکھتے تھے اور افسروں اور ماتحتوں میں جیسا چاہئے ویسا تعاون عمل موجود نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے قومی مفاد کو سخت نقصان پہنچا۔ پھر ان سب سے بڑھ کر انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی قوم کو اپنے ہم قوموں سے جو ہندوستان میں اس کی سیادت قائم کرنا چاہتے تھے کوئی حقیقی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ ان کے مقاصد کو شبہہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ فرانس اس زمانے میں اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہاں ایک زبردست انقلاب کا مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا جس نے نہ صرف اہل فرانس بلکہ اہل یورپ کی زندگی کے ہر شعبے کی کایا پلٹ دی۔ اس کے برخلاف انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقاصد سے ہمدردی تھی اور وہ اس کے کارناموں کو اپنی قومی زندگی کے لیے قابل فخر تصور کرتی تھی۔ پھر فرانسیسی حکومت عرصے سے یورپ کی اندرونی جنگوں کی لپیٹ میں آتی رہی جس کے باعث اس کو انگریزی حکومت کی طرح اس کا موقع نہیں ملا کہ نوآبادکاری کے منصوبوں کو بروئے کار لائے اور سمندر پار اپنی سلطنت کی توسیع کرے۔ غرض کہ ان سب اسباب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں فرانسیسی انگریزوں کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی یہ ایک بوالعجبی ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر یوروپین اقتدار قائم کرنے اور اپنی حکومت کے ڈول ڈالنے کا منصوبہ ایک فرانسیسی (ڈوپلے) نے سوچا اور اسے ایک انگریز (کلائیو) نے عملی جامہ پہنایا۔

چوتھا باب

بنگال میں انگریزی حکومت کا قیام

سلطنت مغلیہ کی کمزوری کے زمانے میں علی وردی خاں نے جو بہار کا عامل تھا، بنگال پر قبضہ و تصرف حاصل کرلیا تھا۔ اس نے ۱۷۴۱ء سے ۱۷۵۶ء تک بنگال پر عدل و اعتدال کے ساتھ حکومت کی اور رعایا کے مختلف طبقوں کا اپنی حکمت عملی اور خوش انتظامی سے اعتماد حاصل کیا۔ اس زمانے میں بنگال پر مرہٹوں کے حملے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ علی وردی خاں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا لیکن بعد میں مجبور ہوکر اس نے اوڑیسہ ان کے حوالہ کردیا اور بنگال کی آمدنی پر بھی چوتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس نے انگریزوں، فرانسیسیوں اور ڈچ لوگوں سے جن کی تجارتی کوٹھیاں بنگال میں عرصے سے قائم تھیں، دوستانہ تعلقات قائم کیے تاکہ ان کی تجارت سے ملک کی مرفہ الحالی کو بڑھائے۔ وہ چاہتا تھا کہ جہاں تک ہوسکے یوروپین اقوام سے کسی طرح بگاڑ نہ ہو۔ جب اس کے بعض مشیروں نے اس سے کہا کہ یوروپین تاجروں کو بنگال سے نکال باہر

کرنا چاہیے ۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ خشکی پر جب آگ لگتی ہے تو اس کو
بجھانا دشوار ہوتا ہے لیکن اگر سمندر میں آگ لگے تو اسے کیسے بجھایا جا سکتا
ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس کے اس جواب سے اس بے بسی کا اظہار
ہوتا ہے جو دیسی والیانِ ملک یوروپین فاتحوں کے مقابلے میں اس وقت
محسوس کرنے لگے تھے اس واسطے کہ اہل مغرب کے سائنٹفک طریق
فکر و عمل کے سامنے وہ ہار مان چکے تھے ۔

علی وردی خاں کا جب ۱۷۵۶ء میں انتقال ہوا تو اس کی جگہ
اس کا نواسہ سراج الدولہ تخت و تاج کا مالک ہوا ۔ سراج الدولہ کو
شروع ہی سے انگریزوں سے حد درجہ نفرت تھی اس لیے کہ اس کو
شبہہ تھا کہ وہ اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو جس کا علی وردی خاں کے
خاندان سے تعلق تھا، بنگال کا نواب بنانا چاہتے تھے ۔ اس کے
علاوہ کلکتہ (فورٹ ولیم) کے گورنر نے ایک شخص مسمی کشن داس کو پناہ دی
تھی جو ڈھاکہ کا رہنے والا اور سراج الدولہ کے سخت مخالفوں میں سے تھا
اور سیٹھ ساہوکاروں پر اس کا بڑا اثر تھا ۔ سراج الدولہ کو جب اس کا
علم ہوا تو اس نے فورٹ ولیم کے گورنر کو لکھا کہ کشن داس کو اس کے حوالہ کر دیا
جائے لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا اس واسطے کہ کشن داس اور دوسرے
سیٹھ ساہوکاروں سے تجارت کے سلسلے میں انگریزوں کے پہلے سے
تعلقات چلے آتے تھے ۔ جو شخص سراج الدولہ کا خطاوار ہوتا تھا اس
کے ساتھ کلکتہ میں نازیبا برتاؤ کیا گیا ۔ پھر سراج الدولہ کو یہ بھی شکایت
تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بغیر محصول ادا کرنے کے تجارت کا جو حق دیا گیا
تھا اسے بیجا استعمال کیا جا رہا تھا اور کمپنی کے ملازم اپنی نجی تجارت میں
محصول سے بچنے کے لیے کمپنی کی دستک یا اجازت نامہ کو بلا تکلف استعمال
کرتے رہتے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نواب کی حکومت کمپنی کے ملازموں سے
جو تجارت کرتے تھے محصول نہیں وصول کر سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ
سراج الدولہ کو عام احساس تھا کہ جس طرح کرناٹک اور دکن میں اہل

یورپ حاوی ہو گئے ہیں اسی طرح بنگال کا بھی حشر ہو گا اگر ابھی سے ان کی قوت کا توڑ نہ کیا گیا۔ اور چونکہ بنگال میں انگریز دوسرے اہل یورپ کے مقابلے میں قوی تھے اس لیے ضرورت تھی کہ انھیں نیچا دکھایا جائے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار تھا۔ اسی اثنا میں سراج الدولہ کو اطلاع ملی کہ فورٹ ولیم کی فصیلیں درست کی جا رہی ہیں اور قلعہ میں مزید تعمیر کا کام بھی جاری ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تعمیر کا کام فوراً بند کر دیا جائے اس لیے کہ انگریزوں کو اپنے مقبوضات کی قلعہ بندی کا حق حاصل نہیں۔ فورٹ ولیم کے گورنر نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ استحکامات اس خطرہ کی بنا پر کیے جا رہے ہیں کہ کہیں عنقریب یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی نہ چھڑ جائے۔ چنانچہ انگلستان سے حال میں آئے ہوئے تمام خطوط میں اس خطرہ کا اظہار کیا گیا ہے اور ابھی سے تیاری کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور چونکہ پچھلی جنگ میں فرانسیسیوں نے مدراس پر قبضہ کر لیا تھا جو سلطنت مغلیہ کی حدود میں تھا اور جہاں انگریزوں کو توقع تھی کہ فرانسیسی سلطنت مغلیہ کی غیر جانبداری کا خیال رکھیں گے، اسی طرح ممکن ہے کہ اب لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں چندر نگر کی فرانسیسی فوج فورٹ ولیم پر قابض ہو جائے۔ چنانچہ اس خطرہ کے مد نظر دریا کے رخ پر توپیں مستحکم طور پر جمائی جا رہی ہیں۔(۱)

اس جواب پر سراج الدولہ بہت برافروختہ ہوا اور قاسم بازار کی انگریزی کوٹھی پر قبضہ کر لیا جو اس کے مستقر مرشدآباد کے قریب واقع تھی۔ یہاں سے اس نے ۵۰ ہزار فوج کا رخ فورٹ ولیم کی طرف پھیر دیا۔ اس وقت فورٹ ولیم میں ۲۶۴ باقاعدہ گورا سپاہ تھی۔ اس کے علاوہ ۵۱۴ باقی دوسری فوج تھی جو شہریوں میں سے بھرتی کی گئی تھی جن میں

(۱) Orme: History of the Military Transactions of the British Nation in Indostan, Vol. II, p. 56.

سے ۱۷۰ یوروپین تھے۔ قلعہ کی عام حالت کمزور تھی اور توپیں بے استعمالی کی وجہ سے بری حالت میں تھیں۔ کرناٹک میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی جنگ کی وجہ سے بنگال کو کچھ عرصہ قبل جو انگریزی سپاہ بھیجی جانے والی تھی وہ سب کی سب کرناٹک میں روک لی گئی تھی۔ اس کے بعد جب جنگ ختم ہو چکی تو بھی اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی کہ بنگال میں اس کی اہمیت کے مد نظر انگریزی سپاہ کی تعداد بڑھائی جائے۔ چنانچہ سراج الدولہ کے حملہ کے وقت فورٹ ولیم میں جو فوج تھی وہ بالکل ناکافی تھی۔ ڈریک نے جو اس وقت فورٹ ولیم کا گورنر تھا پہلے تو پوری کوشش کی کہ کسی طرح سے آئی بلا ٹل جائے چنانچہ اس نے کئی روز سراج الدولہ سے گفت و شنید کرنے میں صرف کئے اور اس کو یقین دلانا چاہا کہ اس کے احکام کی تعمیل کی جائے گی۔ اور اسی دوران میں مدراس اور بمبئی کی کوٹھیوں کو خطوط بھیجے کہ فوراً امداد روانہ کرو۔ سراج الدولہ سمجھ گیا کہ کمک کے انتظار میں گفت و شنید کو طول دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چنانچہ اس نے کلکتہ (فورٹ ولیم) کا محاصرہ کرلیا۔ ڈریک اور دوسرے انگریز جہازوں کے ذریعے سے جو قلعہ کے قریب دریائے ہگلی میں لنگر انداز تھے بھاگ نکلے۔ جو باقی بچے انھوں نے ہالول کی سرکردگی میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں گرفتار کرلیا گیا۔

قاسم بازار پر سراج الدولہ کے قبضے کی خبر پہلی مرتبہ ۱۴ جولائی ۱۷۵۶ء کو مدراس پہنچی۔ چنانچہ ۲۰ جولائی کو کلپٹرک کی ماتحتی میں سمندر کے راستے سے ۲۳۰ سپاہ کمک کے لیے روانہ کی گئی جو ۲ اگست ۱۷۵۶ء کو فلتا پہنچی جہاں ڈریک اور دوسرے کلکتے سے بھاگے ہوئے انگریز پناہ گزین تھے۔ لیکن جب فورٹ ولیم پر سراج الدولہ کے قبضہ کی اطلاع پہنچی تو مدراس کے انگریزوں کو بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کس کی سرکردگی میں فوج بھیجنی چاہئے۔ شاہی فوج کا ایک افسر کرنل اڈلرکرون کا دعویٰ تھا کہ چونکہ وہ ملازمت اور رتبہ میں ان سب افسروں سے برتر ہے جو اس وقت مدراس میں موجود تھے اس لیے اس کے سربراہی میں بنگال کی مہم

روانہ ہونی چاہئے۔ اس نے اپنی شرائط حکومت مدراس کے سامنے پیش کیں جنھیں منظور نہیں کیا گیا۔ اس وقت امیر البحر واٹسن اور کلائیو بمبئی سے مدراس آچکے تھے:

کلائیو کو ۱۷۵۵ء میں مجلس نظماء نے فوجی دستوں کے ساتھ اس غرض سے ہندوستان بھیجا تھا کہ وہ بمبئی جا کر مرہٹوں کی مدد سے بسی کے خلاف دکن میں فوج کشی کرے۔ لیکن جب وہ بمبئی پہنچا تو انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہو چکی تھی۔ چنانچہ دکن پر فوج کشی کی تجویز ملتوی کرنی پڑی۔ امیر البحر واٹسن بھی مع اپنے بیڑے کے بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز تھا۔ حکومت بمبئی نے واٹسن اور کلائیو کی موجودگی سے بحری قزاق انگریا کا زور توڑنے کے لیے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ واٹسن اور کلائیو نے اس کے مستقر گیریا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح ہندوستان کے مغربی ساحل پر انگریزی تجارتی جہازوں کو کوئی کھٹکا باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد واٹسن اور کلائیو مدراس روانہ ہو گئے۔ کلائیو کو مجلس نظماء نے فورٹ سینٹ ڈیوڈ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ حکومت مدراس بھی اس زمانے میں یہ سوچ رہی تھی کہ صلابت جنگ کی مدد کے لیے انگریزی فوج بھیجے اس واسطے کہ صلابت جنگ نے بسی سے ناچاقی کے باعث خود مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مدراس کونسل کا خیال ہوا کہ کلائیو کی سرکردگی میں دکن فوج بھیجی جائے۔ لیکن جب بنگال سے تشویش ناک خبریں پہنچیں تو رابرٹ اورم کے اصرار پر جو مدراس کونسل کا رکن تھا اور جس نے اس زمانہ کے حالات اپنی مشہور اور مستند "ہسٹری آف دی ملٹری ٹرانزاکشنس آف دی برٹش نیشن ان ہندوستان" میں لکھے ہیں، مدراس کونسل نے دکن کی مہم کا منصوبہ ترک کر دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو بنگال کو کمک بھیجنی چاہئے۔ کونسل نے واٹسن اور کلائیو کو یہ کام سپرد کیا اور ۹۰۰ گورا سپاہ اور پندرہ سو ہندوستانی فوج ان کے ساتھ کی۔

کلائیو اور امیر البحر واٹسن ۱۵ دسمبر ۱۷۵۶ء کو ہگلی میں داخل ہوئے

سراج الدولہ کے سپہ سالار نے بج بج کے قلعے پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قلعے پر کلائیو نے قبضہ کر لیا۔ یہاں سے کلائیو فورٹ ولیم کی طرف بڑھا۔ یہاں سراج الدولہ کا ایک افسر مقابلہ پر آیا لیکن اس کو بہت جلد یہ قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ اب پھر دوبارہ فورٹ ولیم کی فصیلوں پر انگریزی پرچم لہلہانے لگا۔ نواب سراج الدولہ جو مرشد آباد میں تھا یہ خبر سن کر بہت مشتعل ہوا۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ فرانسیسیوں سے کچھ مدد ملے لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ فورٹ ولیم پر چڑھائی کر دی۔ کلائیو کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنی فوج لے کر فورٹ ولیم سے باہر نکل آیا تاکہ مقابلہ کرے۔ پیشتر اس کے کہ نواب کی فوج حملہ آور ہو کلائیو نے سورج نکلنے سے پہلے جب کہ ذرا اندھیرا تھا چھاپہ مارا۔ سورج نکلنے کے بعد بھی دیر تک کہر چھائی ہوئی تھی۔ اسی کہر میں کلائیو کی توپوں نے نواب کی فوج میں کھلبلی ڈال دی۔ خود نواب کے ہوش خطا ہو گئے اور اس نے گھبرا کر صلح کی تحریک کر دی۔ چنانچہ ۹ فروری ۱۷۵۷ء کلائیو اور سراج الدولہ میں یہ معاہدہ ہوا کہ کمپنی کے تمام بنگالی مقبوضات واپس کر دئے جائیں گے۔ فورٹ ولیم پر استحکامات تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے گی اور انگریز اپنی ٹکسال قائم کرنے کے مجاز ہوں گے۔ غرض کہ ان شرائط پر کلائیو پہلا معرکہ جیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ عنقریب پھر انگریزوں کو سراج الدولہ سے لڑنا پڑے گا اس لیے وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ چونکہ اس زمانہ میں بنگال میں فرانسیسیوں اور ڈچ لوگوں کی کوٹھیاں موجود تھیں جن میں کافی تعداد میں سپاہ رہتی تھی اس لیے کلائیو نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ عارضی طور پر سراج الدولہ سے صلح و صفائی ہو جائے۔

چندر نگر کی فتح

اس معرکہ کے کچھ دنوں بعد ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں میں یورپ میں جنگ شروع ہو گئی جو تاریخ میں جنگ ہفت سالہ کے نام سے مشہور رہے۔ کلائیو کو اندیشہ ہوا کہ

کہیں نواب سراج الدولہ فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر پھر کلکتہ پر حملہ نہ کردے۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ اس کی نوبت آئے کلائیو نے خود چندر نگر پر حملہ کرنے میں پیش قدمی کردی جہاں سات سو فرانسیسی فوج تھی اور ہندوستانی فوج اس کے علاوہ تھی جس کو فرانسیسی افسروں نے مغربی طریق جنگ اور قواعد پریڈ سکھائی تھی۔ اگر سراج الدولہ کے لکھنے کے مطابق بسی شمالی سرکار سے بنگال کی طرف آجاتا اور پانڈیچیری سے فرانسیسی لوگوں کو کمک پہنچ جاتی تو انگریزوں کے لیے بنگال میں بڑی دشواری پیش آجاتی۔ پھر نواب سراج الدولہ اور کلائیو میں جو معرکہ ہوا اس سے اول الذکر کی قوت میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہ اس کے کس بل میں کوئی فرق آیا تھا۔ لیکن چونکہ پانڈیچیری سے ابھی حال میں بسی کو دکن میں کمک بھیجی جاچکی تھی اس لئے فرانسیسی حکومت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ بنگال کو کافی تعداد میں سپاہ بھیجی جاسکتی۔ پھر کرناٹک میں فرانسیسی مفاد کی حفاظت کے لیے فوج رکھنا ضروری تھا۔ غرض کہ واٹسن نے دریا کے راستے سے چندر نگر پر بڑے زور کی گولہ باری کی اور کلائیو نے خشکی کے راستے سے حملہ کردیا۔ فرانسیسیوں نے نو دن تک جم کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر انھیں ہار ماننی پڑی اس واسطے کہ زیادہ عرصے تک مدافعت ممکن نہ تھی۔ انھوں نے باعزت شرائط پر چندر نگر کو مارچ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اکثر فرانسیسی افسروں نے بھاگ کر مرشدآباد میں پناہ لی جہاں ژان لا پہلے سے فرانسیسی حکومت کے ایجنٹ کی حیثیت سے موجود تھا اور اس کا دربار کے معاملات میں اچھا خاصہ اثر تھا۔

سراج الدولہ نے شروع میں کلائیو کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چندر نگر پر حملہ کرے گا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں وہ اپنے وعدے سے پلٹ گیا اور اس نے بسی کو بنگال آنے کی دعوت دی اور مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ بات یہ تھی کہ سراج الدولہ اس وقت انگریزوں سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا اس واسطے کہ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے (جنوری ۱۷۵۷ء میں) دہلی پر حملہ کرکے مغلیہ سلطنت کو خوب لوٹا تھا۔ سراج الدولہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ادھر ہوتا ہوا بنگال

کا رخ نہ کرے۔ ایسی حالت میں سراج الدولہ انگریزوں سے دوستی اور اتحاد قایم رکھنا چاہتا تھا تاکہ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی صورت میں اسے ان کی مدد حاصل ہو سکے۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد سراج الدولہ کو کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس کی حکمت عملی فوراً بدل گئی۔ اب پھر وہ انگریزوں کو نیچا دکھانے کے منصوبے سوچنے لگا۔ لیکن بُسی کو بنگال بلانے اور فرانسیسیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی جو تدبیریں اس نے کیں وہ الٹی پڑیں۔ ان میں کوئی بھی کامیاب اور کارگر نہ ہوسکی۔

چندر نگر کی فتح سے انگریزوں کی دھاک سارے بنگال میں بیٹھ گئی۔ لڑائی کے زمانے میں بنگال سے جہازوں پر لد لد کر بے شمار غلہ اور دوسرا سامان بوربن اور ماریشش کے جزیروں کو بھیجا جاتا تھا چندر نگر کی تسخیر کے بعد فرانسیسیوں کے لیے بنگال کے وسائل ختم ہو گئے چنانچہ بعد میں فرانسیسیوں کو اپنے مختلف مقبوضات میں سامان غذا کی قلت بہت محسوس ہوئی جس کی فراہمی میں انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اگرچہ انگریزوں نے چندر نگر پر قبضہ کر لیا تھا جو بنگال میں فرانسیسیوں کا بڑا زبردست مرکز تھا اور نواب سراج الدولہ سے انھوں نے معاہدہ کیا تھا اس سے بظاہر ان کا اثر بنگال میں مستحکم ہو چلا تھا لیکن پھر بھی انھیں اب تک اپنے اوپر پورا اعتماد نہ تھا۔ وہ نواب سراج الدولہ سے برابر خائف رہتے تھے۔ مرشدآباد کے سیٹھ ساہوکاروں سے تجارت کے سلسلے میں پہلے سے ان کے تعلقات تھے۔ ان ساہوکاروں اور کمپنی کے ملازموں میں نفع اندوزی کے لیے سانٹھا گانٹھا خوب چلتا تھا۔ بعض ساہوکاروں کو نواب سراج الدولہ سے محصولات کی وصولی کے ضمن میں کچھ شکایت پیدا ہو گئی۔ کلائیو نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک دولت مند تاجر امی چند نامی کے توسط سے ساہوکاروں اور کلائیو میں سراج الدولہ کے خلاف سازباز شروع ہوا۔ اسی اثناء میں
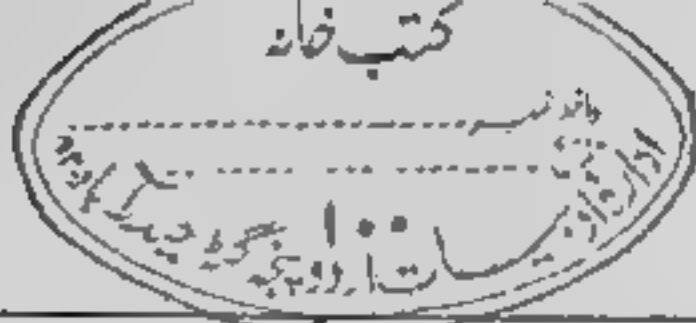
نواب کی بدمزاجی کی وجہ سے دربار کے بعض امرا اور افسر بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ میر جعفر جو نواب علی وردی خاں کا برادر نسبتی اور نواب سراج الدولہ کی فوج کا بخشی تھا، نواب سے ناراض ہو گیا۔ کلائیو نے سیٹھ ساہوکاروں کو چھوڑ کر امی چند کے ذریعے سے اس سے گفت و شنید شروع کر دی۔ چنانچہ دونوں میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ انگریز سراج الدولہ کو نوابی سے برطرف کر کے میر جعفر کو بنگال کا نواب تسلیم کریں گے جس کے معاوضے میں میر جعفر انھیں ایک کروڑ تیرہ لاکھ روپئے نقد ادا کرے گا۔(1) اور اس کے علاوہ انگریز افسروں کو انعام و اکرام دئے جائیں گے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو قاسم بازار اور ڈھاکہ کی کوٹھیوں میں قلعہ بندی کی اجازت ہوگی۔ ۱۷۱۷ء کے شاہی فرمان کے بموجب انگریزوں کو بنگال میں جو تجارتی حقوق و مراعات حاصل ہوئی ہیں وہ برقرار رہیں گی۔ کلکتہ کے حدود میں برطانوی اقتدار تسلیم کیا جائے گا اور اس کے قریب چوبیس پرگنہ بطور جاگیر کمپنی کو دئے جائیں گے جن کی آمدنی سے فوجی اخراجات کی پابجائی کی جائے گی۔ نواب کے مستقر میں ایک انگریز ایجنٹ رہا کرے گا۔ نواب ان فرانسیسیوں کو جو مرشد آباد یا بنگال میں کہیں اور پناہ گزیں ہوں اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دے گا تاکہ ان کی موجودگی سے معاملات میں آئندہ پیچیدگی نہ پیدا ہو۔ میر جعفر نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ انگریز سراج الدولہ سے نبرد آزما ہوں گے تو وہ عین لڑائی کے وقت مع فوج کے ان سے مل جائے گا۔

امی چند کو اگرچہ کلائیو نے ابتدائی گفت و شنید میں شریک کیا تھا لیکن بعد میں اس کے رقمی مطالبات کی وجہ سے اس سے بے تعلقی اختیار کر لی گئی۔ مندرجہ بالا معاہدہ کی بھنک کہیں سے اس کے کان میں

(1) Ormes Vol. II, P. 188.

میں پڑی تو وہ بہت چراغ پا ہوا۔ اس نے کلائیو کو دھمکی دی کہ میں نواب سراج الدولہ کے سامنے بھانڈا پھوڑے دیتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور اس کا خمیازہ ان سبھوں کو بھگتنا پڑے گا جو اس خفیہ معاہدہ میں شریک ہیں۔ اس نے اس شرط پر خاموش رہنا منظور کیا کہ اس کو تیس لاکھ روپئے نقد دئے جائیں اور میر جعفر کے نواب ہونے کے بعد کمپنی کو اس سے جو کچھ روپیہ ملے اس کی پانچ فی صدی دستوری دی جائے۔[1] کلائیو ان شرائط کو سن کر بہت سٹپٹایا — اس نے ایک جعلی دستاویز تیار کی جس میں وہ سب شرائط درج تھیں جن کا مطالبہ امی چند نے کیا تھا اور وہ دستاویز اس کو دکھا کر اطمینان دلا دیا گیا۔ مگر اصلی دستاویز میں جس پر معاہدہ کرنے والوں نے اپنی مہریں ثبت کی تھیں ان شرائط کا کہیں ذکر بھی نہیں تھا۔ کلائیو نے اپنا فوری مقصد حاصل کرنے کے لیے جو پُر فریب طریق عمل اختیار کیا وہ ہمیشہ اس کے نام پر ایک بدنما دھبہ رہے گا۔ اس کی یہ حرکت کسی لحاظ سے بھی حق بجانب نہیں کہی جا سکتی۔ اگرچہ بعض انگریز مورخین یہ کہکر اس اخلاقی جرم کی سنگینی کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ "کلائیو اور اس کے ساتھی اس ضمن میں اس مثال پر عمل کر رہے تھے جو ڈوپلے اور بُسی نے ان کے سامنے پیش کی تھی۔ ان کی نیت خراب نہ تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اور بہت کچھ زیادہ حاصل کر سکتے تھے۔ انھوں نے وہی کیا جو ان کا کوئی اور ہم عصر ان حالات میں کرتا۔ اس لیے ہماری تنقید بجائے افراد کے اس زمانہ پر ہو تو مناسب ہے"[2] لیکن باوجود اس کے یہ کہنا پڑے گا کہ برائی چاہے وہ کسی زمانے میں کی گئی ہو بہر حال برائی ہے اور اخلاقی حیثیت سے اسے کبھی بھی حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ کلائیو اپنی

(1) Malcolm: Memoirs of Lord Clive. Vol.III. P.140

(2) *Dodwell. cambridge History of India Vol. V. P.151*

دانستہ میں اس حرکت کو درست سمجھتا تھا۔ چنانچہ بعد میں وہ کہا کرتا تھا کہ اگر پھر کبھی ایسا موقع آئے گا تو میں اسی طرح عمل کروں گا کیونکہ بدمعاملہ لوگوں کے ساتھ بدمعاملگی ہی سے کام چل سکتا ہے۔ بعض مخصوص حالات میں ناجائز چیز جائز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلائیو کا معیار اخلاق پست تھا اور اس کے نزدیک اس میں آئنا لوچ تھا کہ حسب موقع اس کے ذریعے سے اپنا مطلب حاصل کیا جا سکتا تھا۔

جنگ پلاسی جون ۱۷۵۷ء

غرض کہ میر جعفر سے خفیہ معاہدہ طے ہو جانے کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ کو یاد دہانی کی کہ کمپنی سے فروری ۱۷۵۷ء میں اس نے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب وعدہ کیا تھا کہ فرانسیسیوں سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ لیکن اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ کمپنی کے پاس اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ اس نے موسیو بُسی سے مدد حاصل کرنے لیے خط و کتابت کی ہے۔ سراج الدولہ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ کلائیو نے ساڑھے تین ہزار سپاہ اور دس توپوں کے ساتھ شمال کی جانب کوچ کر دیا اور پلاسی کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا جو مرشد آباد سے ۲۰ میل پر تھا۔ نواب سراج الدولہ کی فوج نے جس کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی میدان کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ نواب کی فوج کے بڑے حصے کی کمان میر جعفر کے تحت تھی جو لڑائی میں تماشہ بین کی حیثیت سے شریک رہا۔ نواب کی فوج نے جب حملہ کیا تو انگریزی توپ خانے نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس حملہ میں نواب کے سپہ سالار میر مدن کے کاری زخم لگا اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس سے نواب کی فوج میں بد دلی پھیل گئی۔ اس لڑائی میں فرانسیسی دستوں نے خوب جم کر انگریزی فوج کا مقابلہ کیا لیکن آخر میں ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ میر جعفر عین لڑائی کے وقت مع فوج کے اس حصے کے جو اس کے تحت تھا کلائیو سے آ کر

مل گیا۔ اگرچہ بعض انگریز مورخوں کا خیال ہے کہ وہ اس وقت آکر ملا جب کہ انگریز بالکل حاوی ہو چکے تھے۔ بہرحال اصلیت کچھ بھی ہو میر جعفر کے ملنے سے سراج الدولہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ خود سراج الدولہ مرشد آباد بھاگا اور وہاں سے بہار کی طرف نکل جانا چاہتا تھا لیکن میر جعفر کے بیٹے میرن نے اس کو گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔

پلاسی کے معرکہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کلائیو میر جعفر کے ساتھ مرشد آباد گیا اور اس کو گدی نشین کیا۔ نواب سراج الدولہ کے خزانہ کا جب جائزہ لیا گیا تو اس میں صرف ۲۵ لاکھ روپیہ نکلا حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ مقیم قاسم بازار نے اس کے متعلق جو اپنا اندازہ پیش کیا تھا وہ $2\frac{1}{2}$ کروڑ روپے کے لگ بھگ تھا۔ معاہدہ میں جو رقم طے ہوئی تھی اسے پورا ادا کرنے اور انگریز افسروں کو انعام واکرام عطا کرنے کے لیے خزانہ میں رقم کافی نہ تھی۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ میر جعفر یہ رقم باقساط ادا کرے گا۔ امی چند کو کلائیو نے جو رقم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے امی چند کی دماغی حالت متاثر ہو گئی اس لیے کہ اس کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔

جنگ پلاسی کے بعد اگرچہ میر جعفر برائے نام بنگال پر حکمران تھا لیکن حقیقی حکومت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ میر جعفر کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں جنھیں کلائیو نے انگریزی فوج کے ذریعے فرو کیا اور اس کی بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنے کا ذمہ لیا۔ اب بنگال میں صرف انگریزوں کی فوج موجود تھی جو اندرونی امن کے قیام اور بیرونی حملہ کی صورت میں مقابلہ پر آسکتی تھی۔ کلائیو اب تک حکومت مدراس کا ملازم تھا لیکن ۱۷۵۸ء میں مجلس نظماء نے اس کو فورٹ ولیم کا گورنر مقرر کر دیا۔ یہ زمانہ تقریباً وہی ہے جب فرانسیسی حکومت نے لالی کو کرناٹک روانہ کیا تھا۔ کلائیو نے میر جعفر کو اپنے قابو میں رکھا اور جب اس نے پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر سے خط وکتابت کرنے کی کوشش کی تو اس کو

ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

شہزادہ علی گوہر کا بہار پر حملہ

عالمگیر ثانی کا بیٹا شہزادہ علی گوہر جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے نام سے مشہور ہوا، اور وزیر غازی الدین سے تنگ آ کر دہلی سے نکل کھڑا ہوا، پہلے کچھ دنوں روہیلکھنڈ کے روہیلہ سرداروں کے پاس رہا۔ اس کے بعد اس نے پورب کا رخ کیا۔ اس کو اطلاع تھی کہ بہار اور بنگال میں بڑی گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ شہزادہ نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ اس کے باپ نے بہار اور بنگال کے صوبے اس کے حوالے کر دئے ہیں[1]۔ اس زمانے میں میر جعفر کی بد انتظامی سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پلاسی کی فتح کے بعد کوئی معقول نظم و نسق اب تک قایم نہیں کیا تھا۔ بقول سیر المتاخرین اب لوگ میر جعفر کے ظلم اور کنجوسی سے پریشان ہو کر سراج الدولہ کے زمانے کو حسرت سے یاد کرتے تھے[2]۔ غرضکہ شہزادہ علی گوہر کے ساتھ بہار کے اکثر زمیندار مل گئے۔ نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ نے بھی اسے مدد دی۔ شہزادہ (۴۰) ہزار فوج لے کر پٹنہ کے قریب پہنچ گیا۔ بہار میں میر جعفر کی طرف سے رام نرائن صوبیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ پہلے تو شہزادہ سے مل گیا لیکن بعد میں الگ ہو گیا۔ اس نے کلائیو کے پہنچنے تک پٹنہ کو بچائے رکھا۔

میر جعفر کو جب یہ سب ماجرا معلوم ہوا تو اس نے کلائیو کو لکھا کہ جیسے بھی ہو پٹنہ کو بچاؤ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔ اگرچہ کلائیو اپنی فوج کا نصف حصہ کرنل فورڈ کی ماتحتی میں شمالی سرکار روانہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی اس کی حوصلہ مندی میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوچ پر کوچ کرتا ہوا پٹنہ

---

[1] Mill: History of India Vol. III, P 254

[2] سیر المتاخرین، ص ۲۴۵

پہنچ گیا۔ میر جعفر کا لڑکا میرن بھی اس کے ہمراہ تھا۔ شہزادہ علی گوہر کے حوصلے پست ہو گئے اور بغیر مقابلہ کئے اس نے راہ فرار اختیار کی۔ کلائیو نے اس کا پیچھا کر کے اس کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ نے اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور وعدہ کیا کہ اب وہ بہار اور بنگال کی طرف آئندہ کبھی رخ نہ کرے گا۔ اکبر و عالمگیر کے اس جانشین کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ سب ساتھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اس کے پاس خرچ کے پیسے بھی کچھ نہ تھا۔ چنانچہ کلائیو نے اس کو ۵ ہزار روپے بطور علیہ دئے اور اس نے اپنی راہ لی۔

چنسورہ کی لڑائی ۱۷۵۹ء

کلائیو نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ بنگال میں ایسے شخص کو نواب مقرر کیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مرضی کا تابع فرمان تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی دوسری یورپین قوتوں کو بنگال میں ختم کر دیا۔ چنسورہ میں ولندیزوں (ڈچ) کی کوٹھی عرصے سے موجود تھی اور ان کی تجارت کی حالت بھی اچھی خاصی تھی۔ جاوا کے ولندیزی گورنر کو جب بنگال کے حالات کی اطلاع ہوئی تو اس کو سخت ناگوار ہوا کہ جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے پورے بنگال کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے۔ کچھ دنوں بعد میر جعفر کو بھی انگریزوں کا اقتدار ناگوار ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے ولندیزی لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکایا تاکہ ان میں آپس میں جھگڑا شروع ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے کھوئے اقتدار کو بنگال میں حاصل کر سکے۔ لیکن یہ ایک موہوم امید تھی جو کبھی پوری نہ ہوئی۔ جاوا کے ولندیزی گورنر نے خیال کیا کہ اس وقت بنگال میں گڑبڑ مچی ہوئی ہے اور ابھی تک حالات نے کوئی معین صورت نہیں اختیار کی ہے چلو اس وقت ہم بھی قسمت آزمائی کریں۔ ولندیزیوں کو کلائیو سے یہ بھی شکایت تھی کہ اس نے ان کی شورہ کی تجارت کو بذریعہ حکم بند کر دیا تھا جو فرانسیسیوں کے ساتھ تھی اس لیے کہ شورہ جنگی ضروریات میں کام آتا ہے۔ اسی طرح

ان کی افیون اور کپڑے کی تجارت کو بھی انگریزوں نے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ چنسورہ کے ولندیزیوں نے جاوا۔ کو لکھا اور امداد طلب کی۔ وہاں کے گورنر نے میر جعفر کی مدد کے بہانے سے بیڑہ روانہ کیا۔ اگرچہ بظاہر اس نے میر جعفر کو انگریزوں کے اثر سے آزاد کرنے کے لیے لیکن حقیقت میں خود اپنی قوم کے منصوبوں کو ترقی دینے کے لیے سات جہازوں کا ایک بیڑا چنسورہ بھیج دیا جس کے ساتھ سو یوروپین اور آٹھ سو قواعد دان ملایا کے دیسی سپاہی تھے۔ لیکن چنسورہ میں ولندیزیوں کا جو اعلیٰ افسر تھا اس میں ہمت اور قوت فیصلہ کی کمی تھی۔ پیشتر اس کے کہ جاوا سے بیڑہ چنسورہ پہنچے کلائیو نے پیشقدمی کر کے ہگلی ہی میں اس کو روک دیا۔ کموڈور ولسن نے کلائیو کے حکم سے تمام جہازوں کو گرفتار کر لیا۔ کلائیو نے کرنل فورڈ کو حکم دیا کہ خشکی پر ولندیزیوں کی فوجوں پر حملہ کر دے۔ کرنل فورڈ کو ولندیزوں پر حملہ کرنے میں ذرا تامل تھا اس واسطے کہ یورپ میں انگریزوں سے ان کے دوستانہ تعلقات قایم تھے۔ چنانچہ اس نے کلائیو سے تحریری حکم طلب کیا۔ جب فورڈ کا خط کلائیو کو پہنچا تو وہ اس وقت بعض احباب کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ چنانچہ کرنل فورڈ نے خط کی پشت پر پنسل سے اس نے یہ الفاظ لکھدیئے "ان سے فوری جنگ کرو۔ میں تمھارے پاس کونسل کا تحریری حکم کل بھیجدوں گا"۔ غرضکہ ولندیزوں کو شکست دے کر کرنل فورڈ نے ان کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ ولندیزوں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور کلائیو کی تمام شرطوں کو مان لیا جن میں اہم شرطیں یہ تھیں کہ وہ بنگال میں ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج رکھنے کے مجاز نہوں گے اور انگریزوں کو دس لاکھ روپیہ بطور ہرجانہ ادا کریں گے۔ چنسورہ کی کوٹھی ولندیزوں کو واپس کر دی گئی۔ اس طرح فرانسیسیوں اور ولندیزوں دونوں کو کلائیو نے نیچا دکھایا۔ اب آئندہ تین سال تک اس کو کوئی ایسا خطرہ بنگال میں پیش نہ آیا جس سے برطانوی اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بنگال کی آب و ہوا سے کلائیو کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ فروری ۱۷۶۰ء میں انگلستان چلا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال

تھی۔ اس نے کرناٹک اور بنگال دونوں جگہ انگریزوں کی سیاسی حیثیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ۱۷۵۶ء میں بنگال میں انگریزوں کی حیثیت معمولی تاجروں کی تھی لیکن ۱۷۶۰ء میں وہ دروبست کے مالک بن گئے تھے۔ نواب بنگال ان کا آوردہ تھا۔ کلائیو جب پہلی گورنری ختم کرکے انگلستان گیا تو بنگال میں کوئی یورپین قوم انگریزوں کی مدمقابل باقی نہیں رہی تھی۔ فرانسیسی اور ولندیزی دونوں کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور اس کا امکان نہ تھا کہ پھر کبھی وہ بنگال میں انگریزوں کی بالادستی میں خلل ڈال سکیں گے۔ دراصل انگریزی اثرات بنگال کے آگے اودھ تک پہنچ چکا تھا اور ان کی فوجی دھاک اس تمام علاقے میں بیٹھ گئی تھی۔ بنگال کے وسائل ہاتھ آجانے سے مدراس میں انگریزوں کی سیاست پر بڑا اثر پڑا اور فرانسیسی وہاں بھی ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ کلائیو نے انگلستان جاتے وقت یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کو بنگال پر باہر سے حملہ کرنے والے کا ڈر نہیں لیکن اگر اسے ڈر ہے تو اندرونی بدانتظامی کا ہے۔ اس کا یہ خدشہ درست تھا۔ اس نے ونسی ٹارٹ کو بنگال کی گورنری پر اپنا جانشین مقرر کیا جو اگرچہ ایماندار اور فرض شناس شخص تھا لیکن اس میں انتظامی قابلیت نہیں تھی۔ اخلاقی جراءت کی بھی اس میں کمی تھی۔ کلائیو کے جانے کے بعد چند مہینے کے لیے ہالول گورنری کے فرائض انجام دیتا رہا اور ونسی ٹارٹ کے مدراس سے کلکتہ پہنچنے پر اس نے اس کو جائزہ دے دیا۔

ونسی ٹارٹ کے عہد میں بدانتظامی۔

ونسی ٹارٹ کے عہد حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کھلم کھلا رشوتیں لیتے اور تحفے تحائف دولت مند ہندوستانیوں سے وصول کرتے تھے۔ ان کی زیادہ دلچسپی نجی تجارت کے ذریعے روپیہ کمانے تک محدود تھی۔ پھر ونسی ٹارٹ کی سب سے بڑی پریشانی جس کی وجہ سے بنگال کے نظم ونسق پر برا اثر پڑا یہ تھی کہ اس کی

کونسل کے ارکان سب کے سب اس کے سخت مخالف تھے۔ وہ ہر معاملے میں مخالفت کرتے اور اس کی کسی تجویز کو منظور نہیں ہونے دیتے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ عالم نے جو پہلے علی گوہر کے نام سے مشہور تھا بہار پر دوبارہ حملہ کر دیا لیکن میجر کیلیاڈ نے جو اس وقت بہار میں انگریزی فوجوں کا اعلیٰ افسر تھا اس کو پسپا کر دیا۔ شاہ عالم نے پھر سے دوستانہ تعلقات کی تجدید کی اور آئندہ کے لیے اتحاد و موافقت کا پکا وعدہ کیا۔

میر جعفر کی نئی حکومت بالکل دوالیہ ہو چکی تھی۔ ملکی انتظام میں ہر طرف ابتری کے آثار نمایاں تھے۔ میر جعفر کا لڑکا میرن میجر کیلیاڈ کے ساتھ بہار میں تھا۔ عجب کہ اتفاق سے اس کے خیمہ پر بجلی گری اور وہ جلکر خاکستر ہو گیا۔ میر جعفر کی دماغی حالت پر اس حادثہ کا بہت برا اثر ہوا اور اس کی رہی سہی انتظامی لیاقت بھی ختم ہو گئی۔ نواب کی فوجوں نے اپنی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا تقاضہ شروع کر دیا اور نواب کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ میر جعفر کے داماد میر قاسم نے معاملے کو رفع دفع کیا اور وہ خود کلکتہ گیا تاکہ انگریزی کونسل سے مالی امداد کی درخواست کرے۔ ہالول اور ونسی ٹارٹ کے بیچ میں پڑنے سے کونسل نے فیصلہ کیا کہ میر جعفر کو گدی سے برطرف کر کے میر قاسم کو اس کی جگہ بنگال کا نواب بنایا جائے تاکہ صوبے کے نظم و نسق کی حالت جو دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی درست ہو سکے۔ ونسی ٹارٹ انگریزی فوج لے کر میر جعفر کو معزول کرنے کی غرض سے مرشد آباد گیا اور با دل ناخواستہ میر جعفر اس پر آمادہ ہوا کہ وہ مرشد آباد سے کلکتہ آ جائے اور وہیں سکونت اختیار کرے۔ میر قاسم نے کونسل کے ارکان کو بیس لاکھ روپے اور جنوبی بنگال میں بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے زرخیز اضلاع بطور انعام عطا کئے۔ ونسی ٹارٹ نے جس کے متعلق انگریز مورخ کہتے ہیں کہ وہ بڑا ایماندار شخص تھا، سات لاکھ روپے بطور نذرانہ وصول کئے۔

میر قاسم منتظم شخص تھا۔ اس نے ان دیسی عہدہ داروں کو چن چن کر برطرف کیا جو رعایا پر ظلم کرتے یا زیادہ ستانی سے اپنی جیبیں گرم کرتے تھے۔ اس نے لگان اراضی پر نظر ثانی کی اور اپنی قلمرو کی آمدنی میں تقریباً ایک کروڑ

کا اضافہ کیا۔ وہ انگریزوں کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا بلکہ بااختیار صوبہ دار کی حیثیت سے **حکومت** کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اور انگریزی حکام میں تجارتی محصولات کے تعین کے متعلق ان بن ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ ویسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم نجی تجارت سے خوب مالامال ہو رہے تھے اس واسطے کہ انھیں کسی قسم کا کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف تو کمپنی کی **حکومت** فوجی اخراجات کی پابجائی کے لیے نواب سے امدادی رقم طلب کرتی رہتی تھی اور دوسری جانب کمپنی کے ملازمین **محصول** سے اپنا استثناء ثابت کرکے نواب کی حکومت کی آمدنی پر کاری ضرب لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ اصول عمل زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ فرخ سیر کے فرمان (۱۷۱۷ء) اور نواب میر جعفر کے معاہدے کی رو سے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے مال کو محصولات سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ انگریز تاجروں نے اس کی یہ توجیہ کی کہ اندرون ملک کی تجارت پر ان سے کوئی محصول نہیں لیا جاسکتا۔[1] ہندوستانی تاجروں نے بھی اپنا مال **محصول** سے بچانے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ وہ بھی کمپنی کے ملازموں سے کچھ رشوت دے دلا کر پروانے (دستک) حاصل کر لیتے تھے اور جن کشتیوں میں ان کا مال دریا کی راہ سے جاتا تھا ان پر انگریزی جھنڈا لگا دیتے تھے۔ بعض دفعہ نواب کے ملازموں نے اس قسم کی کشتیاں گرفتار کیں اور دیسی تاجروں کی چوری پکڑی لیکن چونکہ ان پر انگریزی جھنڈا ہوتا تھا اس لیے ان کو چھڑانے کے لیے کمپنی کی فوج استعمال کی جاتی تھی۔ جب اس قسم کے تصادم زیادہ ہونے لگے تو ونسی ٹارٹ نے میر قاسم سے یہ طے کر لیا کہ کمپنی کے ملازموں کے تجارتی مال پر نو روپے سیکڑہ محصول لگایا جائے حالانکہ دیسی تاجروں کو معمولاً چوبیس فیصدی اور نمک پر چالیس فیصدی محصول دینا پڑتا تھا۔[2] جب ونسی ٹارٹ کلکتہ واپس آیا تو اس کی کونسل کے ارکان نے اس معاہدہ کی توثیق کرنے سے قطعی

۱۔ Dodwell, Dupleix and Clive. p. ۲۰۵

۲۔ The cambridge History of India Vol. V. P. 172

طور پر انکار کر دیا جو اس نے میر قاسم کے ساتھ کیا تھا اور یہ فیصلہ کیا کہ نواب صرف نمک کی تجارت پر ڈھائی روپے فی صد سے زیادہ محصول عاید کرنے کا کسی حالت میں بھی مجاز نہیں ہو سکتا اور اس کے حکام کو انگریزی تجارتی گماشتوں کو گرفتار کرنے یا ان پر مقدمہ عاید کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب میر قاسم کو یہ معلوم ہوا تو اس نے ۱۷۶۳ء میں تنگ آ کر تمام تجارتی محصول ہر ایک کے لیے چاہے وہ ملکی تاجر ہو یا غیر ملکی، معاف کر دئے تاکہ انگریز تاجروں کو دیسی تاجروں پر کوئی ترجیح نہ باقی رہے۔ کمپنی کے اعلیٰ حکام کو یہ انتظام بھی پسند نہیں آیا اس واسطے کہ وہ چاہتے تھے کہ دیسی تاجروں سے حسب سابق محصول وصول کیا جائے لیکن انگریز تاجروں سے کچھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ کلکتہ کونسل نے یہ تجویز منظور کی کہ میر قاسم کو چاہئے کہ دیسی تاجروں پر جن کا مال صوبے میں سے ہو کر گزرتا ہے وہی شرح محصول قائم رکھے جو پہلے سے چلی آ رہی تھی اور صرف اس مال کو محصول سے مستثنے کیا جائے جو انگریزی جھنڈے کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بنگال میں بھیجا جائے۔ ونسی ٹارٹ اور وارن ہیسٹنگز نے جو بنگال کونسل کے رکن تھے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ کونسل کے دوسرے سب ارکان کا اصرار تھا کہ کمپنی کے ملازموں کو میر جعفر کے زمانہ سے جو تجارتی حقوق حاصل رہے ہیں ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہو سکتی اور کمپنی کے ملازمین کی تجارت پر نواب بنگال کے گماشتوں کو نگرانی کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔ غرضکہ اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ نواب اور کمپنی کے ملازموں کے مفاد اس قدر ایک دوسرے سے متصادم ہیں کہ مفاہمت کی کوئی شکل نہیں۔ مفاہمت کی شکل اسی وقت ممکن تھی کہ یا تو نواب کٹھ پتلی بننے پر آمادہ ہو جاتا اور یا کمپنی کے ملازم اپنے مخصوص مراعات سے دستبردار ہو جاتے۔ ان حالات میں کمپنی اور میر قاسم کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ میر قاسم نے اپنے آپ کو کلکتہ کونسل کے اثر سے آزاد کرنے اور با اختیار صوبہ دار بننے کے لیے اپنے صدر مقام کو مرشد آباد سے مونگیر منتقل کر دیا اور وہاں کے قلعے کو خوب مستحکم کر لیا۔ اس نے نواب اودھ شجاع الدولہ سے بھی گہرے دوستانہ تعلقات

پیدا کر لیے تاکہ ضرورت کے وقت اس سے انگریزوں کے خلاف مدد مل سکے۔ تین سال کے اندر اس نے پچیس ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیدل فوج بھرتی کر لی اور ایک بڑا اسلحہ خانہ بھی قائم کر لیا جہاں ٹوپی دار بندوقیں بنتی تھیں اور یورپین ماہروں کی نگرانی میں توپیں ڈھالی جاتی تھیں۔ بعض انگریز افسروں نے بھی جو کمپنی کی ملازمت بعض ذاتی شکایتوں کی بنا پر ترک کر چکے تھے میر قاسم کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے علاوہ دو ارمنی افسر سمرو اور مارکر بھی اس کے ہاں ملازم تھے۔ کلائیو اور کلیاڈ کے انگلستان چلے جانے کے بعد میر قاسم کا خیال تھا کہ اعلیٰ فوجی قابلیت کے افسر فورٹ ولیم میں موجود نہیں رہے۔

اس وقت پٹنہ کی انگریزی کوٹھی مسٹر ایلس کے زیر اہتمام تھی۔ ایلس بڑا تند مزاج اور مغرور شخص تھا۔ وہ عرصے سے اس فکر میں تھا کہ میر قاسم کو نیچا دکھائے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ونسی ٹارٹ نے دو انگریزوں کو جن کے نام امیئٹ اور ہے Haye تھے، میر قاسم سے مزید گفت و شنید کے لیے روانہ کیا ہے تو اسے ونسی ٹارٹ کے خلاف بہت غصہ آیا۔ اس کے خیال میں نئے نواب کے ساتھ جو گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اس سے سوائے انگریز قوم کی ذلت کے اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ ایلس اور میر قاسم کے عہدہ داروں میں پہلے سے رنجش چلی آرہی تھی۔ جب میر قاسم کے نئے احکام پٹنہ میں نافذ کیے گئے تو ایلس نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا اور شہر پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں نواب کے سپہ سالار میر مہدی خاں کو جب یہ خبر ملی تو اس نے میر قاسم کی اجازت سے پٹنہ پر حملہ کر کے انگریزی فوج کو شکست دی۔ بہت سے یورپین سپاہی مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ میر قاسم نے حکم دے دیا کہ اس کے زیر حکومت علاقوں میں جہاں کہیں بھی انگریز ملیں انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ پٹنہ کی لڑائی میں جو ڈیڑھ سو انگریز قیدی گرفتار کیے گئے تھے وہ میر قاسم کے ارمنی افسر سمرو کے حکم سے جو پہلے فرانسیسی فوج میں ملازم تھا قتل کر دیے گئے۔ اس پر بنگال کونسل نے جولائی ۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو صوبیداری سے برطرف کر کے اس کی جگہ دوبارہ میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا اور

میر قاسم کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ میر جعفر نے نواب ہونے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ کمپنی کے ملازموں سے کسی قسم کا تجارتی محصول حسب سابق نہ وصول کیا جائے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ میر قاسم کی حکمت عملی سے کمپنی اور اس کے ملازموں کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی پابجائی کی جائے گی۔ میر قاسم نے جو تین ضلعے کمپنی کے حوالے کئے تھے ان کی بھی میر جعفر نے توثیق کر دی۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ جب تک میر قاسم کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری ہے میر جعفر انگریزوں کو پانچ لاکھ روپیہ مہینہ ادا کرتا رہے گا۔

جنگ بکسر ۱۷۶۴ء

انگریزوں کی طرف سے میر قاسم کے خلاف حملہ کی بڑے پیمانہ پر تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میجر جان ایڈمس نے میر قاسم کی فوجوں کو کٹوا اور گھیریا کے مقام پر شکست دی۔ لیکن یہ لڑائیاں فیصلہ کن نوعیت نہیں رکھتی تھیں۔ میر قاسم کی فوجی قوت بدستور قائم تھی۔ اس اثناء میں میر قاسم نے انگریزوں کے خلاف شاہ عالم اور نواب اودھ کو ملانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور نومبر ۱۷۶۳ء میں وہ خود اودھ چلا گیا۔ نواب اودھ شجاع الدولہ بہار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ چند مہینے کی تیاری کے بعد پچاس ہزار کے لشکر کے ساتھ پٹنہ کی طرف بڑھا۔ اڈمس اور کارنک کی سپہ سالاری میں انگریزی فوج میں جو دیسی سپاہ تھی اس میں تنخواہ کے اضافہ اور بھتے کے متعلق بڑی بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی کارنک کے تحت شجاع الدولہ کی فوج سے پٹنہ کے قریب جو جھڑپیں ہوئیں ان میں نواب اودھ کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انگریزی فوج پیچھے ہٹ گئی۔ کارنک اپنی فوج کے ساتھ رسد کی سہولت کے مدنظر پٹنہ کے بالکل قریب آکر خیمہ زن ہو گیا۔ اس دوران میں میجر ہکٹر منرو کو کمپنی کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی۔ میجر موصوف نے جب کارنک سے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو کمپنی کی فوج میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ منرو نے نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے سخت گیری کی اور دیسی فوج کے پچیس سرغنوں کو فوجی عدالت کے سامنے پیش کرا کے توپ سے

اڑا دیا۔ دیسی فوج کی بغاوت فرو ہوگئی اور امن قائم ہوگیا۔ بارش کا موسم ختم ہونے پر منرو بکسر کی جانب بڑھا جہاں نواب اودھ پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۷۶۴ء میں ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں نواب اودھ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ اپنا تمام ساز و سامان اور ایک سو تیس توپیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ انگریزوں کی فوج کے ۸۴۷ آدمی مارے گئے اور نواب اودھ کے لشکر میں سے تقریباً دو ہزار سپاہی کھیت رہے۔ شاہ عالم نے بھاگنے کے بجائے اپنے آپ کو منرو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خود آ کر اس سے مل گیا۔ بکسر کی جنگ جدید ہند کی تاریخ میں فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں کے قدم بنگال میں جم گئے لیکن بکسر کی جنگ کے بعد انہیں شمالی مشرقی ہند میں وادی گنگا کے تمام علاقوں کا حقیقی اقتدار حاصل ہوگیا۔ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے بنگال کے ایک صوبہ دار کو شکست دی تھی لیکن بکسر کی جنگ میں مغل شہنشاہ اور نواب وزیر دونوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس سے سارے ہندوستان میں انگریزوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزی فوجیں اودھ تک بڑھتی ہوئی چلی گئیں اور بنارس، چنار، الہ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ پر قبضہ کرلیا۔ نواب اودھ کی فوجوں نے کڑہ اور کالپی کے مقامات پر مقابلے کی کوشش کی لیکن ان کے پاؤں نہ جم سکے۔ شجاع الدولہ نے روہیلکھنڈ میں جاکر پناہ لی۔ شجاع الدولہ نے کمپنی کو پچاس لاکھ روپے تاوان ادا کرنے اور انگریزی فوج کے سپہ سالار کو بیش قرار نذرانہ دینے کی استدعا کی لیکن بنگال کی کونسل کلائیو کی انگلستان سے واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ چنانچہ شجاع الدولہ کو اپنی ابتدائی گفت و شنید میں جو اپنے ملک کی واگزاشت کے لیے اس نے شروع کی تھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس گفت و شنید میں اس واسطے اور بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کہ بنگال کونسل کا اصرار تھا کہ میر قاسم کو ان کے حوالے کر دیا جائے لیکن اس پر نواب اودھ آمادہ نہ ہوئے۔ میر قاسم کچھ روز نواب اودھ کے ساتھ رہا اور پھر دہلی جاکر انتہائی بے بسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

۱۷۶۵ء کے شروع میں میر جعفر کے انتقال کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے نجم الدولہ کو نواب بنگال کی گدی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کو نواب مقرر کرتے وقت بنگال کونسل نے یہ شرط کی تھی کہ اس کے مقرر کئے ہوئے وزیر کو نواب برطرف کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ وجہ یہ تھی کہ میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کے بعد اس نے نند کمار کو اپنا وزیر مقرر کیا جو کمپنی کا خیر خواہ نہ تھا اور اکثر مختلف معاملات میں اس کی بنگال کونسل کے ارکان سے ان بن رہا کرتی تھی۔ لیکن بنگال کونسل اس کو برطرف کرنے کی مجاز نہ تھی۔ چنانچہ نند کمار نے میر قاسم اور شجاع الدولہ سے لڑائی کے وقت جتنی مدد کمپنی کو دینی چاہیے تھی اتنی نہیں دی تھی بلکہ بعض دفعہ اس نے روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ بنگال کونسل نے نجم الدولہ کو نواب مقرر کرتے وقت اور اس پر پوری طرح اپنا قابو رکھنے کے لیے یہ بھی طے کیا کہ آئندہ سے وزیر نائب صوبیدار کہلائے گا اور صوبے کا اصلی نظم ونسق اس کے ہاتھ میں رہے گا۔ چنانچہ محمد رضا خاں کو نائب صوبیدار کے عہدہ پر مقرر کیا گیا جو انگریزوں کا خاص آدمی تھا اور ان کے اشارے پر چلتا تھا۔ بنگال کونسل کے ارکان نے نجم الدولہ کو نواب مقرر کرتے وقت نذرانوں سے خوب جیبیں بھریں اور اس سے بیس لاکھ روپیہ وصول کیا۔ غرضکہ اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں کی اخلاقی حالت انتہا درجہ پست تھی۔ ان میں نظم و ضبط اور مفاد عامہ کے احساس کی کمی تھی اور ہر شخص چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لے۔

جب کلائیو پانچ سال انگلستان میں رہنے کے بعد مئی ۱۷۶۵ء میں ہندوستان واپس آیا تو کمپنی کے معاملات انتہائی ابتری کی حالت میں تھے۔ مجلس نظما نے اس کو بنگال کے گورنر اور سپہ سالاری کے پورے اختیارات تفویض کئے تھے۔ اس کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو موجودہ بنگال کونسل کو یونہی برقرار رکھے اور چاہے تو اس کو برخاست کر کے اپنی مرضی کے موافق ایک مجلس منتخبہ (سلکٹ کمیٹی) مقرر کر دے جس کی صدارت وہ خود کرے گا۔ اس مجلس کو حکومت کے جملہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ چنانچہ کلائیو نے اپنی نامزد کردہ مجلس منتخبہ (سیلکٹ کمیٹی) بنائی جس کے مشورے سے اس نے کمپنی کے نظم ونسق

کو درست کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کے پیش نظر سب سے پہلے ان دستوری اور سیاسی تعلقات کی نوعیت کو متعین کرنا تھا جو مغل بادشاہ، نواب اودھ، صوبہ دار بنگال اور کمپنی کے درمیان بکسر کی جنگ کے بعد ایک خاص شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس کو اس امر کا احساس تھا کہ انگریز ہندوستان میں اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں حکومت کی ذمہ داری انھیں اپنے سر لینی چاہئے۔ اودھ اور دہلی کے حکمران نیچا دیکھ چکے تھے اور پورے شمالی ہند میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ بقول کلائیو ملک کے باشندے نہ کسی پیمان وفا کے پابند ہیں اور نہ ان کی فوجیں انگریزی فوجوں کی طرح قواعد داں اور وقت پر تنخواہ پانے والی ہیں۔ اور ان میں اچھے افسر بھی ناپید ہیں۔ پھر اس میں شک و شبہہ کی کیا گنجایش ہے کہ انگریز قوم بالآخر پورے ملک کا اقتدار حاصل کر کے رہے گی۔ لیکن یہ کام اعتدال کو مد نظر رکھتے ہوئے کرنا تھا تاکہ انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط اور گہری قائم ہوں۔

کلائیو جب کلکتہ پہنچا تو نواب نجم الدولہ اس سے آکر ملا تھا۔ کلائیو نے نوجوان نواب کے متعلق اپنی ملاقات میں کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی۔ نواب کی چھچھوری باتوں سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس میں حکومت کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے۔ محمد رضا خاں نے پچھلے دنوں جو قوت حاصل کر لی تھی اس کو بھی کلائیو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ جب وہ مرشد آباد گیا تو اس نے محمد رضا خاں کے وسیع اختیارات میں جو نائب صوبہ دار کی حیثیت سے اس کو حاصل تھے دو اور ایسے اشخاص کو شریک کر لیا تھا جو کمپنی کے آوردہ تھے۔ نواب نجم الدولہ کو اس پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ نظامت کے اختیارات کمپنی کے سپرد کر دے جس کے معاوضے میں اس کو سالانہ ۵۲ لاکھ روپے دئے جائیں گے جن سے وہ دربار کے اخراجات اچھی طرح چلا سکتا ہے۔ کلائیو نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ جب نواب کو اس رقم کے ملنے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ خدا کا شکر ہے کہ اب میں اطمینان سے خاطر خواہ عیش کر سکوں گا۔[1]

مرشد آباد سے کلائیو بنارس پہنچا جہاں نواب اودھ شجاع الدولہ پہلے سے موجود تھا۔ نواب سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ کلائیو اور نواب

Malcolm The life of the Lord Clive, Vol III P 125 ؎۱

اودھ دونوں پہلے الہ آباد جاکر شاہ عالم سے ملیں۔ اس سے معاملات کی یکسوئی ہو جانے کے بعد کمپنی نواب اودھ سے کوئی معاہدہ کر سکے گی۔ چنانچہ دونوں الہ آباد پہنچے۔ شاہ عالم نے کلائیو سے شکایت کی کہ بنگال کے نواب پر اس کے ۳۲ لاکھ روپے واجب الادا ہیں جس کی ادائی کمپنی کو کرنی چاہیے۔ اس پر کلائیو نے کہا کہ کمپنی اس قرضے کی ادائی کا ذمہ اپنے اوپر کیسے لے سکتی ہے جس کے متعلق اسے علم نہیں اور جو ایسی حکومت کے ذمہ ہے جو خود کمپنی کی مخالف تھی۔ بنگال کے معاملے کی پوری طرح یکسوئی کے لیے کلائیو نے تجویز کی کہ کمپنی سالانہ ۲۶ لاکھ روپے شاہ عالم کو حق دیوانی کے طور پر ادا کیا کرے گی بشرطیکہ بنگال، بہار، اوڑیسہ میں آئندہ سے سوائے کمپنی کے مالگزاری اور دوسرے محصولات وصول کرنے کا حق کسی دوسرے کو نہ رہے۔ ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو شاہ عالم جب کلائیو کے خیمے میں گیا تو وہاں باقاعدہ دربار منعقد کیا گیا اور شاہ عالم کو ایک کھانے کی میز پر انگریزی وضع کی گدے دار کرسی رکھ کر بٹھایا گیا جس پر معمولی زردوزی کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ بقول ایک ہمعصر فارسی مورخ کے حقوق دیوانی کا نہایت اہم معاملہ جس کے انجام دینے کے لیے مدبر وزیروں اور قابل سفیروں کے مامور کرنے کی ضرورت پڑتی اس قدر سہولت سے سرانجام پا گیا کہ ایک بار بردار گدھے کی خرید و فروخت بھی غالباً اتنی جلد اور آسانی سے ممکن نہ ہوتی[1]۔ کمپنی کو حق دیوانی ملنے کا فرمان پڑھا گیا اور شاہ عالم نے خود اپنے ہاتھ سے یہ فرمان کلائیو کے حوالے کیا۔ کلائیو نے کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع نواب اودھ کی مملکت سے لے کر شہنشاہ دہلی کی خدمت میں نذر دیے تاکہ وہ اپنی شاہانہ حیثیت کو برقرار رکھ سکے۔

معاہدۂ الہ آباد | نواب اودھ شجاع الدولہ سے ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو ایک علیحدہ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے نواب نے کمپنی کو ۵۰ لاکھ روپے بطور تاوان ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جب تک یہ رقم

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۷۵۳ (کلکتہ ایڈیشن)

پوری ادا نہ ہو جائے اس وقت تک چنار کے قلعے پر کمپنی کا قبضہ رہے گا۔ نواب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ میر قاسم اور سمرو سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا اور نہ کسی طرح سے ان کی امداد کرے گا۔ اگر کوئی یورپین اودھ میں آکر ملازمت اختیار کرنا چاہے یا کمپنی کی ملازمت ترک کر کے وہاں جائے تو اسے کمپنی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگر نواب کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہو تو کمپنی فوج مہیا کرے گی جس کے اخراجات کا بار نواب اودھ کے خزانے پر ہوگا۔ کلائیو اگر چاہتا تو اس وقت اودھ کی پوری ریاست پر کمپنی کا قبضہ ہو جاتا لیکن وہ اس وقت اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہ تھا۔ وہ اودھ کو انگریزی اثر میں باقی رہنے دینا چاہتا تھا تاکہ اگر کبھی مرہٹے اس طرف سے بہار و بنگال کا رخ کریں تو یہ ریاست بیچ میں حدِ فاصل کے طور پر موجود رہے۔ اودھ کے ساتھ اس نے جو معاہدہ کیا وہ کم و بیش سو سال تک قائم رہا۔

کلائیو کے بعض مخالفوں نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے شاہ عالم کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک کیا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ چنانچہ سر آئر کوٹ، ونسی ٹارٹ اور منرو کی رائے تھی کہ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں کو سیدھے دہلی پہنچ کر دم لینا چاہیے تھا اور وہاں پہنچ کر شاہ عالم کے نام سے سارے ہندوستان پر انگریزی اقتدار کا اعلان کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن کلائیو اس کے خلاف تھا۔ اس نے اس وقت بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے حقوق دیوانی ہی کو غنیمت جانا۔ اگر اس سے زیادہ بڑھ کر کوئی اقدام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف والیانِ ملک انگریزوں کے خلاف کہیں متحد نہ ہو جائیں اور خود انگلستان میں اس پر سخت نکتہ چینی نہ کی جائے۔ کلائیو نے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے حقوق دیوانی حاصل کرنے پر جو اکتفا کیا اس سے اس کا مقصد درمیانی راستہ اختیار کرنا تھا۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ تھا اور نقصان کا کوئی خدشہ تھا ہی نہیں۔ فرانس اور ہالینڈ کی حکومتوں سے بھی حکومت انگلستان کہہ سکتی تھی کہ دیسی والیانِ ملک کے زیر سایہ انگریزوں نے حقوق حاصل کئے ہیں

تہ کر انھیں برطرف کرے۔ اس طرح حکومت انگلستان کے لیے کسی قسم کی کوئی بین الاقوامی پیچیدگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خارجی دشمنوں کے علاوہ خود انگلستان میں بھی کلائیو کے دشمن موجود تھے۔ کمپنی کے ملازمین جو دولت سمیٹ کر انگلستان لے جاتے تھے اس سے دوسروں میں حسد پیدا ہو رہا تھا۔ خود پارلیمنٹ کے ارکان میں بعض ایسے تھے جو کمپنی اور اس کے ملازموں کے سخت دشمن تھے اور کھلم کھلا اس کا اظہار کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتے تھے۔ بنگال میں کمپنی کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اسے ان دشمنوں سے بھی چھپانا ضروری تھا ورنہ ان کی مخالفت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ پھر نواب بنگال کمپنی کا وظیفہ خوار بن گیا جس کی آڑ میں کمپنی جو چاہتی کر سکتی تھی۔

دو عملی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے حقوق دیوانی ملنے سے ان علاقوں میں دوعملی کا دور شروع ہوا۔ بنگال کا نواب جو اب کمپنی کا نامزد کردہ ہوتا تھا، اس کے ذمے صرف نظامت یعنی فوجداری کا کام رہ گیا۔ چونکہ کمپنی صوبے کے پورے دربست کی ذمہ دار نہ تھی اس لیے انتظام میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی۔ کلائیو نے میر جعفر کے بیٹے نجم الدولہ کے انتقال پر اس کے چھوٹے بھائی سیف الدولہ کو بنگال کا صوبہ دار نامزد کیا۔[1] اس کے اختیارات کم و بیش وہی تھے جو نجم الدولہ کو دیے گئے تھے۔ نئے نواب کی آڑ میں حکومت کا اصلی اختیار کمپنی کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور نواب محض برائے نام مقتدر رہ گیا تھا۔ کلائیو چاہتا تھا کہ پارلیمنٹ پر یہ بات پوری طرح ظاہر نہ ہو کہ شمالی ہندوستان میں کمپنی کے اقتدار کی وسعت کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ اس طریقے سے کمپنی کے مخالفین تمام معاملات پر بحث و تحقیق شروع کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے امور کی انجام دہی کے ساتھ کمپنی پر ان علاقوں کی حفاظت کی فوجی ذمہ داری بھی عاید ہو گئی تھی۔ کلائیو نے پوری طرح کوشش کی کہ نواب بنگال کے

[1] سیر المتاخرین صفحہ (۳۵۶)

اعزاز میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو اور اس کا ظاہری بھرم برقرار رہے۔ اسی طرح نواب اودھ اور شاہ عالم کی حیثیت بھی بظاہر سیاسی لحاظ سے آزاد تھی لیکن حقیقت میں کمپنی کا اقتدار ان پر چپکے چپکے اپنا اثر جما رہا تھا۔

لیکن بنگال میں جس دوعملی کے نظام نے جنم لیا اس کی خرابیاں بہت جلد ظاہر ہونے لگیں۔ اس انتظام میں قوت کا ذمہ داری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نظم و نسق کا سارا کام براہ راست ہندوستانی عہدہ داروں کے ذریعے سرانجام پاتا تھا جو اگرچہ کمپنی کی نگرانی میں اپنے فرائض پایۂ تکمیل کو پہنچاتے تھے لیکن اب تک ان کا عمل دخل کافی موجود تھا۔ اس دوعملی کے انتظام سے دراصل یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کمپنی اس وقت تک بنگال بہار اور اڑیسہ کے انتظام کو براہ راست اپنے تحت لینے کے لیے تیار نہ تھی اور وہ اس کے لیے بھی تیار نہ تھی کہ ایک تجارتی جماعت کے بجائے خالص حکمران جماعت بن جائے بلاشبہ دوعملی کے نظام سے یہ ضرور ہوا کہ کمپنی کی دستوری حیثیت بنگال بہار اور اڑیسہ میں مضبوط ہو گئی اور نواب بنگال برائے نام حکمران رہ گیا۔ یہ دراصل ایک درمیانی راستہ تھا جو پرانے طریق عمل اور کھلم کھلا اقتدار حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے درمیان کلائیو نے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ مجلس نظماء نے بھی اس امر پر زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو نواب بنگال کے اعزاز کو برقرار رکھا جائے اور مالگذاری وصول کرنے کے جو پرانے طریقے چلے آ رہے ہیں ان میں فوری کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔ کلائیو کی حکمت عملی کی مجلس نظماء نے ان الفاظ میں تائید کی :-

"اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جو ملک ہمیں حاصل ہو چکا ہے وہ مستقل طور پر ہمارے تسلط میں رہے۔ انسانی عقل و دانش ہمارے تسلط کو جتنا مستحکم اور مستقل بنا سکتے ہیں اتنی ہی ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ ہم اپنے عاملانہ اختیارات کو نہایت سادگی سے برتیں۔ گذشتہ زمانے میں بادشاہ کے دیوان کے فرائض اور اختیارات یہ تھے کہ وہ مالگذاری جمع کرتے اور فوج اور نظامت کے اخراجات پورے کرنے کے بعد جو رقم بچتی اس کو

دیکھی بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن ہم اس طریق کار پر عمل نہیں کر سکتے۔ ہمیں بردوان
کے علاقے میں جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس سے یقین پر اطمینان ہو گیا ہے کہ انگریز
مالگزاری جمع کرنے کے کام کے لیے غیر موزوں ہیں اس لیے ہم اس
تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ حکومت کے پرانے طرز اور صوبیدار
کے وقار کو برقرار رکھا جائے۔"(۱)

انتظامی اصلاحات

کلائیو نے بڑی دانشمندی سے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے نظم و نسق کی براہ راست ذمہ داری اپنے اوپر لینے سے اجتناب کیا اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت کمپنی کے ملازموں اور کارندوں میں اس پایہ اور قابلیت کے لوگوں کی کمی ہے جو ان وسیع علاقوں کے انتظام کو سنبھال سکیں۔ کمپنی کو پہلے سے چوبیس پرگنوں، بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے اضلاع کا براہ راست نظم و نسق کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ یہ اضلاع کافی وسعت رکھتے تھے جن میں کمپنی کے ملازم چاہتے تو انتظامی تجربہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اس کی بظاہر کوئی صورت اس وقت کے حالات میں موجود نہ تھی۔ سیاسی معاملات کو طے کر چکنے کے بعد کلائیو نے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ کمپنی کے ملازم والیان ملک اور زمینداروں سے کھلم کھلا تحفے وصول کرتے تھے۔ یہ کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی تھی اس واسطے کہ کمپنی کے بڑے سے لے کر چھوٹے ملازمین میں تحفے لینے کا عام رواج تھا۔ نجی کی تجارت اور تحفے لینے کے متعلق کلائیو نے اپنی مجلس منتخبہ (سلکٹ کمیٹی) کے ذریعے روک تھام کی کوشش کی۔ اگرچہ اس مجلس کے اختیارات کو تسلیم کرنے میں کلکتہ کونسل کو پس و پیش تھا۔ لیکن کلائیو نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سختی کے ساتھ اپنی حکمت عملی پر عمل کرے گا۔ بہت جلد کلائیو کمپنی کے پورے دروبست پر حاوی ہو گیا۔ اس نئے مجلس نظام کے احکام کے موجب کلکتہ کونسل کے ارکان اور

۱۔ Auber, Rise and Progress of the British Power in India, Vol. I, P 148—49

دوسرے کمپنی کے عہدہ داروں سے نئے معاہدے پر دستخط کرائے جس میں صراحت کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ سے وہ تحفے نہیں لیں گے۔ ارکانِ کونسل سمجھے کہ چونکہ کلائیو خود تحفے قبول کرتا رہا ہے اس لیے بہت جلد وہ ان احکام کو یا تو منسوخ کر دے گا یا ان پر عمل کرانے پر زیادہ اصرار نہیں کرے گا۔ لیکن کلائیو نے اس موقع پر خود اپنے ماضی کو جھٹلا دیا اور بڑی سختی سے ان احکام کی پابندی کرائی جس کے باعث کمپنی کے ملازم اس سے بہت ناخوش ہو گئے۔ جب کلائیو مرشد آباد گیا تو معلوم ہوا کہ نواب میر جعفر نے پانچ لاکھ کی قیمت کے جواہرات بطور تحفہ اس کے لیے چھوڑے ہیں۔ اس نے اس تحفے کو ذاتی طور پر قبول کرنے کے بجائے ارکانِ کونسل سے مشورے کے بعد ایک امدادی فنڈ قائم کر دیا جس سے ان سپاہیوں اور افسروں کی بیواؤں کی مدد کی جائے جو لڑائی میں مارے گئے ہوں اور ان سپاہیوں کی اعانت کی جائے جو لڑائی میں زخمی ہوئے ہوں۔ تقریباً آیندہ سو سال تک یہ فنڈ قائم رہا۔ ۱۸۵۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا تو یہ سرمایہ کلائیو کے جانشینوں کو دے دیا گیا۔

نمک کی تجارت بند کرانے کے متعلق کلائیو نے محسوس کیا کہ مجلسِ نظماء کے احکام کی پابندی کرانا دشوار ہے۔ نئے معاہدوں پر دستخط کرا کے کلائیو نے تحفے لینے کی تو قطعی ممانعت کرا دی تھی۔ اب اگر نمک کی تجارت بھی فوراً بند ہو جاتی تو کمپنی کے عہدہ دار ملازموں کی آمدنی ان کے معمولی اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ مجلس نظماء کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کمپنی کے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کرے۔ کونسل کے رکن کی تنخواہ تین سو پونڈ سالانہ تھی۔ کلائیو کو اس کا بخوبی علم تھا کہ رکنِ کونسل کے مرتبے کا شخص ہندوستان میں تین ہزار پونڈ سالانہ سے کم خرچ نہیں کر سکتا۔ کمپنی کے دوسرے ملازموں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔ معمولی کارپردازوں کی تنخواہ (۵۰۰) پونڈ سالانہ تھی جو حیرت انگیز ہے۔ بغیر نمک کی تجارت کے ان کی گزر بسر بھی ناممکن تھی۔ یہ حالات مجلس نظماء کے سامنے پیش کیے گئے اور ڈائرکٹرانِ کمپنی نے مطالبہ کیا کہ نمک کی تجارت کے متعلق جو

احکام بھیجے گئے ہیں ان پر نظر ثانی کی جائے اس لیے کہ بغیر اس کے ہندوستان میں جو کمپنی کے ملازم اس وقت کارپرداز ہیں وہ سخت دشواریوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ کلائیو نے سوچا کہ نجی تجارت کا انسداد ممکن نہیں تو کم از کم اس کی کوئی منظم شکل ہی پیدا ہو جائے تاکہ مختلف مفادوں کا تصادم پیش نہ آئے بعد میں مجلس نظماء نے بھی اس کو بہ حیثیت گورنر بنگال اس کا مجاز کر دیا تھا کہ نجی تجارت کی بابت ایسے قاعدے اور ضابطے بنائے جو قرین انصاف ہوں اس لیے کہ اس قسم کے قاعدے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر انگلستان میں بیٹھ کر نہیں بنائے جا سکتے۔ چنانچہ کلائیو اور اس کے دوسرے شرکائے کار نے ایک انجمن تجارت (سوسائٹی آف ٹریڈ) قایم کی جسے نمک بنانے اور فروخت کرنے کا اجارہ حاصل تھا اور وہی ملک میں نمک کی تجارت کرنے کی مجاز تھی۔ اس انجمن میں زیادہ تر کمپنی کے سینیر عہدہ داروں نے اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ تجارت کا منافع حصوں کی مناسبت سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ انجمن کی عاملانہ جماعت مجلس تجارت (کمیٹی آف ٹریڈ) تھی کہ جو سرمایہ فراہم کرنے اور حصوں پر منافع تقسیم کرنے نیز تجارتی انتظامات کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ نمک کی تجارت کا اس تجارتی انجمن نے جو اجارہ حاصل کر لیا تھا اس سے بہت نفع ہوا۔ ہندوستانی تاجر کمپنی سے نمک خریدتے اور ملک کے دوسرے حصوں میں بلا محصول ادا کئے جاتے تھے۔ اس تجارت سے خود کلائیو کو ۱۷ ½ ہزار پونڈ سالانہ اور کونسل کے ارکان کو ۷ ہزار پونڈ سالانہ منافع ملتا تھا۔[1]

کلائیو کے گورنر بنگال ہونے سے قبل ہی مجلس نظماء نے کئی مرتبہ اس پر زور دیا تھا کہ کمپنی کے افسروں کو جو بھتہ دیا جاتا ہے وہ بہت زیادہ ہے چنانچہ جنگ بکسر سے قبل کلکتہ کونسل بھتے کی تخفیف کے متعلق غور کر رہی تھی لیکن چونکہ اس وقت افسروں کی بددلی سے کمپنی کے مفاد کو سخت نقصان

لہ Forrest: Life of Lord Clive Vol II, p. 299.

پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لیے یہ مسئلہ ملتوی کر دیا گیا۔ یورپین افسروں کو اس
وقت جب وہ میدان جنگ میں خدمات انجام دے رہے ہوں بھتہ دیا جاتا
تھا جس کی مقدار میر جعفر نے اپنی گدی نشینی کی خوشی میں دگنی کر دی تھی۔ بعد
میں لڑائی کے علاوہ اس وقت بھی جب کہ افسر اپنی چھاؤنیوں میں رہتے
تھے دُگنا بھتہ برابر جاری رہا۔ آہستہ آہستہ افسر لوگ اسے اپنا مستقل حق تصوّر
کرنے لگے۔ جس طرح سول ملازمین تحفے وصول کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے
اسی طرح بعض افسر اپنے دوہرے بھتے کو حق خیال کرتے تھے۔ اس سے
ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو جاتا تھا۔ کلائیو نے کمپنی کے نظم ونسق کے
مختلف شعبوں میں جب اصلاح شروع کی تو فوجی تنظیم کا معاملہ بھی زیر غور
آیا۔ مجلس نظماء کا اصرار تھا کہ دگنا بھتہ ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ کلائیو نے
یکم جنوری ۱۷۶۶ء حکم جاری کر دیا کہ اس تاریخ سے دُگنا بھتہ موقوف کیا
جاتا ہے۔ انگریز افسروں نے اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کلائیو
کے خلاف سازش کر کے یہ طے کیا کہ دو سو افسر ایک ساتھ اپنے استعفے پیش
کر دیں تاکہ اس طرح حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اسی زمانے میں یہ خبر بھی
مشہور تھی کہ ۶۰ ہزار مرہٹہ فوج الٰہ آباد کی طرف حملہ آور ہونے والی ہے۔
انگریز افسروں کو یقین تھا کہ ایسے نازک وقت میں ان کی استعفے کی دھمکی کارگر ہوگی
اور ان کی شرطیں مان لی جائیں گی۔ لیکن کلائیو اس طرح دبنے والا شخص نہ
تھا۔ وہ ایک دفعہ جب کسی بات کا ارادہ کر لیتا تو اس کو پورا کر کے رہتا تھا۔
اب ڈسپلن برقرار رکھنے کی خاطر اس کو مجبوراً ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش
آنا پڑا جن کے بل پر اس نے اپنی فوجی کامرانیاں حاصل کی تھیں۔ اس نے
سب افسروں کے استعفے منظور کر لیے اور حکم دے دیا کہ ان سبھوں کو گرفتار
کر کے کلکتہ بھیج دیا جائے تاکہ ان کے خلاف بغاوت کے جرم میں فوجی عدالت
میں مقدمہ چلایا جائے۔ کلائیو نے مدراس سے فوجی دستوں اور افسروں کو
طلب کر لیا اور کلکتہ کی یورپین نوآبادی میں جتنے لوگ افسری کے لیے
موزوں مل سکے انھیں فوراً نوکر رکھ لیا تاکہ مرہٹوں کے خطرے کا سدباب ہو جائے

اس طرح دو ہفتے کے اندر اس نے اپنی مستقل مزاجی سے بغاوت کو بالکل فرو کر دیا اور ڈسپلن قائم کر دیا۔ اس موقع پر ڈسپلن قائم کرنے کی خاطر اس نے صاف کہدیا تھا کہ "میں یہ پسند کروں گا کہ فوجی سنگینیں میری گردن میں بھونک دی جائیں بجائے اس کے کہ میں اس قسم کے مطالبات کے آگے جھکوں"[۱]۔

کلائیو کی انگلستان کو واپسی

۱۷۶۷ء کے شروع میں کلائیو کی صحت جواب دینے لگی۔ چنانچہ وہ انگلستان چلا گیا۔ وہاں اس کے بہت سے دشمن تھے جنھوں نے اس سے انتقام لینا چاہا۔ مجلس نظماء کا ایک رکن سلیوان کلائیو کا سب سے بڑا مخالف پارلیمنٹ کا بھی رکن تھا اس نے اور کرنل بورگوئین نے پارلیمنٹ میں تجویزیں پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لیے پارلیمنٹ کوئی تدبیر اختیار کرے۔ مسٹر بورگوئین نے اس پر بھی اصرار کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جن اعلیٰ عہدہ داروں نے کسی والی ملک سے معاہدہ کر کے یا فوجی قوت کی بنا پر ذاتی دولت اور عطایات حاصل کیے ہیں وہ مملکت کی ملک ہونے چاہئیں۔ لیکن کچھ دنوں بعد کرنل موصوف نے کلائیو کے نام سے کر دو ہری تجویز پیش کر دی جس میں صراحت تھی کہ "کلائیو نے مجلس منتخبہ کے رکن اور کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے دو لاکھ ۳۴ ہزار پونڈ کی رقم حاصل کی ہے وہ اپنے اقتدار کے بے جا استعمال سے حاصل کی ہے اور اس طرح اس نے کمپنی کے دوسرے ملازموں کے لیے ایک بری مثال قائم کی جس سے مملکت کے مفاد کو نقصان پہنچے گا"۔ اس تجویز پر رات بھر بحث ہوتی رہی آخرکار ہاؤس آف کامنز نے یہ تسلیم کیا کہ کلائیو نے جو رقم حاصل کی وہ اسے ہرگز نہیں لینی چاہیے تھی۔ لیکن باوجود اس کے اس نے ملک کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ کلائیو کی غیور طبیعت پر اس بدسلوکی کا بہت اثر ہوا

۱۔ Strachey's Narrativ.., p. 157 (Clive to Barker, May 8, 1766)

جو اس کے اپنے ابنائے وطن کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی۔ وہ پہلے ہی سے بیمار تھا۔ غرض کہ جسمانی اور نفسیاتی حالت سے تنگ آکر اس نے ۱۷۷۴ء میں خودکشی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر ۴۹ سال تھی۔

کلائیو کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں اتنی بڑی مملکت کا مالک بنا دیا جو رقبے میں انگلستان سے زیادہ تھی۔ اس نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی جو بنیادیں قائم کیں انھیں پر آئندہ تعمیر اور استحکام ممکن ہوا۔ اس نے فوجی تعلیم لارنس سے اور سیاسی تعلیم ساندرس سے حاصل کی تھی لیکن بعد میں وہ اپنے ان دونوں استادوں سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے بڑی جرأت اور دانشمندی سے پہلے فرانسیسی منصوبوں کو شمالی سرکار اور کرناٹک میں ختم کیا اور اس کے بعد بنگال کے نظم و نسق کے پورے اختیارات حاصل کر کے برطانوی سلطنت کی اس ملک میں داغ بیل ڈالی۔

کلائیو زبردست سپہ سالار اور مدبر تھا۔ اگرچہ وہ سپاہیوں کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتا تھا لیکن جب نظم و ضبط قائم کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا تو وہ کسی کی مطلق رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس کی سپاہ کو اس کی قوت فیصلہ پر پورا بھروسہ تھا۔ درحقیقت اس کی کامیابیوں کا راز اس کی قوت فیصلہ اور قوت ارادی میں پوشیدہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ جب کسی بات کا ارادہ کر لیتا تو پھر کوئی طاقت اس کو اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ کلائیو بہادری اور اولوالعزمی کے باوجود ہر معاملے میں تدبر اور حکمت عملی سے کام لیتا اور بہت جلد معاملے کی تہہ کو پہنچ جاتا تھا اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے ذریعوں پر فوراً اس کے ذہن کی رسائی ہو جاتی تھی۔ وہ اعتدال کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ بکسر کی کامیابی کے بعد اکثر انگریز اعلیٰ افسروں کی رائے تھی کہ دہلی تک بڑھتے چلے جانا چاہیے لیکن کلائیو نے اس کو اصول اعتدال کے خلاف سمجھا اور انھیں اس سے باز رکھا۔ لیکن باوجود ان خوبیوں کے اس میں صحیح اخلاقی حس کی کمی تھی۔ اس نے اپنے بنگال کے ابتدائی دور میں خوب دولت سمیٹی اور امی چند کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ کسی طور پہ بھی حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔

بعض انگریز مورخ یہ کہہ کر کلائیو کو حق بجانب ٹھیراتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان کے اخلاق عامہ کی حالت اس قدر خراب تھی کہ اگر کلائیو بھی اسی رنگ میں رنگ گیا جو اس کے گرد و پیش تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اول تو تاریخی لحاظ سے صحیح نہیں اور دوسرے اگر اہل ہند کے اخلاق عامہ کی پستی کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی کلائیو اور اس کے شرکائے کار کے ان اعمال کو درست نہیں کہا جا سکتا جو عالمگیر اصول اخلاق سے گرے ہوئے تھے اور جن کا اثر کسی نہ کسی طور پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین باوجود نظار کی ہدایتوں کے کلائیو کی قائم کی ہوئی مثالوں پر عمل کرتے رہے جس کی وجہ سے انگریزی قوم کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا۔ اور اگر بعد میں سختی کے ساتھ اس قسم کے افعال کی روک تھام نہ کی جاتی جس کی مثال کلائیو نے اپنی عملی زندگی میں قائم کر دی تھی تو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے قائم کرنے میں بڑی سخت دشواریاں پیش آتیں۔ میر جعفر کو بنگال کا نواب بناتے وقت کلائیو نے دو لاکھ ۳۴ ہزار پونڈ کی رقم ہتھیالی اور ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ کونسل کے ارکان اور فوجی افسروں کو دلوائے۔ میر جعفر اس غلط فہمی میں تھا کہ کمپنی کے ارباب کار کو یہ رقمیں ادا کرنے کے بعد اس سے مزید مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ کمپنی کے مطالبات ان رقموں کی ادائی کے بعد بھی برقرار رہے جن کی پابجائی کرنی پڑی۔ کلائیو کا یہ دعویٰ کہ یہ رقمیں بطور عطیہ خوشی سے دی گئی تھیں اور ان کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی زبردستی یا جبر سے کام نہیں لیا گیا تھا قابل قبول نہیں(۱) کلائیو کے انگلستان چلے جانے کے بعد کلکتہ کونسل نے پانچ سال تک اس کی قائم کی ہوئی روش پر عمل کیا اور ایسے لوگوں کو بنگال کا در و بست

(۱) Reports of the House of Commons, Vol. III, p 149

دلوایا جن سے عطیات حاصل کرنے کی توقع تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے بنگال میں جو نظم و نسق قائم ہوا وہ نہ تو کمپنی کے لیے مفید ہو سکتا تھا اور نہ وہاں کی رعایا کے لیے۔ بہت جلد اس نظم و نسق کی آڑ سے بدنظمی اور ابتری رونما ہوئی اور سارے بنگال پر چھا گئی۔ پانچ سال تک اس ابتری کا دور دورہ رہا جو انگریزی قوم کے دامن پر ہمیشہ ایک بدنما داغ رہے گا۔

کلائیو کے جانشین

کلائیو نے بنگال کی گورنری کا جائزہ مسٹر ورلسٹ کو دیا جو دو سال تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کے بعد مسٹر کارٹیر بنگال کا گورنر ہوا۔ اس کو اگرچہ بنگال کے حالات کا کافی تجربہ تھا لیکن وہ کوئی کارنمایاں انجام نہ دے سکا۔ ورلسٹ اور کارٹیر کے عہد حکومت میں کمپنی کے ملازموں کی حرص اور لالچ نے سارے نظم و نسق کو مفلوج کر دیا۔ جن معاہدوں پر کلائیو کے عہد میں انھوں نے دستخط کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے وہ تحفے نہیں لیں گے ان کی حیثیت طاقِ نسیان کے نقش و نگار سے زیادہ باقی نہیں رہی۔ انھوں نے کھلم کھلا نجی تجارت پھر شروع کر دی۔ نمک، چھالیا اور تمباکو کی تجارت کا اجارہ اندرونِ ملک کی تجارت میں انھیں حاصل تھا۔ محمد رضا خان نائب نواب اور اس کے کارندے کمپنی کے ملازموں کے معاملات میں مداخلت کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کونسل میں کمپنی کے ملازموں کی روک تھام کرنے کی طاقت نہیں تھی۔

ورلسٹ اور کارٹیر کے عہد حکومت میں دوعملی کے انتظام کی خرابیاں پوری طرح ظاہر ہو گئیں۔ نواب کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی انگریز ملازمین کمپنی من مانی کرتے اور ذمہ داری نواب کی رہتی۔ اگرچہ اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں نے ذاتی تجارت سے نفع کما کر اپنی جیبیں خوب بھریں لیکن کمپنی کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ انگلستان میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کے حقوق دیوانی مل

جانے سے کمپنی کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ برطانوی تاج
کی خواہش تھی کہ اس میں اسے بھی حصہ ملے۔ اور کمپنی کے حصہ داروں
نے مطالبہ شروع کر دیا کہ آئندہ (پچاس سال تک انھیں چودہ فیصدی منافع
دیا جائے)۔ چنانچہ کمپنی نے شرح منافع ۱۰ فیصدی کر دیا۔ حکومت انگلستان
نے یہ بھی طے کر دیا کہ کمپنی خزانہ شاہی میں صرف شاہی کے لئے ۴ لاکھ پونڈ
سالانہ کی رقم ادا کیا کرے گی۔ حالانکہ ۱۷۶۶ء میں کمپنی پر تقریباً ۹۰ لاکھ
پونڈ قرض تھا۔ معمولاً ہندوستان سے جو مال خرید کر انگلستان اور دوسرے
ملکوں کو بھیجا جاتا تھا اس کی قیمت کم و بیش تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی۔ لیکن
مجلس نظماء کے حکم کے بموجب ۸ لاکھ پونڈ کا مال خرید کر بھیجا جانے لگا۔ کمپنی
نے طے کیا کہ یہ تمام مال دیوانی کی آمدنی سے خریدا جائے۔ ڈچ اور فرانسیسی
اپنا اسباب تجارت فراہم کرنے کے لیے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لیتے تھے۔
اور انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی دیوانی کی آمدنی سے انگلستان کو اجناس اور
دوسری اشیاء خرید کر روانہ کرتی تھی۔ بنگال کی دیوانی کی آمدنی میں سے
۸ لاکھ پونڈ کا سونا اجناس کی خریداری کے لیے چین اور دوسرے ممالک
کو تین سال میں بھیجا گیا۔ بنگال کی بے حساب دولت بے دریغ حقوق
دیوانی ملنے کے بعد کئی سال تک دوسرے ملکوں کو کھینچ کھینچ کر بھیجی جانے
لگی۔ خود ورلسٹ نے اپنی کتاب میں اس زمانے کی کیفیت کا ان الفاظ
میں نقشہ کھینچا ہے۔ "پارلیمنٹ اور کمپنی کے حصہ داروں میں یہ شدید
ہوس کہ کمپنی کے نئے مقبوضات سے خوب نفع اندوزی کی جائے بہت
سی ایسی خرابیوں کا باعث ہوئی جو پیدا نہ ہوتیں اگر اہل انگلستان ذرا
ہوشمندی اور اعتدال سے کام لیتے۔ اسی وجہ سے وصول مالگزاری کے
کام میں کوئی مفید تبدیلی نہ ہو سکی اور پرانے زمانے کی وہ تمام برائیاں جو
متعدد حکمرانوں کے تحت پھیل چکی تھیں برابر قائم رہیں۔ یہی خرابیاں اہل
ملک کی معاشی زندگی کے لیے کیا کم تباہ کن تھیں کہ بنگال کو ایک اتھاہ سونے
کی کان سمجھ کر مزید مالگزاری کے شدید مطالبے نے ان بہت سے اسباب

زوال میں اور بھی اضافہ کر دیا جو یہاں کی محنتی اور جفاکش آبادی کو پیسے ڈالتے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہو جب کہ انگلستان سے یہ احکام نہ آئے ہوں کہ ہندوستان میں مال کی خریداری بڑھاؤ۔[۱]

کارٹیر کے عہد میں مالگزاری کی وصولیابی کو منظم کرنے اور دیسی عہدہ داروں کی نگرانی کرنے کے لیے انگریز نگران کار (سپروائزر) مقرر کیے گئے جنھیں نجی تجارت کی اجازت تھی۔[۲] چونکہ یہ نگران کار اضلاع پر رہتے تھے اس واسطے انھیں دولت سمیٹنے کے غیر معمولی مواقع حاصل تھے محاصل لینے والے اور زمیندار ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ نگران کاروں نے ہر ضلع میں ایک جابر حاکم کی حیثیت اختیار کر لی۔[۳] ان نگران کاروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ حقوق اراضی کی جانچ پڑتال کر کے جمع بندی کریں اور مقررہ لگان کے علاوہ جو کاشتکاروں سے زمیندار وصول کرتے ہیں اس کا سدباب کیا جائے۔ ابھی ان نگرانکاروں کو مقرر ہوئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ ۱۷۷۰ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ کے علاقوں میں سخت قحط پڑا۔

بنگال کا قحط

اس قحط کے زمانہ میں بھی مالگزاری کے مطالبات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ کمپنی کے گماشتوں نے اپنی فوجی اور شہری ضروریات کے لیے اضلاع سے غلہ خرید کر حاصل کر لیا اور دیہات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ خود ہمعصر انگریزوں کا خیال ہے کہ اس قحط میں بنگال کی تقریباً ۱/۳ آبادی (یعنی کم و بیش ایک کروڑ) ہلاک ہو گئی۔ کاشتکاروں نے اپنے بچوں کو بیچ ڈالا۔ یہاں تک کہ کوئی ان کا خریدنے والا بھی نہ رہا۔ دیہات میں لوگوں کی

---

۱ Verlest, A view of the rise progress and present state of the English Government in Bengal. p. 81-85.

۲ (سیر المتاخرین۔ صفحہ ۳۶۳)

۳ Ramsay Muir, The Making of British India p 5.

گزر اوقات درخت کے پتوں اور گھانس پر تھی جس کی وجہ سے ہیضہ۔ بخار اور چیچک کی وبائیں پھوٹ پڑیں۔ اگرچہ سنہ ۱۷۷۱ء میں بنگال میں بارش کی حالت اچھی رہی لیکن سنہ ۱۷۷۰ء کی وباؤں اور عام تباہی کے معاشی اور عرانی اثرات ایسے شدید تھے کہ آئندہ نسلوں تک ان کے اثرات اہل بنگال کی زندگی میں موجود رہے[1] پرانے شرفا کے خاندان تباہ ہو گئے۔ کاشتکار اپنی زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ غرض کہ اس زمانہ میں بنگال کی معشیت زرعی کا توازن ایسا بگڑا کہ عرصہ تک درست نہ ہو سکا۔ بعد میں وارن ہیسٹنگز نے نومبر ۱۷۷۲ء کو مجلس نظما کو بنگال کی حالت کے متعلق جو مراسلہ لکھا تھا اس میں بنگال کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگرچہ قحط کے زمانہ میں خدا کی مخلوق سخت مصیبت میں مبتلا تھی لیکن کمپنی نے مالگزاری وصول کرنے میں کوئی کمی یا رعایت نہیں کی۔ وہ لکھتا ہے "۱۷۷۰ء کا قحط جوان صوبوں میں پڑا اور سال بھر رہا اس کے اثرات پہلے بھی مختلف تحریروں سے آپ کو معلوم ہو چکے ہوں گے۔ اس کی نسبت مجلس نظما اور عام پبلک کو جو اطلاع میں بھیجی گئی ہیں ان میں رحم و کرم کے جذبات برانگیختہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر جو الفاظ سے ممکن ہے کی گئی ہے۔ لیکن قحط کا کوئی نمایاں اثر مالگزاری کے جمع کرنے پر نہیں پڑا۔ ممکن ہے کہ مالگزاری جمع کرنے والوں نے کوئی اثر محسوس نہ کیا ہو اور ان لوگوں نے محسوس کیا ہو جن سے وہ جمع کی گئی ہے۔ اگرچہ ان صوبوں کی آبادی کا $\frac{1}{3}$ حصہ موت کے گھاٹ اتر چکا ہے جس کی وجہ سے یقیناً کاشتکاری میں کمی ہوئی ہوگی لیکن سنہ ۱۷۷۱ء کی مالگزاری کی مجموعی رقم سنہ ۱۷۶۸ء کی مجموعی رقم سے بھی زیادہ رہی ہے جیسا کہ حسابات کے خلاصہ سے ظاہر ہوگا"

قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ قحط کے المناک واقعات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مالگذاری میں تخفیف عمل میں آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس

[1] Hunter, the annals of rural Bengal, p. 19

کا سبب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ ماگزاری کے جمع کرنے میں جو سابقہ معیار قایم ہو چکے ہیں انھیں پورا کیا گیا اور اس کے لیے جو ذریعے استعمال کیے گئے ہوں گے انھیں معلوم کرنا آسان کام نہیں "۔

پانچواں باب

جنوبی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دشواریاں

— (۱۷۶۳ء تا ۱۷۷۲ء) —

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیوانی کے حقوق حاصل کر لیے تھے لیکن کرناٹک میں نواب محمد علی والاجاہ دیوان اور ناظم دونوں کے فرائض ادا کر رہا تھا لیکن حقیقی اقتدار یہاں بھی کمپنی کو حاصل ہو چکا تھا۔ انگریز اس وقت تک یہ نہیں چاہتے تھے کہ کرناٹک کے دروبست کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان علاقوں میں بھی جو کمپنی نے بطور جاگیر حاصل کر لیے تھے مالگزاری نواب ہی کے نام پر وصول کی جاتی اور اسی کو ادا کی جاتی تھی۔ معاہدۂ الہ آباد کی رو سے کلائیو نے یہ طے کرا لیا تھا کہ نواب محمد علی آئندہ سے دکن کے آصف جاہی خاندان کا تابع فرمان نہیں رہے گا اور وہ اپنے خاندان کے لیے والاجاہ کا لقب استعمال کر سکے گا۔ نواب محمد علی نے شروع ہی سے اپنے آپ کو انگریزی قوم کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ اگرچہ جنوبی ہند میں فرانسیسی قوت کے ٹوٹ جانے کے بعد کرناٹک کی سیاست کو کمپنی کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت باقی نہیں رہی تھی لیکن بہرحال کمپنی کا تجارتی مفاد اس

کا مقتضی تھا کہ وہاں امن و امان قایم رہے۔ چنانچہ مختلف پولیگاروں (زمینداروں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے نواب محمد علی انگریزوں کی امداد کا متوقع رہتا تھا۔ نواب محمد علی نے اپنے صدر مقام ارکاٹ میں سکونت ترک کر دی اور اب وہ مدراس میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ انگریز ساہوکاروں کا قرض اس پر بڑھتا جا رہا تھا جس کے ضمن میں اس نے اپنی علمداری کے بیشتر حصے ان کے حوالے کر دیے تھے کہ ان کا انتظام کر کے اپنا قرض وصول کریں۔ سنہ ۱۷۶۶ء میں حکومت مدراس نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ آئندہ سے نواب کو جو انگریز ساہوکار قرض دیں اس پر دس فی صدی سے زیادہ سود نہیں لیا جا سکے گا۔ اس زمانہ میں خود مدراس کے اکثر ارکان ذاتی تجارت یا لین دین کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں بعض کی رقمیں بڑھی ہوئی شرح سود پر نواب پر چڑھی رہتی تھیں جس کی وجہ سے نواب کونسل کو اپنے حسب منشا و متاثر کر لیا کرتا تھا۔

سنہ ۱۷۶۲ء میں نواب محمد علی والاجاہ نے مدراس کونسل کو باور کرا لیا کہ تنجور کے راجا پر اس کی پیشکش کی رقم عرصہ سے واجب الادا ہے۔ مدراس کے گورنر پیگاٹ نے نواب والاجاہ کی حمایت کی۔ چنانچہ انگریزی فوج کے بل پر تنجور کے راجا پرتاب سنگھ کو بقایا پیشکش کی رقم ادا کرنی پڑی اور وعدہ کرنا پڑا کہ آئندہ ہر سال وہ مقررہ پیشکش نواب کو ادا کرے گا۔ نواب کے ایما پر ویلور کے فوجدار مرتضیٰ علی اور مدورا کے فوجدار یوسف خاں کے خلاف بھی انگریزوں نے فوج کشی کی تا کہ ان کے علاقوں پر نواب والاجاہ کا نظم و نسق براہ راست قایم ہو جائے لیکن نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ نکلا کہ بد نظمی میں اور زیادہ وسعت ہو گئی۔

سرکار نظام اور کمپنی میں معاہدہ

اس وقت دکن اور جنوبی ہند میں سرکار نظام، مرہٹے اور حیدر علی والیٔ میسور کی تین اہم قوتیں حکمران تھیں جن کے ساتھ کمپنی کو سیاسی تعلقات استوار کرنے تھے۔ کلائیو نے بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ جو معاہدہ طے کیا اس کی رو سے

کمپنی کو شمالی سرکار کے قبضہ کی ترغیب حاصل ہو گئی جنھیں کرنل فورڈ نے فرانسیسیوں کو شکست دے کر ۱۷۵۹ء میں پہلی مرتبہ حاصل کیا تھا۔ ۱۷۵۹ء سے ۱۷۶۶ء تک شمالی سرکار کے نظم و نسق کی نوعیت یہ تھی کہ یہاں آصف جاہ ثانی نے حسین علی کو اپنے نگراں کار اور تعہدار کے طور پر مقرر کر دیا تھا جس کو ہدایت کی تھی کہ مالگزاری میں سے حکومت مدراس کے ساتھ آدھوں آدھ رقم بانٹ لی جایا کرے۔ حسین علی کی حکومت شمالی سرکار پر محض برائے نام تھی۔ لیکن حکومت مدراس نے فرانسیسی مداخلت کے مقابلہ پر بس کو گوارا کیا اور مالگزاری وصول کرنے کے ضمن میں سرکش پالیگاروں (زمینداروں) کے خلاف اگر فوج کشی کی ضرورت پڑتی تو کمپنی کی سپاہ استعمال ہوتی تھی۔ کلائیو نے شاہ عالم سے شمالی سرکار کے قبضہ کی جو سند حاصل کی تھی اس کو حکومت مدراس استعمال کرتے ہوئے ذرا ہچکچاتی تھی اس واسطے کہ جب تک بنگال کی صورت حالات میں یکسوئی نہ پیدا ہو جائے وہ کمپنی کے لیے مزید سیاسی پیچیدگی نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی۔ بالآخر مارچ ۱۷۶۶ء میں حکومت مدراس نے شمالی سرکار میں اس سند کی تشہیر کی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ان اضلاع کی مالگزاری وصول کرنے کے متعلق مغل بادشاہ سے ملی تھی۔ جنرل کیلیاڈ کو مع سپاہ و سامان شمالی سرکار روانہ کیا گیا تاکہ اگر نواب میر نظام علی خاں یا ان کے تعہدار حسین علی کی طرف سے کوئی مزاحمت ہو تو اس کا تدارک کیا جا سکے۔ جنرل کیلیاڈ کو اس کا علم تھا کہ نواب میر نظام علی خاں کو یہ بات بہت ناگوار گزری ہے کہ کلائیو نے بالا بالا بغیر ان کے مشورے کے شمالی سرکاروں کے متعلق شاہ عالم سے فرمان حاصل کر لیا۔ چنانچہ ان کا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف فوج کشی کریں اور اپنے عامل وہاں مقرر کریں۔ لیکن حکومت مدراس خواہ مخواہ صوبیدار دکن سے بگاڑ بھی نہیں چاہتی تھی۔ مدراس کے گورنر نے جنرل کیلیاڈ کو ہدایت دی تھیں کہ شمالی سرکاروں پر انگریزوں کے قبضہ و تصرف کا استقرار کرنے کے ساتھ اگر نواب میر نظام علی خاں سے بھی معاملات کی صفائی ہو جائے تو اچھا ہے۔

چنانچہ جنرل موصوف نے اس ضمن میں گفت و شنید شروع کی اور ۱۲ر نومبر ۱۷۶۶ء بمقام حیدرآباد ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار نظام میں معاہدہ طے ہو گیا جس کی رو سے حکومت مدراس نے سات لاکھ روپے سالانہ بطور پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ؑ یہ اضلاع سرکار نظام نے کمپنی کو بطور انعام جاگیر عطا کیے۔ سرکار مرتضیٰ نگر (گنتور) کے متعلق یہ طے ہوا کہ چونکہ یہ سرکار میر نظام علی خاں کے بھائی بسالت جنگ کی جاگیر ہے اس لیے تاحین حیات یہ انھیں کے قبضہ و تصرف میں رہے گی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سرکار بھی انگریزی عملداری میں شامل کر دی جائے گی۔ لیکن چونکہ سرکار گنتور کرناٹک کی سرحد پر واقع ہے جس کی حفاظت کا ذمہ کمپنی نے اپنے اوپر لیا ہے اس لیے اگر وہاں انتظامی ابتری پیدا ہوئی تو لامحالہ اس کا اثر کرناٹک پر پڑے گا۔ ایسی صورت میں کمپنی مجاز ہوگی کہ سرکار گنتور پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیے تاکہ کرناٹک سیاسی ابتری سے محفوظ رہے۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جب کبھی دونوں حکومتوں (سرکار نظام اور انگریزی حکومت) میں سے کسی کو فوجی امداد کی ضرورت ہو تو دوسرے فریق کا فرض ہوگا کہ وہ امداد کرے۔ یہ بھی طے ہوا کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ جو دو بٹالین پر مشتمل ہوگا یہ توپوں کے ساتھ سرکار عالی کی مدد کے لیے ہمیشہ دکن میں موجود رہے گا اور مناسب موقع پر سرکار نظام اس کو استعمال کرنے کی مجاز ہوگی۔ چنانچہ سرکار نظام نے قلعہ کنڈاپلی میں انگریزی فوج کو رہنے کی اجازت دیدی۔ اس فوج کی تنخواہ کی ادائی کی یہ صورت طے ہوئی کہ شمالی سرکاروں کی بابتہ جو پیشکش کمپنی کے ذمہ واجب الادا ہے اس میں سے اس فوج کی تنخواہ کی رقم منہا کر لی جائے گی اور بقایا سالانہ تین اقساط میں سرکار نظام کو ادا کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ دراصل حکومت مدراس نے حیدر علی والی میسور کے خلاف کیا تھا۔

حیدر علی کا عروج | جس زمانہ میں نواب میر نظام علی خاں دکن میں

لہ۔ Aitchison, Collection of Treatise, Vol. V, p. 145

برسر اقتدار ہوے اسی زمانہ میں جنوبی ہند میں حیدر علی نے عروج حاصل کیا۔ اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ میسور کے راجا کے معمولی ملازم کی حیثیت سے گذارا تھا۔ اپنی قابلیت اور اولعزمی سے وہ ڈنڈیگل کا فوجدار ہوا اور پھر کچھ عرصہ بعد سپہ سالار بن گیا۔ اس نے وزیر نکھندے راؤ کو قید کرلیا اور پھر وروبست پر خود حاوی ہو گیا۔ بیدنور کی ریاست پر قبضہ کرنے سے اس کو بہت کچھ دولت ملی جس سے اس نے اپنی فوج کو مستحکم کیا اور دربار کی رونق میں اضافہ کر کے شاہانہ آداب قائم کیے۔ راجا کو پنشن دے کر وہ میسور کی ریاست کا حکمران بن بیٹھا۔ اس کی قوت بہت جلد اتنی بڑھ گئی کہ آس پاس کے حکمران اس سے ڈرنے لگے۔ جب اس نے مالابار فتح کیا تو وہاں جو انگریزی تجارتی کوٹھیاں حکومت بمبئی کے تحت تھیں ان سے اس کو سابقہ پڑا۔ کمپنی کی حکومت بمبئی حیدر علی سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے حکومت مدراس کو لکھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکالنی چاہیے جس کی بدولت حکومت مدراس بیچ میں پڑ کر حیدر علی اور نواب محمد علی کے جھگڑوں کو ختم کیا جا سکے۔ حیدر علی کو یہ توقع تھی کہ حکومت بمبئی کے توسط سے وہ بارود اور اسلحہ وغیرہ خرید سکے گا جو کہ اس کی حکومت کے لیے نہایت ضروری تھا۔ اس نے حکومت بمبئی سے باہمی امداد کا معاہدہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اس واسطے کہ جنوب کے نائر حکمرانوں سے انگریزی حکومت کے پہلے سے دوستانہ معاہدے تھے اور ان کے ملک کو حیدر علی نے فتح کر لیا تھا۔ لیکن حکومت بمبئی حیدر علی سے بگاڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔[1]

حیدر علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو پیشوا اور سرکار نظام دونوں خاص طور پر اپنے لیے مخدوش خیال کرتے تھے۔ چنانچہ جب حیدر علی نے

---

[1] Forrest, Bombay Selections, II, p. 123-31

مالابار کے اضلاع فتح کرنے کے بعد شمال میں دریائے کرشنا کے علاقوں کی طرف توجہ کی تو ۱۷۶۶ء میں پیشوا اور سرکار نظام نے اس کے خلاف متحد ہو کر کشی کر دی۔ حیدر علی نے مرہٹوں کو روپیہ دے کر راضی کر لیا اور نواب میر نظام علی خاں کو آمادہ کر لیا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف اس سے اتحاد کر لیں تو وہ انھیں شمالی سرکار واپس دلوا دے گا۔ چونکہ انگریزوں نے ۱۷۶۶ء میں سرکار نظام سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی جیسی کہ چاہیے پابندی نہیں کی گئی تھی اور شمالی سرکاروں کی پیشکش ادا نہیں کی گئی تھی اس لیے انھیں حکومت مدراس پر مطلق اعتبار نہیں رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مفاد اسی میں دیکھا کہ اس وقت حیدر علی کا ساتھ دیں۔ اس موقع پر حیدر علی نے یہ بھی طے کر لیا کہ نواب محفوظ علی خاں برادر کلاں نواب محمد علی والاجاہ کی بیٹی سے ٹیپو سلطان کی شادی ہو جائے تو سرکار نظام کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس ترکیب سے نواب محمد علی کو کرناٹک کی نوابی کے حق سے محروم کر کے ٹیپو سلطان کا وہاں حق قائم کر دیا جائے گا۔ اس صلحنامہ پر حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں دونوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

پہلی جنگ میسور

اس کے بعد حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں کی متحدہ افواج نے ۱۷۶۶ء میں کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کی رو سے جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں رکھی گئی تھی اسے حکومت مدراس نے واپس بلا لیا۔ کرنل اسمتھ کی فوج سے حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں کی متحدہ افواج کا مقابلہ چنگما اور تری نوملی کے مقامات پر ہوا۔ اسی دوران میں نواب ارکاٹ محمد علی والاجاہ نے نواب میر نظام علی خاں کے مدارالمہام نواب رکن الدولہ کے توسط سے انگریزی حکومت اور سرکار نظام میں صلح و صفائی کرانے کی کوشش کی اور اس کو اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ نواب میر نظام علی خاں حیدرآباد واپس تشریف لے آئے۔ نواب محمد علی والاجاہ نے نواب میر نظام علی خاں کو یہ باور کرا دیا کہ حیدر علی انھیں اپنے مقاصد کے

لیے بطور آلۂ کار استعمال کررہا ہے۔

سرکار نظام سے معاہدہ کی تجدید

۱۷۶۸ء میں بمقام مدراس ایک جدید معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ سرکار نظام سات لاکھ روپے سالانہ پیشکش کے صلہ میں کرناٹک بالاگھاٹ کی دیوانی کے حقوق ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض فرمادیں گے اور پانچوں سرکاروں پر کمپنی کو حقوق ملکیت حاصل ہوں گے سوائے سرکار گنتور کے جس پر کمپنی کو بسالت جنگ کے حین حیات قبضہ و تصرف کا حق نہ ہوگا۔ ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کے بموجب سات لاکھ کی پیشکش ادا کرنے کا جو حکومت مدراس نے وعدہ کیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔ یہ بھی طے ہوا کہ حکومت مدراس کرناٹک اور بالاگھاٹ کو حیدر علی سے چھین کر اپنے قبضہ و تصرف میں بطور جاگیر کے رکھ سکتی ہے۔ نواب میر نظام علی خاں، ایسٹ انڈیا کمپنی، نواب محمد علی والا جاہ کے مقبوضہ علاقوں کے ایسے زمینداروں کو اپنی پناہ میں نہیں لیں گے اور نہ ان کی ہمت افزائی کریں گی جن کے سبب سے امن و امان میں خلل پڑ رہا ہو۔ تینوں میں سے ہر ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن متصور ہوگا۔ ان تینوں فریق میں سے کسی ایک کے علاقہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو باقی کو مدد کرنا لازم ہوگا۔ کمپنی اور والا جاہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر سرکار نظام کو ضرورت ہوگی تو دو بٹالین، چھ توپیں جو یوروپین ماہروں کی نگرانی میں ہوں گی روانہ کی جائیں گی بشرطیکہ سرکار نظام ان کے اخراجات اپنے ذمہ لیں۔ یہ فوج جب تک کہ سرکار نظام کی خدمت رہے گی اس وقت تک اس کا قیام قلعہ کنداپلی میں رہے گا۔ چونکہ شاہ عالم بادشاہ دہلی نے شاہی فرمان کے ذریعہ سے نواب محمد علی والا جاہ اور اس کے وارثوں کو کرناٹک پائیں گھاٹ کی حکومت تفویض کی ہے اور نواب میر نظام علی خاں نے بھی سالانہ پیشکش کے عوض بذریعہ سند کرناٹک پائین گھاٹ کو دکن کی ماتحتی سے آزاد کردیا ہے اور اس علاقہ کے جملہ گزشتہ و حال کے تمام مطالبات کو سوخت کردیا

ہے، اس لیے نواب محمد علی والاجاہ اور اس کے وارثوں کو کرناٹک پائیں گھاٹ کے علاقے بطور التمغا یا معافی اپنے قبضہ و تصرف میں رکھنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔

حیدر علی نے باوجود سرکار نظام کے علیحدہ ہو جانے اور انگریزوں اور نواب محمد علی والاجاہ کا حلیف بن جانے کے جنگ کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ شروع میں تو دو ایک جگہ اس کی فوج پسپا ہوئی لیکن ۱۷۶۷ء میں اس نے کرنل اسمتھ اور کرنل ووڈ کو پے در پے شکستیں دیں اور ملک میں خوب لوٹ مار کی۔ حیدر علی کا دھیان ہٹانے کے لیے انگریزوں نے بمبئی سے ایک فوج ساحل منگلور پر اتار دی تاکہ اس طرف سے بڑھ کر بیدنور اور قریب کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کرلے۔ حیدر علی نے اپنے بیٹے ٹیپو سلطان کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا اور پھر کچھ دن بعد کرناٹک میں میر علی رضا خاں (فرزند چندا صاحب) اور محمد علی کمیدان کی سرکردگی میں اپنی فوج چھوڑ کر خود بھی منگلور کی جانب بڑھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مغربی ساحل کی طرف چلے جانے سے انگریزی فوج کو موقع ملا کہ کرناٹک کے کھوئے ہوئے علاقوں پر قبضہ کرلے۔ منگلور پر حیدر علی نے قبضہ کرلیا اور انگریزی فوجوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا سامان چھوڑ کر جہازوں پر سوار ہو کر بمبئی واپس جائیں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے کرناٹک پر زبردست حملے شروع کر دئے۔ حیدر علی کے مشہور جنرل فیض اللہ خاں نے انگریزی فوجوں کو متعدد مقامات پر شکست دی۔ اس جنرل کی قابلیت اور فن جنگ کی مہارت کو انگریز مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں۔[۱] دسمبر ۱۷۶۸ء میں حیدر علی کی فوجیں بارہ محل میں داخل ہوئیں اور مارچ ۱۷۶۹ء مدراس سے پانچ میل پہنچ گئیں جس کے باعث حکومت مدراس نے اپنے لیے زبردست

۱۔ Thornton, History of British India, Vol I, p. 366.

خطرہ محسوس کیا اور صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔

مدراس کا صلحنامہ

مدراس کونسل کے رکن مسٹر اینڈریوز نے حیدر علی کے کیمپ میں آکر صلح کی شرطیں طے کیں اور بارہ روز کے لیے التوائے جنگ منظور کر لیا گیا۔ حیدر علی کی شرطوں کو شروع میں مدراس کونسل نے ماننے سے انکار کیا لیکن بہت جلد یہ محسوس کیا گیا کہ وہ مدراس پر قبضہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ جب اس کی فوجیں مدراس کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو مدراس کونسل نے [illegible] مسٹر ڈیوپرے ۱۲ اپریل ۱۷۶۹ء صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجے گئے۔ صلح کی شرائط یہ تھیں کہ فریقین نے ایک دوسرے کے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے وہ واپس کر دئے جائیں۔ بارہ محل کرور کے علاقے اور دوسرے سرحدی مقامات جو اصل میں میسور کے تحت تھے اور جن پر نواب محمد علی والا جاہ قابض ہو گیا تھا وہ حیدر علی کو واپس کر دئے جائیں گے۔ یہ بات نواب والا جاہ کو بہت ناگوار گذری اور کمپنی کے خلاف اس کو شکایت کا موقع ملا لیکن حکومت مدراس مجبور تھی کہ حیدر علی سے معاہدہ کرے اور نواب والا جاہ کے مفاد کو قربان کرے اس لیے کہ بغیر ایسا کیے ہوئے اس کو مصیبت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ فریقین ایک دوسرے کے سب قیدی واپس کر دیں گے۔ اگر کسی تیسری قوت سے جنگ ہو تو فریقین ایک دوسرے کی فوجی اعانت کریں گے[1]

صلحنامۂ مدراس کے کچھ دنوں بعد حکومت بمبئی نے بھی حیدر علی کے ساتھ ایک علحدہ معاہدہ کر لیا جس کی رو سے کمپنی کو ریاست میسور میں مرچ خریدنے کا تنہا ٹھیکا حاصل ہو گیا جس کے عوض حکومت بمبئی حیدر علی کو توپیں، بندوقیں، شورہ، بارود اور سیسہ مہیا کرے گی اور اس کے بعد بھی جو رقم بچے گی وہ نقد ادا کی جائے گی۔ مالابار کے جنگلوں میں لکڑی خریدنے اور منگلور کی بندرگاہ سے چاول باہر بھیجنے کا بھی کمپنی نے حق حاصل کر لیا۔ حکومت بمبئی نے وعدہ کیا کہ وہ حیدر علی کے دشمنوں کی مدد نہ کرے گی اور اسی طرح حیدر علی کمپنی کے دشمنوں کی اعانت سے احتراز

[1] Thronton History of British India P 578

کرے گا۔[1]

غرض کہ حکومت مدراس اور بمبئی دونوں نے حیدر علی کے ساتھ جو معاہدے کیے ان میں اس امر کا وعدہ کیا گیا کہ اگر حیدر علی کی کسی دوسری قوت سے جنگ ہو تو انگریز اس کی مدد کریں گے۔ اس معاملہ میں بڑی نزاکت کے پہلو نکلتے تھے۔ نظام، مرہٹے اور حیدر علی کے مفاد کا تصادم اس قدر واضح تھا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں تھی۔ انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ مدد کرنے کے وعدے تو ان تینوں قوتوں سے کریں لیکن انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نبٹنے دیں تاکہ وہ آپس میں لڑ لڑ کے نڈھال ہو جائیں۔ انگریزوں نے پہلے سرکار نظام سے دوستانہ معاہدہ کیا، پھر حیدر علی سے اور سب سے آخر میں مرہٹوں سے بھی معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں طاقتوں کے مفاد جب ایک دوسرے سے دائمی طور پر ٹکرا رہے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ انگریز ان سب کی مدد کر سکتے۔ پھر حکومت مدراس نے نواب والا جاہ کے ساتھ جو اتحاد قایم کر کے اس کو اپنی حفاظت میں لیا تھا اس کی وجہ سے بھی جنوبی ہند کی سیاست میں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ نواب محمد علی والا جاہ سرکار نظام کا کم اور حیدر علی کا زیادہ مخالف تھا۔

اگرچہ اس نے ظاہری طور پر کمپنی اور سرکار نظام میں یکسوئی اور صفائی کی کوشش کی تھی تاکہ حیدر علی کا خاتمہ کیا جا سکے لیکن وہ دل سے یہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ انگریزوں اور سرکار نظام میں مضبوط اتحاد قایم ہو۔ بلکہ اس کی کوشش برابر یہ رہی کہ حکومت مدراس مرہٹوں سے دائمی اتحاد قایم کرے تاکہ ان کی مدد سے حیدر علی اور سرکار نظام دونوں کو نیچا دکھا

1۔ Dupre to Orme, 10 June, 1769 (Love, Vestiges of old Madras II p. 599); Auber, Vol. I, p. 266-67.

ممکن ہوسکے۔ معاہدۂ مدراس میں جو شرطیں طے ہوئیں ان کی وجہ سے کمپنی دکن کی پرآشوب سیاست میں الجھ کر رہ گئی اور اس کے فوجی اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا۔ نواب محمد علی والاجاہ حکومت مدراس سے ناراض ہوگیا اس لیے کہ معاہدۂ مدراس میں اس کے مفاد کو قربان کردیا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی شکایتیں جان میکفرسن کے ذریعہ جو ان دنوں انگلستان جارہا تھا حکومت انگلستان تک پہنچوادیں اور اس کے ساتھ حکومت مدراس نے جو بدسلوکی کی اس کی تفصیل لکھ بھیجی۔ نواب والاجاہ پر پچھلے دنوں جو قرض ہوگیا تھا اس کی وجہ سے بھی اس میں اور حکومت مدراس میں ناموافقیت پیدا ہوگئی تھی۔

مرہٹے اور حیدر علی

سنہ۱۷۷۰ء میں حکومت انگلستان نے سر جان لنڈ سے کو نواب محمد علی والاجاہ کی شکایات کے متعلق تحقیق کرنے اور کمپنی کے عام سیاسی حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے بطور سفیر خاص روانہ کیا۔ اس کے مدراس پہنچنے کے بعد مرہٹوں اور حیدر علی میں لڑائی چھڑ گئی۔ سنہ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد اگرچہ مرہٹوں کی قوت مضمحل ہوگئی تھی لیکن اس کے سات سال بعد پیشوا مادھوراؤ کی سرگرمی میں مرہٹہ قوت کی تنظیم عمل میں لائی گئی اور نانافرنویس کے تدبر نے کھوئے ہوئے مرہٹہ اقتدار کو پھر سے مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ فوجی تنظیم کے ساتھ تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے راجپوتانہ کے راجاؤں سے دس لاکھ کی رقم بطور چوتھ وصول کی گئی اور پھر سنہ۱۷۷۱ء میں دوآبہ پر یورش کردی گئی۔ روہیلے سردار حافظ رحمت خاں سے بھی (۴۰) لاکھ کی رقم کا وعدہ لے لیا گیا جس کی ضمانت نواب اودھ نے کی۔ حیدر علی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مرہٹے اپنے لیے مخدوش خیال کرتے تھے۔ پچھلے دنوں میسور کے

۱۔ Cambridge History of India, Vol V, p 277.

علاقے میں ان کے چوتھ کے حقوق کا حیدر علی نے خاتمہ کر دیا تھا۔ پیشوا نے حیدر علی سے ایک کروڑ کا مطالبہ کیا اور [illegible] لشکر کے ساتھ قتل و غارت کرتے ہوئے سرنگا پٹم کی فصیلوں تک پہنچ گئے۔ حیدر علی نے ہر چند حکومت مدراس کو لکھا کہ معاہدہ مدراس کے بموجب انھیں مدد کرنی چاہیئے۔ اس نے حکومت مدراس کو یہ بھی لکھا کہ اگر اس وقت اس کی امداد کی گئی تو وہ بارہ محل کا علاقہ واپس کرنے اور کچھ رقم بھی ادا کرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر اس وقت اس کی مدد نہ کی گئی تو وہ مجبور ہو کر فرانسیسیوں سے نامہ و پیام شروع کر دے گا تاکہ انھیں سے کچھ اعانت مل سکے۔ لیکن نواب محمد علی والاجاہ نے سرجان لنڈسے کو اپنا ہم خیال بنالیا کہ انگریزوں کو حیدر علی کی امداد کے بجائے مرہٹوں سے اتحاد قائم کرنا چاہیے کہ اسی میں ان کے مفاد کی حفاظت ممکن ہے۔ چنانچہ لنڈسے اور اس کے جانشین ہارلینڈ نے پیشوا سے معاہدہ کی گفت و شنید کی جس کی مدراس کونسل نے سخت مخالفت کی۔ غرض کہ کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ باوجود نواب محمد علی والاجاہ کی کوشش کے مرہٹوں سے معاہدہ نہ ہو سکا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں نے حیدر علی کی مطلق امداد نہ کی۔ اب حیدر علی کے لیے مرہٹوں سے دب کر صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس نے چھتیس لاکھ روپے نقد ادا کیے اور چودہ لاکھ سالانہ چوتھ دینے کا وعدہ کیا اور اپنی ریاست کے شمال مغربی اضلاع مرہٹوں کے حوالہ کر دیئے۔ اسنے یہ صلح بہت گراں قیمت پر خریدی۔ اس نے انگریزوں کی وعدہ خلافی کو فراموش نہیں کیا اور نو سال بعد ان سے جنگ کر کے تاوان وصول کیا۔

نواب محمد علی والاجاہ نے شاہی سفیر لنڈسے اور اس کے جانشین ہارلنڈ کو ایسا قابو میں کر لیا کہ وہ اسکا کلمہ پڑھنے لگے اور وہ جو کچھ چاہتا اس کی تائید کرتے۔ نواب نے تنجور کے راجا سے اپنے پیشکش کے مطالبات

کی رقم وصول کرنے کی کوشش شروع کی تو ظاہر ہے کہ وہ کمپنی کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ مدراس کونسل بھی اس کی ہم نوا ہوگئی۔ ۱۷۶۲ء میں گورنر پیگاٹ کے بیچ میں پڑنے سے یہ طے ہوگیا تھا کہ راجا تنجور نواب محمد علی والا جاہ کو آئندہ سے پابندی کے ساتھ پیشکش ادا کیا کرے گا۔
نواب محمد علی والا جاہ نے راجا تنجور پر یہ الزام لگایا کہ اس نے حیدر علی کے ساتھ ساز باز کر رکھا ہے اور جو رقم واجب الادا ہے وہ بھی نہیں ادا کی۔ چنانچہ کمپنی کی افواج نے ۱۷۷۳ء میں تنجور پر حملہ کرکے راجا کو گرفتار کرلیا۔ اس پر انگلستان میں سخت تنقید ہوئی اور سابق گورنر پیگاٹ کو حکومت مدراس کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کردیا گیا۔ پیگاٹ نے مدراس پہنچ کر راجا کو اس کی گدی پر بحال کردیا۔ اب نواب محمد علی والا جاہ اور گورنر پیگاٹ میں سخت کشمکش شروع ہوئی۔ نواب والا جاہ نے اپنے قرض خواہوں کو جن میں اکثر انگریز ساہوکار (بینکرز) تھے تنجور کے علاقے میں براہ راست مالگذاری وصول کرنے کے حقوق دیدیے تھے تاکہ ان کے قرض کی بازیابی ہو۔ اس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ان قرض خواہوں میں پال بین فیلڈ نے بعد میں بہت شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مدراس کونسل کے بعض ارکان کا بھی نواب پر قرض تھا۔ وہ بھی تنجور میں مالگذاری وصول کرنے کے حق سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مدراس کونسل کے ارکان کی اکثریت گورنر پیگاٹ کی قدم قدم پر مخالفت کرنے لگی جس کی وجہ سے اس کو کم و بیش اسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو وارن ہیسٹنگز کو بنگال میں پیش آئی تھی۔ جنوبی ہند کے نظم و نسق میں سخت ابتری پیدا ہوجانا ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔

چھٹا باب

وارن ہیسٹنگز کا نظم و نسق اور انگریزی حکومت کا استحکام

وارن ہیسٹنگز ۱۷۴۹ء میں ۱۸ سال کی عمر میں کمپنی کے معمولی اہلکار کی حیثیت سے پہلی مرتبہ ہندوستان آیا۔ اپنی محنت اور قابلیت سے اس نے ایک ایک کرکے ترقی کے سب درجے طے کئے۔ پہلے پہل کلائیو نے اس کے ذاتی جوہر کو پہچانا اور قدر کی۔ جنگ پلاسی کے بعد وارن ہیسٹنگز کو میر جعفر کے دربار میں کمپنی کے ریزیڈنٹ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ پھر وہ کلکتہ کونسل کا رکن ہوا۔ جنگ بکسر کے بعد وہ انگلستان واپس گیا لیکن ۱۷۶۹ء میں کمپنی کی مجلس نظما نے اس کو مدراس کونسل کی رکنیت پر اور پھر ۱۷۷۲ء میں بنگال کی گورنری پر مقرر کیا۔

دوعملی کا خاتمہ

وارن ہیسٹنگز نے جس وقت حکومت بنگال کا جائزہ لیا اس وقت کلائیو کے قائم کئے ہوئے دوعملی کے نظام کی خرابیاں اچھی طرح ظاہر ہو چکی تھیں۔ یہ انتظام ملک کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا جس سے چھٹکارا دلانا ضروری تھا۔ مرشدآباد کے انگریز ریزیڈنٹ بیشر Becher. نے بنگال کی ابتری کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے:-

"ہر انگریز کو یہ معلوم کرکے رنج ہونا چاہئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی کے حقوق ملے ہیں اس ملک کے باشندوں کی حالت پہلے کے مقابلہ میں بہت خراب

ہوگئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خوشنما ملک جو انتہا درجہ کی استبدادی اور مطلق العنان حکومت کے تحت خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا اب جب کہ انگریزوں کا اس کے نظم و نسق میں بڑا حصہ ہے، تباہی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے[1] دو عملی کے تحت وصول مالگزاری کا انتظام نائب دیوان محمد رضا خاں اور شتاب رائے اور ان کے مقرر کئے ہوئے عاملوں اور گماشتوں کے ذریعے سے ہوتا تھا لیکن انگریز ریزیڈنٹ کی نگرانی ان پر رہتی تھی۔ ہر ضلع میں جو انگریز نگراں کار (سپروائزر) مقرر کئے گئے تھے وہ دیسی بنیوں کے ذریعے اندرونی تجارت سے خوب دل کھول کر نفع کما رہے تھے۔ باہر کے سٹہ کرنے والے بھی رعایا کا خون چوس رہے تھے ۱۷۷۰ء کے قحط کے بعد دو عملی کے نظم و نسق سے رعایا اور زیادہ تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ وارن ہیسٹنگز نے پہلا کام یہ کیا کہ محمد رضا خاں اور شتاب رائے دونوں کو خدمت سے الگ کر کے ان پر غبن کا مقدمہ قائم کر دیا اور دونوں کو کلکتہ میں قید کر دیا تا کہ کمپنی کے خلاف وہ اپنے اثر کو استعمال نہ کر سکیں۔ ایک سال کے بعد دونوں کو بری کر دیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں کے لیے اس نے پہلے ہی سے مجلس نظما سے سب کچھ طے کر لیا جس نے اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات دے دئے تھے[2] اس لئے کہ بنگال کی انتظامی ابتری سے انگریزی تجارت اور آمدنی کو بالآخر نقصان پہنچا۔ آیندہ دو سال میں بنگال کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے جو تدبیریں کی گئیں ان کی پوری ذمہ داری وارن ہیسٹنگز پر ہے جیسے اس نے خود مانا ہے[3]

نظم و نسق کی اصلاح

وارن ہیسٹنگز نے مالگزاری جانچ کرا کے زمینوں کو پانچ سال کے ٹھیکہ پر نیلام کرا دیا اور انگریز کلکٹروں کے

۱۔ Monckton Jones, Warren Hastings in Bengal. صفحہ 145

۲۔ ایضاً صفحہ ۵۵

۳۔ Selections from the state papers of the Governers-General of India Warren Hastings ed by G. W Farrest). جلد دوم II, صفحہ

ذریعہ مالگزاری کی پوری رقم وصول ہونے کا انتظام کیا۔ اس کی پابندی بھی کی گئی کہ رعایا پٹہ پر زمین لے سکے اور مقررہ لگان میں اضافہ نہ کیا جائے۔ کلکٹروں کو نجی تجارت سے پورے طور پر روک دینا ممکن نہ تھا جب تک کہ ان کی تنخواہ میں کافی اضافہ نہ کیا جاتا جس کے لیے کمپنی اس وقت تیار نہ تھی۔ چنانچہ نجی تجارت کی کچھ برائیوں کو تجارت کے قاعدے وضع کرکے دور کیا گیا۔ دستک کا طریقہ بند کر دیا گیا۔ کمپنی اور اس کے ملازمین اور دیسی تاجروں کے لیے محصول میں یکسانی قائم کر دی گئی تاکہ فرق و امتیاز کی وجہ سے جو آئے دن جھگڑے ہوا کرتے تھے وہ نہ ہوں[1]۔ پٹنہ اور مرشد آباد کی دو مجالس مال (ریونیو بورڈز) کی جگہ اس نے کلکتہ میں ایک مجلس مال قائم کی اور خزانہ بھی مرشد آباد سے کلکتہ کو منتقل کر دیا۔ مجلس مال گورنر اور اس کی کونسل کے چار ارکان پر مشتمل تھی۔ بنگال کو مالگزاری جمع کرنے کی آسانی کے لحاظ سے چودہ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا۔ مالگزاری کے عہدہ داروں (کلکٹروں) کی ہدایت کے لیے قاعدے مرتب کیے گئے۔ ہر ضلع میں ایک دیوانی اور ایک فوجداری عدالت قائم کی گئی۔ یہ دونوں عدالتیں کلکٹر کے تحت ہوتی تھیں۔ فوجداری عدالت میں کلکٹر ایک قاضی اور دو مفتیوں یا ہندو پنڈتوں کی مدد سے مقدموں کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ کلکتہ میں صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت مرافعہ کے لیے قائم کی گئیں۔ صدر دیوانی عدالت کے مرافعوں کی سماعت ایک ہندوستانی جج کرتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کی تدوین کروائی تاکہ مقدموں کے فیصلوں میں آسانی ہو۔ سنسکرت سے فارسی میں ہندوؤں کے قوانین کا مجموعہ منتقل کیا گیا اور مسلمانوں کے مقدموں کے لیے فتاوی عالمگیری کو معیار قرار دیا گیا۔ ہر ضلع میں پولیس کے محکمہ کی تنظیم کی گئی اور فوجداروں کا تقرر کیا گیا جو ضلع میں امن کے قیام کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ پولیس کے اس نئے انتظام کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ روہانیہ کی ترائی میں جو سنیاسی لوگوں

---

[1] Ramsay Muir, the Making of British India. صفحہ 107

کے غول پھرا کرتے تھے اور گاؤں میں سے چھوٹے بچوں کو چرا لے جایا کرتے تھے انھیں سخت سزائیں دے کر ان کی پوری روک تھام کی گئی۔ یہ اصلاحیں وارن ہیسٹنگز نے اپنی گورنری کے ابتدائی چھ مہینوں میں نافذ کیں۔

نواب نجم الدولہ کا انتقال کلائیو کے عہد ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میر جعفر کے دو بیٹے سیف الدولہ اور پھر مبارک الدولہ باری باری سے نواب ہوئے۔ مبارک الدولہ گدی نشینی کے وقت نابالغ تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اس کی والدہ منی بیگم کو اس کا ولی اور راجا نند کمار کے بیٹے راجا گرو داس کو محل کے انتظامات کا نگران کار مقرر کیا۔ نواب کو ۳۲ لاکھ روپے سالانہ بنگال کی مالگزاری میں سے دئے جاتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے اب ۱۶ لاکھ روپئے سالانہ مقرر کر دئے۔ محل کے انتظامات میں جو فضول خرچیاں ہوتی تھیں ان کا بھی روک تھام کی گئی۔

بنارس کا معاہدہ ستمبر ۱۷۷۳ء

اندرونی اصلاحات کی طرف سے تھوڑی بہت فرصت پانے کے بعد ہیسٹنگز نے کمپنی کے خارجی تعلقات کی طرف توجہ کی۔ کلائیو کے زمانے میں مرہٹوں کی سیاسی قوت پانی پت کی جنگ کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن ۱۷۶۹ء میں انھوں نے پھر نربدا پار کر کے دہلی کی سیاست پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی۔ مادھوجی سندھیا نے ۱۷۷۱ء میں بادشاہ شاہ عالم کو اپنے ساتھ الہ آباد سے دہلی لے گیا اور مدت تک وہ ایک نظر بند کی حیثیت سے رہا۔ جس طرح انگریز شاہ عالم کو الہ آباد میں اپنے قابو میں رکھ کر سیاسی فائدے اٹھانا چاہتے تھے اسی طرح مرہٹے اس کو دہلی میں رکھ کر اس کے ذریعہ سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شاہ عالم نے مادھوجی سندھیا کو سلطنت کا وکیل مطلق مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے دوآبہ کے علاقہ پر اپنا قبضہ جمایا۔ پھر جب مرہٹہ فوجوں کو دہلی خالی کرنا پڑا تو غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا کر قید کر دیا۔ لیکن سندھیا نے دہلی پر پھر قبضہ کر کے شاہ عالم کو چھڑایا اور اس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ چنانچہ

ہیسٹنگز نے ۲۶ لاکھ کی پیشکش بند کردی جو سالانہ ادا کی جاتی تھی اور کڑہ واِلہ آباد کے ضلعوں پر جو کلائیو نے اس کے گذارے کے لیئے دئیے تھے انگریزی فوجوں نے قبضہ کرلیا اس لیے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ مرہٹے ان پر قبضہ کرلیں گے۔
اگست ۱۷۷۳ء میں وارن ہیسٹنگز نے شجاع الدولہ نواب اودھ کے ساتھ بنارس میں معاہدہ کیا جس کی رو سے اِلہ آباد اور کڑہ کے ضلعے پچاس لاکھ روپیے کے معاوضہ میں اس کے حوالہ کردئیے گئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ کمپنی نواب کی فوجی مدد کرے گی تاکہ وہ رہیلکھنڈ کے علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرسکے[1]۔ جب تک انگریزی فوجیں نواب کے استعمال میں رہیں گی اس وقت تک وہ دو لاکھ دس ہزار روپئے ماہوار ان کے خرچ کی بابجائی کے لیے ادا کرے گا۔ نواب نے وعدہ کیا کہ رہیلوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ بنارس کے قریب چنار کا قلعہ کمپنی کو دیدے گا۔ اس کے علاوہ وہ چالیس لاکھ کی رقم بھی ادا کرے گا جو فوج کے اخراجات کے علاوہ ہوگی۔ ہیسٹنگز نے سوچا کہ اس معاہدہ سے کمپنی کی مالی حالت بھی اچھی طرح سدھر جائے گی اور رہیلوں کی قوت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جن کا اگر مرہٹوں سے اس وقت اتحاد ہو جاتا تو اودھ اور کمپنی کے علاقوں کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ رہیلوں نے اب تک انگریزی حکومت کی مخالفت میں کوئی کارروائی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے انہیں کمپنی کا دشمن سمجھا جاتا۔

رہیلوں کی جنگ انگریزوں سے معاملوں کی یکسوئی کے بعد نواب شجاع الدولہ نے رہیلہ سردار حافظ رحمت خاں سے ۳۵ لاکھ کی رقم طلب کی جس کے ادا کرنے کا اس نے اس شرط سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرہٹوں کے خلاف اس کی حفاظت میں امداد کرے۔ کل رقم ۱۷ جون ۱۷۷۲ء کے معاہدہ کے ذریعہ ۴۰ لاکھ ہوئی تھی جس میں سے پہلی قسط

[1] Selections from the state papers of the Governors-General of India, Warren Hastings, جلد II, صفحہ 314.

حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر کو ادا کر دی تھی۔ حافظ رحمت خاں نے کہا کہ مرہٹوں
کی واپسی نواب وزیر کی کوشش سے نہیں بلکہ دربار پونا کے حکم سے ہوئی جس میں
نواب وزیر کی کوششوں کو کوئی خاص دخل نہ تھا۔ غرض کہ کچھ دن نواب وزیر اور
روہیلہ سرداروں میں بات چیت ہوتی رہی۔ آخر نواب وزیر نے وارن ہیسٹنگز کو مدد
کے لیے لکھا جو معاہدہ بنارس کی رو سے اس کا وعدہ کر چکا تھا۔ کلکتہ کونسل نے
کچھ سوچ بچار کے بعد نواب وزیر کی فوجی امداد کرنے کی تائید کی[لہ]۔ چنانچہ کرنل چمپین
کے تحت انگریزی فوج اودھ روانہ ہو گئی۔ انگریزی فوج اور نواب کی فوج نے
مل کر روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا۔ میرن پور کٹرہ کے مقام پر بڑا رن پڑا جس میں حافظ
رحمت خاں شہید ہوئے۔ تقریباً ۲۰ ہزار روہیلوں نے وطن چھوڑ کے گنگا پار جا کر
اپنی بستی بسائی تاکہ نواب اودھ کے قابو سے نجات ملے۔ روہیلکھنڈ کا پورا علاقہ
اودھ میں ملا لیا گیا۔ صرف رامپور کی ریاست باقی رہی جہاں فیض اللہ خاں
کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا جس کے ساتھ ۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء کمپنی نے دوستانہ معاہدہ کر لیا۔
موجودہ نواب رامپور فیض اللہ خاں ہی کی اولاد میں ہیں۔ خود کرنل چمپین نے ان
زیادتیوں کی شکایت کی جو نواب اودھ کے سرداروں نے روہیلکھنڈ کی رعایا
پر روا رکھیں۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز سے جب پوچھ گچھ شروع ہوئی تو جنگ روہیلہ
کے سلسلے کی زیادتیاں ایک ایک کر کے اس کے خلاف الزام کے طور پر پیش کی
گئیں۔

سر جان اسٹریچی، جس نے وارن ہیسٹنگز کی حمایت کی ہے، جنگ روہیلہ
کے فائدوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ روہیلکھنڈ پر نواب وزیر
کا قبضہ ہو جانے سے اودھ اور بنگال کی شمال مغربی سرحد مرہٹوں سے محفوظ ہو گئی
جو اس وقت انگریزی حکومت کے سب سے قوی دشمن تھے۔ پھر یہ دعویٰ بھی درست
نہیں کہ جنگ روہیلہ کے سلسلے میں جو مظالم ہوئے ان کی ذمہ داری ہیسٹنگز پر نہیں
ہے اس واسطے کہ جنگ کی تفصیلات اس نے معین نہیں کی تھیں۔ دراصل چمپین

لہ۔ Strachey,W Hastings and the Rohilla War, p 123

اخلاقی طور پر حق بجانب نہیں کہی جا سکتی۔ بقول لائیل "یہ جنگ اصولاً غلط تھی اس لیے کہ رہیلوں نے ہمیں کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور نواب وزیر سے اس کے سوا کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنے اس مفید تعلق سے جو اس کو انگریزوں کے ساتھ حاصل تھا بیجا فائدہ اٹھاتا"[۱]

اس وقت کے حالات کی جانچ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے رہیلکھنڈ کے علاقے میں جو حکومت قائم کی تھی وہ انتشار کے اس دور میں بہت غنیمت تھی اور نواب اودھ کی حکومت سے کہیں بہتر تھی۔ اس نے تقریباً چالیس سال تک ملک میں امن و امان قائم رکھا۔ چنانچہ رام پور میں جو پہلے انگریز ریزیڈنٹ بھیجا گیا تھا اس نے لکھا تھا کہ حافظ رحمت خاں کے عہد حکومت میں پورے رہیلکھنڈ میں شاید ہی چپا بھر زمین بے کاشت کے رہی ہو[۲]۔ لیکن غالباً اس جنگ کا اصلی محرک کمپنی کی مالی ابتری تھی جسے درست کرنے کی غرض سے وارن ہیسٹنگز نے غیر منصفانہ اقدام کیا۔ چنانچہ مجلس نظماء نے اس جنگ کے اصول سے اختلاف کیا اور اسے ناحق اور ناروا ٹھیرایا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ رہیلوں نے رہیلکھنڈ کے علاقے کو مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں غاصبانہ طور پر حاصل کیا تھا۔ جس طرح ملک کے دوسرے حصوں میں مرکز گریز قوتیں کام کر رہی تھیں اسی طرح یہاں بھی انھیں قوتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس طرح نواب وزیر نے اودھ میں اپنی حکومت قائم کر لی اسی طرح حافظ رحمت خاں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رہیلکھنڈ میں نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی جس طرح انگریز کمپنی کو بنگال اور مدراس کے علاقہ میں اپنی حکومت کے ڈول ڈالنے کا حق تھا اسی طرح حافظ رحمت خاں اور اس کے ساتھی اپنے علاقوں کے انتظام کو سنبھالنے کے مجاز تھے۔ شاہ عالم کو انگریز، مرہٹے، اور رہیلے تینوں اپنے اپنے مقاصد کے لیے دباؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ رہیلے بہادر اور جنگجو تھے اس لیے انگریزی حکومت ان

۱؎ ـ Strachey, W. Hastings and the Rohilla War, p. 123

۲؎ ـ Reports from committees of the House of Commons, VI, p. 30.

کے استحکام میں آئندہ کے لیے خطرہ تصور کر سکتی تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ رہیلوں کی طرف سے اب تک انگریزی مفاد کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا تھا۔ شجاع الدولہ کا یہ کہنا کہ مرہٹے اور رہیلے اتحاد کرلیں گے ٹھیک نہیں۔ یہ دعویٰ محض اس لیے کیا گیا تھا کہ انگریزوں کے دل میں رہیلوں کی طرف سے خدشے پیدا ہو جائیں۔ نواب وزیر کے تحت آنے کے بعد رہیلکھنڈ کا نظم و نسق پہلے کے مقابلہ میں بہت خراب ہو گیا اور رعایا چین اور عافیت سے محروم ہو گئی جس کی ذمہ داری وارن ہیسٹنگز کی حکمت عملی ہی پر عاید ہوتی ہے۔

قانون تنظیم ۱۷۷۳ء

کچھ عرصے سے انگلستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاصل کیے ہوئے ہندوستان کے وسیع علاقوں پر تاج کی براہ راست حکومت قائم ہونی چاہیئے اس لیے کہ کمپنی ان پر حکومت کی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی۔ خود کلائیو نے بھی پٹ کو ۱۷۵۹ء میں ایک خط میں لکھا تھا کہ کمپنی نے بنگال میں جو حقوق اور اختیارات حاصل کر لیے ہیں انھیں وہ بغیر قوم کی مدد کے برقرار نہیں رکھ سکتی۔ لیکن پٹ اس وقت کمپنی کے اختیارات کے دستوری مسئلہ کو اٹھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اس کے ضمن میں بہت سی پیچیدگیوں کے پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کے بعض ارکان اپنی تقریروں میں کمپنی کے ہندوستانی نظم و نسق پر سخت تنقیدیں ہی نہیں بلکہ کھلم کھلا یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ کمپنی نے ہندوستان میں جو مقبوضات حاصل کئے ہیں وہ قانوناً اس کے نہیں بلکہ تاج کے ہیں۔ حکومت نے اس وقت صرف اتنی مداخلت روا رکھی کہ پارلیمنٹ کے ایک منظور کئے ہوئے قانون کی رو سے کمپنی پر لازم کیا گیا کہ وہ سالانہ چار لاکھ پونڈ حکومت انگلستان کو ان مقبوضات کے صلہ میں ادا کرے جو اس نے انگریزی قوم کی مدد سے ہندوستان میں حاصل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کمپنی کا فرض قرار پایا کہ کم سے کم ۲۳ لاکھ پونڈ کے برطانوی سامان کو سالانہ برآمد کیا کرے۔ اس سے زیادہ حکومت انگلستان نے کمپنی کے معاملات میں دخل دینا مناسب نہیں خیال کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بنگال کے دیوانی حقوق ملنے کے بعد کمپنی کے ملازموں نے شخصی طور پر دونوں ہاتھوں سے خوب دولت سمیٹی لیکن کمپنی کی مجموعی طور پر مالی حالت خراب ہوتی گئی۔ کلائیو جانتا تھا کہ انگلستان میں کمپنی کے ملازموں کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر کمپنی کی حالت کے متعلق جو رائے قائم کی جا رہی تھی وہ ٹھیک نہ تھی۔ چنانچہ جب پارلیمنٹ نے یہ قانون منظور کیا کہ کمپنی حکومت انگلستان کو سالانہ چار لاکھ پونڈ ادا کیا کرے تو کلائیو نے اس کی مخالفت کی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کئی سال سے کمپنی اپنے مالی خسارہ کی بنک آف انگلینڈ سے قرض لے کر پابجائی کر رہی تھی۔ ۱۷۷۲ء میں کمپنی نے لارڈ نارتھ کی وزارت سے دس لاکھ پونڈ کے قرضے کی درخواست کی تو پارلیمنٹ کے ان ارکان کو جو کمپنی کے مخالف تھے اس بات کا موقع ملا کہ وہ کمپنی کے حالات کی چھان بین کی تجویزیں پیش کریں۔ چنانچہ لارڈ نارتھ کی حکومت نے کمپنی کے معاملات کی جانچ پڑتال کے لیے دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ ایک پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ (سلیکٹ کمیٹی) جو ۳۱ ارکان پر مشتمل تھی اور دوسری خفیہ مجلس جو ۱۳ ارکان پر مشتمل تھی۔ ان دونوں کمیٹیوں نے کمپنی کے معاملات کی تفصیلی چھان بین کی اور بتایا کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۶ء تک کمپنی کے مختلف ملازموں نے بنگال کے باشندوں سے تقریباً ۲۲ لاکھ پونڈ نذرانہ کے طور پر وصول کیے ہیں۔ اس رقم میں کلائیو کی جاگیر شامل نہیں ہے جس کی قیمت بطور سرمایہ کے اگر متعین کی جائے تو ۶ لاکھ پونڈ ہوگی۔ دونوں کمیٹیوں کی رپورٹ میں کلائیو پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ اس نے جاگیر اور نقد رقم جو حاصل کی وہ کمپنی کی ملکیت قرار دینی چاہیئے تھی کمیٹیوں نے یہ بھی سفارش کی کہ کمپنی کے انتظام اور حکومت کے ڈھنگ میں بنیادی تبدیلی کر دی جائے تاکہ حالات میں بہتری پیدا ہو۔

لارڈ نارتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستور میں تبدیلی کے متعلق پارلیمنٹ میں جو تجویزیں پیش کیں وہ ایک قانون کی شکل میں منظور ہوئیں جسے قانون تنظیم (ریگولیٹنگ ایکٹ) کہتے ہیں۔ اس قانون کے بموجب صرف کمپنی کے دستور ہی میں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ کمپنی کا جو تاج کے ساتھ تعلق تھا اس کی بھی صراحت

کر دی گئی۔ کمپنی کا یہ فرض قرار پایا کہ اپنے تمام اہم کاغذات وزرائے انگلستان
کے سامنے پیش کیا کرے۔ اسی طرح وزیروں کے توسط سے پارلیمنٹ کا عمل دخل
کمپنی کے نظم ونسق میں موثر ہو گیا۔ کمپنی نے ہندوستان میں جو مقبوضات حاصل کرلئے
تھے انہیں اسی کے تصرف میں رہنے دیا گیا۔ مجلس نظما کے ارکان کے عہدہ کی
مدت بجائے ایک سال کے چار سال قرار دی گئی اور صرف مجلس شرکا کے ان
ارکان کو حق رائے دہی دیا گیا جنھوں نے کم از کم ایک ہزار پونڈ کے حصے برابر
ایک سال تک رکھے ہوں۔ یہ اس لیے کیا گیا تاکہ کمپنی کے معاملات میں جو لوگ
اپنی رائے سے فیصلے کریں ان کے احساس ذمہ داری میں اضافہ ہو۔ گورنر
بنگال کو ہندوستان میں کمپنی کے سارے مقبوضات کا گورنر جنرل بنا دیا گیا جسے بمبئی
اور مدراس کے احاطوں (پریسی ڈنسیوں) پر نگرانی کا اختیار دیا گیا۔ چار ارکان کی
ایک کونسل تجویز کی گئی ارکان کی مدت عہدہ پانچ سال قرار پائی۔ گورنر جنرل اور
اس کی کونسل کے چاروں ارکان کے نام قانون تنظیم میں ظاہر کر دئے گئے۔
وارن ہیسٹنگز کو گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ کونسل کے ارکان یہ تھے۔ جان کلیورنگ،
جارج مانسن، فلپ فرانسس اور رچرڈ بارول۔ قانون میں اس کی صراحت تھی
کہ گورنر جنرل کی کونسل کے فیصلے کثرت رائے سے طے ہوا کریں گے۔ مدراس
اور بمبئی کے احاطوں کی حکومتیں گورنر جنرل بنگال بہ اجلاس کونسل کی اجازت
کے بغیر ہندوستانی والیان ملک سے جنگ یا صلح نہیں کر سکیں گی سوائے ایسی صورت
کے کہ اجازت حاصل کرنے میں جو تاخیر ہو گی اس کے سبب سے کمپنی کے مفاد کو
سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو کمپنی کے ہندوستانی
مقبوضات کے لئے ضوابط و احکام (آرڈی ننس) نافذ کرنے کا حق ہو گا لیکن اس شرط
کے ساتھ کہ یہ احکام کسی حیثیت سے بھی قوانین انگلستان کے خلاف نہ ہونے چاہییں
تاج بہ اجلاس کونسل کو حق ہو گا کہ ان احکام کو مسترد کر دے۔ قانون تنظیم کی رو
سے فورٹ ولیم میں ایک عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) ایک چیف جسٹس اور
تین ججوں کی قائم کی گئی۔ وارن ہیسٹنگز کا پرانا ہم مکتب سر ایلیجا امپی
چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے وضع کئے ہوئے ضوابط و

احکام اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ عدالت عالیہ انھیں شائع نہ کرے۔ گورنر جنرل کی ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ، ہر رکن کونسل کی ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ اور چیف جسٹس کی ۸ ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی۔ قانون کی دوسری دفعات میں کمپنی کے عہدہ داروں کے لیے نجی تجارت یا تحفے وصول کرنا قطعی ناجائز قرار دیا گیا۔

قانون تنظیم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کی زبان غیر واضح اور مبہم تھی جس کی وجہ سے بعد میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ مجلس عاملہ اور عدلیہ کے اختیارات کی حد بندی نہیں کی گئی۔ بعض اوقات عدالت عالیہ ایسے فیصلے کر دیتی تھی جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا تمام انتظامی محکمے اس کے تحت ہیں جن کی کارروائیوں کی نظر ثانی اور نگرانی کا اسے پورا اختیار ہے۔ چونکہ مقننہ موجود نہ تھی اور خود وہ قوانین مبہم اور غیر متعین تھے جن کے نافذ کرنے کا عدالت عالیہ کو مجاز کیا گیا تھا، اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت عالیہ کو اپنے اختیارات کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ قانون تنظیم میں اس کی صراحت نہ تھی کہ عدالت عالیہ کا حلقہ سماعت کیا ہے اور وہ کونسا قانون نافذ کرنے کی مجاز کی گئی ہے۔ حکام عدالت کہتے تھے کہ کمپنی کے تمام مقبوضات سلطنت برطانیہ کا جز ہیں اس لیے عدالت عالیہ کے احکام ہر جگہ موثر ہونے چاہئیں اور انھیں یہ بھی اختیار ہے کہ وہ دیسی عدالتوں کی نگرانی کریں جو نواب بنگال کے تحت تھیں جنکے متعدد راہ حقوق کی نسبت قانون تنظیم میں کسی قسم کی توضیح نہیں کی گئی تھی۔ عدالت عالیہ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ انگلستان کے قوانین کا اطلاق کمپنی کے ملازموں کے علاوہ بنگال کے تمام زمینداروں اور محاصل اراضی وصول کرنے والوں پر کر سکتی ہے اس لیے کہ یہ سب کمپنی کے ملازموں کے ذیل میں آتے ہیں۔ ملک کے باشندوں کے نزدیک عدالت عالیہ استبداد کا آلہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ عام طور پر اس کو ایک ڈراؤنی چیز سمجھتے تھے جس کے طریق کار میں ان کے لیے پریشانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

قانون تنظیم کے مطابق گورنر جنرل کو کونسل کی کثرت رائے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ کونسل کے تین ارکان کلیورنگ، فلپ فرانسس اور مونسن

ل کر وارن ہیسٹنگز کو زچ کر دیتے تھے اور وہ ان کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ ایسے اہم امور میں جن کے فیصلہ کے وقت اتحاد عمل کی ضرورت ہوتی ہے گورنر جنرل کو اپنی کونسل کے ارکان کی مخالفانہ مجتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ قدم قدم پر کونسل کے ارکان گورنر جنرل کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے جن سے ملکی نظم ونسق کو سخت نقصان پہنچا۔ فلپ فرانسس کو وارن ہیسٹنگز سے شخصی اختلاف تھا۔ جب وہ انگلستان ہی میں تھا اسی وقت سے اس کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک وارن ہیسٹنگز کو اس کے عہدہ سے برطرفی کے لیے مجبور نہ کر دیا جائے اس وقت تک کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے نظم ونسق کو درست نہیں کیا جا سکتا۔ چھ سال تک برابر وارن ہیسٹنگز کو اپنی کونسل کے ارکان کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کی عام حکمت عملی اور طرز حکمرانی کے سخت مخالف تھے۔ بس عدالت عالیہ سے مقابلہ کے لیے گورنر جنرل اور کونسل کے ارکان میں وقتی اتفاق ہو جاتا تھا ورنہ ویسے ہر معاملہ میں شخصی مخالفت قایم رہتی تھی۔ چنانچہ اکثر وارن ہیسٹنگز ایسے فیصلوں کے نافذ کرنے پر مجبور ہوتا تھا جنھیں وہ خود پسند نہیں کرتا تھا۔ مجلس نظار میں بھی اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جس پر وہ بھروسا کر سکتا۔

ایک تو حکومت کو کونسل کی مخالفت نے اپاہج کر رکھا تھا اور دوسرے قانون تنظیم میں مدراس اور بمبئی کے احاطوں کو اجازت دی گئی تھی کہ سخت ضرورت کے وقت اپنی قوت فیصلہ استعمال کریں تاکہ کمپنی کے مفاد کو نقصان نہ پہنچے چنانچہ مدراس اور بمبئی کی حکومتیں قانون کی اس دفعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے جان بوجھ کر کلکتہ کی حکومت سے پوچھ گچھ کو غیر ضروری خیال کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل کو ان پر قابو حاصل نہیں رہا۔ خاص کر مرہٹوں کی پہلی لڑائی کے موقع پر بمبئی کی حکومت نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ نہ صرف کلکتہ کی حکومت کی حکمت عملی کے خلاف تھا بلکہ اس کی وجہ سے بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

لیکن باوجود ان خرابیوں کے قانون تنظیم سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کمپنی کا نظم ونسق پارلیمانی اثر و اقتدار کے تحت آ گیا اور ہندوستان میں انگریزی حکومت

ایک دستور کے تحت ہوگئی۔ اگرچہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات پر تاج برطانیہ کا راست اقتدار ۱۸۵۸ء تک قایم رہا لیکن قانون تنظیم سے حکومت انگلستان کی نگرانی کی باقاعدہ ابتداء ہوئی۔ ۱۷۷۳ء تک کمپنی کا طرز حکمرانی غیر معین تھا۔ قانون تنظیم کے بعد اس میں تھوڑا بہت دستوری تعین کا رنگ پیدا ہوا۔ کمپنی کے وہ انتظامات جو محض تجارتی اغراض کے تحت کئے جاتے تھے اب آئندہ سے حکومت وسیاست کی ضروریات کے لحاظ سے انجام پانے لگے۔

وارن ہیسٹنگز اور کونسل

قانون تنظیم کے بموجب گورنر جنرل کی کونسل میں چار ارکان نامزد کئے گئے تھے۔ گورنر بنگال کی پرانی کونسل میں سے صرف ایک بارول کو رکن رکھا گیا۔ باقی تین انگلستان سے بھیجے گئے ان میں فلپ فرانسس لبرل جماعت کا ممتاز رکن اور انشاء پرداز کی حیثیت سے ملک میں کافی مشہور تھا۔ دوسرے کرنل مانسن شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور تیسرے جنرل کلیورنگ جس کے تعلقات شاہی خاندان اور وزیروں کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ یہ تینوں ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت جبر اور سختی کا ایک مجموعہ ہے اور خود وارن ہیسٹنگز اس جبر اور بے انصافی کا آلۂ کار ہے جو کمپنی کے تمام ہندوستانی مقبوضات میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ایک ہی جہاز سے ۲۰ر نومبر ۱۷۷۴ء کو کلکتہ پہنچے گودی سے اتر کر گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ وارن ہیسٹنگز نے بجائے پرتپاک آؤ بھگت کرنے کے بے رخی ظاہر کی۔ چنانچہ تینوں نے اس کی شکایت اپنے خطوں میں کی ہے جو انھوں نے ہندوستان پہنچکر ولایت بھیجے۔ غرضکہ ان تینوں میں اور وارن ہیسٹنگز میں اسی دن سے اختلاف رونما ہوگیا جس دن وہ ہندوستان پہنچے اور یہ اختلاف اس وقت تک قایم رہا جب تک کہ ان تینوں میں سے دو کا انتقال نہ ہوگیا اور تیسرا یعنی فرانسس اپنے حریف وارن ہیسٹنگز سے ملکیکی (ڈیول) میں زخمی ہوکر انگلستان نہ چلا گیا جہاں اس نے اس کے خلاف اپنے اثر ورسوخ کو بھی طرح سے استعمال کیا۔ حکومت انگلستان کی جانب سے قانون تنظیم کے نافذ کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل اور ارکان کونسل کو جو

ہدایتیں بھیجی گئی تھیں ان میں خاص طور پر اس پر زور دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں مل کر انتہائی ہم آہنگی کے ساتھ کام کریں گے۔ گورنر جنرل اور ارکان کونسل کو اس کی بھی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جن امور کی چاہیں تحقیق کر سکتے ہیں تاکہ ان کی روک تھام کی مناسب تدبیریں اختیار کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ فرانسس، کلیورنگ اور مانسن نے وارن ہیسٹنگز سے وہ کاغذات طلب کئے جو کمپنی اور نواب اودھ سے خط و کتابت کے سلسلے میں وصول ہوئے تھے تاکہ جنگ روہیلہ اور اس سے متعلق دوسرے معاملات کی چھان بین کی جائے۔ وارن ہیسٹنگز نے کاغذات حوالے کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ کونسل نے کثرت رائے سے وارن ہیسٹنگز کو حکومت کے اختیارات سے محروم کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے فوراً مسٹر مڈل ٹن کو جو اودھ میں کمپنی کی حکومت کا نمائندہ تھا واپس بلا لیا اور اس کی جگہ مسٹر برسٹو کو اس عہدہ پر متقرر کر دیا۔[1] انھوں نے تحکمانہ طور پر اودھ کی امدادی فوج کے کمانڈر کو حکم دیا کہ انگریزی فوج کا جو دستہ اودھ میں ہے اسے ابھی بنگال واپس لے آئے اور نواب اودھ سے امدادی فوج کے سلسلہ میں جو رقم واجب الادا ہے اس کا فوری مطالبہ کرے۔ رقم کی ادائی کے لئے دو ہفتے کی میعاد مقرر کر دی گئی۔ بنارس کے معاہدہ کی رو سے وارن ہیسٹنگز نے کڑہ اور الہ آباد کے ضلعے نواب اودھ کو دیدیئے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں واپس لے لئے گئے۔

اسی دوران میں نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا تو وہ سب معاہدے جو کمپنی اور نواب اودھ کے درمیان اب تک ہوئے تھے منسوخ قرار دیئے گئے۔ یہ کارروائی اس انداز سے کی گئی کہ وارن ہیسٹنگز کی بے بسی اور بے اختیاری کا تمام ہندوستان میں اعلان ہو جائے۔ نئے نواب آصف الدولہ سے الگ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے امدادی فوج کے اخراجات

[1] Gleig, Memoirs of Warren Hastings, جلد 1 صفحہ 474

کے ضمن میں جو رقم کمپنی لیا کرتی تھی اس میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ شجاع الدولہ نے دو کروڑ کے لگ بھگ روپیہ چھوڑا تھا جو اس کے محل کے تہ خانوں میں دفن تھا۔ کونسل نے لکھنؤ کے انگریز ریذیڈنٹ کو ہدایت کی کہ ان خزانوں کا تین چوتھائی شجاع الدولہ کی بیوہ بہو بیگم کو وصیت نامہ کی رو سے ملنا چاہیئے۔ اس وقت آصف الدولہ کی فوج کی تنخواہیں کئی مہینے سے ادا نہیں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے سپاہیوں نے بغاوت کر دی لیکن کمپنی کی فوج کے سبب سے اودھ عام بغاوت سے بچ گیا۔ آصف الدولہ نے ہر چند کونسل کے سامنے اپنے معاملہ کی نمائندگی کرائی کہ نواب شجاع الدولہ کا خزانہ دراصل ریاست کا خزانہ ہے اور سب سے پہلے سپاہ کی تنخواہوں کی ادائی اس سے ہونی چاہئے لیکن کونسل نے ان میں سے ایک بات بھی نہ مانی۔ اس طرح اودھ کی بیگمات کے قضیہ کی بنا پڑی جس کی ذمہ داری بعد میں وارن ہیسٹنگز کے طریق کار پر عاید کی گئی۔

نظم و نسق کی خرابیوں کی چھان بین کے سلسلے میں وارن ہیسٹنگز کے ذاتی معاملات بھی بحث میں آئے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کے اختیارات بڑی حد تک چھینے جا چکے ہیں تو انھوں نے بے خوف ہو کر ارکان کونسل کو شہادتیں بہم پہنچانے میں دریغ نہ کیا۔ سب سے پہلے رانی بردوان کا ایک خط کونسل کے سامنے پیش کیا گیا جس میں وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے رانی سے رشوت قبول کی۔ اس کے بعد نند کمار کا معاملہ پیش ہوا۔ نند کمار ایک برہمن تھا جو ایک زمانہ میں دربار مرشد آباد میں خاص اثر رکھتا تھا۔

نند کمار کا مقدمہ

نند کمار نے کئی خطوں میں ارکان کونسل کو وارن ہیسٹنگز کے رشوت لینے اور غبن کے حالات لکھے اور درخواست کی کہ اگر موقع دیا جائے تو وہ دوسرے واقعات کونسل کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہے۔ دو مرتبہ ارکان کونسل نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ نند کمار کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنا بیان آکر دے لیکن ہر مرتبہ وارن ہیسٹنگز نے صدر کی حیثیت سے کونسل کو برخاست کر دیا اور وہ اور اس کے ساتھ بارول کونسل سے اٹھ کر

چلے گئے۔ اس نے کہا کہ کمپنی کی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے ایسے اجلاس کی صدارت میرے شان شایاں نہیں جس میں مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہو لیکن تیسری مرتبہ جب یہی صورت پیش آئی اور وارن ہیسٹنگز اور بارول اٹھ کر چلے گئے تو کلیورنگ صدر بن گیا اور کونسل کے روبرو نندکمار نے اپنا بیان دیا۔ اس نے ایک فارسی زبان میں لکھا ہوا خط بھی کونسل کے سامنے پیش کیا جو میر جعفر کی بیوہ منی بیگم نے وارن ہیسٹنگز کو لکھا تھا جس سے ساڑھے تین لاکھ روپے رشوت لینا ثابت ہوتا تھا۔ کونسل نے وارن ہیسٹنگز کو حکم دیا کہ یہ رقم جو اس نے ناجائز طور پر وصول کی ہے سرکاری خزانہ میں ابھی داخل کرے۔ بعد میں جب وارن ہیسٹنگز نے مواخذہ کے وقت تمام الزاموں کی صفائی پیش کی تو اس نے تسلیم کیا کہ اس نے منی بیگم سے ڈیڑھ لاکھ روپے تحفہ کے طور پر لئے تھے۔ اس نے اپنی صفائی میں کلائیو اور ورلسٹ کی مثال پیش کی کہ ان دونوں نے بھی جب وہ مرشد آباد گئے تھے تو ۲۲۵ پونڈ روزانہ کے حساب سے نواب سے الاونس وصول کیا تھا۔ لیکن چونکہ کلائیو اور ورلسٹ نے یہ رقم وصول کی تھی اس لئے اس کو حق بجانب تو نہیں کہا جا سکتا۔ سر جیمس اسٹیفن بنک نے جو وارن ہیسٹنگز کا مداح ہے اور اس کو مختلف الزاموں سے بری خیال کرتا ہے اس قسم کے الاؤنس کی وصولی کو ناروا ٹھہرایا ہے[1]

وارن ہیسٹنگز اور بارول نے نندکمار کے الزاموں سے تنگ آکر سازش کی علت میں اس پر عدالت عالیہ میں نالش کر دی۔ ججوں نے نندکمار کو حوالات سے ضمانت پر چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں جب یہ مقدمہ چل رہا تھا ایک شخص موہن پرشاد نامی نے نندکمار پر جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ بارہ گھنٹے کی سماعت کے بعد عدالت عالیہ نے متفقہ طور پر نندکمار کو مجرم قرار دے کر پھانسی کا حکم صادر کر دیا اس لئے کہ اس زمانہ میں انگلستان کے قانون میں جعل سازی کی یہی سزا تھی چنانچہ نندکمار کو پھانسی دیدی گئی اور اس طرح وارن ہیسٹنگز کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا نکل گیا۔ فرانسس اور اس کے ساتھیوں نے وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا کہ اس نے

---

[1] Stphen: Nuncomar and Impey, I, p. 72

قانون کی آڑ لے کر نند کمار کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا تاکہ اس کے خلاف شہادت نہ مل سکے۔ برک نے اپنی پارلیمنٹ کی تقریروں میں صاف صاف کہا کہ نند کمار کو جو پھانسی دی گئی وہ قطعی طور پر وارن ہیسٹنگز کے ایما پر دی گئی ہے تاکہ اس کے خلاف شہادت کی تکمیل نہ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ اس الزام کا ایسا ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکے جسے قانون تسلیم کرے۔ لیکن اس میں تو شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے کہ جو سزا تجویز کی گئی وہ قطعاً غیر منصفانہ تھی۔ نند کمار کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ اس زمانہ کے بنگال کے ذی وجاہت لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ پھانسی کی سزا کو کچھ مدت کے لیے ملتوی نہیں کیا گیا تاکہ اس اہم معاملہ میں حکومت انگلستان کو رجوع کیا جا سکے۔ خود اسٹیفن کا خیال ہے کہ جو سزا تجویز کی گئی وہ ناواجب تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند ماہ کی قید اور جرمانہ کافی سزا ہوتی[1] خود عدالت عالیہ بھی اپنے چارٹر کی رو سے اس کی مجاز تھی کہ ایسے حالات میں جب کہ قانون کے عاید کرنے سے کسی کی جان جاتی ہو اور معاملہ کی نوعیت ایسی ہو کہ اس موقع پر رحم و کرم زیادہ مناسب ہو تو وہ اپنے اختیار تمیزی سے معاف کر سکتی یا سزا میں تخفیف کر سکتی تھی۔ اس مقدمہ سے قبل خود وارن ہیسٹنگز نے اپنے ایک مراسلہ میں جو انگلستان بھیجا گیا تھا لکھا تھا کہ اہل ہند کو ایسی سزا دینا جن کا وہ جرم کی سنگینی سے تعلق قائم نہیں کر سکتے سخت بے انصافی ہو گی[2] چونکہ نند کمار نے وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا تھا اس لیے یہ فطری امر تھا کہ اس زمانہ میں عام طور پر اہل ہند نے نند کمار کے پھانسی دئے جانے کو وارن ہیسٹنگز کی دشمنی کے ساتھ منسوب کیا[3] یہ امر خود مشتبہ تھا کہ آیا عدالت عالیہ کمپنی کے ملازمین کے علاوہ ہندوستانیوں کو سزا دینے کی مجاز بھی تھی یا نہیں۔ ایسی حالت میں جو سزا دی گئی وہ کبھی قرین انصاف نہیں کہی جا سکتی۔

[1] Stephen: Nuncomar and Impey. I. p 72.

[2] Monckton Jones, Warren Hastings, p. 158.

[3] Cambridge History of India. V. p 238.

ننڈکمار کے پھانسی پا جانے کے بعد کلیورنگ کو ننڈکمار کی وہ عرضداشت ملی جس میں اس نے صاف صاف لکھا تھا کہ اس کو وارن ہیسٹنگز اور ججوں کی سازش کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ فرانسس چاہتا تھا کہ اس دستاویز کو وارن ہیسٹنگز کے خلاف استعمال کرے لیکن اس نے سوچا کہ چونکہ عدالت عالیہ وارن ہیسٹنگز کی حمایت کرے گی اس لیے بہتر ہے کہ اس دستاویز کو تلف کر دیا جائے۔ کونسل میں وارن ہیسٹنگز سے نوک جھوک برابر ہوتی رہی۔ ستمبر ۱۷۷۶ء میں مانسن کے انتقال پر وارن ہیسٹنگز نے اپنی فیصلہ کن رائے کے ذریعہ اکثریت کو غیر موثر بنا دیا۔ اگلے سال جب کلیورنگ کا بھی انتقال ہو گیا تو وہ کونسل پر چھا گیا۔ کلیورنگ کی جگہ سر آئرکوٹ کے کمانڈر ان چیف کے عہدہ اور کونسل کی رکنیت پر آنے سے ہیسٹنگز کے مخالفوں کا زور ٹوٹ گیا اس واسطے کہ نیا کمانڈر ان چیف ہیسٹنگز کا حامی تھا۔ باوجود اس کے کہ وارن ہیسٹنگز نے اب اپنے کھوئے ہوئے اختیارات حاصل کر لئے تھے لیکن فرانسس اب بھی ہر وقت کونسل میں مخالفت کرتا رہتا تھا۔ آخرکار ہیسٹنگز اور فرانسس میں مقابلہ (ڈیول) تک نوبت آئی جس میں فرانسس اپنے حریف کے پستول سے زخمی ہوا اور وہ انگلستان روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے ہیسٹنگز کی لبرل جماعت کے ذریعہ خوب چھیڑ چھاڑ کی اور وہ تمام واقعات ایک ایک کر کے اخباروں میں شائع کرائے جن کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزی حکومت سے لوگ ڈرنے لگے تھے۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ

نومبر ۱۷۷۲ء میں پیشوا مادھوراؤ کا انتقال ہوا تو چونکہ وہ لاولد تھا اس لئے اس کے چھوٹے بھائی نارائن راؤ کو پیشوائی کی گدی ملی۔ اس کی عمر اس وقت صرف ۱۸ سال تھی۔ نو مہینے کی حکومت کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ عام طور پر مرہٹوں کا خیال تھا کہ یہ قتل مادھوراؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ اور اس کے حامیوں کی سازش سے ہوا تھا۔ رگھوناتھ راؤ جو عام طور پر رگھوبا کے نام سے مشہور ہے پیشوا باجی راؤ اول کا بھائی اور پیشوا مادھوراؤ کا چچا تھا۔ وہ بڑا سازشی اور اقتدار پسند تھا۔ ۱۷۶۱ء میں پونا کی خالی گدی پر رگھوناتھ قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مرہٹہ سرداروں

میں اپنا اثر بڑھانے کی غرض سے نواب میر نظام علیخاں سے لڑائی چھیڑ دی۔ لیکن دربار پونا میں نانا فرنویس نے اس کے خلاف زبردست اتحاد قایم کر لیا تھا۔ اس اثنا میں متوفی پیشوا نارائن راؤ کی بیوہ کے ایک بچہ ہوا جس کی پیشوائی کو نانا فرنویس اور اس کے ساتھیوں نے تسلیم کر کے ایک مجلس تولیت قایم کر لی تاکہ وہ نظم ونسق کی دیکھ بھال کرے۔ بچے کا نام مادھو راؤ دوم رکھا گیا۔ رگھوناتھ راؤ نے مجلس تولیت کی فوج کو شکست دے کر دوسرے مرہٹہ سرداروں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ سندھیا، ہلکر اور گیکواڑ کو اپنا حامی بنانے کے لئے وہ مالوہ اور گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔ رگھوناتھ راؤ نے بمبئی کی انگریزی حکومت سے بھی نامہ وپیام شروع کر دیا اور فوجی امداد کے معاوضہ میں بہت سا روپیہ اور علاقہ دینے کا وعدہ کیا۔ اسے علم تھا کہ بمبئی کے علاقے میں جزیرہ سالسیٹ اور بندرگاہ باسین پر بہت دنوں سے حکومت بمبئی کی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی تھیں۔

گفت وشنید کے بعد معاہدہ سورت پر حکومت بمبئی اور رگھوناتھ راؤ کی طرف سے دستخط ہو گئے جس کے مطابق یہ طے ہوا کہ حکومت بمبئی رگھوناتھ راؤ کو نومولود پیشوا مادھو راؤ دوم کا ولی مان لینے کو آمادہ ہے بشرطیکہ وہ جزیرہ سالسٹ اور بندرگاہ باسین انگریزوں کے حوالے کرے اور اٹھارہ لاکھ روپے نقد ادا کرے۔ حکومت بمبئی نے اس کی امداد کے لیے تین ہزار فوج فوراً بھیجنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ سالسٹ اور باسین پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور رگھوناتھ راؤ کی مدد کے لیے کرنل کیٹنگ کی سربراہی میں انگریزی فوج روانہ ہو گئی جس نے آراس کے مقام پر دربار پونا کی فوج کو شکست دی۔ گیکواڑ نے رگھوبا کی اس موقع پر مدد کی جب کہ اس کی فوجیں بھاگ کر نربدا پار چلی گئیں۔ ادھر انگریزی بیڑے نے بھی دربار پونا کے بیڑے کو سمندر میں شکست دی۔ غرضکہ خشکی پر اور سمندر میں دونوں جگہ حکومت بمبئی کے منصوبے امید سے بڑھ کر کامیاب رہے۔

وارن ہیسٹنگز معاہدہ کا موئد نہ تھا لیکن چونکہ حکومت بمبئی جنگ شروع کر چکی تھی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کامیابی کے ساتھ اس کو تکمیل تک پہنچا دے۔ کلکتہ کونسل نے

معاہدہ سورت کی سخت مخالفت کی تھی، اس لیے کہ وہ کونسل کی منظوری کے بغیر کیا گیا تھا۔ قانون تنظیم کے بموجب حکومت بمبئی کے لیے لازم تھا کہ وہ اس کی نسبت گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے استصواب کرتی۔ کونسل نے دربار پونا کے خلاف جنگ کرنا ناجائز قرار دیا اور کرنل اپٹن کو اپنے نمایندہ کے طور پر براہ راست پونا بھیج دیا تاکہ وہ نانا فرنویس اور اس کے شرکا سے دوسرا معاہدہ کر لے اور معاہدہ سورت سے کلکتہ کی حکومت کی بے تعلقی کا اظہار کر دے۔ حکومت بمبئی کی اس طرح بڑی توہین ہوئی اور وہ مرہٹوں کی نظر میں بے وقار ہو گئی۔ کرنل اپٹن نے ۱۷۷۶ء میں دربار پونا سے ایک علاحدہ معاہدہ طے کر لیا جو صلحنامہ پورندھر کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے ہوا کہ کمپنی نے مرہٹوں کے جو علاقے حاصل کر لیے ہیں سوائے سالسٹ کے وہ سب واپس کیے جائیں گے جنگ کے اخراجات کے سلسلہ میں دربار پونا ۱۲ لاکھ روپئے ادا کرے گا۔ رگھوبا کی فوج برطرف کر دی جائے گی اور وہ خود دریائے گوداوری کے کنارہ کسی موزوں مقام پر جا کر سکونت اختیار کرے گا۔

معاہدہ پورندھر پر دستخط ہونے کے چار ماہ بعد مجلس نظما کا مراسلہ حکومت بمبئی کو وصول ہوا جس میں معاہدہ سورت کی پوری تائید کی گئی تھی۔ اس مراسلہ سے اس ذلت کی تلافی ہوئی جو کلکتہ کونسل کے ہاتھوں حکومت بمبئی کو اٹھانی پڑی تھی۔ اسی دوران میں پونا میں سینٹ لیوبان نامی ایک فرانسیسی نے نانا فرنویس پر بہت اثر قائم کر لیا۔ اس نے نانا فرنویس کو یقین دلایا کہ جلد فرانس اور انگلستان میں یورپ میں لڑائی چھڑنے والی ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ کافی تعداد میں فرانسیسی فوج بندرگاہ چول پر اتارنے کا انتظام کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی افسر دس ہزار دیسی فوج کو تربیت دے کر اس قابل کر دیں گے کہ وہ بخوبی انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں۔ نانا فرنویس سینٹ لیوبان کی مدد سے دربار پونا میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ اس وقت سکھا رام باپو اور دوسرے وزیر نانا فرنویس کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ سینٹ لیوبان کی پونا میں موجودگی سے کلکتہ کی حکومت نانا فرنویس کے ارادوں کی نسبت شبہ کرنے لگی۔

حکومت بمبئی نے پیشوا مادھوراؤ دوم کا ولی رگھوناتھ راؤ کو مقرر کر دیا اور اس کو بمبئی میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ حکومت بمبئی نے چار ہزار سپاہیوں کی فوج کرنل ایجرٹن کی سرکردگی میں پونا روانہ کی تاکہ رگھوناتھ راؤ کو وہاں کا کرتا دھرتا مقرر کرے اور کمسن پیشوا اس کے قابو میں رہے۔ کرنل ایجرٹن نے فوج کی قیادت کرنل کرناک کے سپرد کر دی جس نے ورگاؤں کے مقام پر شکست کھائی اور ہتھیار ڈال دیے اور ایک اور معاہدہ پر دستخط کر دیے جس کے مطابق سالسٹ دوبارہ پونا کو واپس کر دیا جائے گا۔ رگھوناتھ راؤ کو جب معلوم ہوا کہ انگریز اس کو نانا فرنویس کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہیں تو اس نے بھاگ کر سندھیا کے پاس پناہ لی۔ اس معاہدہ سے انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔

اس دوران میں کلکتہ کونسل کے حالات میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ہیسٹنگز اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ وہ شروع ہی سے اس تجویز کے موافق تھا کہ بمبئی کی حکومت کی مدد کرنی چاہیے اور رگھوناتھ راؤ کا ساتھ دینا چاہیے۔ خاص کر سینٹ لیوبان کا دربار پونا میں انگریزوں کے خلاف سازش کرنا جب سے اس کو معلوم ہوا اس وقت سے وہ اور بھی زیادہ رگھوبا کی تائید پر تل گیا تھا۔ اس نے جنرل گوڈارڈ کی سرکردگی میں بنگال سے ایک زبردست لشکر روانہ کیا تاکہ پونا میں فرانسیسیوں کے جوڑ توڑ کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ لشکر ایک ہزار میل سے زائد مسافت طے کرنے کے بعد برہانپور پہنچ گیا۔ یہاں گوڈارڈ کو ورگاؤں کی شکست اور ذلت آمیز شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنے کی اطلاع ملی۔ ہیسٹنگز نے گوڈارڈ کو یہ ہدایتیں بھیجدی تھیں کہ ورگاؤں کے معاہدہ کو کالعدم قرار دیا جائے اور پورندھر کے معاہدہ کی شرائط کے بموجب از سر نو دربار پونا سے گفت و شنید شروع کی جائے۔ رگھوناتھ راؤ بھی سندھیا کی مدد سے سورت میں آکر جنرل گوڈارڈ سے مل گیا۔

جنرل گوڈارڈ نے دربار پونا سے گفت و شنید کے دوران میں قطعی جواب مانگا تو نانا فرنویس نے صاف کہلا بھیجا کہ جب تک رگھوناتھ راؤ کو حوالہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔ ادھر اس نے نواب میر نظام علی خاں اور حیدر علی سے اتحاد کر لیا۔ جنرل گوڈارڈ نے گیکواڑ سے باہمی مدافعت کا

معاہدہ طے کرنے کے بعد لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ سندھیا اور ہلکر نانا فرنویس سے مل گئے۔ ان دونوں کی فوجیں گجرات کی طرف بڑھیں لیکن گوڈارڈ نے انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔

۱۷۸۰ء میں ہیسٹنگز نے ایک دوسرا لشکر میجر پوپھم کی سرکردگی میں گوالیار روانہ کیا تاکہ سندھیا دربار پونا کو چھوڑ کر اپنے صدر مقام کی حفاظت کے لیے یہاں آنے پر مجبور ہو جائے۔ سر آئر کوٹ نے جو اس زمانے میں کمپنی کی افواج کا کمانڈران چیف تھا قلعہ گوالیار کی تسخیر کو ناقابل عمل بتایا تھا۔ لیکن میجر پوپھم نے بڑی قابلیت سے گویا کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ اس شاندار فتح سے انگریزی وقار بڑھ گیا۔ سندھیا ایسا بد دل ہوا کہ اس نے نانا فرنویس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور انگریزوں سے علیحدہ معاہدہ کر لیا جس کے بموجب اس نے وعدہ کیا کہ وہ بیچ میں پڑ کر انگریزوں اور دربار پونا میں مصالحت کرا دے گا اور جو شرائط طے ہوں گی ان کی تکمیل کرانے میں اپنا اثر پوری طرح استعمال کرے گا۔ سندھیا کا وہ تمام علاقہ جو جمنا کے مغربی جانب تھا اس کو واپس کر دیا گیا۔ راجہ بھونسلا نے بھی نانا فرنویس کی امداد کے لیے جو فوج بھیجی تھی وہ واپس بلا لی۔ اب گوڈارڈ نے باسین پر فوج کشی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ نانا فرنویس نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ صلح کر لی جائے۔ اور خود ہیسٹنگز بھی حیدر علی کی یورش کی وجہ سے مصالحت چاہتا تھا۔ غرضکہ سندھیا کے توسط سے مئی ۱۷۸۲ء میں صلحنامہ سالبائی پر دستخط ہو گئے۔ یہ طے پایا کہ انگریزوں نے معاہدہ پورندھر کے بعد سے مرہٹوں کے جتنے علاقوں پر قبضہ کیا ہے وہ واپس کر دئے جائیں۔ رگھوناتھ راؤ کی ۲۵ ہزار روپیے ماہوار پنشن کر دی جائے اور انگریزی حکومت آئندہ اسے کسی قسم کی مدد نہ دے۔ سندھیا کی خدمات کے صلہ میں بروچ اس کے حوالہ کیا جائے۔ سالسٹ پر انگریزوں کا قبضہ برقرار رہے۔ دربار پونا نے گیکواڑ کے معاملات میں ہر طرح کی دخل دہی سے بچنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اگر حیدر علی اپنی کرناٹک کی تمام فتوحات کو واپس نہ کرے تو دربار پونا اس کو اپنا دشمن تصور کرے۔ معاہدۂ سالبائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد

انگریزوں اور مرہٹوں میں آئندہ بیس سال تک صلح برقرار رہی اور اس دوران میں انگریزی اقتدار چپکے چپکے ہندوستان کے بیشتر حصے میں مستحکم ہو گیا۔ مرہٹوں سے لڑائی کا سلسلہ سات سال تک قائم رہا جس کی وجہ سے کمپنی کے خزانہ پر بہت بار پڑا اور ہیسٹنگز کو اخراجات کی پابجائی کے لیے ایسی تدبیریں کرنی پڑیں جو کسی طرح بھی حق بجانب نہیں کہی جا سکتیں۔

میسور کی دوسری جنگ

۱۷۶۹ء میں معاہدۂ مدراس کی رو سے حکومت مدراس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر حیدر علی کے ملک پر کسی دوسری قوت نے حملہ کیا تو وہ اس کی امداد کرے گی۔ لیکن جب مرہٹوں نے ۱۷۷۱ء میں حملہ کیا تو حیدر علی نے حکومت مدراس سے امداد کی درخواست کی اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس امداد کے معاوضہ میں وہ بارہ محل کا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالہ کر دے گا۔ اور جو کچھ خرچ ہوگا اس کو برداشت کرنے کے علاوہ کچھ اور رقم بھی دے گا۔ لیکن حکومت مدراس نے نواب محمد علی کے کہنے میں آکر مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حیدر علی کو تن تنہا مرہٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بنگلور اور کولار کے اضلاع ان کے حوالہ کرنے پڑے اور تاوان جنگ بھی ادا کیا۔ حکومت مدراس کی اس وعدہ خلافی کو حیدر علی کبھی بھولا نہیں۔ اس نے اپنی فوجی تیاری مکمل کر لی اور اس انتظار میں رہا کہ مناسب موقع پر انگریزوں سے انتقام لے۔ چنانچہ جس وقت انگریزی حکومت دربار پونا سے الجھی ہوئی تھی اور ادھر یورپ میں انگریزوں کی فرانسیسیوں سے جنگ چھڑ گئی تھی حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ انگریزوں کے تعلقات اس زمانہ میں سرکار نظام سے بھی کشیدہ ہو گئے تھے اس لیے کہ حکومت مدراس نے ۱۷۷۹ء میں بسالت جنگ سے نواب میر نظام علی خاں کی اطلاع کے بغیر جو معاہدہ سرکار گنتور کے متعلق کیا تھا وہ نواب میر نظام علی خاں کو نہایت ناگوار گزرا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے سرکار گنتور حکومت مدراس کو منتقل کر دی گئی جسے دس سال کے لیے پٹہ پر نواب محمد علی والاجاہ کو دیدیا گیا۔ پھر حکومت مدراس نے ایک اور بڑی بھاری حماقت یہ کی کہ مسٹر ہالینڈ کو حیدرآباد روانہ کیا تاکہ

نواب میر نظام علی خاں کو آمادہ کیا جائے کہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کے بموجب شمالی سرکار کی بابت حکومت مدراس نے جو سات لاکھ روپیہ سالانہ پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے اس کے بقایے سے دستبردار ہو جائیں اس لیے کہ حکومت مدراس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس حماقت سے نواب میر نظام علی خاں سخت ناراض ہوئے۔ انھیں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ پہلی جنگ مرہٹہ کے سلسلہ میں کلکتہ نے راجا ناگپور کو دربار پونا سے توڑنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں برار کے بعض علاقے اس کو دلوانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ ان حالات میں نواب میر نظام علی خاں نے انگریزی حکومت سے بدظن ہو کر بسالت جنگ کے یہاں کی برطرف شدہ فرانسیسی سپاہ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور نانا فرنویس اور حیدر علی سے مل کر انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ غرضکہ یہ سب حالات حیدر علی کے موافق تھے کہ وہ حکومت مدراس کے خلاف جنگ شروع کردے۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت کلکتہ اور حکومت بمبئی مرہٹوں کی جنگ میں ایسی پھنسی ہوئی ہیں کہ وہ حکومت مدراس کو زیادہ امداد نہ دے سکیں گی۔ اُدھر نانا فرنویس نے حیدر علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرے تو مرہٹے اپنے ان تمام مطالبات سے جو حکومت میسور پر ہیں دستبردار ہو جائیں گے اور انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر وہ اپنی شمالی سرحد دریائے کرشنا تک لے آئے۔

غرضکہ حیدر علی نے جولائی ۱۷۸۰ء میں کرناٹک پر زبردست لشکر سے حملہ کر دیا۔ اس نے کرنل بیلی اور منرو کی فوجوں کو شکست دے کر آرکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ حکومت مدراس نے اس کے مقابلے کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ گورنر مدراس نے صاف کہہ دیا کہ لڑائی لڑنے کے لیے خزانے میں روپیہ ہی نہیں۔ وارن ہیسٹنگز کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے کچھ پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ اگرچہ مرہٹوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن وارن ہیسٹنگز نے سرآئرکوٹ کمانڈر ان چیف کو فوج کے ساتھ فوراً سمندر کے راستہ سے روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں جزیرہ بوربن سے فرانسیسی حکومت نے حیدر علی

کی مدد کے لیے سامان جنگ روانہ کیا اور امیر البحر دے سفران نے انگریزی جنگی
جہازوں کی مزاحمت پر بھی ڈھائی ہزار فرانسیسی فوج حیدر علی کی مدد کے لیے مشرقی
ساحل پر اتار دی۔ حکومت مدراس کی مالی حالت اس زمانہ میں بہت خراب تھی
اور ظاہر ہے کہ کلکتہ کی حکومت جو مرہٹوں کی جنگ کی وجہ سے خود اپنی پریشانیوں
میں مبتلا تھی زیادہ رقمی امداد نہیں بھیج سکتی تھی۔ ہیسٹنگز نے دوسری جنگ
میسور کے اخراجات کی پابجائی کے لیے چار سال کے عرصے میں جب تک
جنگ کا سلسلہ جاری رہا دو کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ نقد یا سامان کی شکل میں بھیجے تھے۔
اس سے زیادہ مدد کرنا حکومت کلکتہ کے بس میں بھی نہ تھا۔ حکومت کلکتہ نے
بارہا گورنر مدراس کو یہ توجہ دلائی کہ وہ نواب کرناٹک سے بھی کچھ نہ کچھ وصول کرے
جس کے ملک کی حفاظت کے لیے حیدر علی سے ان بن ہوئی لیکن نواب کی آمدنی
کا سوتہ ہی خشک ہو چکا تھا۔ وہ انگریز ساہوکاروں کا مقروض تھا جنھیں
اس نے اپنے ملک میں مالگزاری وصول کرنے کا حق دے دیا تھا۔
ان حالات میں لارڈ میکارٹنی نے جو اب مدراس کا گورنر مقرر ہوا تھا نواب
محمد علی والاجاہ کو مجبور کیا کہ وہ پانچ سال کے لیے کرناٹک کی مالگزاری وصول
کرنے کا حق حکومت مدراس کو دیدے۔ مالگزاری کا ۱/۶ حصہ نواب اور اس
کے قرض خواہوں کو ادا کیا جائے گا۔[1] گورنر مدراس نے یہ دلیل پیش کی کہ
چونکہ حیدر علی کے خلاف جو جنگ کی جا رہی ہے اس کا مقصد نواب والاجاہ
کے علاقوں کی حفاظت ہے اس لیے اسی کو خرچ کا بار بھی اٹھانا چاہیئے۔
اس کی صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ وہ مالگزاری وصول کرنے کا حق آئندہ
کم از کم پانچ سال کے لیے حکومت مدراس کے حوالے کرے۔ حکومت مدراس
نے ایک خاص کمیٹی (کمیٹی آف اسائنڈ ریونیو) مقرر کی تاکہ وہ مالگزاری کی
وصولیابی کی نگرانی کرے اور انتظامی اصلاحات نافذ کرے۔ نئے انتظام کی وجہ
سے نواب کرناٹک کے علاقوں کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ ہو گئی۔

۱۔ Cambridge History of India, Vol. V, p.

سر آئیر کوٹ کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ ۱۷۸۲ء میں وہ مجبور ہو کر بنگال واپس چلا گیا۔ حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان کو بمبئی سے ایک فوج کے آنے کا انتظار رہا تاکہ دونوں مل کر انگریزوں کو مدراس سے بے دخل کر دیں۔ لیکن بمبئی کے فوج کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ اس اثنا میں وارن ہیسٹنگز نے معاہدۂ سالبائی کے ذریعے مرہٹوں سے صلح کر لی تھی اور بمبئی کے مغربی ساحل پر انگریزی بیڑے کا حیدر علی کے خلاف استعمال ممکن ہو گیا تھا۔ چنانچہ کرنل ہمبر اسٹن کے تحت ایک فوج حیدر علی کی مغربی سرحد پر حملہ کرنے کالی کٹ پر اتری۔ اس کے مقابلے کے لئے ٹیپو سلطان کرناٹک سے مالابار کی طرف چلا آیا۔ لیکن دسمبر ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کے انتقال کی وجہ سے اس کو پھر کرناٹک لوٹ جانا پڑا۔ حکومت بمبئی نے جو جنگی بیڑا بھیجا اس نے بنگلور پر قبضہ کر لیا اور انگریزی فوجیں کوئمبتور تک پہنچ گئیں۔ ہیسٹنگز نے ولندیزوں سے اس موقع پر مدد مانگی لیکن چونکہ اس زمانے میں حکومت انگلستان اور حکومت ہالینڈ کے سیاسی تعلقات کشیدہ تھے اس لئے ولندیزیوں نے مدد دینے سے انکار کیا۔ چونکہ یورپ میں انگلستان اور ہالینڈ میں جنگ شروع ہو گئی اس لئے بجائے اس کے کہ ولندیزوں سے مدد ملے اور ان کی طرف سے حکومت کلکتہ کو دغدغہ پیدا ہو گیا۔

وارن ہیسٹنگز نے جس طرح ناگپور کے بھونسلا راجا کو مرہٹوں کے اتحاد سے الگ کر لیا تھا اسی طرح نواب میر نظام علی خاں کو حیدر علی سے الگ کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوا۔ اس لئے پھر بھی کونسل سے یہ منظور کرا دیا کہ گنٹور سرکار نواب میر نظام علیخاں کو واپس کر دی

جائے اور اس کے متعلق حکومت مدراس نے نواب محمد علی والاجاہ سے جو وس سال کا پٹہ کیا ہے اس کو منسوخ سمجھا جائے۔ گورنر مدراس سر ولیم رمبالڈ اور اس کی کونسل کے دو ارکان کو خدمت سے الگ کر دیا گیا اور باقی دو ارکان رکنیت سے علیٰحدہ کر دیئے گئے۔ مجلس نظماء نے بھی حکومت کلکتہ کے اس فیصلہ کی تائید کی۔ مجلس نظماء کے فیصلہ سے نواب میر نظام علی خاں کو اطمینان ہوا اور انگریزوں کی موافقت میں ان کی حکمت عملی بدل گئی چونکہ آئندہ بھی کمپنی اور سرکار نظام میں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا اس لیے حکومت کلکتہ نے مسٹر ہالینڈ کی خدمات حکومت مدراس سے حاصل کریں اور اس کو اپنی جانب سے حیدرآباد میں وکیل (ریزیڈنٹ) مقرر کیا۔ اگر وارن ہیسٹنگز کا سا دانشمند اس وقت کلکتہ کی سپریم گورنمنٹ کا گورنر جنرل نہ ہوتا تو یقیناً سرکار نظام، مرہٹوں اور حیدر علی کے منشاء کے مطابق اپنی حکمت عملی کی تشکیل کرتی۔

حکومت مدراس اپنے دیوالیہ پن اور بد انتظامی سے ایسی پریشان ہوگئی تھی کہ اس نے ٹیپو سلطان سے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ مارچ ۱۷۸۴ء میں صلحنامہ منگلور پر دستخط ہوئے جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ دونوں فریق فتح کیئے ہوئے علاقوں اور قیدیوں کو واپس کردیں۔ دونوں جانب سے یہ محسوس کیا گیا کہ اپنے حریف کو بالکل زچ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن صلح کی درخواست میں حکومت مدراس نے وارن ہیسٹنگز کی مرضی کے خلاف جس طرح سے پہل کی اور انگریز وکیلوں کے ساتھ جو ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا اس سے انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ وارن ہیسٹنگز نے اس معاہدہ کو پسند نہیں کیا اور اس میں ایسی تبدیلی کرنی چاہی جس سے ظاہر ہو کہ انگریزوں کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن وہ حکومت مدراس کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ دوسری جنگ میسور کے بعد بھی حکومت مدراس کی بد انتظامیاں جاری رہیں۔ نواب محمد علی والاجاہ سے کرناٹک کی مالگزاری وصول کرنے کا حق اس نے جو حاصل کیا تھا اس سے بھی حالت کچھ سدھری نہیں۔ نواب والاجاہ نے کوشش

کر کے "مجلس نظماء" سے ۱۷۸۵ء میں اس انتظام کو منسوخ کرا دیا جس کی وجہ سے گورنر مدراس لارڈ میکارٹنی نے استعفیٰ دے دیا۔

راجا چیت سنگھ اور وارن ہیسٹنگز

وارن ہیسٹنگز کے لیے ۱۷۷۸ء سے ۱۷۸۱ء کے سال بڑی پریشانی کے تھے۔ مرہٹوں اور حیدر علی کے علاوہ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں سے جنگ جاری تھی۔ حکومت بنگال قرضدار ہو گئی تھی۔ لیکن ان تمام لڑائیوں کی کفالت اسی کے ذمہ تھی۔ ہیسٹنگز نے بڑھتے ہوئے مالی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ایسے ذریعے استعمال کیے جو اخلاقی اعتبار سے کسی طرح بھی حق بجانب نہیں کہے جا سکتے۔ چنانچہ راجا چیت سنگھ کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا وہ اسی نوعیت کا ہے۔ راجا چیت سنگھ بنارس کا راجا تھا جس نے کمپنی کی سند حاصل کر لی تھی جس کی رو سے راجا کمپنی کو سالانہ ۲۲½ لاکھ روپیہ بطور پیشکش ادا کیا کرتا تھا۔ ۱۷۷۸ء میں ہیسٹنگز نے راجا سے پیشکش کے علاوہ مزید پانچ لاکھ روپیہ کی رقم طلب کی۔ راجا نے چھ ماہ کی مہلت مانگی تو حکم بھیجا گیا کہ پانچ روز کے اندر رقم کی ادائی ہو جانی چاہیے۔ ورنہ یہ تصور کیا جائے گا کہ اس نے حکم عدولی کی ہے۔ چنانچہ راجا نے بادل ناخواستہ رقم ادا کر دی۔ ۱۷۷۹ء میں پانچ لاکھ روپیہ پھر طلب کیے گئے۔ اور ۱۷۸۰ء میں پھر اسی قدر رقم کا مطالبہ کیا گیا اور کہا گیا کہ ایک باجگزار رئیس کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ جب کبھی اصل مالک کو ضرورت پڑے تو غیر معمولی مطالبات کی تعمیل کی جائے۔ راجا نے یہ عذر کیا کہ اس کے اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے وہ ساڑھے بائیس لاکھ روپیہ کے پیشکش کے علاوہ اور کسی مطالبہ کے ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ۵ جولائی ۱۷۷۵ء چیت سنگھ اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس کی صراحت کر دی گئی تھی کہ "مقررہ رقم کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس پر کسی قسم کا اور کوئی مطالبہ عائد نہ کرے گی چاہے وہ کسی صورت میں کیوں نہ ہو اور کوئی شخص اس کا مجاز نہ ہوگا کہ اس کے اختیارات میں دخل دے یا اس کے ملک کے امن میں

خلل ڈالے[1]۔ پھر بھی اس نے دو لاکھ روپے کی رقم پیش کر دی جسے وارن ہیسٹنگز نے قبول کر لیا۔ لیکن باقی رقم کا مطالبہ باقی رہا۔ راجا کے وکیل نے کلکتہ جا کر ہیسٹنگز کو ہر چند سمجھایا کہ راجا کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہے اس لیے مزید مطالبہ نہ کیا جائے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ رقم کے علاوہ ایک ہزار سپاہیوں کی بھرتی کا حکم کلکتہ سے بھیجا گیا۔ راجا نے ۵۰۰ سپاہی بھرتی کئے اور کہلا بھیجا کہ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وارن ہیسٹنگز کو بڑا غصہ آیا۔ وہ خود بنارس گیا اور پچاس لاکھ روپیہ کا مطالبہ پیش کیا۔ بنارس پہنچکر راجا کو حراست میں لے لیا گیا اور اس کے محل کے چاروں طرف کمپنی کی فوج کے پہرے بٹھا دیے گئے اس پر رعایا میں بڑی برہمی پھیلی۔ بنارس کی عام آبادی کمپنی کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ چونکہ فوج کے پاس کافی سامان نہیں تھا اس لیے لوگوں نے جوش میں بہت سے سپاہیوں اور تین انگریز افسروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہیسٹنگز نے بھاگ کر تیس آدمیوں کے ساتھ چنار کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس گڑبڑ میں راجا چیت سنگھ بھی نکل بھاگا اور گوالیار میں سندھیا کے پاس جا چھپا۔ ہیسٹنگز نے میجر پوپہم کو بنارس پر فوج کشی کا حکم دیا۔ چنانچہ میجر موصوف نے راجا کے محل سے چالیس لاکھ نقد حاصل کیا۔ بنارس کی گدی پر راجا چیت سنگھ کا بھتیجا بٹھا دیا گیا جس نے پیشکش کی رقم میں مزید اضافہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ راجا چیت سنگھ پر ہیسٹنگز نے بڑی زیادتی کی جسے کسی طرح بھی حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اودھ کی بیگمات کا معاملہ

نواب آصف الدولہ والی اودھ کے ذمہ کمپنی کا ڈیڑھ کروڑ روپیہ بقایا انگریزی امدادی فوجوں کی

[1] Selections from the Letters, Despatches, and other state papers in the foreign. Dept. of the Govt., of India, 1772-1785 (ed by G W Forrest), Vol. II. p. 402.

تنخواہوں کے ضمن میں نکلتا تھا۔ ہیسٹنگز جب چنار کے قلعہ میں تھا تو نواب اودھ نے خود وہاں کے پاس جاکر اس کو مطلع کیا کہ اس کا خزانہ بالکل خالی ہوگیا ہے اس لیے انگریزی فوج کی تنخواہوں کی کفالت ممکن نہ ہوسکے گی جب تک کوئی اور انتظام نہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے اشاروں اشاروں میں یہ بھی کہہ دیا کہ اس کی والدہ اور دادی کے پاس کئی کروڑ روپیہ موجود ہے جو شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد ان کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اگر اس خزانہ کو ضبط کرنے کی کوئی صورت ہوسکے تو کمپنی کے مطالبات کی ادائی ہوسکتی ہے۔ ہیسٹنگز کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ چیت سنگھ کی بغاوت میں بیگمات اودھ کی امداد شامل تھی۔ حالانکہ اس الزام کی کوئی اصلیت نہ تھی لیکن ہیسٹنگز کو سہولت اسی میں نظر آئی کہ جو کچھ بیگمات کے خلاف کہا جائے اسے وہ یقین کرے۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی بیوہ بہو بیگم نے انگریز ریزیڈنٹ کے توسط سے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ آصف الدولہ کو ۵۰ لاکھ روپیہ ادا کرے گی بشرطیکہ آئندہ اس سے کسی قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے ہیسٹنگز کو اس پر آمادہ کرلیا کہ ۱۷۷۵ء کا معاہدہ ختم کرکے بیگمات کے خزانے ضبط کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ ہیسٹنگز کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی چنانچہ اس نے اجازت دے دی۔ انگریز افسروں کی مدد سے آصف الدولہ نے بڑی بے رحمی اور بے دردی سے خزانے چھین لیے جن میں سے ۵۰ لاکھ کی رقم کلکتہ بھیجی گئی۔ خود مجلس نظماء نے یہ تسلیم کیا کہ بیگمات نے چیت سنگھ کی کسی قسم سے نہ مدد کی اور نہ بغاوت پر اکسایا۔ اگر ہیسٹنگز کے پاس اس کے متعلق کوئی ثبوت موجود تھا تو اس کو چاہیے تھا کہ بیگمات سے اس کی نسبت جواب طلب کرتا تاکہ ان کا نقطۂ نظر بھی اس کو معلوم ہوجاتا۔ لیکن ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ انگریز افسر کی ماتحتی میں بیگمات سے روپیہ وصول کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے وہ انتہا درجہ سخت اور تہذیب سے گرے ہوئے تھے۔ خواجہ سراؤں کو سلاخیں گرم کرکے چبھو دیئے گئے اور دوسری اذیتیں پہنچائی گئیں اور

بیگمات کی نہایت بے باکی سے بے پردگی کی گئی۔ یہ کہنا کہ یہ طریق کار آصف الدولہ نے اختیار کیا درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ سب کچھ انگریزی فوج کی مدد سے اور انگریز افسروں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ بیگمات اور ان کے متعلقین کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی اس کی ذمہ داری براہ راست ہیسٹنگز پر اس لیے عاید ہوتی ہے کہ لکھنؤ میں جو انگریز رزیڈنٹ تھا وہ برابر گورنر جنرل سے خط وکتابت کے ذریعہ اس کی مرضی معلوم کرتا رہا۔ بلکہ اس زمانے کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ برسٹو نہیں چاہتا تھا کہ بیگمات کے ساتھ اتنی بدسلوکی کی جائے لیکن ہیسٹنگز کی تاکید پر وہ مجبور ہوا کہ ایسے سخت اور نازیبا طریق کار کی اجازت دے جو بعد میں اس ضمن میں روا رکھا گیا[1] اصل بات یہ غور طلب ہے کہ آیا بیگمات کا اس جاگیر اور خزانہ پر کوئی حق تھا یا نہیں جو نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ذریعہ وصیت انہیں ملا۔ اگر ان کا کوئی حق نہ تھا تو چھ سال قبل حکومت کلکتہ نے ان کے حق کو کیوں صراحت سے تحریری طور پر تسلیم کیا تھا۔ ہیسٹنگز کا جب پارلیمنٹ میں مواخذہ کیا گیا تو راجا چیت سنگھ اور بیگمات اودھ کے متعلق جو اس نے زیادتیاں کیں ان کا کوئی معقول جواب اس کے پاس موجود نہ تھا۔

پٹ کا قانون ۱۷۸۴ء

۱۷۸۱ء میں پارلیمنٹ نے ہندوستان کے معاملات کی چھان بین کی غرض سے دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ ایک مجلس منتخبہ (سلیکٹ کمیٹی) اور دوسری مجلس خفیہ (سیکریٹ کمیٹی)۔ مئی ۱۷۸۲ء میں ان دونوں کمیٹیوں نے رپورٹیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں جن کی بنا پر پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ وارن ہیسٹنگز اور گورنر مدراس دونوں کو ان کے عہدوں سے الگ کر دینا چاہیے لیکن کمپنی

[1] Selections from the Letters Despatches, etc., Vol III, p. 969 (ed. by G. W. Forrest).

کی مجلس شرکا (کورٹ آف پروپرائٹرز) نے ہاؤس آف کامنز کے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس اثناء میں سنہ ۱۷۸۳ء میں راکنگھم کی وزارت کی جگہ لارڈ نارتھ اور مسٹر فاکس کی ملی جلی وزارت قائم ہوئی چنانچہ فاکس نے کمپنی کے نظم و نسق کی اصلاح کی غرض سے پارلیمنٹ میں اپنے مسودات قانون پیش کئے جن کا مقصد کمپنی کے دستور میں بنیادی تبدیلی کرنا تھا۔ ان مسودات کی رو سے مجلس نظماء اور کمپنی کی مجلس شرکا دونوں کو ختم کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ چار سال کے لیے کمپنی کے تمام سیاسی اور فوجی امور کا انتظام سات کمشنروں کے بورڈ کے ذمہ کرنے کی سفارش کی گئی تھی جنھیں پہلے پہل تو پارلیمنٹ مقرر کرے گی لیکن پھر تاج کی جانب سے ان کی نامزدگی اور کمپنی کی ملازمتوں میں تمام اہم تقررات تاج ہی کی جانب سے ہوا کریں گے۔ ان کمشنروں کے نو (۹) مددگار ہوں گے جن کے ذمہ تجارتی امور ہوں گے اور جنھیں پارلیمنٹ مقرر کرے گی لیکن بعد میں ان کی نامزدگی مجلس شرکاء کمپنی کی جانب سے ہوا کرے گی۔ فاکس نے ان مسودات کو پیش کرتے وقت وارن ہیسٹنگز پر سخت چوٹیں کیں اور کمپنی کے معاملات کی خرابی کا اس کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا " پارلیمنٹ اور مجلس نظماء کی کوششوں کے باوجود اہل ہند اس وقت ایک بے رحم اور بے باک شخص کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں آج صمیم قلب کے ساتھ اس شخص پر لعنت بھیجتا ہوں[لہ] فاکس کے قانونی مسودے ہاؤس آف کامنز میں باوجود پٹ کی سخت مخالفت کے منظور ہو گئے لیکن ہاؤس آف لارڈز میں انھیں رد کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں جارج سوم بادشاہ انگلستان نے نئے پارلیمانی انتخاب کے لئے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا نئے انتخاب میں وہگ پارٹی کو سخت شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور پٹ نے اپنی وزارت کی تشکیل دی آیندہ بیس سال تک حکومت انگلستان کی سیاسی حکمت عملی کی باگ ڈور پٹ کے ہاتھ میں رہی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد سنہ ۱۷۸۴ء میں اس نے کمپنی کے

لہ ۔ Cambridge History of India Vol V. p. 196, p.

انتظام و دستور کے متعلق اپنا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا جو قانون پٹ کے نام سے مشہور ہے۔ انگلستان کی سیاست کی ایک یہ انوکھی بات ہے کہ کوئی سیاسی جماعت اپنی بے اقتداری کے زمانے میں تو کسی خاص حکمت عملی کی مخالفت کرتی ہے لیکن وہی برسر اقتدار آکر کم و بیش اسی اصول عمل کی سب سے بڑی حامی بن جاتی ہے۔ پٹ نے مخالف پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے فاکس کے ان مسودات کی سخت مخالفت کی تھی جو اس نے کمپنی کے دستور کی جدید تشکیل کے متعلق پیش کئے تھے لیکن اقتدار پانے کے بعد خود اس نے جو مسودات پیش کیے وہ بڑی حد تک فاکس کے پیش کردہ اصول عمل کے مشابہ تھے۔ پٹ کے قانون کی رو سے حکومت کے مقرر کیے ہوئے چھ کمشنروں کے ایک بورڈ کی ماتحتی میں کمپنی کے تمام مالی فوجی اور ملکی امور کی انجام دہی کی نگرانی ہوگی۔ یہ بورڈ آف کنٹرول کہلاتا ہے۔ اس میں انگلستان کا وزیر مالیات (چانسلر آف دی اکس چکر) ایک وزیر مملکت (سکریٹری آف اسٹیٹ) اور چار ارکان پریوی کونسل شامل ہوں گے جنھیں تاج نامزد کرے گا اور ان کی مدت عہدہ کا انحصار اس کی خوشنودی پر منحصر ہوگا۔ بورڈ آف کنٹرول کے ارکان اعزازی طور پر کام کریں گے اس کے جلسوں کی صدارت سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی غیر موجودگی میں وزیر مالیات کرے گا اور اگر وہ بھی موجود نہ ہو تو پریوی کونسل کے ارکان میں جو سینیر ہوگا اس کے ذمہ صدارت کے فرائض ہوں گے۔ بورڈ کی ایک خفیہ کمیٹی ہوگی جو بورڈ کے خفیہ اور اہم احکام کو ہندوستان روانہ کیا کرے گی۔ اس کمیٹی کے ارکان مجلس نظما میں سے مقرر کیئے جائیں گے اگر مجلس نظما کی کسی تجویز کو بورڈ آف کنٹرول نے منظور کر لیا ہو تو اس کو کمپنی کی مجلس سنفر کا رد کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ ہندوستانی مقبوضات کا نظم و نسق گورنر جنرل کے ذمہ کیا گیا جس کی کونسل کے ارکان کی تعداد بجائے چار کے تین کر دی گئی۔ گورنر جنرل کو سیاسی اور انتظامی امور میں بمبئی اور مدراس کے دونوں حاطوں پر پورے اختیارات دئے گئے۔ پٹ نے اپنے قانون کی رو سے حکومت انگلستان کی نگرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں

قائم کردی لیکن کمپنی کو ملکیت کے حقوق سے محروم نہیں کیا ۔ اس نے کمپنی کے نظماء سے مشورہ کے بعد اپنا مسودہ تیار کیا تاکہ وہ اپنے وجود کو خطرہ میں نہ سمجھیں جس طرح فاکس کے مسودۂ قانون کے پیش ہونے کے وقت وہ محسوس کرتے تھے ۔ اگرچہ دونوں پارٹیوں کی یہ غرض تھی کہ حکومت کی نگرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں موثر ہو جائے لیکن پٹ نے جس احتیاط اور دانشمندی سے اپنا مقصد حاصل کیا اس کا اعتراف پارلیمنٹ میں خود برک نے کیا[1] اس قانون کی وجہ سے وہ خرابیاں جاتی رہیں جو قانون تنظیم کے نافذ ہونے کے بعد کمپنی کے نظم و نسق میں پیدا ہو گئی تھیں ۔ اب وہ رکاوٹیں دور ہو گئیں جن کی وجہ سے ہیسٹنگز اور اس کی کونسل اور ماتحت احاطوں اور مرکز میں اکثر تصادم ہوا کرتا تھا ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا حکومت برطانیہ سے براہ راست تعلق قائم ہو گیا اور اس کے معاملات کی جوابدہی بھی پارلیمنٹ کے سامنے ہونے لگی ۔ آئندہ ۸۰ سال تک یہی انتظام قائم رہا جو پٹ کے قانون کے نافذ ہونے کے بعد ہندوستان میں رائج ہوا تھا جب کہ ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ سے وابستہ ہو گیا ۔

قانون پٹ کے منظور ہونے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے محسوس کیا کہ نئی وزارت متوقع ہے کہ وہ استعفیٰ دے کر اپنی خدمت سے الگ ہو جائے ۔ مسٹر پٹ نے اپنا مسودہ پیش کرتے وقت جو تقریر کی اس میں کمپنی کی بد انتظامیوں کا نقشہ کھینچا تھا جن کی اصلاح اس کی تجویزوں سے ہو سکتی تھی ۔ ہیسٹنگز سمجھتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام حکومت پر جو نکتہ چینی کی گئی وہ دراصل اس کی ذات پر حملہ ہے[2] حالانکہ پٹ اس کا مخالف نہ تھا ۔ ہیسٹنگز فروری ۱۷۸۵ء میں کلکتہ سے انگلستان روانہ ہو گیا ۔ اس نے حکومت کا چارج سرجان میکفرسن کو دے دیا جو کونسل کا سینیر ممبر تھا تاکہ

[1] Cambridge History of India, Vol. V, p. 202

[2] Gleig, Memoirs of W. Hastings, II, p. 224-26

نئے گورنر جنرل کے آنے تک وہ اس عہدہ کے فرائض ادا کرے۔

ہیسٹنگز کے انگلستان پہنچنے پر اس کے مخالفوں نے پارلیمنٹ میں اس کے مواخذہ کی تجویز پیش کی۔ برک نے اپنی جادو بیانی سے اپنے بہت سے مخالفوں تک کو رام کر لیا اور پارلیمنٹ کی اکثریت نے اس کی تائید کی۔ چنانچہ پٹ اور ڈنڈس جو اس کے موافق تھے مجبور ہو گئے کہ چیت سنگھ اور بیگمات اودھ والی تجویزوں میں برک کے ساتھ رائے دیں۔ ہاؤس آف کامنز نے ۱۹ ارکان کی کمیٹی مقرر کر دی تاکہ ہیسٹنگز کے خلاف ہاؤس آف لارڈز میں مواخذہ کی کارروائی کرے۔ یہ مقدمہ سات سال تک چلتا رہا۔ ہیسٹنگز نے اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے انگلستان کے بعض مشہور وکیلوں کی خدمات حاصل کیں اور تقریباً ایک لاکھ پونڈ کی پونجی جو وہ ہندوستان سے سمیٹ لے گیا تھا اس مقدمہ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جب مواخذہ میں اسے بری قرار دیا گیا تو اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی خدمات کے اعتراف میں ۴ ہزار پونڈ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ اس نے زندگی کے آخری ۲۴ سال اپنے گاؤں ڈیلسفورڈ میں عملی سیاسیات سے الگ تھلگ رہ کر گزارے۔

وارن ہیسٹنگز کے متعلق بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ وہ بدی کا مجسمہ اور فریب کا پتلا تھا۔ چنانچہ میکالے اور مل اسی خیال کے ہیں۔ دوسروں کے نزدیک وہ بڑی قابلیت کا شخص تھا جس نے اخلاقی احساس کی کمی کی وجہ سے بعض وقت ایسی سخت غلطیاں کیں جن کی وجہ سے انگریز قوم کی ساکھ کو صدمہ پہنچا۔ لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ بڑا مدبر تھا۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ انگریز قوم امریکہ کی سلطنت کھو چکی تھی اس نے ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ اس نے الحاقی اصول کار پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف دیسی حکمرانوں کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کا کوئی حصہ سلطنت برطانیہ میں شامل نہیں کیا گیا لیکن اس نے اپنے حسن تدبیر سے کمپنی کے اثر و اقتدار

کو ہندوستان کے ہر دربار تک پہنچا دیا۔ وہ کام جسے بعد میں ولزلی نے وسیع پیمانہ پر انجام دیا اسی کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس نے کمپنی کی حکومت کو اس زمانہ کے ہندوستانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ قوی اور زبردست بنا دیا۔

ساتواں باب

لارڈ کارنوالس اور سر جان شور کا عہد حکومت

لارڈ کارنوالس سنہ ۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۳ء

وارن ہیسٹنگز کے انگلستان جانے کے بعد میکفرسن نے ایک سال دس مہینے تک گورنر جنرل کے فرائض ادا کیے اور اس عرصہ میں اس نے کمپنی کے نظم و نسق کے سالانہ اخراجات میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی بچت کی۔ جب مرہٹوں اور ٹیپو سلطان میں لڑائی چھڑ گئی تو میکفرسن نے صلحنامہ منگلور کے خلاف مرہٹوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا جس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف اور زیادہ نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ انتقامی منصوبے سوچنے لگا۔

وارن ہیسٹنگز کے مستعفی ہونے کے بعد وزارت انگلستان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ سے ہندوستان کے برطانوی مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں سے تعلق نہ رکھتا ہو تاکہ وہ معاملات پر غیر جانبداری سے نظر ڈالے ورنہ یہ ڈر تھا کہ اگر کمپنی کے ملازموں میں سے اس عہدہ کے لیے کسی کو چنا گیا تو وہ اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر برطانوی روایات کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہیں برت سکیگا۔ پھر پٹ کے قانون کی رو سے گورنر

جنرل کے اختیارات میں بہت کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ ۱۷۸۶ء میں اس
قانون کی ترمیم کے بموجب گورنر جنرل کے عہدہ میں کمانڈر ان چیف کے عہدہ
کو ضم کر کے گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی کونسل کی اکثریت کے
خلاف فیصلہ کر سکے۔ ان حالات میں بورڈ آف کنٹرول کو گورنر جنرل کے
عہدہ کے لیے کسی ممتاز شخص کو بھیجنے کا خیال ہوا۔ لارڈ کارنوالس
نے اگرچہ واشنگٹن کے ہاتھوں یارک ٹاؤن میں شکست کھائی تھی
لیکن اس پر بھی ایک سپہ سالار اور مدبر کی حیثیت سے اس کی بڑی ساکھ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ
ہفت سالہ میں اس نے جو خدمات انجام دی تھیں انھیں فراموش نہیں کیا
گیا تھا۔ امریکہ میں اس کی شکست ایسے حالات کا نتیجہ تھی جن پر کوئی سپہ سالار
بھی قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس پر وزیر اعظم پٹ کو پورا بھروسا تھا۔ وہ ایک
خاندانی افسر تھا اور اس کے تعلقات طبقۂ امرا میں بہت کافی وسیع تھے۔
اس کے تقرر کے متعلق مورخ مارشمین کی رائے ہے کہ "کارکنان قضا و قدر
کی یہ ستم ظریفی دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ شخص ہندوستان کی حکومت کے
لیے منتخب کیا گیا جس نے "یارک ٹاؤن" پر جنرل واشنگٹن کے سامنے برطانوی
فوج سے ہتھیار رکھوا دیے جس کے نتیجے میں امریکہ ہمیشہ کے لیے انگلستان
کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس شخص پر جس نے انتہا سے زیادہ نازک موقعوں پر
ہندوستان کو انگریز قوم کے ہاتھ سے نکل جانے سے بچا لیا تھا ہولناک جرموں
اور بدکرداریوں کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا"۔[1]

انتظامی اصلاحات

کارنوالس کو اپنے پیشرو کے مقابلہ میں نظم و نسق کی اصلاح کے زیادہ مواقع حاصل تھے۔
وزارت انگلستان پر اس کا اثر تھا اور خود اس کی کونسل کے ارکان جانتے تھے
کہ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو وہ اس کو چلنے نہ
دے گا۔ اس لیے اب اس طرح ٹکرانے اور جھگڑنے کا کوئی ڈر نہ تھا جو وارن ہیسٹنگز

[1] Marshman, History of India, p 443.

اور اس کے ارکان کونسل میں آئے دن پیش آتا رہتا تھا اور جس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ کارنوالس نے اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے ابتدائی تین سال میں کمپنی کی ملازمت کی اصلاح کی کوشش کی۔ پٹ کے قانون کے مطابق کمپنی کے ملازموں پر لازم کیا گیا کہ وہ آئندہ سے تحفے لینے سے بچیں اور اس کی خلاف ورزی میں سخت سزا کے مستوجب قرار پائیں گے۔ کمپنی کے ہر ملازم کو حکام مجاز کے سامنے حلفیہ بیان کرنا ہوگا کہ اس نے ہندوستان میں کس قدر ملکیت حاصل کی ہے۔ کارنوالس نے پٹ کے قانون کی اس دفعہ کو عملی جامہ پہنایا۔ کمپنی کے ملازموں کے قواعد ملازمت کا تعین کیا گیا۔ ان کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کیا گیا تاکہ اگر وہ دیانت کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو بجا لائیں تو مفلس نہ رہیں اور رشوت کا لالچ ان کے پاس نہ پھٹک سکے۔ اس نے مجلس نظماء پر یہ بات واضح کی کہ جن لوگوں کو بڑی ذمہ داری اور بھروسے کے عہدے سپرد کیے جاتے ہیں انھیں ان کے عہدوں کی مناسبت سے تنخواہ زیادہ دیا جانا ضروری ہے تاکہ وہ ناجائز طور سے اپنے اثر اور رسوخ کو استعمال نہ کریں۔ مجلس نظماء نے اس اصول کو تسلیم کر لیا جس کی وجہ سے ملازمت کا حلقہ بہت کچھ کثافت سے صاف ہو گیا۔ مجلس نظماء کے ارکان اور انگلستان کے دوسرے با اثر اشخاص کی سعی و سفارش سے اپنے ایسے عزیزوں کو جو کوئی خاص امتیاز یا قابلیت نہیں رکھتے تھے کمپنی کی ملازمت میں داخل کرا دیا کرتے تھے۔ کارنوالس نے اس کی سخت مخالفت کی اور ایک دفعہ تو اس نے شہزادہ ولیعہد کی سفارش تک کو رد کر دیا۔ اس نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں کا اہل نہ سمجھا۔ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ داروغہ پولیس اور منصف عدالت کے عہدے تھے جن تک وہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ عہدوں پر انگریز رہیں اور ان کے تحت ادنیٰ عہدوں پر ہندوستانی کام کریں۔ حالانکہ مقامی زبانوں اور عام حالات سے واقفیت کی بناء پر ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے لیے ہر طرح موزوں تھے۔ کارنوالس

نے ہندوستانیوں کے لیے باعزت عہدۂ منصفی کا دروازہ بند کر دیا۔

دیوانی اور فوجداری عدالتوں کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ کلکٹر کے فرائض سول جج کے فرائض سے الگ کر دیے گئے۔ بورڈ آف ریونیو اور اضلاع کے کلکٹروں کے عدالتی اختیارات چھین لیے گئے۔ ہر ضلع میں دیوانی عدالتیں قائم کی گئیں جن پر انگریز ججوں کا تقرر کیا گیا جن کی مدد کے لیے ہندوستانی افسر ہوتے تھے تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قانون کی وضاحت کریں۔ ان عدالتوں کے حدودِ سماعت تمام ہندوستانیوں پر حاوی تھے اور برطانوی رعایا کے مقدمات کی سماعت عدالت العالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوتی تھی۔ چار اپیل کی عدالتیں کلکتہ، ڈھاکہ، مرشدآباد اور پٹنہ میں قائم کی گئیں جن کے فیصلوں کے خلاف کلکتہ کی صدر عدالت میں مرافعہ کیا جا سکتا تھا جس کے رکن گورنر جنرل اور آپ کی کونسل کے ارکان ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ چار عدالتیں مقرر کی گئیں جن میں سے ہر ایک پر کمپنی کے دو ملازم متعہد نگرانی کے لیے مقرر تھے جو سال میں دو مرتبہ دورہ کرتے تھے تاکہ ایسے فوجداری معاملات کی تحقیقات کریں جو دورے کے وقت کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہوں اور اس طرح انھیں براہ راست رعایا سے ربط قائم کرنے کا موقع ملے اور دادرسانی میں سہولت ہو۔ مقامی ججوں کو مجسٹریٹ کی حیثیت سے معمولی نوعیت کے مقدمات کی سماعت کا حق تھا۔ لیکن سنگین مقدمات کی سماعت عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوتی تھی۔ ہر ضلع کو تحصیلوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر تحصیل پر ایک داروغہ مقرر کیا گیا جس کو اختیار رہتا کہ ملزموں کو حکمنامہ گرفتاری پر یا بلا حکمنامہ گرفتار کرے اور ان سے حاضری عدالت کا مچلکہ یا ضمانت لے سکے۔ سر ایلیجا امپی نے قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کر دیا تھا کارنوالس نے اسی مجموعہ کو دوبارہ ایک ضابطہ کی صورت میں تدوین کرایا جو کارنوالس کوڈ کہلاتا ہے۔ فارسی اور بنگالی زبان میں اس ضابطہ کے ترجمے کرائے گئے تاکہ اہل ملک کو اس سے واقفیت ہو۔ اس میں رعایا کے جان، مال اور حقوق کی حفاظت کے متعلق صراحت کی گئی تھی۔ اس ضابطہ میں وہ طریقے بھی بتا دیے گئے تھے جن کی

بنارس ہر ذیلی عدالت سے اعلیٰ تر عدالت تک مرافعہ ہو سکتا تھا اور اگر ضرورت ہو تو گورنر جنرل باجلاس کونسل سے بھی دادرسی ہو سکتی تھی جس کے فیصلے عدل گستری کے تمام معاملات نیز ملکی انتظام سے متعلق قطعی ہوتے تھے سوائے ان دیوانی مقدمات کے جن میں پچاس ہزار روپے یا پانچ ہزار آٹھ سو پونڈ سے زیادہ ڈگری کی گئی ہو۔ ایسے مقدمات کے مرافعے ملک معظم بہ اجلاس کونسل میں ہوتے تھے لیکن عدالت کی کارروائی کا جو طریقہ اس ضابطہ میں پیش کیا گیا وہ ہندوستانیوں کے لیے نہایت پیچیدہ تھا جس سے معمولی سوجھ بوجھ کا شہری الجھن میں پڑ جاتا تھا۔ نیز انصاف رسانی میں تاخیر ہوتی تھی جس کی وجہ سے ضابطہ کا اصلی مقصد بڑی حد تک فوت ہو جاتا تھا۔ اصولی طور پر ضابطہ کے نافذ ہونے سے رعایا زمینداروں اور حکام کے خلاف اور زمیندار مالگزاری جمع کرنے والوں کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کر سکتے تھے لیکن مقدمات کے فیصلوں میں اتنی تاخیر ہوتی تھی اور ہر معاملہ اصطلاحات کی الجھنوں میں اس طرح الجھا دیا جاتا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کو عمر بھر اپنے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار رہتا تھا۔ لوگوں میں غیر ضروری طور پر مقدمہ بازی کے چسکے سے ان کے اخلاق پر برا اثر پڑا۔ لیکن ضابطہ کے نافذ ہونے سے یہ ضرور ہوا کہ افراد کے مقابلہ میں قانون کا اقتدار مسلم ہو گیا اور اصولاً رعایا کے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ بڑے سے بڑے اعلیٰ عہدہ دار کی زیادتی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکے[1]۔

بندوبست دوامی

بنگال و بہار کے دیوانی حقوق ملنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان علاقوں کے قدیم زمینداروں کے حقوق تلف کر دیے تاکہ کسی نہ کسی طرح مالگزاری کی رقم میں اضافہ ہو۔

۱؎ Mill, History of British India, Vol. V. p 355,

۲؎ Ross, Cornwallis Correspondence, Vol. II, p. 558,

نئے انتظام میں ایسے لوگ مالگزاری جمع کرنے کے کام پر مقرر کیے گئے جنھیں زمین سے کوئی مستقل تعلق نہ تھا بلکہ انھوں نے کسی علاقہ کا ٹھیکہ پٹہ کی صورت میں کمپنی کے محاسبوں اور منشیوں کو ملا کر نیلام میں انھیں حاصل کیا تھا۔ ان میں دلال، بنئے اور سٹہ باز شامل تھے جو نیلام کے وقت اونچی بولی بول کر بڑے بڑے علاقوں کی مالگزاری ادا کرانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے تھے۔ غرضکہ اسی طرح آہستہ آہستہ بنیوں اور سٹہ بازوں نے پرانے خاندانی زمینداروں کو بے دخل کر کے زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان حالات کے لازمی نتیجہ میں بنگال و بہار کی زرعی معیشت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ اکثر قدیم شریف خاندان جن کا تعلق زمین سے پشتہا پشت سے چلا آتا تھا۔ چند سالوں میں مٹ گئے اور ان کی جگہ نو دولتوں نے حاصل کر لی۔ زمینداروں کے علاوہ قحط سالی کی وجہ سے کسانوں کی حالت بھی بد سے بدتر ہو رہی تھی اور بنگال و بہار کے عوام کی قوت خرید میں ضعف اور کمی پیدا ہو گئی تھی۔

ان حالات کے مدنظر فلپ فرانسس نے سب سے پہلے سنہ ۱۷۷۶ء میں مالگزاری کے انتظامات کو مستقل بنیاد پر قایم کرنے کی تجویز پیش کی جس سے وارن ہیسٹنگز کو اختلاف تھا[1] ہیسٹنگز کے عہد میں کمپنی کی حکومت اور بنگال کے قدیم زمینداروں میں سخت کشمکش رہی۔ ہیسٹنگز کا دعویٰ یہ تھا کہ زمین حکومت کی ملکیت ہے اور زمیندار کہتے تھے کہ قدیم زمانے سے زمین زمیندار کی ملکیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ فلپ فرانسس زمینداروں کی بات سچ سمجھتا تھا جو مقامی روایتوں کے موجب بالکل درست تھا۔ لیکن ہیسٹنگز نے سنہ ۱۷۷۲ء میں پنج سالہ بندوبست قایم کیا۔ اس کی میعاد جب سنہ ۱۷۷۷ء میں ختم ہوئی تو آئندہ تین سال تک برابر ہر سال بندوبست ہوتا رہا۔ سنہ ۱۷۸۱ء میں تین سال کے لیے بندوبست ہوا اور مالگزاری کے

[1] Ascoli, Early Revenue History of Bengal and the Fifth Report, p. 34.

مطالبہ میں ۲ لاکھ ساٹھ ہزار روپے کا مزید اضافہ عمل میں آیا۔ اس کے بعد پھر سال بسال بھر کے لیے بندوبست ہوا اور جو سب سے اونچی بولی بولتا اسے مالگزاری کی وصولی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا۔ غرضکہ وارن ہیسٹنگز نے اپنے عہد میں برابر یہ کوشش کی کہ زمینداری کے بجائے عارضی اجارہ داری کا طریقہ رائج رہے تاکہ زمین حکومت کی ملکیت تسلیم کی جائے۔ اس انتظام کو بنگال کے سب قدیم زمیندار سخت ناپسند کرتے تھے۔

۱۷۸۴ء کے ایکٹ کے قانون میں اس کی صراحت کر دی گئی تھی کہ "ہندوستانی راجاؤں۔ زمینداروں۔ تعلقداروں پولیگروں اور دوسرے دیسی مالکان آراضی کی رقم مالگزاری اور خدمات کے تعین کے لیے مستقل قاعدے بنانے چاہییں"۔ چنانچہ جب کارنوالس ہندوستان آیا تو اس کو مجلس نظما نے صاف صاف ہدایت کی تھی کہ وہ مالگزاری کے سابقہ انتظام کا مطالعہ کر کے ایک مستقل بندوبست کی بنا ڈالے تاکہ کمپنی کی آمدنی میں تعین اور استحکام کی صورت پیدا ہو۔ لیکن مجلس نظما چاہتی تھی کہ پہلے تھوڑی مدت کے لیے بندوبست کیا جائے پھر تجربہ کی روشنی میں اسی انتظام کو دوامی کر دیا جائے۔ چنانچہ کارنوالس نے ہندوستان پہنچنے کے بعد مشرقی ہند کے مالگزاری کے نظام کے متعلق تفصیلی تحقیق شروع کرا دی۔ ڈنکن اور شور جیسے تجربہ کار افسروں نے اس مسئلہ کے متعلق اچھی طرح چھان بین کی۔ یہ دونوں اس اصول کو مانتے تھے کہ زمینداروں کے زمین کے حق ملکیت کو تسلیم کرنا چاہئے لیکن گرانٹ اس کے خلاف تھا۔ شور کا کہنا تھا کہ زمیندار کے آراضی کے حق ملکیت کو مان لینا چاہیے لیکن اس وقت بندوبست دس سال کے لیے ہونا چاہیے تاکہ اس عرصہ میں جو نیا تجربہ ہو اس کو آئندہ مستقل بندوبست کرتے وقت استعمال کیا جا سکے۔ بغیر اس کے یہ ناممکن تھا کہ ہر ایک گاؤں اور ہر ایک پرگنہ کے حقیقی رقبہ اور مالگزاری کو معین کیا جا سکے۔ دس سال کی مدت زمینداروں کو اپنے علاقوں کی ترقی کی جانب مائل کرنے کے لیے کافی ہوگی اور آئندہ ان خرابیوں کو دور کرنا

ممکن ہوگا جو اس عرصہ میں رونما ہونگی۔ لیکن اگر فوراً دوامی بندوبست کردیا گیا تو بہت سی خرابیوں کا ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ پر جم جانے کا ڈر رہے گا۔ پھر اس وقت کمپنی کے پاس معلومات بہت ناکافی تھیں۔ ملک قحط کے اثرات سے بالکل آزاد نہیں ہوا تھا۔ بنگال کے ایک تہائی حصہ پر کاشت نہیں کی جارہی تھی۔ ان حالات میں کوئی ایسا اقدام مصلحت کے خلاف تھا جس کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑنے والے ہوں گے۔

کارنوالس شروع ہی سے دوامی بندوبست کی خوبیوں کا قائل تھا۔ اس نے وزیر اعظم مسٹر پٹ اور مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) کے صدر مسٹر ڈنڈس کو آمادہ کر لیا کہ دوامی بندوبست کو نافذ کرنے کی اجازت دیدیں۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ میں اعلان کے ذریعے سے یہ انتظام نافذ کر دیا گیا اور دو سال بعد بنارس میں بھی اسی کے مطابق عمل ہونے لگا۔ کارنوالس نے اپنی یادداشت میں شور کے دلائل کا جواب دیا کہ دس سال کا بندوبست درحقیقت اجارے کے مساوی ہوگا اور اس کی وجہ سے زمینداروں کی بے اطمینانی کم نہ ہوگی۔ بنگال کے وسیع رقبوں میں زراعت کی ترقی اور جنگلوں کو صاف کرنے کے لیے یہ مدت ناکافی ہوگی اور زمینداروں کو میعاد کے ختم پر زائد لگان کے عاید ہونے کا خدشہ رہے گا۔ اگر دس سال کے لیے بندوبست کیا گیا تو زمینداروں کی یہ کوشش رہے گی کہ اس مدت میں زمین سے جتنا بھی استحصال کر سکتے ہیں کرلیں اور مقررہ میعاد کے ختم ہونے کے قریب اسے تباہ و ویران چھوڑ دیں۔ اس طرح وہی خرابیاں رہیں گی جو ایک سال یا تین سال کے اجاروں میں تھیں اور جن کی وجہ سے بنگال کی پیداوار اور ملک کی عام ترقی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

اس کے علاوہ کارنوالس نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دوامی بندوبست سے ہندوستان میں امراء کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے گا جو کم و بیش انگلستان کے طبقہ امراء سے مشابہ ہوگا۔ اور چونکہ یہ طبقہ حکومت کا آوردہ ہوگا اس لیے اس کا مفاد یہی ہوگا کہ حکومت کا وفادار رہے۔ لیکن دراصل

یہ ایک طرح کا مغالطہ تھا۔ کارنوالس کو ہندوستانی طبقۂ امراء کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جب کہ خود تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے متعلق اس کی رائے نہایت خراب تھی اور وہ انہیں کسی ایسے اعلیٰ عہدہ کے لائق نہ سمجھتا تھا جس میں ذمہ داری عاید ہوتی ہو۔ اگر دوامی بندوبست کا مقصد طبقۂ امراء پیدا کرنا تھا تو مالگزاری کے ناواجب مطالبات میں تخفیف ضروری تھی لیکن کمپنی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ اس کی آمدنی میں ذراسی بھی کمی ہو۔ زمینداروں کو زمین سے وابستہ کر کے اور انہیں زمین کا مالک تسلیم کر کے کمپنی ناواجب مطالبات من مانے طور پر عاید کر سکتی تھی چنانچہ مالگزاری کے بقائے کی نسبت اس قدر سخت احکام نافذ کئے گئے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس انتظام سے ہندوستانیوں میں طبقۂ امراء پیدا کرنا ہرگز اصلی مقصود نہیں ہو سکتا تھا۔

دوامی بندوبست کے تحت جتنے علاقے بنگال بہار اور اڑیسہ میں تھے ان سے تقریباً ۳۰ لاکھ روپے سالانہ مالگزاری کے علاقے ایک سال میں بقائے کی علت میں فروخت کر دئے گئے۔ اس انتظام کے تحت ۲۲ سال کے اندر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی تقریباً نصف جائدادیں بقائے کے سلسلہ میں فروخت ہوئیں اور اپنے پہلے مالکوں کے ہاتھ سے نکل کر ان سیٹھ ساہوکاروں کے پاس چلی گئیں جو کمپنی کے محاسبوں اور منشیوں سے اچھے تعلقات رکھتے اور انہیں رشوتوں سے خوش کرتے رہتے تھے۔ انہیں محاسبوں اور منشیوں کے ہاتھ میں تھا کہ مقررہ مالگزاری داخل کرنے میں اگر ایک دن کی بھی دیر ہو تو بڑی سے بڑی جائداد کو قرق کر کے نیلام کرا دیں۔ اس انتظام سے دیناجپور راجشاہی، بشن پور اور دوسرے علاقوں کے بعض بڑے بڑے زمیندار ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئے (۱)۔ ان جائدادوں کے خریدنے والے اکثر ایسے لوگ تھے جو کلکتہ میں رہتے اور اپنے کارندوں کے ذریعہ ان کا انتظام کراتے تھے۔ غرضکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر واقعی کارنوالس دوامی بندوبست کے

۱۔ Ascoli, F. 214-223

ذریعہ ایک نیا طبقہ امراء قایم کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنے اس مقصد میں ناکام رہا اس لیے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر سٹہ باز تھے جنھیں زمین سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ دوامی بندوبست کے ذریعہ کارنوالس ایسے وقت میں جب کہ کمپنی کا قرضہ بڑھ رہا تھا اور اس کا کاروبار منتشر ہوگیا تھا، کمپنی کی مالی حالت کو سدھارنا اور آمدنی میں تعین و استحکام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ استحکام محض عارضی ہوگا۔ غالباً اس کا اور اس کی ہم خیال جماعت کا یہ خیال تھا کہ ابھی انگریزی نظم و نسق کو اتنی ترقی نہیں ہوئی کہ حاکم طبقہ براہ راست محکوموں سے تعلق قایم کرے۔ مالگزاری وصول کرنے اور برطانوی مفاد کو ترقی دینے میں اسی طرح سہولت تھی کہ زمینداروں کو ان کی اپنی زمینوں سے ہمیشہ کے لیے وابستہ کردیا جائے۔

تعجب ہے کہ رمیش دت کا سا قوم پرست مصنف نہ معلوم کن خاص مصلحتوں سے کارنوالس کے اس کارنامہ کو دل کھول کر سراہتا ہے[1]۔ رمیش دت نے اسی قسم کے دوامی بندوبست کو ملک کے دوسرے حصوں میں رائج کرنے کی بھی سفارش کی ہے تاکہ زراعت پیشہ طبقہ کی حالت بہتر ہوسکے[2]۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس انتظام سے کاشتکار کی حالت بد سے بدتر ہوگئی، اگرچہ زمینداروں نے خوب نفع کمایا اس لیے کہ زرعی پیداوار کی قیمت میں پچھلے ڈیڑھ سو برس میں بہت اضافہ ہوگیا ہے جس کی مناسبت سے انھوں نے کاشتکار سے لگان بڑھا دیا ہے لیکن حکومت کو جو مالگزاری ڈیڑھ سو سال پہلے ادا کی جاتی تھی وہی آج بھی ادا کی جاتی ہے۔ دوامی بندوبست کی خرابیوں کو دیکھکر بہت عرصہ بعد سنہ ۱۸۵۹ء اور پھر سنہ ۱۸۹۸ء میں حکومت نے قوانین اراضی منظور کیے تاکہ زمیندار من مانے طور پر لگان نہ بڑھا سکیں قیمتوں

[1] R. Dutt, Economics of British India p 94 96

[2] R. Dutt, Famines in India (p xii Preface)

کے اضافہ کے ساتھ مالگزاری کی رقم میں اضافہ نہ کر سکنے کی وجہ سے حکومت بنگال بغیر حکومت ہند کی مدد کے اپنے میزانیہ کے خسارہ کو پورا نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا کہ دوامی بندوبست کی وجہ سے زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوا درست نہیں اس واسطے کہ اس کی وجہ آبادی کا بڑھنا ہے نہ کہ دوامی بندوبست۔ اس انتظام کی وجہ سے زراعت میں کسی قسم کی کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی[1] بلکہ اس کی وجہ سے حکومت کو کم از کم تین کروڑ روپیے سالانہ آمدنی کا نقصان اٹھانا پڑا جس کی پابجائی دوسرے ذریعوں سے کی گئی[2]۔

شاہی منشور ۱۷۹۳ء

۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ نے منشور کے ذریعے کمپنی کے حقوق کی آئندہ بیس سال کے لیے تجدید کی۔ اس قانون کے منظور ہونے سے پانچ سال قبل مجلس نظماء کے لیے لازم کیا گیا تھا کہ سالانہ کمپنی کی آمدنی اور خرچ کی تمام رسیدیں مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) کے ملاحظہ میں پیش کیا کرے۔

بورڈ آف کنٹرول کو یہ اختیار بھی حاصل ہو گیا تھا کہ جو شاہی فوجیں ہندوستان بھیجی جائیں ان کے اخراجات کمپنی کی آمدنی میں سے منہا کیے جائیں۔ یہ پہلا قدم تھا جس کے بموجب ہندوستان میں جتنی بھی انگریزی فوج تھی وہ شاہی قرار دی گئی۔ منشوری قانون جب پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو گلاسگو، برسٹل، مانچسٹر اور دوسرے صنعتی مرکزوں سے بے شمار درخواستیں اس مضمون کی حکومت کو موصول ہوئیں کہ ہندوستان کی تجارت کے منافع سے سارے ملک کو محروم کر کے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کو اجارہ دار بنا دینا مناسب نہیں ہے۔ مسٹر ڈنڈاس صدر مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول)

---

[1] Chandhri, History and Economics of the Land-system in Bengal, صفحہ 34

[2] Imperial Gazetteer of India (1908. Vol. VIII, p. 301).

نے ارکان پارلیمینٹ کو باور کرایا کہ اگر انگلستان آزاد تجارت کے اصول پر عمل کرے گا تو دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ لارڈ کارنوالس نے بھی صدر مجلس نگراں کو جتا دیا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی حقوق کا خاتمہ ہوا تو ہندوستان انگریز سٹہ بازوں کا دنگل بن جائے گا۔ بعض نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کی بڑی تعداد آباد ہو گئی تو خطرناک سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور امریکہ کی طرح یہ ملک انگلستان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ کمپنی کے اجارے کی بیس سال کے لیے اور تجدید کر دی گئی۔ دوسرے تجارت پیشہ لوگوں کی جیج پکار روانے کے لیے کمپنی کو حکم دیا گیا کہ تین ہزار ٹن سالانہ مال کی تجارت نرخ کی تجارت کرنے والوں کے لیے چھوڑ دی جائے۔ مسٹر ولبرفورس کی یہ کوشش تھی کہ مسیحی پرچار کرنیوالوں کو ہندوستان جاکے عیسائیت کا پرچار کرنے اور اپنے تعلیمی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے لیکن وزارت اور پارلیمنٹ نے اس تجویز سے اس لیے اختلاف کیا کہ کہیں اس سے ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ غرض کہ قانون منشور سے کمپنی کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ گورنر جنرل اگر چاہے تو اپنی کونسل کی اکثریت کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو بھی ان کی کونسلوں کے خلاف عمل کرنے کی اجازت دی گئی۔

نواب اودھ اور کمپنی نواب اودھ چاہتا تھا کہ جو انگریزی فوجیں اس کے یہاں رکھی گئی ہیں انھیں کمپنی کی حکومت واپس بلا لے اس لیے کہ ان کی وجہ سے اس کا خزانہ بری طرح زیر بار ہو رہا تھا۔ سالانہ ۵۴ لاکھ روپے وہ کمپنی کی حکومت کو ادا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے نواب نے اپنے وزیر حیدر بیگ خاں کو کلکتہ روانہ کیا۔ کارنوالس اور حیدر بیگ خاں میں کئی ملاقاتیں ہوئیں جن میں یہ طے ہوا کہ اگر انگریزی فوج اودھ سے ہٹالی گئی تو سکھوں اور مرہٹوں سے نواب کی فوج

مقابلہ نہ کر سکیں گی اور اس طرح خود اس کے ملک اور کمپنی کے علاقے غیر محفوظ رہیں گے۔ کارنوالس نے انگریزی فوج کے خرچ کے لیے بجائے ۷۴ لاکھ کے ۵۰ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دیا تاکہ نواب کی زیر باری میں کمی ہو۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ کمپنی کی حکومت اودھ کے اندرونی نظم و نسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔ لیکن سیاسی اور دفاعی نوعیت کے مسائل میں بغیر کمپنی کی مدد کے حکومت اودھ بے بس ہو گی اس لیے ان امور کی انجام دہی کمپنی کی مرضی سے ضروری ہے۔ لارڈ کارنوالس نے ان انگریز قرض خواہوں کے مطالبوں کو ماننے سے انکار کیا جو نواب اودھ کے خلاف پیش کیے گئے اور اس طرح نواب اودھ ان پیچیدگیوں سے بچ گیا جن میں نواب ارکاٹ کو الجھنا پڑا تھا۔ لارڈ کارنوالس نے اس بدنظمی کی طرف نواب کو توجہ دلائی جو اس زمانے میں اودھ میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے ملک کی آمدنی متاثر ہو رہی تھی۔[1]

سرکار گنتور کا معاملہ

۱۷۸۲ء میں نواب بسالت جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی رو سے جو کمپنی اور نواب میر نظام علیخاں کے درمیان ہوا تھا یہ طے پایا کہ نواب بسالت جنگ کے انتقال پر سرکار گنتور کمپنی کے حوالہ کر دی جائے گی۔ لیکن نواب میر نظام علی خاں نے ایسا کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ سابقہ عہد نامہ کے بموجب شمالی سرکاروں کی جو رقم پیشکش کمپنی پر واجب الادا تھی اس کا بقایا برابر چلا آتا تھا۔ اگرچہ وارن ہیسٹنگز نے نواب میر نظام علیخاں کی خوشنودی کے لیے سوبیدار دکن کا تعلق بجائے حکومت مدراس کے براہ راست حکومت ہند سے قائم کر لیا تھا لیکن پیشکش کی رقم کی ادائی اب تک حکومت مدراس ہی کے ذمہ تھی۔ حکومت مدراس نے بار بار یہ وعدہ کیا کہ بقایا جلد ادا کیا جائے گا لیکن اس وعدہ کی پابندی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے سرکار نظام کو شکایت کا موقع پیدا ہوا۔

[1] Ross, correspondence of Marquis Cornwallis, I, p 300 .ـه

جب لارڈ کارنوالس ہندوستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چونکہ ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں اور سرکار نظام نے اتحاد قایم کر لیا ہے اس لیے ٹیپو سلطان کا سرکار نظام سے مل کر جنوبی ہند میں انگریزوں کے مفاد سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں چنانچہ وہ گنتور کے معاملہ میں برابر ٹال مٹول کرتا رہا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ وہ سرکار گنتور کو دوسری سرکاروں کی طرح کمپنی کے لیے حاصل کرے گا اور مجلس نظما نے بھی اس کو اسی قسم کی ہدایتیں دی تھیں۔

سرکار گنتور کی اہمیت سرکار نظام کے نزدیک اس لیے تھی کہ اس کے ذریعہ سے سمندر تک رسائی ہو سکتی تھی۔ کمپنی سے بگاڑ کی صورت میں مشرقی ساحلی علاقہ سے فرانسیسیوں سے فوج اور سامان جنگ حاصل کرنا بھی ممکن تھا جیسے کہ سابق میں کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے لیے سرکار گنتور کی اہمیت اس لیے تھی کہ اس پر قبضہ کیے بغیر مدراس اور دوسری سرکاروں میں براہ راست تعلق برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۷۸۸ء میں کارنوالس نے دیکھا کہ اگر سرکار گنتور کا مطالبہ اب اس وقت کیا گیا تو نواب میر نظام علیخاں سے کمپنی کے مفاد کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لیے کہ انگریزوں کے خلاف مرہٹوں اور ٹیپو سلطان سے ان کے ایکے کا بظاہر امکان نہیں تھا اور بغیر اس قسم کے اتحاد کے وہ جانتا تھا نواب میر نظام علیخاں انگریزوں سے لڑائی مول نہیں لیں گے۔ ان حالات میں کارنوالس نے کپتان کناوے کو رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا اور ہدایت کی کہ وہ گنتور کے متعلق سرکار نظام سے معاملہ طے کرے اور جو پیشکش کمپنی کی طرف سے واجب الادا ہے اس کی جانچ کر لی جائے۔ چنانچہ کناوے نے حیدرآباد پہنچ کر گنتور کا مطالبہ پیش کر دیا اور نواب میر نظام علیخاں کو آگاہ کر دیا کہ وہ ہفتے کے اندر انگریزی فوجیں گنتور میں داخل ہو جائینگی۔ یہ سب کارنوالس کی ہدایتوں کے بموجب کیا گیا (۱) اس تصفیہ کی اطلاع پیشوا، سندھیا اور بھونسلا کو بھی کر دی

(۱) Forrest, selections from the state-papers of the Governers-general of India, Vol. II, p. 178

گئی۔

نواب میر نظام علیخاں کو چونکہ مرہٹوں پر اعتبار نہ تھا اور ٹیپو سلطان سے بھی اتحاد کی کوئی صورت نہ نکل سکی اس لیے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ انگریزی حکومت سے معاملہ کر لیا جائے اور سرکار گنتور کے مسئلے پر جو اس کے مقابلے میں حقیر تھا ریاست کے مستقبل کو قربان نہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سیف جنگ کو جو گنتور میں سرکار نظام کا مقرر کیا ہوا حاکم تھا ہدایات بھیجیں کہ سرکار گنتور انگریزوں کے حوالے کر دی جائے۔ شمالی سرکار کے متعلق جو پیشکش واجب الادا تھیں اس کے تصفیہ کے لیے میر عالم کو کلکتہ روانہ کیا گیا اور یہ تصفیہ ہوا کہ کمپنی سرکار نظام کو نو لاکھ سولہ ہزار چھ سو پینسٹھ روپے گیارہ آنے ادا کرے۔ میر عالم نے سرکار نظام کی جانب سے لارڈ کارنوالس سے خواہش ظاہر کی تھی کہ دونوں حکومتوں میں معاہدہ کی تجدید ہو جائے اور اس کی صراحت کر دی جائے کہ جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں رہتی ہے جس کے مصارف کا بار سرکار نظام کے خزانہ پر ہے اس کو سرکار نظام اپنے منشاء کے موافق استعمال کر سکیں۔ چنانچہ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی ترمیم اور سرکار نظام سے معاملات کی یکسوئی کی خاطر نواب میر نظام علیخاں کو ایک خط لکھا جس میں حکومت حیدرآباد کے بنیادی مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔ اس خط کے متعلق پارلیمنٹ نے توثیق کر دی کہ وہ معاہدہ کے مثل تصور کیا جائے گا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ میں یہ دفعہ تھی کہ انگریزی فوج کی دو پلٹنیں اور چھ توپیں یوروپین ماہروں کے تحت ممالک محروسہ میں موجود رہیں گی۔ اس دفعہ کے ساتھ یہ الفاظ بھی تھے "جب کبھی کمپنی کے معاملات اور ضروریات کے مدنظر ایسا کرنا ممکن ہوگا"۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے خط میں اس دفعہ کی اس طرح صراحت کر دی کہ جب کبھی سرکار نظام ضرورت محسوس کریں دو پلٹنوں کو جن میں سے ہر ایک آٹھ سو سپاہیوں پر مشتمل ہوگی اور جن کے افسر یوروپین ہوں گے طلب کر سکتے ہیں۔ اس شرط سے انھیں حلیفوں کے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگا جن میں نواب اودھ، نواب ارکاٹ، راجا تنجور اور راجا ٹراونکور کا ذکر

کیا گیا تھا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ میں اس کا بھی ذکر تھا کہ حیدر علی سے کمپنی ان اضلاع کو حاصل کرے گی جن پر اس نے کرناٹک بالاگھاٹ کے علاقہ میں قبضہ کر لیا تھا اور ان کے متعلق کمپنی سرکار نظام کو ۷ لاکھ روپے سالانہ پیشکش ادا کرے گی۔ میر عالم نے لارڈ کارنوالس کو اس جانب متوجہ کیا کہ معاہدے کی اس دفعہ پر اب تک عمل نہیں کیا گیا۔ اس پر لارڈ کارنوالس نے یہ جواب دیا کہ ۱۷۶۸ء کے حالات اور تھے اب سیاسی حالات کی نوعیت دوسری ہے۔ اس وقت چونکہ کمپنی اور دربار میسور میں صلح ہے اس واسطے اس ضمن میں کچھ کرنا ممکن نہیں لیکن اگر آئندہ کبھی ان اضلاع پر کمپنی کا قبضہ اور تصرف ہو گیا تو ممکن ہے ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی اس دفعہ پر کمپنی عمل کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کے بعد جو کمپنی نے سرکار نظام کے ساتھ کیا تھا ۱۷۶۹ء اور ۱۷۸۴ء میں کمپنی نے دربار میسور کے ساتھ جو معاہدے کئے ان میں یہ بات صراحت سے تسلیم کر لی تھی کہ کرناٹک بالاگھاٹ کے جن علاقوں پر دربار میسور کا قبضہ ہے وہ برقرار رہے گا۔ اگر سرکار نظام کے معاہدہ پر کمپنی عمل کرتی تو ان دونوں معاہدوں کو توڑنا پڑتا جو اس نے دربار میسور سے کئے تھے۔ یہ بات اس ضمن میں قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں کمپنی اور ٹیپو سلطان میں صلح تھی لیکن پھر بھی کارنوالس نے جان بوجھ کر اپنے اس خط میں جو اس نے نواب میر نظام علیخاں کو لکھا تھا اس کا نام حلیفوں میں نہیں شامل کیا جن کے خلاف کمپنی کی فوج استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس میں ایک اشارہ تھا کہ دربار میسور کے خلاف اگر نواب میر نظام علیخاں چاہیں تو کمپنی کی فوج کو استعمال کر سکیں گے۔ اگرچہ کمپنی اور ٹیپو سلطان میں بظاہر صلح ہو چکی تھی لیکن کارنوالس بخوبی جانتا تھا کہ عنقریب کمپنی کو اس کے خلاف فیصلہ جنگ کرنا پڑے گی۔ ٹیپو سلطان نے اپنے سفیر پیرس روانہ کئے اور سولھویں لوئی سے انگریزوں کے خلاف مدد مانگی۔ اس نے گورنر پانڈیچری سے بھی خط کتابت شروع کر دی تھی تاکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جب لڑائی چھڑ جائے تو فوراً کرناٹک پر حملہ کر دے۔ ٹیپو سلطان کو یہ معلوم کر کے بہت غصہ آیا کہ کارنوالس کا منشاء سلطنت میسور کے حصے بخرے کرنے کا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ سرکار نظام کمپنی کی فوج کو اس کے خلاف استعمال کرے۔

ٹیپو سلطان نے بجا طور پر کارنوالس کے اس تحریری وعدہ کو اپنے خلاف کسی قسم کی جارحانہ کارروائی کا پیش خیمہ سمجھا اور وہ بھی لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

میسور کی تیسری جنگ

جب ٹیپو سلطان کو معلوم ہوا کہ ڈچ لوگوں نے راجا ٹراونکور کے ہاتھ دو گاؤں بیچ ڈالے جو اصل میں کوچین کے تھے تو اس نے راجا ٹراونکور کو لکھا کہ چونکہ کوچین کی ریاست اس کی باجگزار ہے اس واسطے ڈچ نے ان دونوں گاؤں کے متعلق اس سے جو معاملہ کیا ہے وہ بغیر اس کی مرضی کے درست نہیں ہے۔ اس مطالبہ کے ساتھ اس نے ۱۷۸۹ء میں ٹراونکور پر حملہ کردیا۔ اس وقت چونکہ فرانسیسی ٹیپو سلطان کی براہ راست مدد نہیں کرسکتے تھے اور مرہٹے اور نواب نظام الملک انگریزوں کے موافق ہوچکے تھے اس لیے ٹیپو سلطان سے لڑنے کا یہ بہترین موقع تھا جس سے کارنوالس نے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کارنوالس نے حکومت مدراس کو تیاری حکم دیا کہ ٹیپو سلطان کے خلاف فوج کشی کی جائے۔ اس وقت مدراس میں مسٹر ہالینڈ گورنر تھا۔ اس نے کارنوالس کو لکھا کہ حکومت مدراس ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کو مصلحت نہیں سمجھتی اور وہ اپنے سابقہ عہدناموں کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی۔ چنانچہ مسٹر ہالینڈ کو استعفاء دینے پر مجبور کیا گیا اور ٹراونکور کا بہانہ دربار میسور کے خلاف جنگ کرنے کے لیے کافی تصور کیا گیا (۱) اس کی جگہ جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر اور کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا جو کارنوالس کے خیالات کا حامی تھا۔

اتحاد ثلاثہ

اس اثنا میں کارنوالس نے نواب میر نظام علی خاں اور پیشوا سے ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد قائم کرلیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ پیشوا اور سرکار نظام دس دس ہزار سوار سے انگریزوں کے شریک ہوکر ٹیپو سلطان پر حملہ کریں گے۔ اور اگر ضرورت ہوگی تو مزید فوج سے بھی امداد کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ متحدہ افواج جتنے قلعے اور سلطنت میسور کا جس قدر

---

(۱) Wilk's South India, Vol II p. [illegible]

علاقہ فتح کریں گے وہ سب تینوں اتحادیوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا جنگ کے دوران میں پیشوا اور نواب نظام الملک کی فوجوں کے خرچ کا بار انگریزوں پر پڑے گا۔ مسٹر میلٹ نے جو دربار پونا میں انگریزی حکومت کا رزیڈنٹ تھا مرہٹوں اور کمپنی میں معاہدہ کرانے میں بڑی دوڑ دھوپ کی۔ اس کے علاوہ کارنوالس نے جارج فارسٹر کو ناگپور روانہ کیا تاکہ وہ بھونسلا راجا سے موافقت پیدا کر لے۔

مئی سنہ ۱۷۹۰ء میں کارنوالس کے منشاء کے بموجب جنرل میڈوز ترچناپلی سے ۱۵ ہزار فوج لے کر کوئمبٹور کی طرف بڑھا اور کوئمبٹور، پال گھاٹ، اور ڈنڈیگل کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جنرل میڈوز نے غلطی سے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ دو طرف سے میسور کی طرف بڑھے۔ ٹیپو نے ماہرانہ نقل و حرکت سے اپنی فوجیں ان دونوں حصوں کے درمیان پہنچا دیں اور انگریزوں کو جان اور مال کا بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ جب کارنوالس کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے زبردست لشکر سمندر کے کنارے کنارے بنگال سے مدراس بھیج دیا۔ اس فوج کے مدراس پہنچنے کے بعد بھی ٹیپو سلطان کے خلاف اطمینان کے قابل نتیجے نہ نکل سکے۔ آخرکار کارنوالس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج کی باگ خود اپنے ہاتھ میں لے۔ وہ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۷۹۰ء کو مدراس پہنچا۔ فروری سنہ ۱۷۹۱ء میں کارنوالس نے بنگلور پر قبضہ کر لیا۔ سرکار نظام اور مرہٹوں کی فوج بھی امداد کے لیے پہنچ چکی تھی۔ نواب میر نظام علیخاں بہ نفس نفیس مہم پر تشریف لے گئے اور قلعہ پنگل میں اس وقت تک قیام کیا جب تک کہ جنگ کا خاتمہ نہ ہو گیا[1]۔ انگریزی فوج کو رسد کی قلت کی وجہ سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ ٹیپو سلطان کے سبک رو رسالوں نے رسد کو ہر طرف سے روک دیا تھا۔ کارنوالس کو مجبور ہو کر مدراس کی طرف پسپا ہو کر واپس جانا پڑا اور جنرل ایبر کرومبی کو بھی جو بمبئی کی طرف سے امدادی فوج لے کر مغربی ساحل کی طرف سے آگے بڑھ رہا تھا

[1] گلزار آصفیہ صفحہ (۸۲)

احکام بھیجدئے گئے کہ وہ بھی ساحل کی طرف پیچھے ہٹ جائے۔ مرہٹوں نے کوئی خاص مدد نہ کی بلکہ یہ لوٹ کھسوٹ میں رہتے۔ کارنوالس سے انھوں نے فوج کے خرچ کے لیے چودہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا جسے اس لیے منظور کیا گیا کہ کہیں وہ ٹیپو سلطان سے جا کر نہ مل جائیں۔

مدراس واپس آکر کارنوالس فوج کے لیے رسد کا پوری طرح انتظام کر کے پھر جنوری ۱۷۹۲ء میں بائیس ہزار فوج کے ساتھ میدان میں اُترا۔ سرکار نظام کی دس ہزار فوج اس کے علاوہ تھی۔ مرہٹوں کی بھی پانچ چھ ہزار فوج آکر مل گئی۔ یہ فوج ونڈیا تی لڑتی لڑاتی سرنگاپٹم پہنچ گئی۔ ٹیپو سلطان نے زبردست حملے کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی جنرل ایبر کرومبی مغربی ساحل کی طرف سے بڑھتا ہوا سرنگاپٹم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ٹیپو سلطان نے جب کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو صلح کی درخواست کی۔ ۲۴ فروری ۱۷۹۲ء صلحنامہ سرنگاپٹم پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ جنگ سے قبل ٹیپو سلطان جس پر قابض تھا اس میں سے نصف حصہ اتحادیوں کے حوالہ کرے اور تین کروڑ تیس لاکھ روپئے تاوان جنگ ادا کرے۔ یہ رقم فوراً نصف اور باقی تین قسطوں میں ادا کی جائیگی۔ ٹیپو سلطان اپنے دو بیٹوں کو بطور یرغمال انگریزوں کے سپرد کر دے گا۔ دونوں طرف کے تمام قیدی چھوڑ دئے جائیں گے انگریزوں نے مفتوحات کا ایک ثلث اور تاوان کا ایک ثلث اپنے اتحادیوں کو دیا۔ انگریزوں کو مالابار، کرگ، ڈنڈیگل اور بارہ محل کے علاقے ملے جن کی آمدنی تقریباً چالیس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ سرکار نظام کو کڑپہ، اکرم کنڈہ گوٹی اور دوآب کے علاقے دئے گئے جن پر دربار میسور نے پچھلے زمانے میں قبضہ کر لیا تھا۔ مرہٹوں کی جنوبی سرحد دریائے تنگ بھدرا قرار پائی جو پہلے تھی۔ غرض کہ صلحنامہ سرنگاپٹم نے جنوبی ہند کی قوتوں میں ایک طرح

کا توازن پیدا کر دیا اور انگریزی وقار میں اس سے کافی اضافہ ہوا۔ ٹیپو سلطان کی قوت اتنی کمزور اور اس کے وسائل اس قدر محدود ہو گئے کہ اتحادیوں کے لیے اب اس کی طرف سے زیادہ خطرہ باقی نہیں رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریزوں کی سیاسی حیثیت جنوبی ہند میں بہت مستحکم ہو گئی لیکن وہ مرہٹوں اور سرکار نظام کے درمیان جو توازن قایم کرنا چاہتے تھے وہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ بعد میں ٹیپو سلطان نے جب اتحاد ثلاثہ کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو پھر اس کی ہمت بندھی اور اس نے ایک دفعہ پھر انگریزوں سے قسمت آزمائی کی کوشش کی۔ لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اسی کوشش میں وہ اور اس کی سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنروں پر اکثر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ خواہ مخواہ دیسی والیان ملک سے مملکت کی توسیع کے لیے غیر ضروری جنگیں کرتے ہیں اور اپنی ہمسایہ حکومتوں کے علاقوں کو ہڑپ کرنے کی نیت ان کی محرک عمل رہتی ہے۔ چنانچہ پٹ کے قانون میں گورنر جنرل کو مملکت کی توسیع کے تمام منصوبوں کو خیرباد کرنے کی تاکید کی گئی تھی سوائے ایسی صورت میں جبکہ انگریز قوم کے خلاف اقدام کیا گیا ہو اور کمپنی کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف اسی بنا پر جنگ کی کہ وہ ایسا نہ کرتا تو ٹیپو سلطان کمپنی کی حکومت پر جنوبی ہند میں کاری ضرب لگاتا۔ لیکن یہ محض جارحانہ حکمت عملی کی ایک طرح توجیہ ہوئی۔

نواب ارکاٹ سے معاہدہ ۱۷۹۲ء

میسور کی تیسری جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد کارنوالس مدراس پہنچا اور نواب محمد علی کو اپنے ملکی انتظام کے متعلق نیا معاہدہ کرنے کی دعوت دی۔ ۱۷۸۱ء میں نواب ارکاٹ نے حکومت مدراس سے یہ طے کیا تھا کہ جنگ کی حالت میں وہ اپنی مالگزاری کا ⅚ حصہ کمپنی کو ادا کرے گا جس پر اس کی عملداری کی حفاظت کی ذمہ داری عاید تھی۔ ٹیپو سلطان سے جب لڑائی شروع ہوئی تو نواب ارکاٹ نے اپنے وعدہ کی پابندی نہ کی اور کمپنی نے جن لوگوں کو مالگزاری کی رقم

وصول کرنے کے لیے مقرر کیا تھا ان کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں۔
چنانچہ کارنوالس نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب ارکاٹ امن اور جنگ دونوں حالتوں
میں اپنے ملک کی مالگزاری وصول کرنے کا انتظام کمپنی کے ہاتھ میں دیدے۔
کمپنی اس کے اور اس کے گھرانے کے خرچ کے لیے کافی رقم کی علیحدہ نشاندہی
کر دے گی جو اس کو باقاعدہ ملتی رہے گی اور اس پر جو قرضہ ہے اس کی
ادائی کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا۔ لیکن نواب ارکاٹ نے اس تجویز
کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ کارنوالس نے مناسب سمجھا کہ نواب کو اس
قسم معاہدہ پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ نرمی اور اعتدال سے کام کیا جائے۔ ۱۲۔
جولائی ۱۷۹۲ء میں نواب ارکاٹ اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا جس کے مطابق
کمپنی کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ اگر کبھی کرناٹک میں جنگ ہو تو نواب ارکاٹ کے
تمام علاقوں کی مالگزاری کمپنی وصول کرے گی اور امن کی حالت میں نواب
اس کا انتظام کرے گا۔ جنگ کی حالت میں جو رقم وصول کی جائے گی اس
میں سے ۴/۵ حصہ جنگ کے اغراض پر صرف کیا جائے گا۔ لیکن نواب پر
لازم ہوگا کہ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے وہ سالانہ ۹ لاکھ پگوڈا ادا کیا
کرے چھ لاکھ بیس ہزار پگوڈا سالانہ کمپنی کو قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے
کے لیے ادا کیے جائیں گے۔ اگر نواب ارکاٹ کی جانب سے
ان رقوم کی ادائی باقاعدہ نہ کی گئی تو کمپنی مجاز ہوگی کہ اس کے علاقوں
سے جنھیں چاہے اپنے قبضے اور تصرف میں لے کر قرضہ کی ادائی تک
ان پر قابض رہے۔ کارنوالس چاہتا تھا کہ اس معاہدہ کے ذریعہ آئندہ کے
لیے ایسا انتظام کرے کہ کمپنی کو نواب کی وجہ سے مالی زیر باری نہ اٹھانا پڑے
بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر ڈنڈس کو ایک خط میں اس معاہدہ کی نسبت
کارنوالس نے لکھا کہ "میں نے نواب سے تمام امور کے متعلق تصفیہ کر لیا ہے
اور میرا خیال ہے کہ جو صورت اس ضمن میں اختیار کی گئی اس سے بہتر کوئی
صورت ممکن نہ تھی سوائے اس کے کہ ہم اس کے پورے ملک پر قبضہ کر لیں
لیکن یہ صرف تشدد ہی کے ذریعہ ممکن ہے جسے کسی طرح بھی عقل و انصاف کی

روسے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔"(۱)

سرجان شور ۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۸ء

سرجان شور کمپنی کے نہایت قابل عہدہ داروں میں سے تھا۔ اگرچہ دوامی بندوبست کے متعلق اس کو کارنوالس سے اختلاف تھا اور وہ چاہتا تھا کہ دس سال سے زائد کے لیے بندوبست نہ ہو لیکن جب دوامی بندوبست نافذ ہو گیا تو اس نے اس کو کامیاب بنانے کی انتھک کوشش کی۔ اس کی قابلیت جانفشانی اور احساس فرض کے جذبہ سے پٹ اور ڈنڈس دونوں بہت کافی متاثر تھے چنانچہ انھوں نے اس کو کارنوالس کا جانشین نامزد کیا۔ حالانکہ کارنوالس نے بورڈ آف کنٹرول کو لکھا تھا کہ گورنر جنرل ہمیشہ ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو کبھی پہلے کمپنی کی ملازمت میں نہ رہا ہو اور ایسے مرتبہ کا ہو جو اپنے ماتحتوں سے عزت و احترام حاصل کر سکے۔ لیکن کارنوالس کا خط پہنچنے سے پہلے مسٹر پٹ سرجان شور کو اس کا جانشین مقرر کر چکا تھا۔

سندھیا اور نانا فرنویس

سرجان شور کو سب سے پہلے مرہٹوں کی ریاست کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس زمانے میں مہادجی سندھیا نے بہت قوت حاصل کر لی تھی۔ معاہدہ سالبائی کے بعد اس نے ایک فرانسیسی افسر کونت دے بوین کو یورپین طریقے پر اپنی فوج کو تربیت دینے کے لیے نوکر رکھ لیا اس نے دہلی، آگرہ اور علیگڑھ پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ شاہ عالم اس کی حراست میں تھا مغل شہنشاہ نے مہادجی کو اپنا وکیل مطلق مقرر کر دیا تھا۔ اپنی بڑھتی ہوئی فوج کے اخراجات کے لیے مہادجی کو روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ اس نے راجپوتانہ کی ریاستوں اور دوآبہ کے زرخیز علاقوں سے رقم وصول کرنے کا انتظام کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ راجا جے پور نے اسمٰعیل بیگ اور محمد بیگ کی مغل فوج کی مدد سے سندھیا کو اپنے ہاں سے بے دخل کر دیا۔ ادھر روہیلکھنڈ میں غلام قادر نے زور پکڑا اور دہلی اور علیگڑھ

---

(۱) Beveridge, A comprehensive History of India I, p 626.

پر قبضہ کر لیا۔ اس نے شاہ عالم کو شاہی محل میں گھس کر گرفتار کر لیا اور اسے اندھا کر دیا۔ لیکن مہادجی سندھیا نے ۱۷۸۹ء میں دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا اور غلام قادر کو شکست دے کر قتل کروا دیا۔ راجپوتانہ میں بھی اس نے پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا۔ مہادجی سندھیا نے اپنی فوج کے بل پر جو یورپین طریق جنگ سے واقف تھی رانی اہلیہ بائی کے سپہ سالار تکوجی ہلکر کو شکست دی اور راجپوتانہ کے خراج میں اب کوئی مرہٹہ سردار اس کا شریک نہ رہا۔

غرضیکہ شمالی ہند میں اس وقت مہادجی کی قوت سب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اس کی نانا فرنویس سے سخت رقابت تھی اس لیے کہ وہ پونا دربار کی سیاست پر بھی چھا جانا چاہتا تھا۔ لیکن پیشوا مادھو راؤ کو اپنے وزیر نانا فرنویس پر ایسا بھروسا تھا کہ اس میں مہادجی بھی اپنی پوری کوشش پر بھی خلل نہ ڈال سکا۔ جس وقت لارڈ کارنوالس نے پیشوا مادھو راؤ اور نواب میر نظام علیخاں سے اتحاد ثلاثہ کی شرطیں طے کیں تو مہادجی سندھیا نے گورنر جنرل کو کہلا بھیجا کہ اگر کمپنی اس کے شمالی ہند کے مقبوضات کی اسی طرح سے ذمہ دار ہو جائے جس طرح سے وہ نواب میر نظام علیخاں کی ریاست کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کی ذمہ دار بن گئی تو وہ بھی ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد میں شریک ہونے کو آمادہ ہے لیکن کارنوالس اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس پر مہادجی کمپنی کا مخالف ہو گیا اور ۱۷۹۲ء میں پونا آیا تاکہ پیشوا کو انگریزوں کے خلاف اکسائے۔ پونا آنے سے قبل اس نے بادشاہ شاہ عالم سے پیشوا کے لیے خلعت اور سند حاصل کر لی تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی اہمیت جتلائے چنانچہ سند اور فرمان کے استقبال کے لیے پونا میں بڑا دربار ہوا۔ نانا فرنویس اگرچہ سندھیا کے سب داؤں گھات سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اندور کے تکوجی ہلکر کو اکسایا کہ سندھیا کے علاقے پر حملہ کر دے تاکہ سندھیا پونا سے اپنے علاقے کو واپس چلا جائے لیکن دے بوئین نے تکوجی کو نیچا دکھلا دیا۔ آہستہ آہستہ مہادجی نے پیشوا مادھو راؤ پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے پیشوا کو یقین دلایا کہ اگر انگریزوں کو شکست دے دی

جائے تو پورا شمالی ہند اس کے قبضے میں آجائے گا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ٹیپو سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہییں تاکہ وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو بے دخل کردے۔ لیکن یہ منصوبے پورے نہ ہونے پائے کہ پونا میں ۱۲ ر فروری سنہ ۱۷۹۴ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ دولت راؤ سندھیا اس کا جانشین ہوا۔ مادھوجی سندھیا نے ۲۵ سال حکومت کی۔ اس کو ورثہ میں چھوٹی سی ریاست ملی تھی لیکن اس نے مرتے وقت ستلج سے الٰہ آباد تک وسیع مقبوضات چھوڑے جن میں دو ثلث مالوہ اور دکن کے نہایت زرخیز ضلع بھی شامل تھے۔

مادھوجی سندھیا کے انتقال کے بعد نانا فرنویس پھر مرہٹہ سیاست پر چھا گیا۔ اس نے اپنے اثر کو بڑھانے کے لیے سرکار نظام کے خلاف جنگ کے منصوبے میں دوسرے مرہٹہ سرداروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا اور یقین دلایا کہ چوتھ اور سردیش مکھی کی بقایا رقم وصول ہوگی اس میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے گا۔ چنانچہ دولت راؤ سندھیا، تکوجی ہلکر، راگھوجی بھونسلا اور گوندراؤ گیکواڑ نے اپنے اپنے حصے کی فوجیں دکن پر چڑھائی کیلئے روانہ کیں۔

کھرڈلا کی جنگ

سنہ ۱۷۹۳ء کے بعد جب نانا فرنویس نے پیشوا کی طرف سے چوتھ اور سردیش مکھی کا سختی سے مطالبہ کیا تو سرکار نظام نے انگریزی حکومت سے حسب وعدہ امداد طلب کی۔ لیکن جان شور عدم مداخلت کی حکمت عملی کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزوں میں ابھی اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ مرہٹوں کی متحدہ افواج کا مقابلہ کرسکیں۔ پھر اس کو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر وہ سرکار نظام کی مدد کا وعدہ کرے تو کہیں پیشوا اور دوسرے مرہٹہ سردار ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے خلاف ایکا نہ کرلیں۔ غرض کہ سرکار نظام اور مرہٹوں کی کشیدگی برابر بڑھتی گئی۔ کئی مہینے تک گفت و شنید ہوتی رہی لیکن جب دونوں میں سے کوئی سمجھوتے پر آمادہ نہ ہوا تو سوائے جنگ کرنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ انگریزی ریذیڈنٹ کپتان کرک پیٹرک نے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ انگریزی پلٹنوں کو ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے استعمال کرنے کی اجازت دے سکتا ہے تاکہ اس وقت

جب کہ سرکار نظام کی فوجیں مرہٹوں سے نبرد آزما ہوں تو ملک میں اندرونی ابتری نہ پیدا ہو۔ نواب میر نظام علیخاں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انگریزی فوج کو نہیں استعمال کر سکتے تو انھوں نے رزیڈنٹ کرک پیٹرک کو کہلا بھیجا کہ ممالک محروسہ میں جس قدر انگریزی فوج ہے اس کو واپس بھیج دیا جائے۔ نواب موصوف نے اپنی فوج کی تربیت کا کام ایک فرانسیسی افسر موسیوریموں کے سپرد کر دیا جس نے بیدر کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا۔ چونکہ اس زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی اس لیے انگریزی رزیڈنٹ کرک پیٹرک نے ہر چند کوشش کی کہ سرکار نظام فرانسیسی اثر میں نہ آئیں لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ موسیوریموں کی وجہ سے دربار حیدرآباد میں فرانسیسی اثر کا بڑھنا بالکل قدرتی بات تھی۔

۱۷۹۵ء کے شروع میں مرہٹوں کی تقریباً ایک لاکھ ۲۵ ہزار متحدہ فوج دولت آصفیہ کے شمال مغربی علاقوں کی طرف بڑھی اس فوج میں سے ۲۵ ہزار فوج دولت راؤ سندھیا کی بھیجی ہوئی تھی جس کی تربیت ڈی بوائن اور پیروں کے سے قابل فرانسیسی افسروں نے اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی۔ اس میں ناگپور کے بھونسلا راجا کی ۱۵ ہزار اور ہلکر کی دس ہزار فوج بھی شامل تھی۔ سرکار نظام کی طرف سے ۵۰ ہزار بے قاعدہ اور موسیوریموں کی ۱۵ ہزار باقاعدہ فوج تھی۔ لطف یہ کہ مرہٹوں کی فوج کے ساتھ پونا کا انگریز رزیڈنٹ مسٹر مالیٹ اور سرکار نظام کی فوج کے ساتھ حیدرآباد کا انگریز رزیڈنٹ کرک پیٹرک بھی تھا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ دریائے انجرا کے قریب ہوا۔ پیروں اور ریموں کی فوجوں کا بڑا رن پڑا۔ سرکار نظام کی فوج سے پہلے مرہٹوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن مرہٹوں نے سرکار نظام کے بعض افسروں کو رشوت دے کر ملا لیا جس کے سبب سے دولت آصفیہ کو زک اٹھانی پڑی (۱) نواب میر نظام علیخاں مارچ ۱۷۹۵ء

(۱) گلزار آصفیہ ۔ صفحہ ۱۵۹

میں کھرڈلا کے قلعہ میں گھیر گئے جس کا مرہٹوں نے محاصرہ کر لیا۔ کئی ہفتے تک محاصرہ جاری رہا اور رسد کی قلت کی وجہ سے سرکار نظام کو بڑی پریشانی ہوئی۔ آخر میں راؤ رمبھا کے توسط سے مصالحت ہو گئی۔ سرکار نظام کو اپنی سلطنت کے مغربی ضلعوں کا بہت سا حصہ دریائے تاپتی سے قلعہ پرینڈہ تک مرہٹوں کے حوالہ کرنا پڑا جس میں دولت آباد، احمد نگر اور شولاپور کے ضلعے شامل تھے۔ ان علاقوں کی مجموعی آمدنی ۳۵ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ اسکے علاوہ تین کروڑ روپے کا تاوان جنگ مشیر اور رگھوجی بھونسلا کو ۲۹ لاکھ کا چوتھ کا بقایا ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ تین کروڑ میں سے ایک کروڑ کی رقم فوراً اور باقی قسطوں سے ادا کرنا طے ہوا اس رقم کی ادائی کی ضمانت میں اعظم الامراء ارسطو جاہ کو بطور یرغمال پونا بھیجنا پڑا۔

سر جان شور کی حکمت عملی یعنی عدم مداخلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگریزی اثر کا دربار حیدرآباد میں خاتمہ ہو گیا۔ موسیو ریموں نے سرکار نظام کی فوجوں کی از سر نو تنظیم شروع کر دی۔ نواب میر نظام علیخاں نے کڑپہ کے قریب اس کو فوج کے اخراجات کی پابجائی کے لیے ۱۸ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر عنایت کی اور اژدر الدولہ کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا۔ جب موسیو ریموں نے کڑپہ میں فرانسیسی فوج رکھی تو انگریزی حکومت بہت برہم ہوئی اس واسطے کہ یہ مقام احاطۂ مدراس کی سرحد پر واقع تھا۔ انگریزی ریزیڈنٹ کرک پیٹرک نے ہرچند کوشش کی کہ انگریزی اثر کو دربار حیدرآباد میں پھر سے قائم کرے لیکن کچھ عرصہ تک کامیابی نہیں ہوئی اس کی پوری ذمہ داری سر جان شور کی حکمت عملی پر تھی جو اس کے لیے تو تیار تھا کہ اگر ٹیپو سلطان سرکار نظام کے خلاف حملہ آور ہو تو سرکار نظام کی مدد کرے لیکن اگر مرہٹے حملہ کریں تو عدم مداخلت کی آڑ لے کر علیحدہ رہے۔ کارنوالس نے تیسری جنگ میسور ٹیپو سلطان کے خلاف اس بنا پر شروع کی تھی کہ اس نے انگریزوں کے حلیف راجا ٹراونکور کے علاقوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ سرکار نظام بھی انگریزوں کے حلیف تھے کیا اسی قسم

کا استدلال مرہٹوں کے سرکار نظام کے علاقوں پر حملہ کرنے کی صورت میں حق بجانب نہ ہوتا۔ لیکن سر جان شور کے پیش نظر اصول سے زیادہ اپنی سہولت تھی۔ کمپنی اس وقت مرہٹوں سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اور نانا فرنویس کو سرکار نظام کے خلاف مرہٹہ اتحاد قائم کرتے وقت پورا یقین تھا کہ کمپنی غیر جانبدار رہے گی ورنہ وہ ریاست حیدرآباد پر حملہ کی جرأت نہ کرتا۔

سنہ ۱۷۹۵ء میں پیشوا مادھو راؤ کے بے وقت انتقال پر دربار پونا میں آپس کے جھگڑے زور شور سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پیشوا نے جو ان پابندیوں کو عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا تھا جو نانا فرنویس نے اس پر عاید کر رکھی تھیں اپنے بالاخانہ پر سے گر کر جان دی۔ اس کے مرنے کے بعد رگھوبا کے لڑکے باجی راؤ دوم کو مرہٹہ سرداروں نے پیشوا بنا دیا۔ نانا فرنویس نے نوجوان باجی راؤ کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ باجی راؤ نے دوسرے مرہٹہ سرداروں سے مل کر نانا فرنویس کو قید کرا دیا۔ مگر اس کے بعد بھی دربار پونا میں سازشوں کا جال بچھا رہا اور مرہٹوں کی قوت آپس کے جھگڑوں سے کمزور ہو گئی۔ ارسطو جاہ نے اپنے پونا کے قیام کے دوران میں ان اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہیں اسی لیے رہا کر دیا گیا کہ مرہٹہ سرداروں کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان اختلافات کی تہ میں ارسطو جاہ کا بھی ہاتھ ہے جن کے تعلقات دولت راؤ سندھیا سے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ انہیں تعلقات کے اثر سے اور کچھ پیشوا اور بھونسلا کی مخالفت کے باعث دولت راؤ سندھیا نے کوشش کر کے محمد آباد بیدر کے چوتھ کی معافی ارسطو جاہ کو دلوا دی۔ نواب ارسطو جاہ اعظم الامرا تین سال پونا میں رہے اور اس کے بعد رہا کر دئے گئے۔ نواب میر نظام علیخاں نے دربار پونا اور دوسرے مرہٹہ حکمرانوں کے اختلافات سے خوب فائدہ اٹھایا اور جو علاقے کھرڈلا کی جنگ کے بعد ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے وہ اپنی حکمت عملی سے پھر حاصل کر لیے اور تین کروڑ کے تاوان میں سے صرف ۶۵ ہزار روپے ادا کئے۔

اودھ | کارنوالس کے عہد میں نواب اودھ اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں نواب کو یقین دلایا گیا تھا کہ کمپنی کی حکومت اس کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دے گی اور نہ فوجی اخراجات کے ضمن میں مطالبات کئے جائیں گے لیکن شور نے دو رجمنٹوں کے خرچ کا مزید بار اودھ کے خزانہ پر ڈالا ۔ ۱۷۹۷ء میں شور خود لکھنؤ گیا اور ریاست کی بدنظمی کی اصلاح کی ضرورت نواب آصف الدولہ کے ذہن نشین کرائی اور تفضل حسین خاں کو جو انگریزوں کا موافق تھا وزیر اعظم مقرر کیا ۔ نواب نے بادل ناخواستہ اس مداخلت کو برداشت کیا شور کے کلکتہ واپس ہونے کے چھ ہفتے بعد نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اور وزیر علی اس کا جانشین ہوا جس کی گدی نشینی حکومت ہند نے بھی تسلیم کر لی ۔ لیکن اودھ میں عام طور پر وزیر علی کی جانشینی کو ناپسند کیا گیا ۔ اگر چہ آصف الدولہ نے اپنی کوئی اولاد نہ ہونے سے اس کو اپنا بیٹا بنایا تھا لیکن اس کی طینت خراب تھی ۔ سعادت علی خاں نے جو نواب آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا اور بنارس میں رہا کرتا تھا کلکتہ کی حکومت کو اپنے موافق کرنے کی کوشش کی تاکہ وزیر علی کو گدی سے الگ کر کے اس کو نواب بنایا جائے ۔ اس نے کمپنی کو مزید مراعات دینے کا بھی وعدہ کیا ۔ چنانچہ سر جان شور دوبارہ لکھنؤ گیا اور انگریزی سنگینیوں کے بل پر وزیر علی کو الگ کر کے سعادت علی خاں کو اودھ کی گدی پر بٹھایا ۔ نئے نواب سے گدی نشینی کے وقت نئے معاہدے پر دستخط کرائے گئے جس کی رو سے طے ہوا کہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی پر ہوگی ۔ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے وہ سالانہ ۷۶ لاکھ روپے کمپنی کو ادا کیا کریگا ۔ معمولاً دس ہزار کمپنی کی فوج اودھ میں رہے گی لیکن ضرورت کے وقت اس کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے گا ۔ اگر اضافہ ہوگا تو اخراجات کے لیے مزید رقم کی ادائی اودھ کے خزانہ سے ادائی کی جائے گی ۔ نواب اندرونی نظم و نسق کے لیے ۳۵ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے گا ۔ قلعہ الٰہ آباد جو ممالک مغربی و شمالی کی کنجی سمجھا جاتا تھا کمپنی کے حوالے کر دیا جائے گا ۔ نواب نے

یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ کسی دوسری حکومت کے ساتھ نامہ و پیام نہیں کرے گا اور بغیر کمپنی کی اجازت کے نہ کسی یورپین کو اپنی فوج میں ملازم رکھے گا اور نہ اپنے ملک میں اجازت دے گا۔ وزیر علی کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور بنارس میں رہنے کی اس کو اجازت دے دی گئی۔ معاہدہ کی رو سے نظم و نسق کی عام نگرانی بھی کمپنی نے اپنے ذمہ کر لی تاکہ آئندہ انتظامی ابتری نہ پیدا ہو۔ غرضیکہ تمام علی اغراض کے مدنظر اس معاہدہ کے بموجب ریاست اودھ کی رہی سہی آزادی کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ سرجان شور کو یہ ڈر تھا کہ کابل کے حکمران زمان شاہ نے اگر اودھ کا رخ کیا تو نواب اودھ کی فوج میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اس کے حملہ کی تاب لا سکے۔ زمان شاہ نے لاہور تک کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا تھا لیکن افغانستان کی اندرونی گڑبڑ اور اپنی مغربی سرحد پر ایرانیوں کے حملے کی وجہ سے اس کو واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔ اب انگریزی مفاد اسی میں تھا کہ وہ اودھ کی ریاست کو اس طرح برقرار رکھے کہ بجائے خطرہ کے وہ ضرورت کے وقت مددگار ثابت ہو۔ اس کی صورت یہی تھی کہ وہ وہاں کے نظم و نسق کی عام نگرانی اپنے ذمے لے لے اور نواب کی فوج کو جو بالکل ناکارہ تھی کم کر کے کمپنی کی فوج کو بڑھا دے جو اودھ کی حفاظت کی ذمہ دار ٹھہرے۔

سرجان شور کی حکومت کے آخری زمانے میں بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج اور شاہی فوج کے افسروں میں اپنے رتبے اور تنخواہ کے متعلق سخت اختلافات شروع ہو گئے۔ چنانچہ کمپنی کے افسروں نے کھلم کھلا حکومت کی حکم عدولی شروع کر دی۔ ڈنڈاس اور کارنوالس چاہتے تھے کہ کمپنی کی فوج اور شاہی فوج کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے لیکن اس خیال کو پورے طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ سرجان شور کمزور شخص تھا۔ فوجی افسروں کے ان اختلافات سے گھبرا گیا۔ اس میں کلائیو کی سی ہمت اور جوانمردی نہیں تھی کہ اپنی قوت ارادی سے حالات پر قابو پاتا۔ اس نے کمپنی کے افسروں کی تنخواہ اور بھتہ میں اضافہ کر کے انہیں رضامند کرنے کی

کوشش کی۔ شور کی اس کمزوری سے فوج کے نظم و ضبط پر بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ بورڈ آف کنٹرول نے اس کے طرز عمل کو ناپسند کیا۔ اس کی جگہ لارڈ ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس نے ۱۷۹۸ء میں اپنی خدمت کا جائزہ حاصل کیا۔ سر جان شور کو اس کی خدمات کے صلہ میں لارڈ ٹیگن موتھ کا خطاب دیا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے وارن ہیسٹنگز کی طرح اس کا مواخذہ کرنے کی بھی تجویز پیش کی لیکن پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

آٹھواں باب

لارڈ ولزلی اور عہد معاونت

ہندوستان آنے سے پہلے مارکوس ولزلی (لارڈ مارنگٹن) چار سال
تک بورڈ آف کنٹرول کا رکن رہ چکا تھا اور اس لیے ہندوستانی معاملات کا
اس کو پورا علم تھا۔ مسٹر پٹ سے اس کے شخصی تعلقات تھے اور مسٹر ڈنڈاس
کو اس کی قابلیت پر پورا بھروسا تھا۔ انگلستان سے ہندوستان آتے وقت
وہ راس امید (کیپ آف گڈ ہوپ) پر اترا اور یہاں اسے لارڈ ہربرٹ اور
میکارٹنی سے ملنے کا موقع ملا جو دونوں مدراس کے گورنر رہ چکے تھے۔ ان
کے علاوہ یہیں اس کی میجر کرک پیٹرک سے بھی ملاقات ہوئی جو سندھیا اور سرکار
نظام کے دربار میں ریزیڈنٹ رہ چکا تھا اور دیسی والیان ملک کے معاملات کا
وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ ان سب سے ولزلی کو ہندوستان کے نئے حالات معلوم
ہوئے۔ ولزلی نے ارادہ کر لیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے وہ
ٹیپو سلطان اور اس کی سلطنت کا خاتمہ کرے گا اس لیے کہ اس سے بڑھ کر
اس وقت انگریزوں کا اور کوئی دشمن ہندوستان میں نہیں۔ ولزلی نہایت
حوصلہ مند شخص تھا۔ وہ انگریزی حکومت کی سیادت کو سارے ملک میں
منوانا چاہتا تھا تاکہ کمپنی کی حکومت کا کوئی حریف باقی نہ رہے اور جو دیسی

والیان ملک باقی رہ گئی تھیں تو وہ کمپنی کی طاقت کے آگے سر جھکا دیتیں۔ جب وہ
ہندوستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ہر طرف کمپنی کے خلاف بے اعتمادی پھیلی
ہوئی ہے۔ سر جان شور کی عدم مداخلت کی حکمت عملی سے دیسی والیان
ملک کو کمپنی کے وعدوں پر اعتبار نہیں رہا تھا اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان
انگریزوں کے خلاف جوڑ توڑ کر رہا تھا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف زمان
شاہ والی افغانستان اور سلطان ترکی سے فوجی امداد طلب کی۔ اس زمانے
میں نپولین بوناپارٹ شہنشاہ فرانس نے سارے یورپ پر اپنی دھاک بٹھا دی
تھی اور وہ مشرقی ملکوں کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ مصر
میں تھا تو ٹیپو سلطان نے اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔
نپولین چاہتا تھا کہ ایران کی طرف سے بڑھ کر خشکی کے راستے سے ہندوستان
پر حملہ کرے لیکن بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اسے فرانس واپس جانا پڑا۔

میسور کی تیسری لڑائی کے بعد ٹیپو سلطان اپنی قوت کو بڑھانے اور
انگریزوں سے مقابلہ کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دارالحکومت کی
قلعہ بندی میں اضافہ کیا۔ فوج کی جدید تنظیم کی اور اپنے سفیر ماریشس روانہ کیے
تاکہ انگریزوں کے خلاف امداد حاصل کرے۔ ولزلی چاہتا تھا کہ ہندوستان پہنچنے
کے بعد فوراً ٹیپو کے خلاف جنگ شروع کر دے تاکہ مالابار کے ساحلی علاقے
پر قبضہ کر کے سرنگاپٹم پر چڑھائی کر دی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ
اپنے ہاں ایک برٹش ریزیڈنٹ رکھے اور جتنے فرانسیسی اس کی ملازمت میں
ہیں انہیں الگ کر دے۔ لیکن حکومت مدراس نے اس منصوبہ کی مخالفت
کی اور کہا کہ اس کی فوجیں چھ مہینے سے پہلے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں
جنرل ہیرس نے بھی فوری جنگ کی مخالفت کی اور کہا کہ ٹیپو سلطان کو موقع
دینا چاہیے کہ اگر وہ چاہے تو انگریزی حکومت سے معاملات کی یکسوئی کر لے[1]
چنانچہ ولزلی اس وقت خاموش ہو گیا اگرچہ اس کا ارادہ یہی رہا کہ وہ فوراً اپنے منصوبہ کو

[1] Martin. Wellesley's Despatches, Vol. 1, p. 55.

عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔

اس دوران میں ولزلی نے مرہٹوں اور نظام سے اتحاد ثلاثہ کی تجدید کی کوشش شروع کر دی۔ سر جان شور کی عدم مداخلت کی حکمت عملی کے سبب سے نواب میر نظام علیخاں انگریزی حکومت سے آگتا گئے تھے اور انھوں نے اپنی فوج کی تربیت اور تنظیم کا پورا کام موسیو ریمون کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں موسیو ریمون کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ موسیو پیرون فرانسیسی فوج کا قائد مقرر ہوا۔ اس میں ریمون کی سی قیادت کی صفتیں موجود نہ تھیں اور نواب میر نظام علیخاں کو بھی اس پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے پیرون کی سرکردگی میں دکن کے سیاسی معاملات میں جو دخل اندازی شروع کر دی تھی وہ امرائے دکن کو سخت ناگوار تھی۔ خاص طور پر اعظم الامراء ارسطو جاہ فرانسیسیوں کے سخت مخالف ہو گئے تھے[1] غرضکہ یہ سب حالات ایسے تھے جن سے ولزلی پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ولزلی کو اس کی بھی اطلاع تھی کہ ٹیپو سلطان نے سرکار نظام سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور نواب میر نظام علیخاں کے بھتیجے امتیاز الدولہ کے توسط سے وہ دولت آصفیہ کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ولزلی کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ ریاست حیدرآباد میں جو فرانسیسی فوج ہے وہ انگریزوں کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے نواب میر نظام علیخاں سے صلح و صفائی کرنی چاہی اور یقین دلایا کہ سر جان شور کی حکمت عملی سے انھیں جو شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں آئندہ کبھی ان کی نوبت نہ آئیگی۔

سرکار نظام سے معاہدہ

ٹیپو سلطان کے خلاف فوجی اقدام کرنے سے پہلے ولزلی نے یہ ضروری خیال کیا کہ سرکار نظام سے نامہ و پیام کے ذریعہ معاملات کی یکسوئی کر لے۔ نواب ارسطو جاہ اور

[1] حدیقۃ العالم۔ جلد ۲ صفحہ ۴۱۴

میر عالم فرانسیسی اثر کے بے حد مخالف تھے جو پچھلے دنوں سر جان شور کی ناعاقبت اندیش
حکمت عملی کی وجہ سے انھیں دربار حیدرآباد میں حاصل ہو گیا تھا۔ دراصل ارسطوجاہ
نے سر جان شور سے نامہ و پیام کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ فرانسیسی
پلٹنوں کی جگہ ایک انگریزی امدادی فوج ریاست حیدرآباد میں رہے
لیکن سر جان شور اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ ولزلی نے حیدرآباد کے انگریز
ریزیڈنٹ کپتان جیمس کرک پیٹرک کو ہدایات بھیجیں کہ وہ ارسطوجاہ سے
فوراً گفت و شنید شروع کر دے۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۷۹۸ء سرکار نظام اور
کمپنی میں ایک معاہدے کی رو سے طے ہوا کہ فرانسیسی افسروں کو جو ممالک
محروسہ میں ہوں انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ اور فرانسیسی پلٹنوں
کو الگ کر کے ان کی جگہ انگریزی چھ پلٹنیں یعنی ہر پلٹن ایک ہزار جوان اور ایک
رجمنٹ پانچ سو سواروں کی اور توپ خانہ ممالک محروسہ میں رہے گا۔ اس
اعانتی فوج اور توپ خانہ کا خرچہ چوبیس لاکھ سترہ ہزار روپے سالانہ قرار
پایا جس کا بار دربار حیدرآباد پر رہے گا۔[1] یہ بھی طے ہوا کہ سرکار نظام آئندہ
کسی یورپین کو اپنے ہاں کمپنی سے بے پوچھے ملازم نہیں رکھے گی۔ سرکار نظام
اور مرہٹوں میں جو اختلافی مسائل ہوں گے ان کا انگریزی حکومت پنچ بن کے
تصفیہ کر دے گی۔ اگر مرہٹے کمپنی کے تصفیے کو ماننے سے انکار کریں تو انگریزی
حکومت دولت آصفیہ کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی۔[2]

ولزلی نے یہ محسوس کیا کہ اگر سرکار نظام نے فرانسیسی سپاہ کو برطرف
کر دیا اور مرہٹوں نے اس کے بعد میدان خالی پا کر ممالک محروسہ سرکار عالی
کے سرحدی علاقوں پر چڑھائی کی تو کمپنی کی طرف سے سرکار نظام کو اس بات
کا اطمینان دلانا ضروری ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے گی۔ جس کی ذمہ داری
کو اپنے اوپر لینے کی جرأت سر جان شور میں نہ تھی اس کی تکمیل ولزلی
نے کر دی۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ جب تک سرکار نظام کو اس کی حفاظت

[1] Aitchison, Vol. IX, p. 49.
[2] Aitchison, Vol IX, p. 50.
[3] Fraser, Our faithful Ally the Nizam, p 216

کا یقین نہ دلا دیا جائے وہ کمپنی کے ساتھ ٹیپو سلطان کے خلاف کی داہم میں دل کھول کر حصہ نہیں لے سکتی۔ اس کا امکان تھا کہ سرکار نظام اپنی فوجیں کمپنی کی فوجوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کے خلاف بھیج دے اور ادھر مرہٹے ممالک محروسہ کی شمالی مغربی سرحد پر چڑھائی کر دیں۔ اس معاہدہ میں اگرچہ مرہٹوں کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا لیکن ممالک محروسہ کے تحفظ کا یقین دلایا گیا۔ اس معاہدہ کی تمہید میں وضاحت کی گئی کہ کمپنی اور سرکار نظام کی حکمت عملی اور مفاد ایک ہے اور دونوں کی دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی وقت پر مدد کرے[4]

پیشوا اور ولزلی

ولزلی چاہتا تھا کہ جس طرح سرکار نظام سے معاہدہ کے ذریعہ یکسوئی ہو گئی ہے اسی طرح پیشوا باجی راؤ سے بھی استحکام ہو جائے۔ پیشوا نے بھی ولزلی کے ہندوستان آنے سے پہلے سر جان شور سے سندھیا کے خلاف فوجی امداد طلب کی تھی لیکن شور نے مرہٹوں کے آپس کے جھگڑوں میں کسی کا بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ پیشوا نے نواب میر نظام علیخاں سے اتحاد کر لیا جس کی رو سے آٹھ لاکھ سالانہ کا علاقہ سرکار نظام کو واپس دیدیا گیا تھا۔ اس پر سندھیا نے ٹیپو سلطان سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اس کو ممالک محروسہ پر حملہ کرنے کے لیے ابھارا۔ ولزلی کے ہندوستان پہنچنے کے وقت پیشوا اور سندھیا کے تعلقات میں ظاہری طور پر یکسوئی ہو گئی تھی۔ اس لیے پیشوا کو جب ولزلی نے عہد معاونت کی شرطیں پیش کیں تو اس نے انھیں غیر ضروری بتایا اور وعدہ کیا کہ اگر کمپنی کی حکومت ٹیپو سلطان کے خلاف لڑے تو اتحاد ثلاثہ کے بموجب مرہٹے اسکی امداد کریں گے۔

میسور کی چوتھی جنگ سنہ ۱۷۹۹ء

جب ولزلی کو یہ اطلاع پہنچی کہ حیدرآباد کی فرانسیسی فوج کو مائکم اور کرک پٹرک

4. Martin, Wellesly's Despatches, Vol. II p 70

نے بڑی خوبی سے بغیر ایک قطرہ خون بہائے نہتا کر دیا تو اس نے اپنا پہلا مراسلہ ٹیپو سلطان کے نام روانہ کیا جس میں اس سے اس سفارت کے متعلق شکایت کی گئی تھی جو اس نے ماریشیس کے فرانسیسی گورنر کے پاس امداد طلب کرنے کے لیے روانہ کی تھی۔ ولزلی نے لکھا کہ چونکہ اس نے برطانوی قوم کے دشمنوں سے میل ملاپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے اس نے اس اتحاد کی خلاف ورزی کی جو کارنوالس کے عہد میں ہوا تھا۔ اس مراسلہ میں ولزلی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ میجر ڈوٹن کو ٹیپو سلطان کے دربار میں بہ حیثیت وکیل بھیجا جائے گا تاکہ دونوں حکومتوں کے درمیان شکوک اور شبہے آسانی سے رفع ہو جایا کریں اور معاملے طول نہ کھینچا کریں۔ اس مراسلہ کے لکھنے کے بعد ولزلی خود مدراس گیا تاکہ تمام سیاسی اور فوجی معاملات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے اور گورنر مدراس کے ذمہ صرف مقامی انتظامات رہیں۔ یہ اس نے اس واسطے کیا کہ اسے ڈر تھا کہ حکومت مدراس اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں پوری طرح سے مدد نہیں کرے گی۔ ولزلی کے خط کا ٹیپو سلطان نے یہ جواب دیا کہ جو جہاز مغربی ساحل سے ماریشیس گیا ہے وہ تجارتی تھا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں کہ اس نے اس میں سفارت بھیجی تھی۔ واپسی پر ۴۰ ماریشیس کے باشندے اس سلطنت میں ملازمت کی تلاش میں آئے تھے جن میں سے دس بارہ کو ملازمت دیدی گئی۔ میجر ڈوٹن کے میسور بھیجے جانے کو ٹیپو سلطان نے بے ضرورت بتایا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد ولزلی نے ۹ جنوری ۱۷۹۹ء کو دوسرا مراسلہ بھیجا جس میں میجر ڈوٹن کے میسور بھیجے جانے پر اصرار کیا اور فوراً جواب کا مطالبہ کیا۔ جب اس کا جواب نہ ملا تو ولزلی نے ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ لڑائی بہت دنوں تک نہیں چلی۔ صرف تین مہینوں میں اس کا فیصلہ ہو گیا۔ کمپنی کی فوج جنرل ہیرس کی کمان میں بیس ہزار سے اوپر تھی جس نے مشرق کی طرف سے حملہ کیا۔ اس کے ساتھ دس ہزار سوار حیدرآباد کی امدادی فوج کے اور چھ ہزار حیدرآباد کی انگریزی

حمایتی فوج تھی جو کپتان جان مالکم کے تحت اور کرنل آرتھر ولزلی کی نگرانی میں تھی جو گورنر جنرل کا چھوٹا بھائی اور بعد میں ڈیوک آف ویلنگٹن کے نام سے مشہور ہوا۔ مغربی سرحد کی طرف سے بمبئی کی فوج نے جنرل اسٹورٹ کی ماتحتی میں حملہ کیا۔ بمبئی کی فوج نے پہلے سری سیور کے مقام پر ٹیپو سلطان کو شکست دی اسی دوران میں جنرل ہیرس نے بنگلور پہنچ کر سرنگا پٹم کا رخ کیا۔ ملولی کے مقام پر جنرل ہیرس نے ٹیپو سلطان کی فوج کو پیچھے دکھایا اور دریائے کاویری کو پار کر کے بمبئی کی فوج سے مل گیا۔ مدراس اور بمبئی کی فوجوں نے جن کے ساتھ سرکار نظام کی فوج بھی تھی سرنگا پٹم کا محاصرہ ۶ اپریل ۱۷۹۹ء کو کر لیا۔ ٹیپو سلطان نے صلح کے نامہ و پیام شروع کیے لیکن ولزلی نے جو شرطیں پیش کیں وہ ایسی کڑی تھیں کہ انہیں قبول کرنا اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا۔ ولزلی چاہتا تھا کہ ٹیپو سلطان اپنی رہی سہی سلطنت میں سے نصف انگریزوں کے حوالے کر دے اور دو کروڑ روپے تاوان ادا کرے اور اپنے چار بیٹوں کو یرغمال کے طور پر حوالے کر دے۔ سلطان نے ان شرطوں کو نہ مانا اور آخری وقت تک مقابلہ کی ٹھان لی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزی فوج نے بڑے زور شور سے گولے برسائے اور فصیل میں شگاف ڈال کر قلعہ کے اندر داخل ہو گئی۔ ٹیپو سلطان آخری وقت تک بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۶ سال تھی۔ اس کو حیدر علی کے مقبرہ کے قریب دفن کیا گیا۔

سرنگا پٹم کی تسخیر کے بعد انگریزوں نے تمام سلطنت میسور کے حصے بخرے کر دئے۔ مرہٹے اگرچہ انگریزوں کے اتحادی تھے لیکن چونکہ انھوں نے جنگ میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا اور پیشوا عہد معاونت کے لیے تیار نہ تھا اس لیے انہیں کوئی علاقہ نہیں دیا گیا۔ پیشوا کے حصے میں سے دو ثلث سرکار نظام کو اور ایک ثلث کمپنی کو ملا۔ سلطنت میسور کا تقریباً نصف علاقہ کرشنا راج وڈیار کو دیا گیا اور اس کو معاہدے کے ذریعے انگریزی حکومت نے اپنے تحت لے لیا۔ ایک تجربہ کار برہمن پورنیا کو اس کا دیوان مقرر کیا گیا۔ میسور کی یہ نئی ریاست کمپنی نے کرشنا راج وڈیار کو بطور عطیہ دی اور اس

شرط کا بھی اظہار کر دیا گیا کہ یہ عطیہ شخصی ہے خاندانی نہیں۔ چنانچہ جو معاہدہ کیا گیا اس میں جانشینوں اور وارثوں کا جان بوجھ کر کوئی ذکر نہیں۔ باقی علاقے میں سے کمپنی نے کنارا اور کوئمبٹور کے اضلاع کے علاوہ مالابار اور کرناٹک کا درمیانی علاقہ پر قبضہ جمایا۔ کمپنی نے جو علاقے حاصل کیے ان سب کی آمدنی تیس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ سرکار نظام کو گوٹی اور گرم کنڈے کے اضلاع ملے[1] جن میں چتل درگ، نندی درگ اور کولار کے قلعے شامل تھے۔ سرنگا پٹم کی لوٹ میں ایک کروڑ سے زائد مالیت کا سامان اور زر وجواہر ولزلی نے فوج میں تقسیم کرا دیے۔ ٹیپو کے خاندان کے لوگوں کے لیے جنھیں ویلور میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ آٹھ لاکھ سالانہ کے وظیفے مقرر کیے گئے جن کی ادائی کمپنی نے اپنے ذمہ لی۔ چوتھی جنگ میسور کے بعد جنوبی ہند میں انگریزی تسلط قائم ہو گیا اور گذشتہ تیس سال سے انگریزی حکومت کو میسور کے حکمرانوں سے جو خدشہ لگا ہوا تھا وہ جاتا رہا۔ اس خدشہ کے مٹ جانے سے انگریزوں کے خلاف جنوبی ہند میں فرانسیسی سازش کا کوئی مرکز باقی نہ رہا جس کی آڑ لے کر وہ اپنے تسخیر ہند کے منصوبوں کو آگے بڑھا سکتے۔

عہد معاونت کا اصول

میسور کی طرف سے اطمینان کے بعد ولزلی نے عہد معاونت کے اصول پر عمل کرنے اور مختلف دیسی ریاستوں کو برطانوی سیادت کے تحت لانے کی کوشش شروع کی۔ دراصل عہد معاونت کا اصول ولزلی نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں رائج نہیں کیا۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں اودھ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ اسی طرح کا تھا۔ چنانچہ اس کے بموجب اودھ میں انگریزی فوج رہتی تھی جس کے ذمہ ملک کی حفاظت اور مدافعت تھی اور جس کے اخراجات کا بار نواب وزیر کے خزانہ پر تھا۔ اس کے علاوہ وارن ہیسٹنگز کے زمانے ہی میں انگریز ریذیڈنٹ بھی لکھنؤ

[1] Owen. The Wellington Despatches, p 136; Briggs The Nizam, appendix, p. 267-297).

میں مقرر کر دیا گیا تھا جو نواب وزیر کو کمپنی کی حکومت کے منشا سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن وارن ہیسٹنگز نے جس طریق کار کی ابتدا کی تھی اس کی تکمیل ولزلی نے کی۔ اس اصول کو رواج دینے سے ایک فائدہ یہ تھا کہ ولزلی کمپنی کی فوجی حدوں کو اس کی سیاسی حدوں سے آگے بڑھا دینا چاہتا تھا تاکہ ہندوستان کا بیشتر حصہ انگریزی سیادت اور بالادستی کو تسلیم کرلے۔ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ کمپنی کی بے اجازت دیسی والیان ملک آپس میں کوئی سیاسی اتحاد نہیں کر سکتے جو آئندہ کبھی کمپنی کے مفاد کے لیے مضر ہو۔ چنانچہ آئندہ وہ کمپنی کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر پائے اس لیے کہ ہر ایک ان میں سے الگ الگ کمپنی کی حکومت سے تعلق رکھتا تھا اور اکثر ہر ایک کے تعلق کی نوعیت میں فرق ہوتا تھا جسے انگریز حکمران اپنی عام سیاسی مصلحتوں کے مطابق پیش نظر رکھا کرتے تھے۔ عہد معاونت سے ایک یہ بھی مقصد تھا کہ فرانسیسی نفوذ اور اثر کا دروازہ بند کر دیا جائے اس لیے کہ وہ والی ملک جو اس قسم کا معاہدہ کرتے تھے یہ بھی وعدہ کرتے تھے کہ وہ بغیر کمپنی کی اجازت کے کسی یورپین کو اپنے ہاں ملازم نہیں رکھ سکیں گے۔ دیسی ریاستوں میں کمپنی کی جو فوج رکھی جاتی تھی اسے کمپنی اپنے تسخیر ہند کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتی تھی اور کمپنی کی سیاسی حدوں کے باہر اس کے فوجی مرکز قائم ہو جاتے تھے۔ کمپنی کے مقبوضات کے امن و امان میں کسی طرح کا خلل ڈالے بغیر اس فوج کو ان مرکزوں سے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجا جا سکتا تھا۔ اس طرح حکومت ہند کو ایک بڑی فوج مل جاتی تھی جسے وہ اپنے اغراض کے لیے استعمال کر سکتی تھی بلا کسی قسم کی مالی زیر باری کے۔[1]

لیکن اصول عہد معاونت میں یہ خرابی تھی کہ دیسی والیان ملک سے انگریزی فوج کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے جو رقم طلب کی جاتی تھی وہ ان کی مجموعی آمدنی کے تناسب سے بہت زیادہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے متعلقہ

ـــــــــــ

[1] Martin the Wellesly Despatches, Vol IV, p 176 7.

ریاست کا معاشی توازن درہم برہم ہو جاتا تھا۔ انگریزی فوجوں کی تنخواہیں جو عہد معاونت کی ہوئی ریاستوں میں رکھی جاتی تھیں ان فوجوں کی تنخواہوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھیں جو برطانوی ہند میں رہتی تھیں۔ خود ڈیوک آف ولنگٹن (آرتھر ولزلی) نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ انگریزی حکومت عہد معاونت کے سلسلے میں فوجی اخراجات کی تکمیل کے لیے جو رقم لیتی ہے وہ وقت پر نہیں ادا ہو سکتی اس لیے کہ متعلقہ ریاست کی آمدنی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔[1] ایک برا اثر اصول عہد معاونت کا یہ ہوا کہ جس ریاست کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا اس کا حکمران طبقہ اپنی حفاظت کے لیے انگریزی سنگینوں کا آسرا لینے لگا اور رعایا کی بھلائی اور خوشحالی کے مطالبات کی طرف سے بے توجہی برتنے لگا چونکہ ان والیان ملک کو یقین ہوتا تھا کہ انگریزی حکومت ان کی حفاظت کر رہی ہے اس لیے رعایا ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔[2] عہد معاونت کے انتظام سے بقول منرو "خود مختاری اور قومی کردار کے علاوہ ہر وہ چیز قربان کر دی جاتی تھی جو کسی قوم کو عزت و احترام کا مستحق ٹھہراتی ہے"۔[3]

ولزلی نے عہد معاونت کے ذریعہ انگریزی حکومت کی بالادستی ہندوستان کے بیشتر حصے پر تسلیم کرا دی۔ اس ضمن میں جو معاہدے کئے جاتے تھے ان کی شرطوں سے دیسی ریاستوں کو ایسے ذریعوں سے محروم کر دیا جاتا تھا جن کی بدولت وہ کوئی ایسا طریق کار اختیار کر سکیں جو سلطنت برطانیہ کے مفاد اور منصوبوں کے خلاف پڑتا ہو۔ اس طرح حکومت ہند کی نگرانی ایسے وسیع علاقوں پر قائم ہو گئی جو سیاسی اعتبار سے براہ راست کمپنی کے ماتحت نہیں تھے۔ معاہدہ کرنیوالی ریاستوں کی فوج میں تخفیف کر دی جاتی تھی اور اس اندرونی حفاظت اور خارجی مدافعت کی ذمہ داری کے لیے انگریزی فوج کا دست نگر ہونا پڑتا تھا۔ اس قسم کے انتظام کی ولزلی نے اس واسطے بھی ضرورت محسوس کی کہ کمپنی کو گزشتہ زمانے

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol IV, p. 13.
[2] Roberts, India under Wellesley, p 87.
[3] Gleig, Life of Sir Thomas Munro, Vol II, p. 7.

میں مختلف لڑائیوں میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ان کی حلیف ریاستیں امداد کے لیے جو فوج بھیجتی تھیں اس کا طرز عمل اپنے حکمران کی حکمت عملی کے تابع ہوتا تھا اور اگر کہیں عین لڑائی میں حکمران نے علٰحدہ ہو جانے کے اصول کو اپنے لیے مناسب سمجھا تو فوج بھی لڑائی میں ساتھ چھوڑ کر چل دیتی تھی۔ چنانچہ ولزلی چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں میں جو انگریزی فوج رہے اس کی تربیت بالکل انھیں اصول پر کی جائے جن کے مطابق برطانوی ہند کی فوجوں کی تربیت کی جاتی تھی اور انھیں براہ راست انگریز افسروں کے ماتحت رکھا جائے تاکہ وہ لڑائی کے وقت یا کسی اور وقت بھی کمپنی کے مفاد کے خلاف اقدام نہ کر سکیں اور اپنے افسروں کا حکم ماننے کے عادی ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور بھتے بھی انگریز افسروں کے ذریعہ سے دلائے جاتے تھے تاکہ وہی ان کی وفاداری اور اطاعت کا مرکز بن جائیں اگرچہ انگریزی حکومت ان تنخواہوں کی رقم کو براہ راست متعلقہ ریاست کے خزانہ سے حاصل کر لیتی تھی۔ ان فوجوں کی کارکردگی اور تربیت نہایت اعلٰے پیمانہ پر ہوتی تھی اور وہ چند روز کی اطلاع ملنے پر لڑائی کے میدان میں کیل کانٹے سے لیس پہنچ سکتی تھیں۔ چونکہ ان تنخواہوں کی رقم کے ضمن میں جس رقم کی ادائی کا تعین کیا جاتا تھا وہ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ اس کی باقاعدہ ادائی ممکن نہ تھی اس لیے کچھ عرصے کے بعد یہ طریقہ نکالا گیا کہ بجائے نقد زرمعاوضہ ادا کرنے کے ریاست متعلقہ بعض علاقے کمپنی کے حوالے کر دے۔

سرکار نظام سے عہد معاونت کی تجدید ۱۸۰۰ء

۱۷۹۸ء میں سرکار نظام اور کمپنی میں جو عہد معاونت ہوا تھا اس کی رو سے انگریزی

فوج کے اخراجات چوبیس لاکھ ستر ہزار روپے سالانہ قرار پائے تھے جس کی دو سال سے پابجائی نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۰۰ء[1] میں سرکار نظام اور کمپنی میں ایک جدید معاہدہ ہوا جس کی دفعہ ۵ کے مطابق یہ طے ہوا کہ ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی تیسری اور چوتھی جنگ میسور کے بعد سرکار نظام کو جو علاقے ملے ہیں وہ سب کے سب دائمی طور پر حکومت برطانیہ کے حوالے کر دئے جائیں ان میں بلاری۔ کڑپہ کرنول اور اننت پور کے زرخیز اضلاع شامل تھے جن کی سالانہ آمدنی تقریباً ۶۲ لاکھ روپے تھی۔ ان علاقوں کو حوالے کرنے کے بعد انگریزی حکومت ممالک محروسہ کی حفاظت کی ہمیشہ کے لیے ذمہ دار ٹھہرے گی اور اس ضمن میں آئندہ کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ حمایتی فوج کی تعداد میں دو پلٹنوں اور ایک رجمنٹ کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ اس امر کی بھی صراحت کی گئی کہ انگریزی حکومت سرکار نظام کے علاقوں کی حفاظت کی ذمہ دار رہے۔ یہ شرط صراحت کے ساتھ اس واسطے رکھی گئی کہ پیشوا نے اپنے اور سرکار نظام کے معاملات میں انگریزوں کو ثالث بنانا منظور نہیں کیا تھا۔ سرکار نظام نے اپنے آپ کو بلا کمپنی کی اجازت کے دوسرے والی ملک سے سیاسی تعلق رکھنے یا نامہ و پیام کرنے کے حق سے دستبردار کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان شرائط سے ریاست حیدرآباد کی سیاسی آزادی کو سخت صدمہ پہنچا لیکن مرہٹوں سے جو خطرہ تھا اس کا سدباب ہو گیا۔ کمپنی اور سرکار نظام کے علاقوں میں دریائے تنگ بھدرا کو سرحد قرار دیا گیا۔ دریائے تنگ بھدرا کے جنوب میں دھونی اور اس کے نواح کے علاقے سرکار نظام کی ملکیت تھے وہ کمپنی کو دیدیئے گئے اور ان کے عوض کمپنی نے کم و بیش اسی آمدنی کے علاقے دریائے تنگ بھدرا کے شمال میں سرکار نظام کو حوالے کر دیئے۔ ان میں ضلع اناگنڈی کے وہ گاؤں تھے جو دریائے تنگ بھدرا کے شمال میں واقع ہیں اور کپل کے آٹھ علاقے بھی شامل تھے جہاں تک کہ سرکار نظام کے اندرونی معاملات کا تعلق تھا۔

---

[1] (Aitchison, Vol. IX, p. 63-68-

کمپنی ان میں مداخلت کی مجاز نہ تھی۔ لیکن دولت آصفیہ کے خارجی اختیارات کا کمپنی کی صوابدید پر انحصار سرکار نظام کے شاہی حقوق پر تحدید عاید کرنے کے مرادف تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی مملکت کے حدود کے اندر دوسرے ملک کی فوج کے مستقل طور پر رہنے سے چاہے وہ حفاظت ہی کے لیے کیوں نہ ہو اس مملکت کے اقتدارانہ حقوق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کمپنی اور سرکار نظام میں ۱۸۰۲ء میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ برطانوی اموال درآمد و برآمد کے لیے ۵ فی صدی محصول کے راہداری اور دوسرے مقامی محصول نہیں لئے جائیں گے لیکن جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں مقیم ہے اس کے سامان کو اس محصول سے مستثنیٰ کیا جائے گا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو مجاز کیا گیا کہ وہ بندرگاہ سولی پٹم میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرے اور وہاں اپنے کارندوں کو ان شرائط کے تحت رکھے جو کمپنی کی حکومت نے وضع کیے ہوں اور جن کے متعلق سرکار نظام و گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل میں باہمی رضامندی حاصل کر لی گئی ہو۔ اگر ممالک محروسہ سے انگریزی علاقے میں کوئی مال بھیجا جائے گا تو وہاں بھی پانچ فی صدی محصول مال کی قیمت پر لیا جائے گا ممالک محروسہ سے انگریزی علاقوں کو غلے کی درآمد سرکار نظام سے خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد کی جا سکے گی۔ انگریزی حکومت ممالک محروسہ میں صرف اس قدر غلہ خریدنے کی مجاز ہو گی جو معاونتی فوج کی ضروریات کے لیے درکار ہو گا۔

الحاق کرناٹک

۱۷۹۲ء میں کارنوالس نے نواب محمد علی سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب قطعی طور پر طے ہو گیا تھا کہ اگر نواب انگریزی حکومت کو مقررہ رقم نہ ادا کرے جو اس کے علاقوں کی فوجی حفاظت کے ضمن میں طے ہوئی ہے تو کمپنی کو اختیار ہو گا کہ نواب کے ملک پر قابض ہو جائے نیز یہ کہ جنگ کے زمانے میں رسد اور فوجی نقل و حرکت کی سہولت کے مد نظر کرناٹک کے نظم و نسق پر کمپنی کی نگرانی قائم ہو جانی چاہیے۔ لیکن نواب محمد علی نے مقروض ہونے کے سبب سے کمپنی کے مالی مطالبہ کو پورا کرنے میں ٹال مٹول کی اور وہ اضلاع جن کی آمدنی کمپنی کے رقمی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے

مختص کر دیے گئے تھے، اپنے مختلف قرض خواہوں کو مکفول کر دیے۔ اس زمانے میں کمپنی کے انگریز ملازمین نجی تجارت اور ساہوکارہ کا لین دین کیا کرتے تھے اور نواب سے من مانی شرح سود وصول کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض ۳۰ فی صدی شرح سود پر رقم قرض دیتے تھے۔ اس قرض کی ادائی کے لیے نواب اپنے مختلف علاقے مکفول کر دیتے تھے اور ان علاقوں کی مالگزاری قرضخواہ براہ راست وصول کر کے اپنے قرض کی بازیابی کرتے تھے۔ اس طرح کمپنی کے ملازموں نے جو اس قسم کا لین دین کرتے تھے تھوڑے سے عرصے میں خوب دولت سمیٹی۔ نواب نے مدراس کے قریب جو عالیشان محل تعمیر کرایا تھا اس میں وہ عیش دیتا اور انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی کی خاطر مدارات میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ ملک کی عام زندگی سے وہ کچھ عرصے سے بے تعلق سا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان قرض خواہوں کو من مانے طور پر نظم و نسق کے معاملات میں بھی مداخلت کا موقع حاصل ہو گیا۔ پال بین فیلڈ نے جو حکومت مدراس کی ملازمت میں تھا اپنے لین دین کے تعلق کی وجہ سے نواب پر بڑا اثر قائم کر لیا تھا۔ پال بین فیلڈ کو کمپنی کی ملازمت سے بعض بدعنوانیوں کے سبب سے برطرف کر دیا گیا تھا لیکن اس کو اب ملازمت کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ ہندوستان چھوڑنے سے قبل اس نے دس لاکھ پونڈ جمع کر لیے تھے۔ انگلستان پہنچ کر وہ پارلیمنٹ کا رکن بن گیا۔ غرضکہ کمپنی کے ملازمین اور دوسرے ساہوکاروں کا اس قدر قرضہ نواب پر ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی کمپنی کے ان مطالبوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا جن کی بازیابی کا اس نے بذریعہ معاہدہ وعدہ کیا تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ کمپنی کے ملازمین اپنے قرض کے ذریعہ جو نواب پر تھا خوب روپیہ سمیٹ رہے تھے اور کمپنی کو نواب سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ پٹ کے قانون (سنہ ۱۷۸۴ء) میں اس قرض اور نواب کی مالی حالت کے متعلق حکومت مدراس کو تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا۔ کارنوالس نے بھی سختی کے ساتھ کمپنی کے ان ملازمین کی روک تھام کرنی چاہی جو نواب کے ساتھ لین دین کے تعلقات رکھتے تھے اس واسطے کہ ان کی

وجہ سے کمپنی کی بدنامی ہو رہی تھی[1]۔ قرضہ کے متعلق تحقیق اور چھان بین کا سلسلہ عرصے تک برابر جاری ہی رہا۔ ایک قرضہ ادا ہو جاتا تھا تو دوسرا اس سے بڑا قرضہ موجود ہوتا تھا غرضکہ پورے طور پر قرضوں سے چھٹکارا ممکن نہیں ہوا۔

سنہ ۱۷۹۵ء میں نواب محمد علی کے انتقال پر عمدۃ الامرا گدی پر بیٹھے۔ گورنر مدراس لارڈ ہیوبرٹ نے نئے نواب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تمام علاقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبے پورے کرنے کے لیے خاص کیے گئے ہیں وہ حکومت مدراس کے تصرف میں دے دیئے جائیں تو مناسب ہے۔ لیکن نئے نواب نے اس انتظام کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ نواب پر سب سے زیادہ زور اس کے انگریز قرض خواہوں نے ڈالا کہ وہ لارڈ ہیوبرٹ کی تجویز کو کبھی بھی نہ مانے[2]۔ ظاہر ہے کہ ان قرض خواہوں کو اندیشہ تھا کہ اگر یہ علاقے نواب کرناٹک کے ہاتھ سے نکل کر کمپنی کے تصرف میں چلے گئے تو ان کی آمدنی ختم ہو جائے گی۔ لارڈ ہیوبرٹ نے اپنی تجویز کو بہ جبر نہیں منوانا چاہا اس لیے کہ ایسا کرنے سے سیاسی گتھیاں پڑ جاتیں۔ غرضکہ جب ولزلی ہندوستان آیا تو کرناٹک میں نواب کے انگریز قرض خواہوں کے پو بارہ تھے۔ ملک میں چوطرف ابتری اور انتشار کی کیفیت تھی۔ نواب کے مقروض ہونے کے سبب سے کمپنی کی مقررہ رقم کی ادائی ممکن نہ تھی۔ ولزلی نے محسوس کیا کہ کرناٹک کے معاملے میں کمپنی اور اس کے مقامی ملازمین کے مفاد میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہو گیا ہے جسے دور کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ پورے کرناٹک کے نظم و نسق کو براہ راست کمپنی کے تحت کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اس نے جو طریق کار استعمال کیا وہ یقیناً قابل اعتراض تھا۔ اس نے کہا کہ قلعہ سرنگاپٹم کی فتح کے بعد بعض ایسے کاغذات ملے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے کمپنی کے مفاد کے خلاف ٹیپو سلطان سے ساز باز کیا تھا۔

۱۔ Ross, Corrsespondence of Marquis Corronwallis, Vol. II, p 482.

۲۔ Malcolm, History of India, I. p. 164..

یہ کاغذات بورڈ آف کنٹرول کے ملاحظہ کے لیے انگلستان بھیجے گئے۔ بورڈ
آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (مجلس نظماء) کے مشورے کے بعد ولزلی نے
فیصلہ کر لیا تھا کہ نواب عمدۃ الامرا سے گدی چھین لی جائے لیکن اسی اثناء میں
۱۵ جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب عمدۃ الامرا کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا
نواب علی حسین تاج الامرا مسند نشین ہوا۔ ولزلی کے حکم کے بموجب گورنر مدراس
نے نواب عمدۃ الامرا کی عین حالت نزع میں نواب کے محل کا انگریزی فوج سے
محاصرہ کرا لیا تھا۔ نواب عمدۃ الامرا کے گذر جانے کے بعد اور نواب تاج الامراء
اور اس کے مشیروں کے سامنے گورنر مدراس کے چیف سکرٹری نے لارڈ ولزلی
کے حکم کے بموجب یہ شرطیں پیش کیں کہ نواب کرناٹک کا نظم ونسق کمپنی کے حوالے
کر دے اور کمپنی جو وظیفہ مقرر کرے اس کو قبول کرے۔ اس طرح اگر نواب
حقوق ملک سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو جائیں تو ان کی جانشینی کو کمپنی تسلیم
کر لے گی۔ لیکن نواب تاج الامرا اور اس کے مشیروں نے ان شرطوں کو ماننے
سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر گورنر مدراس نے نواب عمدۃ الامرا کے بھتیجے
نواب عظیم الدولہ سے گفت وشنید شروع کی جس نے کمپنی کی شرطیں مان لیں
اور اس کو نواب کرناٹک تسلیم کر لیا گیا۔ نواب عظیم الدولہ نے کمپنی سے معاہدہ
کیا جس کی رو سے کرناٹک کا فوجی اور دیوانی انتظام کمپنی کے تصرف میں آ گیا
اور کل مالگزاری کا ۱/۵ نواب کے لیے بطور پنشن مقرر کر دیا گیا۔ اپریل ۱۸۰۲ء
نواب تاج الامرا نے رحلت کی۔ عظیم الدولہ کی گدی نشینی کو وراثتی استحقاق
کی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ محض کمپنی کی عنایت کی۔ غرضکہ یہ تمام معاملہ جس
طریقے سے پیش آیا وہ قابل اعتراض ہے۔ مورخ مل کے بقول یہ کاغذات
جو سرنگاپٹم میں ملے ان میں صرف ان وکیلوں کے بیانات درج تھے جو ٹیپو سلطان
کے لڑکوں کے ساتھ کرناٹک بھیجے گئے تھے۔ وکیلوں کا بیان کہ نواب محمد علی یا نواب
عمدۃ الامرا نے یہ کہا کس حد تک ان کے خلاف بطور ثبوت وشہادت استعمال
کیا جا سکتا ہے، قانونی لحاظ سے غور طلب ہے۔ اس قسم کی شہادت جو سنا ہو
یا تحقیق پر مبنی نہ ہو صرف اسی وقت کسی فریق کے خلاف استعمال کی جا سکتی

ہے جب کہ اس کا استعمال کرنے والا قوت و اختیار رکھتا ہو ورنہ اُسے کسی حالت میں بھی عادلانہ اصول پر مبنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کاغذات میں بعض بیانات میجر ڈوٹن کی طرف منسوب کیے گئے ہیں جو یقیناً میجر موصوف کے نہیں تھے، اسی طرح جو بیان نوابان کرناٹک کی طرف منسوب کئے گئے ہیں انہیں بھی مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے۔[۱] بعد میں ان وکیلوں نے تحقیقات کے سلسلے میں جو زبانی بیان دئے ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے مختلف موقعوں پر ٹیپو سلطان کی خیر خواہی کا اظہار کیا وہ محض رسمی تھا۔ اس تمام معاملہ کے متعلق مل کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ سرنگا پٹم کے کاغذات کے ضمن میں جو تحقیقات کی گئی اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے انگریزی مفاد کے خلاف ٹیپو سلطان سے مراسلت کی۔ اگرچہ دربار میسور کا پورا دفتر انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور جن وکیلوں کے بیان پیش کیے گئے وہ انگریزوں کے قابو میں تھے اور کمپنی سے وظیفہ پاتے تھے پھر بھی شہادت سے نوابوں کا قصور ثابت نہیں ہوتا۔[۲] لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامراء نے ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے مفاد کے خلاف مراسلت کی تو بھی یہ بات کس طرح حق بجانب ہو سکتی ہے کہ عمدۃ الامراء کے بیٹے یا بھتیجے کو حقوق حکمرانی سے ان مفروضہ قصوروں کی بنا پر محروم کیا جائے جو انھوں نے خود نہیں کیے۔ ولزلی کا یہ کہنا ہے چاہے کہ چونکہ تاج الامرا اُنکا والد (یعنی عمدۃ الامراء) کمپنی کے مفاد کا دشمن تھا اس لیے انگریزی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی جانشینی کے متعلق جو نقطۂ نظر چاہے اختیار کرے۔ اور ان حالات میں کمپنی پر جو سابقہ معاہدے کی پابندی تھی وہ ساقط ہو گئی ہے۔[۳] یہ نقطۂ نظر عدل و انصاف کی رو سے حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔

۱۔ Mill, History of India, Vol. VI, p. 218.

۲۔ Mill, History of India, Vol. II, p. 516.

۳۔ Martin, Wellesley's Despatches. Vol. II, p 558; Robert's, India under Wellesley, p. 109.

الحاق تنجور

تنجور کے راجا تلجاجی نے ۱۷۸۷ء میں وفات پائی تو جانشینی کا جھگڑا پیش آیا اور انگریزی حکومت کو دخل دینے کا موقع ہاتھ لگا۔ حکومت مدراس نے تنجور کے پنڈتوں کے مشورہ کے مطابق تلجاجی کے سوتیلے بھائی امر سنگھ کی گدی نشینی کو پہلے تو مان لیا لیکن بعد میں تلجاجی کے متبنے سرفوجی نے اپنے حقوق کے متعلق گورنر جنرل کارنوالس کو اپیل کی۔ کارنوالس نے اس معاملے کو دوبارہ بنارس اور کلکتہ کے پنڈتوں کے غور کے لیے پیش کیا جنھوں نے سرفوجی کے حق میں تصفیہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنارس اور کلکتہ کے جن پنڈتوں سے یہ تصفیہ کرایا گیا وہ انگریزی اثر میں تھے۔ انگریز مورخ بے ورج کی یہ رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ اگر امر سنگھ نے کمپنی کے مالی مطالبات مان لیے ہوتے تو یہ معاملہ دوبارہ نہیں اٹھایا جاتا۔[1] بہر نوع امر سنگھ اور سرفوجی کا جھگڑا کارنوالس اور سرجان شور کے عہد حکومت میں برابر جاری رہا اور حکومت ہند اس باب میں کوئی قطعی فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچاتی رہی۔ لیکن ولزلی ہچکچانے والا شخص نہ تھا اس نے سرفوجی کو تنجور کا جائز راجا مان لیا اور راجا نے اس کے بدلے میں اپنی پوری ریاست کا انتظام کمپنی کے حوالے کر دیا۔ صرف تنجور کے قلعہ اور اس کے مضافات پر راجا کا براہ راست قبضہ قایم رہا۔ اس کے گزارے کے لیے چار لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور اس کے علاوہ مالگزاری میں سے ⅕ حصہ منظور کیا گیا۔ سرفوجی ۱۸۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کی وفات کے وقت چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے مجلس نظمار کے تصفیہ کے بموجب اس کے خاندانی اعزاز و مراتب کا خاتمہ کر دیا گیا۔

کرناٹک، تنجور، کنارا اور مفوضہ ضلعوں سے جو سرکار نظام سے ملے تھے احاطۂ مدراس بہت کافی وسیع ہو گیا اور شمالی سرکار کو ملا کر جو پہلے حاصل

1. Beveridge, Comprehensive History of India, Vol II, p. 715.

کر لیئے گئے تھے موجودہ صوبہ مدراس کی تشکیل ولزلی کے عہد میں عمل میں آچکی تھی۔ ان تمام علاقوں میں مالگزاری اور عدالت کے نظم و نسق کی اصلاح ریڈ اور منرو جیسے قابل عہدہ داروں کی نگرانی میں عمل میں آئی۔ سرکش زمینداروں اور پولی گاروں پر قابو حاصل کیا گیا زمینوں کی نئی تشخیص کی گئی ولزلی بنگال کے زمینداری نظام اور دوامی بندوبست کو مدراس میں بھی رائج کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ منرو نے ولزلی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد رعیت واری انتظام کو نافذ کیا جس سے کاشتکاروں کو بہت فائدہ ہوا۔

الحاق سورت

سورت کے نواب کا ۱۷۹۹ء میں انتقال ہوا تو اس[1] کا بھائی اس کی جانشینی کا دعویدار ہوا۔ اس معاملے میں ولزلی نے یہ اصول پیش کیا کہ چونکہ عملی طور پر کمپنی کی حکومت ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی جانشین ہوگئی ہے اس لیے ان سب ریاستوں کے جانشینی کے معاملات میں جو سلطنت مغلیہ کے تحت ہیں کمپنی کو مداخلت کا حق پہنچتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ نئے نواب کی مسند نشینی کو کمپنی تسلیم کرے نواب معاہدے کے ذریعے وعدہ کرے کہ جو انگریزی فوج اس کی حفاظت کے لیے رکھی جائے اس کے اخراجات کی باقاعدہ ادائی ہوا کرے گی۔ چنانچہ نواب نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سے زیادہ وہ ادا کر ہی نہیں سکتا تھا جیسا کہ انگریز ریذیڈنٹ مقیم سورت نے لکھا تھا کہ اگر نواب کے پاس وسائل ہوتے تو وہ بلا شبہہ اور زیادہ رقم کمپنی کو خوشی سے ادا کرتا۔ ابھی یہ گفت و شنید ہو ہی رہی تھی کہ ولزلی نے حکم دیدیا کہ سورت کی پوری ریاست کے نظم و نسق کو براہ راست کمپنی کے تحت کر لینا چاہیے۔ نواب کو ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن دی جائے اور کل مالگزاری کا ۱/۵ حصہ اس کے لیے مقرر کر دیا جائے۔ اس معاملے میں ولزلی

---

[1] Mill, History of India, Vol. p. 207 .

نے سخت زیادتی سے کام لیا۔ سورت کی ریاست کو احاطہ بمبئی میں شامل کر لیا گیا۔

اودھ سر جان شور نے نواب اودھ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ کمپنی تیرہ ہزار فوج تک اودھ میں رکھ سکے گی جس کے خرچے کے لیے ۷۶ لاکھ روپے سالانہ دربار اودھ ادا کرے گا۔ اگر اس سے زیادہ فوج کی ضرورت ہوگی تو رقم میں اسی تناسب سے اضافہ کرنا ہوگا۔ چونکہ اس زمانے میں والیٔ افغانستان زمان شاہ سے اودھ کی شمال مغربی سرحد پر ڈر لگا ہوا تھا اس لیے اودھ میں کمپنی کی فوج میں اضافہ ضروری تھا۔ زمان شاہ نے نواب اودھ اور کمپنی کی حکومت کلکتہ کو لکھا تھا کہ وہ دونوں شاہ عالم کو مرہٹوں کے پنجے سے چھڑانے اور مغل علاقوں میں سے مرہٹوں کو بے دخل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کی یہ بے توجہی دشمنی سمجھی جائے گی[1]۔ چنانچہ انگریزی فوج کی تعداد میں جو اودھ میں رہتی تھی مزید سات ہزار سپاہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اب اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد بیس ہزار ہوگئی لیکن جب اس فوج کے خرچ کی ادائی کا وقت آیا تو نواب اودھ ٹال مٹول کرنے لگا اور آمدنی کی کمی کا عذر پیش کیا۔ ولزلی نے کہا کہ جو بے قاعدہ فوج نواب نے رکھی ہے اس کو برطرف کر دیا جائے اس لیے کہ اس کے رکھنے سے خزانہ پر فضول بار پڑتا ہے۔ نواب اودھ کا کہنا یہ تھا کہ جو مزید فوج اودھ میں رکھی گئی ہے وہ کمپنی نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے رکھی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے خرچ کے لیے اس کو زیر بار کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کمپنی کی حکومت کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے وفادار حلیف نواب اودھ کو جس کی مالی حالت پہلے سے خراب تھی مزید فوج رکھ کر مجبور کرتی کہ اس کے خرچ کے لیے کہیں سے بھی رقم مہیا کرو۔ کیا اس مزید فوج کا خرچ خود کمپنی کو نہیں

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. I. p 252

اٹھانا چاہیے تھا!۔ مورخ مل نے اس ضمن میں ولزلی کی حکمت عملی پر جو اعتراض کئے ہیں وہ بہت ٹھیک ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ امن کے زمانے میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اودھ میں اس قدر فوج رکھی جاتی جو محاذ جنگ قایم کرتے وقت ہی ضروری ہوسکتی تھی پھر زمان شاہ کے اودھ پر حملہ کرنے کا بہت کم امکان تھا۔ زمان شاہ کے خطرے سے اودھ میں انگریزوں کی فوجی تیاری کرنا ویسا ہی تھا جیسے انگلستان میں ترکوں کے حملے کے خوف سے جنگی تیاری کی جائے۔ ولزلی نواب کی فوج کو گھٹا کر جو فوجی اصلاح اودھ میں کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نواب کا ایک دوسری مملکت کی فوج پر دار و مدار رہنا جو کوئی حکمران پسند نہیں کرسکتا۔[1]

جب ولزلی کی شرطیں نواب اودھ کے سامنے پیش کی گئیں تو اس نے ماننے سے انکار کردیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ شرطیں منوانے کی کوشش کی گئی تو وہ تخت سے دست بردار ہوکر گوشہ نشیں ہو جائے گا۔ ریزیڈنٹ نے ولزلی کو اسکی اطلاع دی تو اس نے جواب میں لکھا کہ "اگر نواب گدی سے الگ ہو جائیں تو اس سے نہ صرف کمپنی کو بلکہ اودھ کے باشندوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ نواب کی اس قسم کی خواہش کی ہر طرح سے ہمت افزائی کرنی چاہیے" اس معاملے کے متعلق اس نے مجلس نظما کو لکھا کہ "میں اس واقعہ سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ولزلی نے ریزیڈنٹ کو ہدایات بھیجدیں کہ اگر نواب واقعی حکومت کی ذمہ داری سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود اس کا کوئی اعلان کرے ہمیں ایک خفیہ معاہدہ اس ضمن میں کرلینا چاہیے[2]

---

[1] - Mill, History of India, Vol. VI, p.

[2] - Martin, Wellesly's Despatches, Vol. II, p.

جس میں اس کی جانشینی وغیرہ کے مسائل کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ نواب کے بیٹوں کا اس معاہدہ میں ذکر اس طرح ہونا چاہیئے جس سے ظاہر ہو کہ ان کے گزارے کے لیے انتظام کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی حکومت اپنے تئیں جانشینی وغیرہ کے جھگڑوں میں پھنسائے بغیر پورے اودھ پر اپنا قبضہ اور تصرف منوا لینا چاہتی تھی۔ ولزلی نے دوسری ریاستوں کے متعلق جو الحاقی حکمت عملی اختیار کی تھی وہی وہ اودھ کے متعلق بھی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نواب نے جب ریزیڈنٹ کو دست برداری کا خط لکھا تھا، تو اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ چونکہ اس کے بیٹوں میں سے ایک اس کے بعد مسند نشین ہو جائے گا اس لیے اس کے خاندان کا اور اس کا نام برابر چلتا رہے گا۔ جب ولزلی کی تحریر پہنچنے پر ریزیڈنٹ نے کہا کہ جانشین کا مسئلہ اس وقت نہ چھیڑا جائے تو نواب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی حالت میں وہ دستبرداری کے وعدہ سے دستبردار ہوتا ہے اور اس ضمن میں کسی معاہدے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جب ولزلی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور نواب کو لکھ بھیجا کہ چاہے وہ حکومت کے اختیارات سے دستبردار ہو یا نہ ہو انگریزی فوج کا مزید خرچ اس کو اٹھانا ہوگا اور اس کی فوج کی اصلاح کا انگریزی حکومت نے تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مزید انگریزی فوج نواب کی منظوری کا انتظار کئے بغیر اودھ روانہ کر دی گئی۔ نواب نے ہر چند اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا اور بتایا کہ سر جان شور نے ۱۷۹۸ء میں اس سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب کمپنی کی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اودھ کے اندرونی نظم و نسق میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی لیکن اب جب کہ اس کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی فوج کو برطرف کرے تو یہ معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ لیکن جب نواب سے کہا گیا کہ اگر اس معاملے کو زیادہ طول دیا گیا تو

لے Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, P. 158

اس کے لیے اچھا نہ ہوگا تو وہ بیچارہ خاموش ہوگیا۔ نواب کی سب فوج برطرف کردی گئی۔ ہاں اتنا ضرور کیا گیا کہ جن افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہ کا بقایا چلا آتا تھا اس کی ادائی کردی گئی۔ نواب اودھ نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے ملک میں ایسا نظم ونسق رکھے گا جس سے رعایا کی فلاح وبہبود کی ترقی ہو اور وہ کمپنی کے نمائندے کے مشورے سے تمام اہم امور انجام دیا کرے گا۔ لیکن ولزلی نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے نواب سے عہد معاونت کے شرائط تسلیم کرائے۔[1] یہ معاہدہ ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء میں لکھنؤ میں ہوا جس کی رو سے روہیلکھنڈ اور دوابہ کے زرخیز اضلاع نواب نے کمپنی کے حوالے کردیئے تاکہ آئندہ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے اپنی مالگزاری میں سے سالانہ رقم ادا کرنے کے بجائے ان علاقوں کی آمدنی میں سے کمپنی کی فوج کے اخراجات محسوب ہوجایا کریں۔ ان ضلعوں کی آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ ان اضلاع کو کمپنی کے حوالے کرنے سے اودھ کی ریاست چاروں طرف برطانوی علاقوں سے گھر گئی سوائے شمال کے جہاں ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور نیپال کی سرحد چھوتی تھی۔ وارن ہیسٹنگز چاہتا تھا کہ اودھ کو حاجب مملکت کے طور پر برقرار رکھے تاکہ اگر بنگال کی طرف مرہٹے رخ کریں تو پہلی ٹکر اودھ سے ہو اور اس دوران میں انگریزی حکومت مقابلے کی تیاری کرلے۔ لیکن ولزلی کی حکمت عملی اس کے بالکل خلاف تھی وہ چاہتا تھا کہ اودھ کو ہر طرف سے برطانوی مقبوضات سے گھیر لیا جائے تاکہ اگر اس طرف مرہٹے یا والیِ افغانستان زمان شاہ کبھی رخ کریں تو انگریزی فوجیں مقابلے کے لیے موجود رہیں۔ نواب اودھ نے ۱۷۹۸ء کے معاہدے کے بموجب انگریزی فوج کے خرچ کے ضمن میں جس رقم کی ادائی کا وعدہ کیا تھا اس کو پابندی سے ادا کیا تھا اس لئے اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا کسی طرح بھی

---

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p. 601

حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ پھر نواب پر یہ پابندی عاید کرنا کہ وہ کمپنی کے حکام سے اندرونی نظم ونسق کے معاملات میں بھی مشورہ کرے ۱۷۹۸ء کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اسکے علاوہ معاہدے پر دستخط کرانے کے لیے جو طریق کار ولزلی نے اختیار کیا وہ قرین انصاف نہیں کہا جا سکتا۔

رہیل کھنڈ اور دوآبہ کے ضلعوں کے الحاق کے بعد ان کا انتظام ایک بورڈ آف کمشنرز کے سپرد کر دیا گیا جس کا صدر ہنری ولزلی تھا جو گورنر جنرل کا چھوٹا بھائی تھا۔ ہنری ولزلی کو بورڈ آف کمشنرز کے علاوہ نئے صوبے کا لفٹیننٹ گورنر بھی مقرر کیا گیا۔ اس بورڈ کو نظم ونسق کے تمام معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ان اضلاع میں جو افسر مقرر کیے گئے انھیں انتظامی عدالتی اور مالیاتی اختیارات حاصل تھے۔ بورڈ کو نظم ونسق کے لیے قاعدے اور ضابطے بنانے کا بھی اختیار تھا جن کی منظوری گورنر جنرل سے لی جاتی تھی۔

دو سال بعد ان اضلاع میں بنگال کا طریق حکومت رائج کیا گیا اور تمام علاقوں کو سات ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر ضلع میں مالگزاری جمع کرنے کے لیے ایک کلکٹر اور مقدمات کے تصفیہ کے لیے ایک جج مقرر ہوا۔ زمینوں کا پہلے سہ سالہ اور پھر چار سالہ بندوبست کیا گیا۔ دوامی بندوبست کو رائج نہیں کیا گیا اس لیے کہ ان ضلعوں کے حالات بنگال کے حالات سے مختلف تھے۔

الحاق فرخ آباد فرخ آباد کی ریاست دریائے گنگا کے مغربی کنارہ پر ڈیڑھ سو میل لمبی پٹی پر پھیلی ہوئی تھی جہاں بنگش خاندان کے پٹھان نوابوں کی حکومت قایم تھی۔ اگرچہ شروع میں یہ نواب خود مختار تھے لیکن بعد میں اودھ کا اقتدار ماننے لگے تھے اور انھوں نے کمپنی سے بھی دوستانہ تعلقات قایم کر لیے تھے۔ ناصر جنگ ولزلی کے عہد حکومت میں فرخ آباد کی گدی پر بیٹھا تو اس کی عمر ۱۰ سال تھی۔ اس کے وزیر امین الدولہ نے ملک کا سارا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نواب کو ۵۰ ہزار روپے سالانہ گزارے کے لیے مقرر کر دیے۔ نواب فرخ آباد بریلی چلا گیا جو ہنری ولزلی کا صدر مقام تھا اور اس سے نامہ وپیام شروع کر دیا۔ چنانچہ ولزلی نے نواب سے

۴ جون ۱۸۰۲ء ایک معاہدہ کر لیا جس کے بموجب فرخ آباد کی ریاست کا نظم و نسق کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے صلے میں کمپنی نے نواب کی ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ بنگش خاندان کے نواب ۱۸۵۷ء کے غدر تک برائے نام باقی رہے۔

نواں باب

ولزلی اور مرہٹے

معاہدہ بسین دسمبر ۱۸۰۲ء

ولزلی نے ۱۷۹۸ء اور ۱۷۹۹ء میں پیشوا باجی راؤ کو عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کرنے کے متعلق لکھا تھا لیکن نانا فرنویس نے پیشوا کو اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ پیشوا باجی راؤ اپنی خود مختاری باقی رکھنے پر اڑ گیا اور سلطنت میسور کے خاتمہ پر جب اتحادیوں کو حصے بخرے بانٹے جا رہے تھے تو نانا فرنویس نے کوئی حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا اسواسطے کہ ولزلی اس سلسلہ میں دربار پونا سے عہد معاونت کے اصول کو بھی تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حکومت بمبئی نے رگھوبا کے ذریعے سے دربار پونا پر اثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے پہلی جنگ مرہٹہ کی نوبت آئی اور کمپنی کو چھ سال تک کھکھیڑ میں پڑنا پڑا اور معاہدہ سالبائی کے بعد کم و بیش وہی سیاسی صورت حال کمپنی اور مرہٹوں کے درمیان برقرار رہی جو اس جنگ سے پہلے تھی۔

مرہٹے سیاسی حیثیت سے زیادہ حساس اس واسطے اور بھی تھے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر کمپنی کی سیادت کسی طرح بھی مان لی گئی تو چوتھ اور سردیسمکھی کے

بقائے کے بہانے سے آئے دن جو وہ سرکار نظام کے خلاف یورشیں کرتے رہتے ہیں ان کا سلسلہ ختم کرنا پڑے گا۔ سرکار نظام نے کمپنی سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں خاص طور پر اس شرط پر زور دیا تھا کہ کمپنی کی فوج کو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا اور اس باب میں کمپنی کو کوئی تامل نہ ہوگا جیسا کہ سرجان شور کے عہد میں ہوا۔

۱۸۰۰ء میں نانا فرنویس نے تقریباً ایک چوتھائی صدی تک مرہٹہ سیاست کا اصلی کرتا دھرتا رہنے کے بعد وفات پائی۔ بقول کیپٹان پامر جو اس زمانے میں پونا میں انگریزی ریزیڈنٹ تھا "نانا فرنویس کی وفات سے مرہٹہ حکومت کا تدبر اور اعتدال رخصت ہو گیا[1]"۔ مرہٹوں میں ہر طرف انتشار پھیل گیا۔ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر میں سخت کشمکش شروع ہو گئی اس واسطے کہ دونوں دربار پونا کی سیاست کو اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ دراصل دربار پونا کی قوت اور اثر برائے نام رہ گیا لیکن تاہم مرہٹوں میں اسکی اخلاقی حیثیت اب بھی بلند تھی۔ اس دربار کے نام سے دوسرے باثر سردار بہت کچھ من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔ نانا فرنویس نے بڑی دانشمندی اور سیاست کاری سے دربار پونا کا بھرم قایم رکھا تھا اور مرہٹوں کے معاملات میں اسکے ذریعے سے ایک طرح کی یکجہتی قایم کر دی تھی۔ نانا فرنویس کی وفات کے بعد دولت راؤ سندھیا نے پیشوا باجی راؤ کو پہلے تو اپنے قابو میں کر لیا۔ لیکن اس کا اثر بہت دنوں تک قایم نہ رہ سکا جسونت راؤ ہلکر کو سندھیا کا یہ اثر ناگوار ہوا اور اس نے پیشوا اور سندھیا دونوں کی متحدہ فوجوں کو اکتوبر ۱۸۰۲ء میں پونا کے قریب شکست دیکر خود پونا پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا باجی راؤ نے ایک انگریزی جہاز کے ذریعے فرار ہو کر بسین میں پناہ لی۔ ہلکر نے رگھوبا کے خاندان کے ایک لڑکے ونائک راؤ کو پیشوائی کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس زمانے میں پونا میں انگریز ریزیڈنٹ بیرے کلوز تھا۔

[1] Grant D[illegible], History of the ?ahrattas, Vol. III, p.135

ہلکر نے اس کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ سب کچھ اس کے مشورے کے مطابق کرے گا بشرطیکہ وہ اس کے امیدوار کو کمپنی سے پیشوا تسلیم کروا دے۔ لیکن انگریز ریزیڈنٹ کو حکومت ہند کی ہدایات پہنچ چکی تھیں کہ وہ پونا سے ترک مستقر کرکے چلا جائے تاکہ وہاں جو نئی صورت حالات پیدا ہو رہی ہے اس سے بے تعلق رہے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

ادھر پیشوا باجی راؤ نے بسین سے ولزلی کو مدد کے لیے لکھا اور وعدہ کیا کہ وہ عہد معاونت کی ان تمام شرطوں کو ماننے کے لیے تیار ہے جو کچھ عرصہ قبل پیش کی گئی تھیں اس سے پہلے بھی ۱۸۰۱ء میں جبکہ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر کی کشمکش خطرناک شکل اختیار کر رہی تھی تو پیشوا نے ولزلی کو لکھا تھا کہ اگر انگریزی فوج اس کی حفاظت کے لیے خاص کر دی جائے تو وہ اس کا خرچ اٹھانے کو تیار ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ فوج اسکے علاقے میں نہیں رکھی جائے گی بلکہ کمپنی کے علاقے میں رہے گی اور اسوقت بھیجی جائے گی جبکہ وہ اس کو طلب کرے۔ پیشوا نے اپنی ریاست میں اس فوج کے اخراجات کی پابجائی کے لیے بعض علاقے بھی کمپنی کو حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ علاقے ایسے تھے جنھیں کمپنی حاصل کرنے کی متمنی نہیں تھی۔ اس طرح سے پیشوا اپنا مقصد تو حاصل کر لینا چاہتا تھا لیکن ولزلی کے پیش نظر جو مقاصد تھے انھیں پورا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ولزلی نے ان شرطوں پر اسے کسی قسم کی مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔

اب جبکہ پیشوا اپنے صدر مقام سے بے دخل کر دیا گیا اور انگریزی علاقے میں اس نے پناہ لے کر کمپنی کی حکومت سے مدد کی درخواست کی تو گورنر جنرل کے سامنے اس وقت تین راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صاف کہہ دیتا کہ ہم مرہٹوں کے آپس کے جھگڑے میں کسی کی طرفداری نہیں کریں گے۔ یا یہ کہ وہ ہلکر کی تائید کرتا اور ہلکر نے جس کو پیشوا بنایا تھا اس کی پیشوائی کو مان لیتا۔ ایک یہ صورت تھی کہ گورنر جنرل

پیشوا باجی راؤ کو اس کی کھوئی ہوئی گدی واپس دلوا لے اور اس سے ایسا معاہدہ طے کرے جس سے کمپنی کے مفاد کو ترقی ہوتی ہو۔ ولزلی شور کی طرح عدم مداخلت کا قائل نہ تھا۔ یہ اصول اس کی طبیعت کی افتاد کے بالکل خلاف تھا اور اس کو وہ کمپنی کے حقیقی مفاد کے بھی خلاف سمجھتا تھا اس کو یقین کہ برطانوی حکومت نے مرہٹوں کے معاملات میں مداخلت نہ کی تو ان کے جھگڑے بہت طول کھینچیں گے اور لازمی طور پر سرکار نظام ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ اور چونکہ سرکار نظام کی حفاظت کا ذمہ کمپنی نے اپنے اوپر لیا ہے اس لیے بالواسطہ طور پر کمپنی کو بھی اس کشمکش میں مبتلا ہونا پڑے گا اور ایسی حالت میں مبتلا ہونا پڑے گا جبکہ پہل دوسروں کی طرف سے ہو چکی ہوگی اور اس کے سارے فائدوں سے وہ بہرہ مند ہو چکے ہوں گے۔ ولزلی نے سوچا کہ مرہٹوں کی آپس کی پھوٹ سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اسکی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ ان سبھوں سے عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کروا لیتا۔ اس وقت جو مرہٹہ حکمران کشمکش میں مبتلا تھے ان میں سے ہر ایک انگریزوں سے مدد کا خواہاں تھا۔ پیشوا باجی راؤ چاہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی راج گدی پھر حاصل کر لے۔ سندھیا چاہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد سے پیشوا باجی راؤ کو پونا کی گدی پر بٹھائے اور اس پر اپنا اثر قائم کر لے۔ ہلکر چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت اس کے نامزد کیے ہوئے پیشوا کو مان لے تاکہ دربار پونا میں اس کی بات رہے ناگپور کا بھونسلا راجا چاہتا تھا کہ پیشوائی کے اس جھگڑے میں انگریزوں کی مدد سے ستارا کا راج اس کے خاندان کو مل جائے اس لیے کہ حقیقت میں وہ اس کا مستحق تھا۔ ان حالات میں ولزلی نے سوچا کہ مرہٹہ حکمرانوں سے برطانوی مفاد کو منوانے کا بہترین موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مرہٹہ حکمرانوں سے عہد معاونت کے اصول کو اسی طرح سے منوایا جا سکتا ہے جیسے کہ سرکار نظام سے

ل۔ Roberts, India under Wellesley, p. 192.

تسلیم کرا یا گیا تھا[1]۔

ولزلی صورت حالات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مرہٹہ حکمرانوں میں پیشوا باجی راؤ سے من ماننے ڈھب سے شرطیں منوائی جا سکتی ہیں اس واسطے کہ اس وقت وہ بالکل بے دست و پا ہے اور کمپنی کے رحم و کرم پر اس کے آئندہ کا پورا انحصار ہے۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۸۰۲ء بسین کے مقام پر پیشوا اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے انگریزی فوج کی پانچ پلٹنوں کو ہمیشہ پیشوا کے علاقے میں رکھنا طے ہوا۔ اس فوج کے خرچ کی پابجائی کے لیے پیشوا اپنی ریاست میں سے ایسے علاقے دے گا جنھیں کمپنی موزوں خیال کرے اور جن کی مجموعی آمدنی ۲۶ لاکھ روپے سالانہ ہونی چاہیے۔ ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں سے پیشوا کمپنی کی بے اجازت کسی قسم کے سیاسی تعلقات نہیں رکھے گا۔ اگر آئندہ کبھی پیشوا کا سرکار نظام یا گیکواڑ سے جھگڑا ہو تو کمپنی بطور ثالث تصفیہ کرے گی جس کی پابندی لازمی ہوگی۔ پیشوا نے اپنے اوپر یہ پابندی بھی عاید کرلی کہ وہ آئندہ کسی یورپین کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھے گا۔

معاہدہ بسین سیاسی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ پیشوا کی حکومت مرہٹہ برادری میں پہلے سے اپنی اگلی ساکھ کھو چکی تھی لیکن اب بھی وہ مرہٹوں کے قومی ایکے کا اڈا سمجھا جاتا اور ان کا سب سے بڑا سردار مانا جاتا تھا۔ ولزلی کا خیال تھا کہ اس معاہدے میں قدرتی طور پر یہ پوشیدہ ہے کہ جن شرطوں کو پیشوا نے مانا ہے انھیں کچھ دنوں بعد دوسرے مرہٹہ حکمران بھی مان لیں گے۔ لیکن ولزلی نے یہاں سخت دھوکا کھایا۔ اب تک حکومت انگلستان نے ولزلی کا ہر معاملے میں پوری طرح سے ساتھ دیا تھا لیکن معاہدہ بسین کے متعلق بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) نے ولزلی سے جواب طلب کیا اور ان نازک اور پیچیدہ حالات کی طرف اسے توجہ دلائی جو لازمی طور پر

---

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. III, p. 7.

اس معاہدے کے بعد ظاہر ہونے والے تھے اس معاہدے کو احتیاط اور اعتدال کے اصول کے منافی اور قانون پٹ کی ہدایتوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ اس معاہدے کے بعد انگریزوں کو مرہٹوں سے الجھنا پڑے گا۔ مرہٹہ حکمرانوں نے اس معاہدے سے یہ سوچا کہ ان سب کی خود مختاری خطرے میں پڑ گئی ہے اس لیے انھیں آپس کے اختلافات کو بھلا کر کمپنی کے خلاف متحد محاذ بنانا چاہیے۔

۲۰ راپریل ۱۸۰۳ء آرتھر ولزلی ۸ ہزار پیدل اور سترہ سو سواروں کے ساتھ پونا میں داخل ہوا۔ کرنل اسٹیونس پیشوا کی سرحد پر ۸ ہزار انگریز فوج اور ۱۵ ہزار سرکار نظام کی فوج کے ساتھ پڑا ہوا تھا کہ اگر ہلکر آرتھر ولزلی کا مقابلہ کرے تو وہ پریندہ سے پونا کی طرف بڑھے۔ لیکن ہلکر کی فوج پونا کے بے لڑے بھڑے پیچھے ہٹ گئی۔ ۱۳ رمئی ۱۸۰۴ء پیشوا باجی راو بسین سے آکر پونا میں داخل ہوا اور پھر سے اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔ اس دفعہ اس کی مسند نشینی پر انگریزی توپوں نے سلامی دی۔

سندھیا اور بھونسلا کا ایکا پونا میں انگریزی سیاسی اثر قایم ہو جانے سے مرہٹہ حکمرانوں کو اپنی خود مختاری خطرہ میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ سندھیا اور بھونسلا نے آپس میں ایکا کیا تاکہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی کی تیاری کریں۔ ہلکر مالوہ میں بیٹھ کر واقعات کی رفتار کو جانچتا رہا۔ سندھیا اور بھونسلا نے ہر چند کوشش کی کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی میں انکے ساتھ شریک ہو جائے لیکن اسکو سندھیا پر ایسی بے اعتباری تھی کہ اس نے اسوقت الگ رہنا ہی مناسب سمجھا ادھر پیشوا باجی راؤ نے اپنے قاصد سندھیا اور بھونسلا کے پاس بھیجے تاکہ معاہدہ بسین کی چھپی ہوئی باتوں کو ان پر واضح کریں تاکہ مرہٹہ برادری میں جو اس کی سبکی ہوئی اس کی تھوڑی بہت تلافی ہو سکے۔ سندھیا کی فوجوں نے نربدا کو پار کر کے برہان پور کو اپنا مرکز بنالیا۔ بھونسلا کی فوج یہاں آکر مل گئی۔ اس مقام سے سرکار نظام اور پیشوا دونوں کے علاقوں پر آسانی سے فوج کشی کی جا سکتی تھی۔ ولزلی نے عہد معاونت کی شرطیں منظور

کرلے کی سندھیا کو دعوت دی لیکن اس نے انھیں رد کردیا۔ جنرل ولزلی (آرتھر ولزلی) نے سندھیا کو کہلا بھیجا کہ اگر وہ اپنی فوج کو بھونسلا کی فوج سے الگ کرکے نربدا پار کرکے نہ چلا گیا تو جنگ شروع کردی جائے گی۔ لیکن سندھیا اور بھونسلا دونوں اڑے رہے کہ پیشوا کو ان کے بے مشورے کے کوئی حق نہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے معاہدہ کرتا۔ چنانچہ سندھیا اور بھونسلا دونوں کا ارادہ تھا کہ وہ پونا آکر پیشوا کے نظام حکومت کو باقاعدہ کریں۔ سندھیا نے یہ بھی کہا کہ برہان پور اس کی سرحد میں ہے اس لئے وہاں اپنی فوج رکھنے کا اس کو حق ہے۔ غرضکہ ۳۔ اگست ۱۸۰۳ء کو برطانوی ایلچی واپس آگیا اور سندھیا اور بھونسلا کے خلاف اعلان جنگ کردیا گیا۔ جنرل ولزلی کو دکن کے مرہٹوں کے معاملات میں کامل ملکی، فوجی اور سفارتی اختیارات سپرد کردیئے گئے اس لیے کہ اگر کلکتہ سے ہر معاملے کی نسبت پوچھ گچھ کی جاتی تو بڑی دشواری ہوتی۔ کلکتہ سے دکن کو کوئی جواب چھ ہفتے سے کم میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

لارڈ ولزلی چاہتا تھا کہ سندھیا اور بھونسلا کے مقبوضات پر ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں سے بھرپور وار کیا جائے۔ چنانچہ جنرل لیک کو شمال میں، جنرل ولزلی کو دکن میں اور کرنل مرے کو مغربی ہند میں مرہٹوں کے خلاف فوج کشی کے اختیارات دیدیئے گئے لارڈ ولزلی چاہتا تھا کہ سندھیا کی قوت کو خاص طور پر اتنا کمزور کردیا جائے کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کے لیے آئندہ کوئی خطرہ نہ پیش کرسکے۔ سندھیا کی فوج موسیو پیرون کی سرکردگی میں تھی اس لیے اس کو یہ بھی ڈر تھا کہ ممکن ہے کہ نپولین کی حکومت مشرق میں اس فوج کو اپنے مقصدوں کے لیے استعمال کرے۔ انگلستان اور فرانس کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت پیرون کی قوت کو گوارا نہیں کرسکتی تھی جس سے راجپوتانہ اور مشرقی پنجاب تک کے علاقے فرانسیسی فوجی برتری اور کارکردگی کی بدولت سندھیا کے تحت آگئے تھے۔ ولزلی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ کمپنی کی سرحد کو دریائے جمنا تک پہنچادے تاکہ دہلی اور آگرہ براہ راست انگریزی حکومت

کے تحت آجائیں۔ اور مغل بادشاہ شاہ عالم بجائے سندھیا کے انگریزوں کے زیر اثر آجائے[1] وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دریائے جمنا کے جنوب اور مغرب میں جو راجپوت ریاستیں تھیں انھیں عہد معاونت کے حلقے میں شریک کرلے۔ اس کے علاوہ وہ بندیل کھنڈ کا بھی الحاق کرنا چاہتا تھا[2]۔

سب سے پہلے جنرل ولزلی نے دکن کے اس علاقے کی طرف چڑھائی کی جہاں پیشوا سندھیا اور سرکار نظام کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس نے یہ سوچا کہ برہان پور میں سندھیا اور بھونسلا کی فوجوں نے جو اڈا بنایا ہے اسے جب تک بے اثر نہ بنایا جائے کسی دوسری طرف پیشقدمی کرنا بیکار ہوگا۔ چنانچہ اس نے سندھیا کے دکن کے سب سے بڑے اسلحہ خانہ اور قلعہ احمد نگر پر حملہ بول دیا اور اس پر قبضہ کرکے دریائے گوداوری کے جنوب میں سندھیا کا جتنا بھی علاقہ تھا چھین لیا۔ احمد نگر پر قبضہ ہو جانے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ انگریزوں نے پونا سے براہ راست اپنی مراسلت کا سلسلہ قایم کرلیا اور دوسرے یہ کہ احمد نگر سندھیا کی رسد کا بڑا مرکز تھا اس سے وہ محروم ہوگیا۔ سندھیا اور بھونسلا نے اپنی فوجوں کا رخ سرکار نظام کے شمالی ضلعوں کی طرف پھیر دیا اور اجنٹا کے پہاڑی سلسلے میں سے گزر کر جالنہ پر قبضہ کرلیا۔ جنرل ولزلی نے جب ان کا پیچھا کیا تو وہ شمال کی طرف فوج لیکر نکل گئے۔ برہان پور کے قریب اسٹیونسن کی فوج جنرل ولزلی کی فوج سے آکر مل گئی لیکن پھر دونوں کی فوجیں دشمن کو مشرقی اور مغربی جانب سے گھیرنے کے لیے الگ الگ ہوگئیں اور نگ آباد سے ۵ میل شمال کی جانب اسائی کے مقام پر جنرل ولزلی نے سندھیا اور بھونسلہ کی متحدہ فوج سے مقابلے کا ارادہ کرلیا۔ اگرچہ مرہٹوں کی فوج کی تعداد چاس ہزار تھی اور جنرل ولزلی کی فوج صرف پانچ ہزار تھی لیکن اسے شاندار کامیابی

---

[1] Martin, Wellesley's Despaches, Vol. III. p. 214.

[2] Roberts India under Wellesley,

ہوئی۔ لارڈ ولزلی نے اس کامیابی پر اپنے بھائی کو ان الفاظ میں تہنیتی پیام بھیجا۔ "سرکاری حیثیت سے میں جو تم سے توقع رکھتا تھا اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تم نے اپنے فرائض ادا کیے۔ میرے دل میں جو تمھاری محبت ہے اور ہمارے مشترک خون سے ہونے کا جو مجھے فخر ہے اس کا احساس نہایت بلند نقطہ پر پہنچ گیا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے جس کی محبت کے ساتھ میں عزت بھی کرتا ہوں جو امیدیں قایم کی تھیں وہ پوری ہوئیں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ آج تمھاری نیک نامی کی ہر طرف دھوم ہے تمھاری ۲۳ ستمبر والی شاندار کامیابی کی مثال نہیں ملتی لیکن مجھے جو تم سے توقع تھی وہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی"[1]۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو اسٹیونسن نے برہان پور پر قبضہ کرلیا اور ایک ہفتہ بعد اسیرگڈھ کا مشہور قلعہ بھی اس کے قبضے میں آگیا۔ ۲۳۔ نومبر ۱۸۰۳ء سندھیا نے التوائے جنگ کی درخواست کی۔ جنرل ولزلی نے سندھیا پر اس شرط کی پابندی لگائی کہ وہ ایلچپور کے مشرق میں چالیس میل پر اپنا پڑاو ڈال دیگا اور وہاں سے کسی قسم کی نقل وحرکت نہیں کرے گا۔ جنرل ولزلی نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس شرط کی پابندی کرے گا تو انگریزی فوجیں اس کے علاقے میں زیادہ نہیں بڑھیں گی۔ لیکن سندھیا نے اپنے وعدے کی پابندی نہیں کی اور بھونسلا راجا کو مدد پہنچائی جبکہ اس کی فوج سرکار نظام کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جنرل ولزلی نے ارگاؤں پر جو برہان پور سے پچاس میل مشرق میں واقع ہے بھونسلا راجا کی فوج کو شکست دی۔ اس نے ۱۷۔ دسمبر ۱۸۰۳ء دیوگاؤں کے معاہدے پر دستخط کردیئے جس کی رو سے کٹک کا ضلع اور دریاے وردھا کے مغرب کے سب علاقے انگریزوں کے حوالے کردیے۔ کٹک کے علاقوں کے مل جانے سے بنگال اور مدراس کے احاطوں میں خشکی کے راستے سے ایسا سلسلہ قایم ہوگیا جس کی عرصے سے مجلس نظماء

[1] Owen, Wellington's Despatches. p. 306.

کو تسلیم کرنا تھی اور جس کے معاوضے میں وہ ایک زمانے میں راجا ناگپور کو معاوضہ دینے کو بھی تیار تھی۔ کمپنی کو اختیار مل گیا کہ اگر بھونسلا کے پیشوا یا سرکار نظام سے اختلافی معاملہ پیش آئیں تو کمپنی بطور ثالث تصفیہ کرے گی۔ برار کا علاقہ سرکار نظام کو دے دیا گیا جس کی وجہ سے راجا ناگپور کی حیثیت بہت گھٹ گئی۔

جس طرح جنرل ولزلی کو دکن میں فوجی اور سیاسی اختیارات گورنر جنرل نے سپرد کئے تھے اسی طرح جنرل لیک کو شمالی ہند میں اختیارات عطا کئے گئے تھے۔ شمالی ہند میں سندھیا کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ اور رسد کا مرکز علیگڈھ کا قلعہ تھا جس کا جنرل لیک نے محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا۔ پیرون نے جو پہلے سے سندھیا سے بددل تھا اسلئے کہ مرہٹہ سرداروں نے جو اس سے جلتے تھے اس کے خلاف سندھیا کے کان خوب بھرے تھے، لیک کو لکھا کہ اس نے سندھیا کی ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ چنانچہ اس کو لکھنو جانے کی اجازت دیدی گئی۔ پیرون چاہتا تھا کہ اس نے پچھلے چند سالوں میں جو زر و جواہر جمع کئے تھے انھیں حفاظت سے لے کر نکل جائے اور لڑائی کی کھکھیڑ میں نہ پڑے چنانچہ وہ فرانس بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ لوئی بورکین سندھیا کی شمالی ہند کی افواج کا افسر اعلی مقرر ہوا۔ بورکین اور لیک میں دہلی کے قریب مقابلہ ہوا۔ یہ جھڑپ بہت سخت تھی لیکن جنرل لیک کو کامیابی ہوئی۔ بورکین نے ہتھیار ڈال دیئے اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ شاہ عالم کو جنرل لیک نے اپنے قابو میں کر لیا۔ لارڈ ولزلی کو ویسے تو شاہ عالم سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا لیکن جب سے کہ فرانسیسی افسروں کی سرکردگی میں سندھیا کی فوج نے شمالی ہند میں موثر حیثیت اختیار کر لی تھی اسوقت سے اس کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں فرانسیسی شہنشاہ دہلی کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے نہ استعمال کریں۔ شاہ عالم کو دہلی کے قریب کے چند گاؤں پر مقتدرانہ حقوق حاصل رہے لیکن اصلی اختیارات انگریز ریذیڈنٹ کے ہاتھ میں

آ گئے۔ شاہ عالم کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنا دیوان مقرر کرے۔ اس کے نام
سے مالیہ جمع کیا جاتا تھا اور عدل و انصاف کا نفاذ ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت[1]
کی طرف سے اس کو ۹۰ ہزار روپے ماہوار گزارے کے لیے ملتے تھے۔
مغل بادشاہوں کو یہ برائے نام اختیارات ۱۸۵۷ء کی شورش تک قائم
رہے۔ ولزلی چاہتا تھا کہ شاہ عالم دہلی کی سکونت ترک کر کے مونگھیر چلا جائے
لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ گورنر جنرل نے بھی اپنی اس تجویز پر زیادہ
اصرار نہیں کیا۔

دہلی کی فتح کے بعد جنرل لیک نے آگرہ کے قلعہ پر قبضہ کیا جہاں اس
کو سندھیا کا ۲۸ لاکھ روپے کا خزانہ ہاتھ آیا جسے انگریز افسروں اور سپاہیوں
پر تقسیم کر دیا گیا۔ سندھیا کی پندرہ ہزار فوج ایک فرانسیسی افسر دودرنش
کی ماتحتی میں آگرہ سے ۶۵ میل پر پڑاو ڈالے پڑی تھی۔ اس کے ساتھ
اعلیٰ درجے کا توپ خانہ تھا۔ یہ سندھیا کی آخری تربیت یافتہ فوج باقی
رہ گئی تھی۔ چنانچہ لیک نے اس سے لسواڑی کے مقام پر یکم نومبر ۱۸۰۳ء
مقابلہ کیا۔ سندھیا کی اس فوج نے بڑا سخت مقابلہ کیا لیکن اس کو شکست
ہوئی۔ لیک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کو کبھی اپنی عمر میں اتنا سخت
مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ گجرات میں سندھیا کے جتنے مقبوضات تھے ان پر کرنل مرے
نے قبضہ کر لیا تھا۔ بروچ سندھیا کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اسی طرح اڑیسہ
میں جگن ناتھ اور بالاسور پر کمپنی کی افواج قابض ہو گئی تھیں۔ غرضکہ ان حالات
میں سندھیا کے لیے سوائے دب کر معاہدہ کرنے کے اور کوئی مفر نہ تھا۔ اس
کی فرانسیسی افسروں کی ترتیب پائی ہوئی فوجیں فنا ہو چکی تھیں۔ راجا ناگپور
کے صلح نامہ (دیوگاؤں) پر دستخط کر دینے کے بعد آخر سندھیا نے بھی گورنر جنرل کی
پیش کی ہوئی شرطوں کو تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور سرجی ارجن گاؤں کے
مقام پر ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء صلح نامہ پر دستخط کر دیئے جس کے بموجب سندھیا

[1] Martin Wellesley's Despatches. Vol. IV. p. 153

نے اپنے وہ تمام علاقے کمپنی کے حوالے کر دیئے جو دریائے گنگا اور دریائے جمنا کے درمیان واقع تھے۔ جے پور۔ جودھ پور اور گوہد کے شمال میں جو اس کے مقبوضات تھے ان سے بے دخل ہونا پڑا۔ پیشوا سے انگریزوں نے جو معاہدہ بسین کیا تھا اس کی شرطوں کو بھی سندھیا نے تسلیم کیا۔ احمد نگر پیشوا کو دیا گیا۔ گجرات میں بروچ اور دوسرے علاقے کمپنی کے تصرف میں آئے۔ سندھیا نے ان تمام دعووں سے دست برداری کا اعلان کیا جو سرکار نظام گیکواڑ اور پیشوا کے خلاف اس کو حاصل تھے۔ اس نے راجپوتانہ کے ان راجاؤں اور جاگیرداروں سے بے تعلقی کا اظہار کیا جو کمپنی سے ساتھ معاہدے کر چکے ہیں۔ سندھیا نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کو ملازمت سے علٰحدہ کر کے اپنے خرچ پر انگریزی فوج سرحد کے قریب رکھے گا۔ سندھیا کے دربار میں انگریز ریذیڈنٹ رہا کرے گا۔ شمال میں نواب اودھ سے جو ضلعے ملے تھے اور اب معاہدہ سرجی ارجن گاؤں کی رو سے جو دوآبہ میں علاقے حاصل ہوئے انھیں ملا کر ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا جو صوبہ شمالی مغربی کہلاتا تھا اور جس کو اب صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (یو۔ پی) کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کے بعد سندھیا کا وہ تمام نظم و نسق جس پر اس کے اقتدار کا دارومدار تھا پاش پاش ہو چکا تھا۔ دربار مغلیہ سے جو اس کے تعلقات تھے اور جن تعلقات کو اپنے غلبہ کے استحکام کے لیے استعمال کرتا تھا توڑ ڈالے گئے۔ دربار پونا میں اس نے جو اثر قایم کر لیا تھا اور جس کی وجہ سے مرہٹہ برادری میں اس کی اہمیت تھی وہ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ جنرل لیک نے بھرت پور، جے پور، جودھپور، گوہد اور بوندی کے راجاؤں سے جو معاہدے کئے ان کی رو سے یہ سب ریاستیں سندھیا اور ہلکر کی باجگذاری سے آزاد ہو گئیں اور انگریزی حلقۂ اثر میں شامل ہو گئیں۔

ہلکر سے جنگ

سندھیا اور بھونسلا نے شروع میں کوشش کی تھی کہ ہلکر ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف مل جائے لیکن وہ الگ رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سندھیا کی کمزوری سے وہ آئندہ فائدہ

اٹھا لے گا۔ لیکن بعد میں اس نے دیکھا کہ انگریزوں نے جس طرح سندھیا اور بھونسلا کو زیر کر لیا ہے اور انھیں ان کے دیرینہ چوتھ کے حقوق سے راجپوتانہ اور دوسرے علاقوں میں محروم کر دیا ہے اسی طرح وہ اسے بھی محروم کر کے رہیں گے۔ اب اس نے سندھیا سے نامہ و پیام شروع کیا جس لئے اس کی اطلاع انگریزی حکومت کو کر دی اس لئے کہ وہ ہلکر پر خار کھائے ہوئے تھا۔ اس نے لیک کے پاس اپنے وکیل بھیجے اور کہلا بھیجا کہ راجپوتانہ، دوآب اور بندیلکھنڈ میں قدیم سے اس کو چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل ہے، اس میں کسی طرح مزاحمت نہ کی جائے اسی طرح کا ایک خط اس نے جنرل ولزلی کو بھیجا کہ دکن کے بعض علاقے جو اس کے خاندان کے تحت عرصے سے رہے ہیں ان پر انگریزی فوجیں قابض و متصرف ہوگئی ہیں۔ اگر ان علاقوں کو فوراً حوالے نہ کیا گیا تو سیکڑوں کوس تک ملک کے ملک لوٹ لئے جائیں گے اور مرہٹہ فوج انھیں روند کر رکھ دیگی اور لاکھوں خدا کی مخلوق پر مصائب نازل ہو جائیں گے[1] اس کے کچھ عرصے بعد ہلکر نے راجا جے پور کے علاقے میں یورش کر دی۔ اس پر لارڈ ولزلی نے جنرل ولزلی اور جنرل لیک کو ۱۶۔ اپریل ۱۸۰۴ء ہلکر کے خلاف جنگ کرنے اور اس کی یورشوں کی روک تھام کرنے کو لکھا جنرل لیک نے فوراً جے پور کا رخ کیا اور ہلکر کا پیچھا کر کے اسے جے پور کے علاقے سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد جنرل لیک نے بجائے اس کے کہ خود ہلکر کا پیچھا جاری رکھتا کرنل مانسن کو اس کام پر مامور کیا۔ کرنل مانسن اگرچہ دلیر اور جانباز تھا لیکن فن حرب سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ صرف ڈھائی ہزار فوج لے کر ہلکر کے علاقے میں گھستا چلا گیا اور نہ رسد کا کوئی انتظام کیا اور نہ دریاؤں اور ندیوں کو پار کرنے کا سامان ساتھ لیا جو بارش کی وجہ سے طغیانی کی حالت میں تھیں۔ جنرل ولزلی نے کرنل مرے کی جو فوج گجرات

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. p. 107

سے مانسن کی کمک کے لئے بھیجی تھی وہ کہیں راستہ میں رک گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہلکر نے مانسن کی فوج کو گھیر لیا اور اس کی رسد کے راستے بند کر دیئے۔ مانسن کو پسپائی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ ہلکر نے مانسن کی بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کیا۔ بہت سی سپاہ کو گولی کا نشانہ بنایا اور سارے ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ مانسن آگرہ کی طرف جان بچا کر بھاگ گیا۔ ہلکر نے آگے بڑھ کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ وہ چاہتا تھا شاہ عالم کو انگریزوں کے قابو سے نکال کر اپنی حراست میں اس طرح سے لے لیے جس طرح سندھیا نے لے لیا تھا اور اس کے ذریعہ سے اپنی قوت مضبوط کرے۔ لیکن کرنل آکٹرلونی نے بڑی بہادری سے دہلی کی مدافعت کی اور نو دن تک ایسے دشمن کے مقابلے میں بچائے رکھا جس کے ساتھ بیس ہزار فوج تھی اور ایک سو سے زائد بڑی توپیں تھیں مایوس ہو کر ہلکر نے دہلی کا محاصرہ اٹھا لیا اور اپنی پیدل فوج اور توپوں کو راجا بھرت پور کے علاقے میں بھیجدیا اور سواروں کو لے کر دوآبہ کا رخ کیا تاکہ اس زرخیز علاقے کو خوب لوٹے۔ راجا بھرت پور نے اگرچہ انگریزوں کی فتح مندی کے زمانے میں جنرل لیک سے اتحاد کا معاہدہ کیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہوا کا رخ دوسری طرف ہے تو یہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہلکر سے مل گیا۔

جنرل لیک دیسی اور انگریزی سواروں کے چھ رسالے اور توپ خانہ لے کر ہلکر کا پیچھا کرنے دوآبہ کی طرف روانہ ہوا اور منزل بر منزل طے کر کے فتح گڈھ (فرخ آباد) کے قریب اس کو آلیا۔ ہلکر مقابلے کی تاب نہ لا کر اپنی پیدل فوج سے ملنے کے لئے بھرت پور کی طرف بھاگا۔ اس اثنا میں جنرل فریزر نے اس کی پیدل فوج کو ڈیگ کے مقام پر سخت شکست دیدی تھی۔ جنرل لیک ہلکر کے تعاقب میں بھرت پور تک پہنچ گیا اور ہلکر مالوہ کی طرف نکل گیا۔ چونکہ بھرت پور کے راجا سے ہلکر کو برابر ہر قسم کی مدد ملتی رہی تھی اس واسطے جنرل لیک نے فیصلہ کیا کہ بھرت پور کے قلعہ کو فتح کرنا چاہئے۔ اس قلعہ کے گرد نہایت اونچی اور موٹی مٹی کی دیوار تھی جسکی

حفاظت کے لئے تھوڑی تھوڑی دور پر برجیاں بنی ہوئی تھیں اور دیوار کے چاروں طرف ایک گہری خندق تھی جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ قلعہ میں راجا بھرت پور کی آٹھ ہزار فوج کے علاوہ ہلکر کی پیدل فوج کی بھاگی ہوئی ٹکڑیاں بھی تھیں۔ جنرل لیک نے بغیر قلعہ شکن توپوں اور کسی ماہر انجنیر کے مشورہ کے محاصرہ بڑی سرگرمی سے شروع کر دیا۔ ہر قسم کی تیاری کے بعد چار مرتبہ قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی آخر محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو سخت ذلت اٹھانا پڑی۔ لیکن راجا بھرت پور نے دیکھا کہ ہلکر اب اس کی زیادہ عرصے تک مدد نہ کر سکے گا تو اس نے جنرل لیک سے صلح کا نامہ و پیام شروع کر دیا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ انگریزی فوج کی قوت مزید جنگی سامان اور کمک پہنچنے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ معاہدے کی رو سے طے ہوا کہ راجا چار قسطوں میں بیس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ انگریزوں کو ادا کرے اور کمپنی کے دشمنوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے۔ کمپنی کی بے اجازت کسی یورپین کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھ سکے گا۔ ان شرطوں کے منظور ہو جانے کے بعد محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

سندھیا' ہلکر کی اس ساری لڑائی کے زمانہ میں' اپنی حکمت عملی کو برابر بدلتا رہا۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ ہلکر کو کامیابی ہو رہی ہے تو گورنر جنرل سے اس کے خطوط کا لہجہ سخت اور اس کے مطالبات کی فہرست طویل ہو جاتی تھی لیکن جب وہ انگریزوں کا پلہ بھاری دیکھتا تو فوراً نرم لہجہ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن اس اثناء میں اس کو برابر یہ شکایت رہی کہ سرجی ارجن گاؤں کے معاہدے کی جو توجیہ پیش کی گئی ہے جس کی رو سے اس کو قلعہ گوالیار راجہ گوہد کے حوالے کرنا پڑا' درست نہیں۔ گوالیار کا قلعہ صرف اپنے استحکام کی وجہ سے سندھیا کو عزیز نہ تھا بلکہ عطیہ شاہی کی وجہ سے اس کی بڑی قدر تھی۔ خود جنرل ولزلی نے لارڈ ولزلی کو لکھا کہ معاہدہ کی رو سے قلعہ سندھیا ہی کے تحت رہنا چاہئے۔ معاہدہ کی دفعہ ۹ میں اس کی صراحت تھی کہ جے پور

جودھپور اور گوہد کے جنوب کے جن علاقوں میں سندھیا کے عامل مالگزاری وصول کرتے رہے ہیں وہ اسی کے تحت رہیں گے۔ اس بنا پر گوالیار سندھیا کو واپس دینا چاہئے تھا۔ لیکن گورنر جنرل نے یہ استدلال کیا کہ دفعہ ۹ کا اطلاق ان علاقوں کے لیے ہے جو سندھیا سے کمپنی نے چھینے ہیں اور جو جے پور، جودھپور اور گوہد کے جنوب میں واقع ہیں۔ لیکن چونکہ گوالیار کو کمپنی کی فوج نے سندھیا سے نہیں لیا بلکہ امباجی سے چھینا ہے، اس واسطے دفعہ ۹ کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ جنرل ولزلی نے اس بات کی تصدیق کی کہ معاہدہ کے وقت سندھیا نے اس صراحت کے بعد دستخط کئے تھے اگرچہ زبانی تھی، کہ گوالیار ان علاقوں میں شامل ہوگا جو اس کو واپس کئے جائیں گے۔ جنرل ولزلی نے اپنے ایک مراسلہ میں اپنے بھائی لارڈ ولزلی کی حکمت عملی پر اس طرح سے تنقید کی ہے۔ "میں جانتا ہوں کہ گورنر جنرل اپنے من گھڑت استدلال سے گوالیار کے قلعہ کا دعویدار ہوگا۔ لیکن یہ استدلال نرا من گھڑت ہوگا اور اصلی واقعات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میں گوالیار کو یا برطانوی ہند کے کسی دوسرے سرحدی مقام کو دس مرتبہ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں تاکہ ہماری دیانت داری کی ساکھ برقرار رہے۔ پچھلی جنگ اور اس کے بعد کی صلح سے ہمیں جو فائدے اور نیک نامی حاصل ہوئی ہے انھیں بحث و مباحث میں ضائع نہ کرنا چاہئے جو بین الاقوامی قوانین کی کھینچ تان کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں اس ملک میں کوئی نہیں سمجھتا۔ جنگ کی دشواریوں اور صلح کی گفت و شنید میں مجھے جس چیز سے سب سے زیادہ مدد ملی وہ بھروسے کا جذبہ تھا جو ہماری بات پر کیا جاتا تھا[1]۔" اس قسم کے خیالات کا اظہار جنرل ولزلی نے اپنے چھوٹے بھائی ہنری ولزلی والے خط میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ سندھیا کو غیر مطمئن کرنے سے انگریزوں کے لئے الجھنیں پیدا ہوں گی۔ وہ لکھتا ہے "مجھے گورنر جنرل سے

---

[1] Gurwood, The Duke of Wellington's Indian Despatches Vol III, p. 150

قلعہ گوالیار پر قبضہ کرنے کے متعلق اختلاف ہے۔ میرا یہ اختلاف حق اور حکمت عملی دونوں پر مبنی ہے۔ گورنر جنرل نے معمول کے موافق مین گراعت استدلال سے کام لیا ہے لیکن مجھے پھر بھی اس سے اختلاف ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے مرہٹوں سے جو معاہدے کئے ان میں اعتدال اور مصالحت کے اصول کو برتا تھا جس کی ہر طرف تعریف کی گئی تھی اب چاہے یہ اصول صحیح ہو یا درست لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب اس اصول کو ترک کیا جا رہا ہے۔ ہمارے دشمن ہم سے بیزار ہیں اور بد دیانتی کی کھلم کھلا شکایت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس ملک کا امن و امان خطرہ میں نظر آرہا ہے۔ پیارے ہنری! ہمیں کلکتہ میں ایک ایسے شخص کی سخت ضرورت ہے جو گورنر جنرل کو صاف صاف تمام باتیں بتائے۔ جب سے تم اور مالکم وہاں سے چلے آئے اس کے قریب کے لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جو ان مسائل کو سمجھ سکے اور اس میں اتنی جرات ہو کہ ان کے متعلق اس سے بحث کر سکے اور اسکے خیالات غلطی پر مبنی ہوں تو انھیں غلط کر سکے۔ گوالیار کے متعلق میں اور مالکم اور جنرل لیک اور دیب سب ہی کا یہ خیال ہے کہ سندھیا سے جو معاہدہ ہوا ہے اسکی رو سے گوالیار اسکو واپس دینا چاہئے۔[لہ]

لیکن لارڈ ولزلی اپنی اس ضد پر اڑا رہا کہ گوالیار گوہد کے رئیس کو دیا جائیگا جو پہلے سندھیا کا باجگذار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا نے بالکل مایوس ہو کر چالیس ہزار کی سپاہ فراہم کی اور انگریزوں کے خلاف ہلکر راجا بھرت پور اور امیر خاں سے اتحاد کیا۔ مسٹر وب کے انتقال پر مسٹر جنکنس سندھیا کے دربار میں انگریزی ریزیڈنٹ مقرر ہوا۔ اس لئے جب سندھیا کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس نے اس سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور ۲۳ جنوری ۱۸۰۵ء میں وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن سندھیا کے پروانہ پر وہ راستہ سے دربار میں واپس آیا تو اس کا سامان لوٹ لیا گیا اور اس کو نظر بند کر دیا گیا۔ اب اس نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ بھرت پور کی طرف اس بہانے سے

لہ Owen, Wellington's Despatches, p. 395 7

پیشقدمی کی کہ وہ راجا بھرت پور اور انگریزی حکومت میں صلح وصفائی کے لئے جا رہا ہے۔ سندھیا نے یہ بھی صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ چونکہ اس کی مالی حالت بالکل خراب ہو گئی ہے اس لئے وہ حملہ کرکے انگریزوں کے اتحادیوں سے روپیہ وصول کرے گا۔ چنانچہ اس نے ساگر (بھوپال) کی طرف رخ کیا۔ لارڈ ولزلی کو جب سندھیا کی نقل وحرکت اور ریزیڈنٹ کی حراست کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت بگڑا لیکن وہ اس وقت اس سے کھلم کھلا بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ گورنر جنرل کی حکمت عملی کو سندھیا نے اس کی کمزوری پر محمول کیا۔ جب سندھیا کی فوجیں بھرت پور کی طرف بڑھنے لگیں تو ولزلی نے جنرل لیک کو حکم دیا کہ اس کو دریائے چنبل سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ لیکن بھرت پور کے محاصرہ کی وجہ سے انگریزی فوجوں کی اخلاقی حالت ایسی پست تھی کہ وہ سندھیا کا غالباً اچھی طرح سے مقابلہ نہ کر سکتیں۔ چنانچہ جنرل ولزلی کے مشورہ کے مطابق لارڈ ولزلی نے سندھیا کو واپس جانے کے لیے سرکاری خزانہ سے معقول رقم دلوادی۔

اس اثنا میں راجا بھرت پور اور انگریزوں میں صلح ہو جانے سے جنرل لیک کو یکسوئی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس نے دریائے چنبل کے کنارے ڈیرا ڈال دیا جس کے دوسری طرف ہلکر اور امیر خاں اپنے تیس ہزار سواروں کے ساتھ سندھیا سے آکر مل گئے تھے۔ جنرل لیک نے سندھیا کو لکھا کہ اگر انگریزی حکومت کے ریزیڈنٹ مسٹر جنکنس کو دس روز کے اندر حراست سے نہ چھوڑا گیا تو انگریزی حکومت اور سندھیا کے دوستانہ تعلقات منقطع سمجھے جائیں گے۔ سندھیا نے ریزیڈنٹ کو حراست سے رہا کر دیا اس لئے کہ اس کو امید دلائی گئی کہ اگر وہ ہلکر سے تعلقات نہ رکھے تو انگریزی حکومت اس کو گوالیار واپس دینے کے مسئلہ پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ سندھیا کو ہلکر سے اتحاد کرنے میں جب زیادہ فائدہ کی امید نہ رہی تو اس نے اس کی طرف سے بے رخی اختیار کر لی۔ لارڈ ولزلی نے جو اب مرہٹہ سیاست کی پیچیدگیوں سے بیزار ہو چلا تھا مصلحت کی خاطر گوالیار سندھیا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن

اسے ایسا کرنے سے پہلے استعفا دینا پڑا۔ ہلکر اس کے ساتھی امیر خاں کی فوج
اب بھی وسط ہند اور مالوہ میں انگریزوں کے اتحادیوں کو چین سے نہیں
بیٹھنے دے رہی تھی۔ ولزلی نے مجلس نظماء کو یقین دلایا کہ ہلکر سے لڑنے
کے سبب سے سیاسی تعلقات کا وہ نظام مطلق متاثر نہ ہوگا جو برطانوی
حکومت اور ہندوستان کے مختلف والیان ریاست کے درمیان وجود
میں آگیا ہے بلکہ ان تعلقات سے ہمارے وسائل کو ایسا استحکام حاصل
ہوگا کہ اسے ہمارے دشمن ہلا نہیں سکیں گے۔ لیکن مانسن کی شکست اور
بھرت پور کے محاصرہ کی ناکامی سے انگلستان میں ولزلی کے مخالفوں
کو اس پر نکتہ چینی کا اچھا موقع مل گیا۔ فلپ فرانسس نے پارلیمنٹ میں
لارڈ ولزلی پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔[1] "جب سے ۱۸۰۳ء کا انتظامی قانون
(قانون پٹ) منظور ہوا ہے اس وقت سے ہمیں سوائے جنگ اور الحاق کے
اور کوئی خبر نہیں ملی۔ میں ایوان سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مجھے بتائے کہ
اس کے سوا ہم نے اور کیا سنا۔ بہت سی فتحیں ہوئیں۔ نئے نئے ملک
سلطنت برطانیہ میں شامل کئے گئے۔ کبھی کبھی کچھ عرصے کے لئے سستانے
کا وقفہ آیا تاکہ دم لے کر پھر وہی لڑائی جھگڑا چھیڑ دی جائے۔ پھر کہا جاتا
ہے کہ ان سب جنگوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کمزور نے طاقتور پر
حملہ کیا۔ اس دعوے کو یقین کرنے کے لئے نہایت واضح شہادت کی
ضرورت ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ہمیشہ جہاں تک ہوسکا
امن وامان کے قیام کے لئے کوشاں رہی ہے۔ لیکن برطانوی حکومت
اپنے اس نیک ارادے کو کبھی بروئے کار نہ لاسکی اسواسطے کہ ہندوستانی
والیان ملک نہایت بے چین اور سرکش واقع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں
ہم اپنے ساتھ بڑی بے انصافی کریں گے اگر ہم ان پر حملہ کرنے سے بچیں
یہ کیا قصہ ہے کہ خونخوار اور سرکش بھیڑیا حلیم، نرم مزاج اور اعتدال پسند
بھیڑ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔"

۱۔ Hansard parliarventary Debats Vol I p. 866-7

فرانسس کے علاوہ پارلیمنٹ کے دوسرے ارکان بھی لارڈ ولزلی کی الحاقی حکمت عملی کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ خود وزارت وقت نے دشواری محسوس کی کہ وہ ارکان پارلیمنٹ کے اعتراضوں کا معقول جواب دے سکے۔ مجلس نظماء تو پہلے ہی سے ولزلی کی سخت مخالف تھی۔ اب چارلس گرانٹ مجلس نظماء کا صدر ہوگیا تھا جو لارڈ ولزلی کا سخت مخالف تھا۔ اب تک وزارت نے مجلس نظماء کی مخالفت کے باوجود ولزلی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ ولزلی کی زیادہ عرصے تک تائید وحمایت نہیں کی جاسکتی اس واسطے کہ پارلیمنٹ کے ہر گوشہ سے اس کی حکمت عملی سے اختلاف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وارن ہیسٹنگز اور ولزلی کے ساتھ پارلیمنٹ اور مجلس نظماء نے مختلف اصول اختیار کئے۔ مجلس نظماء نے وارن ہیسٹنگز کی برابر تائید کی تھی اور پارلیمنٹ نے برابر اس کی مخالفت کی تھی لیکن ولزلی کی پارلیمنٹ نے آخر وقت تک حمایت کی اور مجلس نظماء نے برابر اس کی مخالفت کی۔ پارلیمنٹ میں انگریزوں نے ولزلی کا مواخذہ کرنے کی تجویز پیش کی لیکن یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اس کے برخلاف پارلیمنٹ نے لارڈ ولزلی کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ولزلی کا چھوٹا بھائی جنرل ولزلی (جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن ہوا) ہندوستان سے انگلستان واپس جاچکا تھا۔ اس نے پٹ اور کاسل ریے سے ملاقات کی اور اپنے بھائی کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے دیکھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پٹ نے کارنواس سے ایک گفتگو کے دوران میں صاف طور کہہ دیا تھا کہ ولزلی نے بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام کیا ہے اور اس کو زیادہ عرصے تک گورنر جنرل کی حیثیت سے نہیں رکھا جاسکتا۔[1] جنرل ولزلی نے جب اپنے بھائی کے خلاف انگلستان میں یہ فضا دیکھی تو اس کو ایک خط میں صاف طور پر لکھ دیا کہ "مجھے بڑا خطرہ ہے کہ آپ کو عہدہ سے الگ

[1] Ross, Correspondence of Marquis Cornwallis Vol. III p. 522

نہ کر دیا جائے[1]" ان حالات میں ولزلی نے اپنا استعفاء پیش کر دیا۔ ۳۰ جولائی ۱۸۰۵ء لارڈ کارنوالس کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا اور اس کو ہدایت کی گئی کہ ہندوستان جا کر ملک میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کرے۔

ولزلی کی خارجی سیاست

اس میں شبہ نہیں کہ ولزلی نے عہد معاونت کے اصول سے فرانسیسیوں کے اثر کو ہندوستانی والیان ملک کے دربار میں ختم کر دیا تھا اور جو فوجیں فرانسیسی افسروں کے زیر تربیت تیار کی گئی تھیں وہ منتشر کر دی گئی تھیں لیکن ولزلی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت انگلستان انقلابی فرانس کے ساتھ حیات اور ممات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور فرانس انگلستان کی مشرقی سلطنت پر کاری ضرب لگانے کے لئے آمادہ تھا۔ ۱۷۹۹ء میں ولزلی نے پرتگالی حکومت سے معاملات طے کرنے کے بعد گوا میں انگریزی محافظ فوج متعین کر دی تاکہ فرانسیسی اس بندرگاہ پر قبضہ کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے اور انگریزی مفاد کے خلاف نہ استعمال کر سکیں۔ ۱۸۰۱ء میں برطانیہ اور ڈنمارک میں یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو ولزلی کو بڑا اچھا موقع ملا کہ وہ ٹرانک بار اور سیرام پور پر جو ڈنمارک کے مقبوضات تھے قبضہ کر لے۔ جس وقت ڈنمارک غیر جانبدار تھا تو ولزلی کو اندیشہ تھا کہ اس کے مقبوضات کو فرانس اپنا مرکز نہ بنا لے۔ سیرام پور کلکتہ سے اس قدر قریب تھا کہ وہاں سے انگریزی صدر مقام کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس کی اطلاعیں بھی پہنچیں تھیں کہ سیرام پور میں انقلابی فرانسیسیوں (جیکوبنز) نے اپنا مرکز قائم کیا ہے۔ دشمن ان مراعات سے جو ڈنمارک کو دریائے ہگلی میں جہاز رانی کے متعلق حاصل تھیں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ غرضکہ ڈنمارک کے دونوں مقبوضات پر قبضہ کرنے سے یہ اندیشہ جاتا رہا۔

نپولین کا عرصے سے خیال تھا کہ وہ خشکی کے راستے سے ہندوستان

---

[1] Roberts, India under Wellesley, p. 264

پر حملہ کر کے سلطنت برطانیہ کی شہ رگ پر ضرب لگائے گا۔ چنانچہ اس نے زار روس پال اول سے جو معاہدہ کیا اس کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ ۳۵ ہزار فرانسیسی فوج ڈینیوب کے دریائی راستہ سے بحر اسود اور وہاں سے استرا خان جائیگی جہاں روس کی ۳۵ ہزار فوج تیار رہے گی۔ یہ دونوں لشکر ہرات اور قندھار ہوتے ہوئے دریائے انڈس کی طرف بڑھیں گے[1] یہ منصوبہ چاہے کتنا ہی ناقابل عمل کیوں نہو لیکن نپولین جیسے بے باک شخص سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس پر عمل کر بیٹھتا۔ چنانچہ ولزلی نے اس خطرہ کی روک تھام کرنے کے لیے پہلے ایک ایرانی مہدی علیخاں نامی کو جو کمپنی کی ملازمت میں عرصے سے تھا طہران روانہ کیا تاکہ وہ شاہ ایران کو انگریزی حکومت کا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد ولزلی نے مالکم کو نہایت قیمتی تحفے دیکر طہران روانہ کیا۔ مالکم نے شاہ ایران سے دو معاہدے کئے۔ ایک تجارتی اور دوسرا سیاسی۔ تجارتی معاہدہ کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اجازت مل گئی کہ وہ ایرانی بندرگاہوں کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرے اور وہاں اپنی کوٹھیاں بنائے۔ سیاسی معاہدہ کی رو سے زماں شاہ والی افغانستان اور حکومت ایران نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔ ولزلی نے اپنے اس کارنامہ کے متعلق بڑے فخر سے مجلس نظماء کو لکھا کہ "برطانوی حکومت اور ایک ایسی مملکت کے درمیان اتحاد کے مضبوط تعلقات قایم ہو گئے ہیں جس کے وسائل انگریز قوم کے دشمنوں کی دسترس میں آسکتے ہیں اور ان سے ہمارے مشرقی مقبوضات کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے[2]"

لیکن جب روس اور ایران میں جنگ چھڑی تو شاہ ایران نے سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کا حوالہ دے کر جو مالکم کے ساتھ ہوا تھا لارڈ ولزلی سے امداد طلب

---

[1] Roberts, India under Wellesley, p 144.

[2] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p

کی لیکن روس اور برطانیہ میں چونکہ اتحاد ہو چکا تھا اس لئے ولزلی کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتا تھا۔ شاہ ایران نے اپنے ایلچی فرانس روانہ کیئے تاکہ ادھر سے کچھ مدد ملے۔ نپولین نے جنرل گاردان کو اپنے سفیر کی حیثیت سے طہران روانہ کیا جس نے جاکر شاہ ایران سے یہ معاہدہ کیا کہ فرانس روس کے خلاف ایران کی مدد کرے گا۔ اس کے صلہ میں شاہ ایران نے وعدہ کیا کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے جو فرانسیسی فوج اس کے ملک میں سے گزرے گی اس کو رسد بہم پہنچانے کا وہ ذمہ لیتا ہے اور وہ اس کے علاوہ فوجی امداد سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ لیکن اس اثنا میں یورپ کی بین الاقوامی سیاست میں زبردست تبدیلی ہوگئی۔ ۱۸۰۷ء میں نپولین اعظم نے روس کو شکست دی اور تلسٹ کے مقام پر روس اور فرانس میں جو معاہدہ ہوا اس کے بموجب یہ طے ہوا کہ زار الگزنڈر فرانس کے ساتھ اتحاد میں شریک ہوگا۔ چنانچہ وسط ایشیا اور ایران کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے منصوبے پھر سوچے جانے لگے لیکن اس معاہدہ کے ایک سال کے اندر ہی نپولین کو یورپ میں واپسی ایسے اہم مسائل پیش آئے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال پس پشت ڈال دینا پڑا۔ لیکن نپولین کے ان مشرقی منصوبوں سے اتنا ضرور ہوا کہ ولزلی نے اپنی سیاست کے نقطۂ نظر کو ہندوستان کی حدود سے محدود نہ کیا بلکہ برطانوی شہنشاہیت کی مشرقی ضرورتوں کو اپنا محرک عمل بنایا۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں ولزلی چاہتا تھا فرانسیسی مقبوضہ آئل آف فرانس کے خلاف سیلون سے بحری بیڑہ بھیجے۔ جب سے فرانس اور انگلستان کی جنگ شروع ہوئی تھی اس وقت سے اس جزیرے سے ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ کا برطانوی مال لوٹا جا چکا تھا اور بے شمار جہاز ڈبوئے جا چکے تھے اس مہم پر جنرل ولزلی جانے کو تیار تھا لیکن شاہی بحریہ کے اڈمیرل رینیر نے اس مہم میں اسوقت تک شرکت کرنے سے انکار کیا جب تک کہ اس کو حکومت انگلستان کے احکام نہ ملجائیں۔ بورڈ آف کنٹرول نے ولزلی کے منصوبہ کی تعریف کی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اڈمیرل رینیر نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض

کے سلسلہ میں کیا اس لیے کہ جب تک اس کو براہ راست احکام نہ ملیں وہ کسی بحری مہم کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا تھا۔ ولزلی نے جو فوج اس مہم کے لیے تیار کی تھی وہ بورڈ آف کنٹرول کے احکام کے بموجب سر ڈیوڈ بیرڈ کی ماتحتی میں سمندر کے راستے سے مصر بھیجدی گئی۔ لیکن پیشتر اس کے سر ڈیوڈ بیرڈ وہاں پہنچے فرانسیسی فوج کو سر رالف ابرکرومبی کے ماتحت انگریزی فوج نیچا دکھا چکی تھی اور فرانسیسی افسروں نے ہتیار ڈال دیے تھے۔

فورٹ ولیم کالج وارن ہسٹنگز نے سب سے پہلے اس جانب توجہ کی کہ کمپنی کے ملازمین کی واقفیت اہل ہند کے متعلق بڑھائی جائے۔ چنانچہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اس نے سر ولیم جونس کے زیر صدارت اسلئے قایم کی تھی کہ مشرقی علوم وفنون کو انگریزی زبان میں منتقل کیا جائے تاکہ کمپنی کے ملازمین ان کتابوں کو انگریزی میں پڑھ کر ہندوستان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ ولزلی نے محسوس کیا کہ اکثر ملازم کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کرتے جو انھیں ان کی آئندہ ذمہ داریوں کے متعلق تیار کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان پر آئندہ انگریزوں کی حکومت عارضی نوعیت کی نہ ہو بلکہ ایسے لوگ حکومت کریں جو برطانوی شہنشاہیت کا اصولی احساس رکھتے ہوں۔ اس نے بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) کو کمپنی کے ملازموں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم بناکر بھیجی اس میں ایس نے اس امر پر زور دیا کہ اس کی بنیاد انگلستان میں قایم ہونی چاہیے اور تعلیمی عمارت کا بالائی حصہ باقاعدہ ہندوستان میں مکمل ہونا چاہیے چنانچہ اس نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج اسی غرض کے لیے قایم کیا۔ کمپنی کے سیول ملازم ہندوستان آنے کے بعد یہاں تین سال رکھے جاتے تھے۔ انھیں ہندوستانی زبانیں، ہندوستانی تاریخ اور ہندؤوں اور مسلمانوں کے قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کے اخراجات کی پابجائی کے لیے اس نے کمپنی کے مالیہ کو زیر بار نہیں کیا اس لئے کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً مجلس نظماء اس پوری اسکیم کی

مخالفت کرتی۔ اس لیے کمپنی کے تمام سیول ملازموں کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم وضع کرنے کا قاعدہ مقرر کردیا جسے سب نے بخوشی منظور کرلیا۔ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول کی منظوری کا انتظار کئے بغیر یہ کالج قایم کردیا جس کی وجہ سے بورڈ نے اس کی مخالفت شروع کردی اور اس کے مطلق العنانہ طرز عمل کو قابل اعتراض ٹھہرایا۔ لیکن ایک مرتبہ کالج قایم ہوجانے کے بعد اس کا توڑنا مشکل تھا۔ بورڈ نے کالج کو توڑنے کی بہترین ترکیب یہ سوچی کہ اسی قسم کے کالج بمبئی اور مدراس میں بھی قایم کئے جائیں لیکن ولزلی نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ ایسا کرنے سے تعلیم میں یکسانیت نہیں رہے گی جو ایک مرکزی ادارہ ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے جیسے مرکزی حکومت اپنی نگرانی میں چلاتی ہو۔[1] بورڈ آف کنٹرول نے وزارت وقت کے زیر اثر فورٹ ولیم کالج کو توڑنے کے خیال کو ملتوی کردیا لیکن مجلس نظما اس پہ برابر اڑی رہی۔ لیکن ولزلی نے اس بات میں اپنے ان دوستوں سے جو وزارت انگلستان کے رکن تھے پرزور اپیل کی اور درخواست کی کہ کالج کو تباہ ہونے سے بچائیں۔ اس واسطے کہ اس کو اپنے اس کام پر تسخیر میسور سے زیادہ فخر وناز تھا۔ آخر بورڈ آف کنٹرول نے کچھ عرصے کیلئے اس کالج کو باقی رہنے کی اجازت دے دی۔

لارڈ ولزلی کا کارنامہ

ولزلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سر جان شور کی عدم مداخلت کی کمزور حکمت عملی سے انگریزی حکومت کے خلاف جو عام طور پر ہندوستانی والیان ملک میں بے اعتباری پیدا ہوگئی تھی اس کو اس نے دور کردیا۔ ولزلی کو اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ہندوستان کے حالات کا قدرتی اقتضا یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے بجائے ملک کی سیاست میں پہل کرے۔ اس نے اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں کوئی ایسی زبردست

---

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p 640-66.

سلطنت قایم نہ ہو جائے جو اپنے وسائل اور فوجی قوت کی وجہ سے سب پر غلبہ حاصل کر لے اس وقت تک ملک کی ابتری اور انتشار کو دور نہیں کیا جا سکتا جو دیسی حکمرانوں کے آپس کے آئے دن کے جھگڑوں کا لازمی نتیجہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اگرچہ ہندوستان میں اب ایک زبردست سلطنت قایم کر لی تھی لیکن اس کے ارباب حل و عقد کی ذہنیت ابھی تک تاجرانہ تھی وہ فوجی کارروائیوں کو بری نظر سے دیکھتے تھے اس واسطے کہ ان سے ان کے سالانہ منافع میں کمی ہو جاتی تھی۔ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (مجلس نظماء) کو صاف صاف بتایا کہ کمپنی کی تاجرانہ ذہنیت کو اب بدلنا ہوگا، اور کمپنی کے شاہانہ فرائض اس کے تجارتی مقاصد پر غالب رہنے چاہئیں۔ ولزلی نے عہد معاونت کے اصول کے ذریعہ انگریزی سیادت کو اکثر والیان ملک سے منوا لیا اور اس طرح کمپنی کو تقریباً نصف ہندوستان کا حامی یا نگہبان بنا دیا۔ باقی نصف پر کمپنی کا پرچم لہرانے لگا۔ ولزلی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسی سیاسی حیثیت حاصل کر لی ہے کہ وہ پورے ملک کی سیادت اور بالادستی کے بجا طور پر دعویدار ہو سکتے ہیں۔ اب اگر وہ جس مقام تک پہنچ چکے ہیں وہیں ٹھہر جائیں گے تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری قوت ان کی جگہ لے اور پورے ہندوستان میں اپنے اقتدار کا سکہ چلائے۔ ولزلی کا سب سے بڑا مقصد تو یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو پورے ہندوستان کا مقتدر بنا دے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ سلطنت برطانیہ کے سب سے بڑے حریف یعنی نپولین اور حکومت فرانس کے مشرقی ممالک کے منصوبوں کو خاک میں ملا دے اور اس غرض کے لئے ہندوستان کے وسیلوں کو استعمال کرے۔ چنانچہ ٹیپو کی تباہی، سرکار نظام سے عہد معاونت، بسین کا معاہدہ اور مرہٹوں کی جنگ یہ سب آخر الذکر مقصد کے ذریعے تھے جو استعمال کئے گئے۔ ولزلی کے توسیع سلطنت کے منصوبوں کی پارلیمنٹ میں مخالفت ہوتی رہی لیکن وہ دھن کا پکا تھا۔ اس نے مخالفت کی کوئی پروا نہیں کی۔ اپنے اٹل عزم اور استقلال سے انگریزی حکومت کو ہندوستان کے بیشتر حصوں میں تفوق اور

تسلط حاصل ہوگیا۔ اس کے عہد میں سلطنت کی غیر معمولی توسیع عمل میں آئی اور انگریزوں کی برتری کو ہندوستان کی باقی ماندہ قوتوں نے تسلیم کرلیا۔ شروع میں وزارت اور مجلس نگران نے اس کا ساتھ دیا لیکن ہلکر کی لڑائی کے وقت سے وہ بھی ان بھاری ذمہ داریوں کو تشویش کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ وزارت نے لارڈ کارنواس کو گورنر جنرل کے عہدہ کو قبول کرنے پر اصرار کیا تاکہ وہ پھر اس اصول کا اعلان کرائے جو پٹ کے قانون میں پیش کیا گیا تھا تاکہ دیسی والیانِ ملک کی سابقہ خود مختارانہ حیثیت بحال کردی جائے اور یہ خیال ان کے دل سے محو ہو جائے کہ انگریزی حکومت تمام دیسی ریاستوں پر قبضہ کرنیکا ارادہ رکھتی ہے۔

لارڈ کارنوالس کا دوبارہ گورنر جنرل ہونا

لارڈ کارنواس کو دوبارہ جب گورنر جنرل کا عہدہ تفویض کیا گیا تو اس کی عمر ۶۶ سال تھی۔ اس کی صحت خراب تھی لیکن اس نے دعوت فرض قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ۳۰ جولائی ۱۸۰۵ء کو کلکتہ پہنچا۔ اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ولزلی کی حکمت عمل کو پلٹنے کی تدبیر کرے۔ مرہٹوں سے مصالحت کرے اور ملک گیری کے بجائے اندرونی نظم ونسق کو بہتر بنانے کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرہٹوں سے ولزلی کے عہد حکومت میں جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی کڑی شرطوں کو منسوخ کردیا جائے تاکہ ان کی بے اطمینانی دور ہو۔ کارنواس نے ۱۹ ستمبر ۱۸۰۵ء کو جنرل لیک کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس کے طرز عمل پر جو اس نے مرہٹوں کے معاملات میں اختیار کر رکھا تھا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ ہلکر سے مصالحت کرلی جائے۔ گوالیار سندھیا کو واپس کردیا جائے اور گوہد پر اس کی باجگذاری تسلیم کرلی جائے۔ سندھیا نے انگریز ریذیڈنٹ مسٹر جنکنس کو جو حراست میں رکھ چھوڑا تھا اگر وہ اس کو رضامندی سے چھوڑ دے تو اچھا لیکن اگر اس کی رہائی کے مطالبہ سے انگریزی حکومت اور سندھیا میں

صلح ہونے میں خلل پڑتا ہو تو اس مطالبہ پر زیادہ اڑنا نہ چاہیے۔ جے پور کے ساتھ جو کمپنی نے معاہدہ کرلیا تھا اسے کالعدم تصور کیا جائے اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مرہٹوں سے سیاسی اُلجھاؤ کا ہمیشہ ڈر رہیگا۔ شاہ عالم کو کلکتہ یا کسی اور دوسرے محفوظ مقام پر بھیج کر دہلی سندھیا کو واپس دیدیا جائے۔ دریائے چنبل کے شمال میں جن والیان ریاست سے معاہدے کئے گئے ہیں وہ سب منسوخ کئے جائیں۔ انگریزی حمایت سے محروم ہونے کی وجہ سے ان والیان ملک کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا اس کی تلافی اسطرح کی جاسکتی ہے کہ انھیں انگریزی علاقے میں سے بعض حصے حوالے کردیئے جائیں۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ مراسلہ لیک کو پہنچتا لارڈ کارنوالس غازی پور کے مقام پر وفات پاچکا تھا۔ لارڈ کارنوالس میں اگرچہ وارن ہیسٹنگز کی سی اُپج اور ولزلی کی سی اولوالعزمی نہ تھی لیکن وہ راست باز اور اعتدال پسند تھا جس کی وجہ سے انگلستان کی وزارت کو ہمیشہ اس پر بھروسا رہا۔ اور پٹ تو ہندوستان کے تمام معاملات میں بغیر اُس کے مشورے کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔

دسواں باب

جارج بارلو اور منٹو کا عہد حکومت

سرجارج بارلو

لارڈ کارنوالس کی وفات پر سرجارج بارلو نے جو گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پرانا رکن تھا گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لیا۔ وہ کمپنی کے تجربہ کار عہدہ داروں میں سے تھا اور نظم ونسق کے مختلف شعبوں کا اس کو وسیع تجربہ حاصل تھا۔ اگرچہ وزارت نے سرجان شور کے زمانہ میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ آئندہ کسی ایسے شخص کو جو کمپنی کی ملازمت میں ہندوستان میں عرصے سے ہو گورنر جنرل کا اعلیٰ عہدہ نہیں دیا جائے گا لیکن لارڈ ولزلی کی سفارش پر سرجارج بارلو اس عہدہ پر عارضی طور پر سرفراز کیا گیا۔ سرجارج بارلو میں دفتری کام کی صلاحیت اچھی تھی۔ لیکن اعلیٰ سیاست کے مسائل سے وہ بالکل ناآشنا تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں وہ اس کی فہمتا ہی حکمت عملی کا قائل تھا لیکن بعد میں جب اس نے دیکھا کہ وزارت کی حکمت عملی بدل چکی ہے تو اس نے بھی اپنے مسلک میں تبدیلی کرلی۔ گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد سرجارج بارلو نے جنرل لیک

کو آگاہ کر دیا کہ وہ جلد سے جلد سندھیا اور ہلکر سے صلح کرنا چاہتا ہے۔ اس نے لیک کو یہ بھی ہدایت کی کہ ان معاہدوں میں ہمیں معاونت کے اصول پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں اور نہ جمنا کے پار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ سیاسی تعلقات ضروری ہیں۔ ہمیں ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کے تمام حقوق سے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے۔ کمپنی کی سرحد دریائے جمنا رہنی چاہئے۔ ولزلی کا اصول یہ تھا کہ برطانوی بالادستی کے تحت ہندوستان کو امن و امان حاصل ہوگا لیکن سر جارج بارلو نے یہ اصول پیش کیا کہ دیسی ریاستوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہئے تاکہ انھیں کمپنی کے مقبوضات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اس نقطۂ نظر کی بدولت کمپنی کو بقول مٹکاف "ایسی دولت ہوئی جس میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ ایسے معاہدے کئے گئے جن سے حفاظت میسر نہ آسکی اور ایسی صلح ہوئی جس سے امن و امان نصیب نہ ہو سکا۔"

جنرل لیک نے سندھیا سے نومبر ۱۸۰۵ء میں ایک معاہدہ کر لیا جس کے بموجب معاہدہ سرجی ارجن گاؤں کی بعض دفعات میں تبدیل کر دی گئی۔ گوالیار سندھیا کو واپس کر دیا گیا اور گوہد پر اس کے باجگذاری کے حقوق تسلیم کر لئے گئے۔ عہد معاونت کی شرطیں جو گزشتہ عہد نامہ میں تھیں وہ جدید معاہدہ میں نہیں رہیں۔ انگریزی حکومت اور سندھیا کی ریاست کے درمیان دریائے چنبل کو سرحد قرار دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ چے پور، جودھ پور اور اودے پور کے راجاؤں سے کوئی معاہدہ نہیں کرے گی اس لئے کہ سندھیا کو ان پر اپنے باجگذار ہونے کا دعویٰ تھا۔ راجپوتانہ کے راجاؤں کے ساتھ اس طرح بے مروتی سے پیش آنے سے کمپنی نے اپنے تئیں دوسروں کی نظروں میں بڑا ذلیل کر لیا۔

لیک نے پوری کوشش کی کہ ہلکر نے فوجی لحاظ سے کمپنی کو جو نیچا

۱۔ Roberts, History of British India, p. 264.

دکھایا تھا کہ اس کی تلافی کرے۔ اس وقت ہلکر کے ساتھ بارہ ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل فوج
تھی جس سے وہ وسط ہند میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ لیک نے ہلکر کا شمال کی طرف پیچھا کیا جو پنجاب
میں داخل ہو گیا تھا۔ لیک نے دریائے ستلج کو پار کر کے رنجیت سنگھ سے ملاقات کی جو اس زمانے
میں اپنی سکھ ریاست کو مستحکم کرنے میں لگا ہوا تھا۔ لیک چاہتا تھا کہ رنجیت سنگھ ہلکر کے
خلاف انگریزوں کی مدد کرے لیکن اس نے غیر جانبداری کے اصول پر عمل کیا
اس واسطے کہ وہ مرہٹوں کو خواہ مخواہ اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتا تھا لیکن
اس نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ ہلکر کو پنجاب سے فوراً چلے جانے پر مجبور کرے گا۔
ہلکر اس وقت سکھوں کے متبرک مقام امرتسر میں پناہ گزیں تھا۔ اس نے
اپنا ایلچی جنرل لیک کے پاس بھیجا جو خود بھی گورنر جنرل کے احکام کے بموجب
جلد سے جلد صلح کرنا چاہتا تھا۔ سر جارج بارلو کی ہدایت کے مطابق ایک معاہدے
کا مسودہ ہلکر کے سامنے پیش کیا گیا جس کے مطابق ہلکر کو اس کی قوت و حکومت
بحال کر دی گئی۔ اس کے وہ تمام علاقے واپس کر دئے گئے جو پہلے سے اس کے
خاندان کی حکومت کے تحت چلے آتے تھے۔ انگریزی حکومت نے
راجپوتانہ کی ان تمام ریاستوں کے معاملات میں مداخلت سے دستبرداری
کا وعدہ کیا جن پر ہلکر کو اپنے باجگذار ہونے کا دعویٰ تھا۔ بوندی، رام پورہ
دریائے چنبل کے شمال کے تمام علاقوں اور بندیل کھنڈ میں ہلکر اپنے تمام
دعووں سے دستبردار ہو گیا۔ لیکن معاہدے کے بعد بھی ہلکر کے وکیلوں کی
کوشش سے گورنر جنرل نے رامپورہ ہلکر کو واپس دے دیا اور بوندی اور ٹونک
میں اس کی مداخلت کو تسلیم کر لیا۔
سندھیا اور ہلکر سے معاہدے ہو جانے کے بعد باوجود لیک کے سخت احتجاج کے
گورنر جنرل نے اعلان کر دیا کہ دریائے چنبل کے پار جتنی راجپوت ریاستیں ہیں
ان کو مرہٹوں کی دستبرد سے بچانے کی ذمہ داری کمپنی پر نہیں۔ سر جارج بارلو
کا کہنا یہ تھا کہ وہ جہاں تک ممکن ہے حکومت انگلستان کی حکمت عملی کو جامہ عمل پہنانا
پہنانے کی کوشش کرے گا۔ جے پور اور بوندی کے راجا وفادار اتحادی
ہونے کی حیثیت سے اس سے بہتر سلوک کے مستحق تھے جو ان کے ساتھ روا

رکھا گیا۔ ہلکر پنجاب سے واپسی پر ایک مہینہ تک جے پور کی ریاست کو لوٹتا گھسوٹتا رہا لیکن گورنر جنرل کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ جب ہلکر کو معلوم ہو گیا کہ انگریزوں نے راجا پر سے اپنا حمایتی سایہ اٹھا لیا ہے تو اس نے اس سے اٹھارہ لاکھ کا نذرانہ جبریہ وصول کیا۔ اس عدم مداخلت کی حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ اور وسط ہند میں پھر طوائف الملوکی پھیل گئی۔ راجپوت راجاؤں کے آپس کے جھگڑوں میں مرہٹے حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدگی اور ابتری پیدا ہوئی۔ راجا جے پور اور راجا جودھپور کی لڑائی میں سندھیا اور امیر خاں نے جے پور کے راجا کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے جودھپور کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد راجا جودھپور نے پچاس لاکھ کا وعدہ کر کے امیر خاں کو راجا جے پور کی طرف سے توڑ لیا اور اس نے جے پور کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ راجا اودے پور کے علاقے کو بھی سندھیا اور امیر خاں نے خوب جی بھر کے لوٹا۔ راجا نے گورنر جنرل سے مدد کی درخواست کی اور کہا کہ ہندوستان میں ہمیشہ ایسی مقتدر حکومت رہی ہے جس کی طرف کمزوروں کی نظریں داد رسی کے لئے اٹھتی رہی ہیں۔ اس وقت کمپنی نے یہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے اس لئے اس کا منصب ہے کہ وہ کمزوروں کو زیردستوں کی چیرہ دستی سے محفوظ رکھے لیکن سرجارج بارلو اس اپیل سے ٹس سے مس نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجا اودے پور کو اپنی ریاست کا نصف حصہ امیر خاں کے حوالے کرنا پڑا۔ اس زمانے کی برطانوی حکمت عملی پر کلنگ کا ٹیکا یہ ہے کہ اس نے راجپوتانہ کی ریاستوں کو بے پناہ اور مرہٹوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونے کے لئے چھوڑ دیا جس سے انگریزی حکومت کی طرف سے ہر طرف بے اعتباری پیدا ہو گئی۔ ولزلی کے دفاعی اتحاد کے منصوبے سے برطانوی سیادت ملک کے مختلف حصوں میں قایم ہو گئی تھی۔ سرجارج بارلو نے اس کے خلاف جو حکمت عملی اختیار کی اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ راجپوتانہ اور وسط ہند میں سخت بدنظمی پھیل گئی اور برطانوی بالادستی کو ٹھیس لگی۔

اس ابتری اور تاراج کے زمانے میں نواب سکندر جاہ والی ریاست حیدرآباد نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے مدنظر ہلکر اور سندھیا سے نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ سر جارج بارلو نے دربار حیدرآباد کی سیاست پر اپنا اثر قایم رکھنے کے لئے اصرار کیا کہ اعظم الامرا کے انتقال کے بعد جنھوں نے تیس سال تک دولت آصفیہ کی مدار المہامی کے فرائض بڑی قابلیت اور وفاداری سے انجام دیئے تھے میر عالم کا تقرر کیا جائے جو انگریزی حکومت کا دوست اور ہوا خواہ تھا۔ چنانچہ شروع میں تو نواب سکندر جاہ نے کچھ عذر کیا لیکن جب انگریزی حکومت اڑی رہی تو مجبوراً انھوں نے میر عالم کو اپنا مدار المہام بنا لیا۔ سر جارج بارلو نے اس موقع پر ریاست حیدرآباد کے مدار المہام کے تقرر کے متعلق مداخلت کی جو بالکل اندرونی انتظامی معاملہ تھا اور جس کا براہ راست تعلق معاہدوں کے بموجب سرکار نظام کی ذات سے تھا۔ میر عالم کی انگریز پرستی کے باعث ریزیڈنٹ کا عمل دخل ریاست حیدرآباد کے اندرونی انتظامی معاملات میں بھی شروع ہو گیا۔

پونا کے معاملات میں بھی سر جارج بارلو نے عدم مداخلت کے اصول کو خیر باد کہا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر پیشوا کو اس کا موقع دیا گیا کہ وہ معاہدہ بسین کی شرطوں کی پابندی اپنے اوپر سے اٹھا لے تو اس کا نتیجہ مرہٹہ سیاست کی سخت پیچیدگی اور عدم توازن کی شکل میں برآمد ہوگا۔ پیشوا وسط ہند کے بعض علاقوں میں اپنا اقتدار منوانا چاہتا تھا جو معاہدہ بسین کے خلاف تھا۔ اگرچہ مجلس نظما چاہتی تھی کہ برطانوی حکومت ہند اپنے آپ کو مرہٹہ سیاست سے بالکل بے تعلق کر لے اور پیشوا کی مرہٹہ برادری کے سرپنچ کی حیثیت بحال کر دی جائے لیکن سر جارج بارلو نے معاہدہ بسین میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے انکار کیا اور مجلس نظما سے باادب درخواست کی کہ وہ ایسا کرنے پر اصرار نہ کرے اس لئے کہ اگر پیشوا کی مرکزیت پھر قایم ہو گئی تو انگریزی مفاد کو آئندہ سخت صدمہ پہنچے گا۔

لارڈ ولزلی کی توسیع مملکت کی حکمت عملی کی وجہ سے کمپنی کا مالیہ بہت زیر بار

ہوا تھا اور حکومت ہند کا قرض بہت کافی بڑھ گیا تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ولزلی کے عہد میں جو الحاقات ہوئے ان کی سالانہ آمدنی بہت کافی تھی لیکن اس وقت اچانک کمپنی کی مالیات کا توازن بگڑ گیا تھا۔ سر جارج بارلو نے حکومت کے اخراجات میں تخفیف کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے میزانیہ میں بجائے خسارہ کے اخراجات پورے کرنے کے بعد فاضل رقم بچنے لگی۔ سر جارج بارلو نے حکومت کی مالیات کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قایم کر دیا کہ آئندہ بیس سال تک اس میں کوئی کمزوری نہیں ہوئی۔ کٹک، بندیلکھنڈ اور دوآبہ کے ضلعوں کے نظم و نسق میں بھی اصلاح کی گئی۔

ویلور کی بغاوت

جولائی ۱۸۰۶ء میں ویلور کے مقام پر انگریز افسروں کے خلاف ہندوستانی سپاہ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ احاطہ مدراس میں فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ سپاہی لوگ قواعد پریڈ کے وقت تلک وغیرہ کی مذہبی نشانیاں پیشانی پر نہ لگایا کریں۔ داڑھی منڈانے اور مونچھوں کی خاص تراش کے متعلق بھی قاعدے بنا دئے گئے۔ سپاہیوں کے لئے جو نئی وضع کی پگڑی تجویز کی گئی تھی وہ انگریزی ہیٹ سے بہت کچھ مشابہ تھی۔ سپاہیوں کو اندیشہ ہوا کہ انگریز ان کے دھرم کو بگاڑنا چاہتے ہیں اور یہ سب کارروائیاں انھیں آئندہ عیسائی بنانے کا پیش خیمہ ہیں چنانچہ وہ بگڑ گئے اور بغاوت کر کے ایک سو تیرہ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ ارکاٹ سے انگریزی فوج نے موقع پر پہنچکر فساد فرو کر دیا۔ چھ سو سپاہیوں کو قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ بعد میں لارڈ منٹو نے جب وہ گورنر جنرل ہو کر آیا تو انھیں ملازمت سے خارج اور آئندہ کے لیے ممنوع الخدمت قرار دیا۔ اس زمانہ میں ویلور میں ٹیپو سلطان کے لڑکے رہتے تھے۔ انگریزی حکومت کو شبہہ ہوا کہ شاید ان کے بھڑکانے سے یہ فساد ہوا۔ چنانچہ انھیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں مدراس میں بینٹنگ گورنر تھا۔ اس کو اور فوج کے

Thornton, History of the British Empire in India, Vol. IV p. 62-4, ۱۔

کمانڈر سر جان کریڈیک کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ بنٹنگ نے اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا اور بتایا کہ اس تمام معاملہ کا اس سے تعلق نہ تھا۔ لیکن مجلس نظماء نے انگلستان کی رائے عامہ سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا اس لئے[1] وہ اس پر قایم رہی۔

اس اثناء میں انگلستان کی سیاست میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ مسٹر پٹ کے انتقال اور قدامت پسند جماعت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہگ جماعت نے اپنی حکومت قایم کر لی تھی۔ اگرچہ سر جارج بارلو کا تقرر عارضی تھا لیکن بعد میں مجلس نظماء کی سفارش پر قدامت پسند وزارت نے اس کو مستقل کر دیا۔ لبرل وزارت نے اس حق کی رو سے جو پٹ کے قانون کی بدولت اس کو حاصل تھا مجلس نظماء کی رائے کو رد کر کے لارڈ منٹو کو جو بورڈ آف کنٹرول (مجلس نظمار) کا صدر تھا ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا۔

لارڈ منٹو کا عہد حکومت سنہ ۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء

لارڈ منٹو لبرل جماعت کا رکن تھا۔ جس وقت وارن ہیسٹنگز پر مقدمہ چلایا گیا تو اس نے اس میں دوسرے لبرل جماعت کے ارکان کی طرح حصہ لیا تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل وہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت سے سلطنت کے معاملات کا کافی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ لارڈ منٹو نے لبرل وزارت کی ہدایتوں کے بموجب ہندوستان کے والیان ملک کے معاملات میں عدم مداخلت کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ اس کے عہد میں کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی سر جارج بارلو کے زمانے میں مرہٹوں سے جو معاہدے ہوئے تھے ان پر منٹو نے عمل کیا۔ ولزلی کے عہد حکومت میں انگریزی راج کی حدود کی جو توسیع ہو چکی تھی اس سے آگے قدم بارلو اور منٹو نے نہیں بڑھایا۔ منٹو کو اپنے عہدے کا جائزہ لیتے ہی وسط ہند کی بدامنی کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس تمام ملک میں غارت گری کا دور دورہ تھا۔ بندیلکھنڈ کے بعض علاقے معاہدہ بیسن کے بعد کمپنی کے

[1] Thornton, History of the British Empire in India, Vol. IV p. 116.

زیر اقتدار آ گئے تھے۔ لارڈ منٹو نے وسط ہند کی بدامنی دور کرنے کی کوشش کی۔ اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں پر ایسے سرداروں نے قبضہ جما لیا تھا جو لٹیروں کے حامی اور انگریزی حکومت کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جنرل لیک نے سر جارج بارلو سے ان دونوں قلعوں پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی لیکن اس کو یہ اجازت نہیں دی گئی۔ مگر اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں پر جو سردار قابض تھے انھوں نے لٹیروں کے سرغنوں سے مل کر آس پاس کے برطانوی ضلعوں پر قبضہ کر لیا۔ بندیلکھنڈ کی بدامنی کے مضر اثرات اب آہستہ آہستہ دوآبہ تک پہنچنے لگے تھے اور جمنا کی جنوبی سرحد محفوظ نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں کے خلاف فوج کشی کا حکم دے دیا۔ یہ دونوں قلعے چھین لئے گئے۔ بندیلکھنڈ کے بہت سے دوسرے سرداروں نے انگریزوں کی اس کامیابی سے متاثر ہو کر کمپنی کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے تمام جھگڑوں میں انگریزی حکومت کو ثالث تسلیم کر لیا۔ پنڈاریوں کے سردار امیر خاں نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جب بھونسلا راجا کے جنوبی حصوں پر حملہ بول دیا تو منٹو نے باوجود اس کے کہ راجا نے اپنے آپ کو عہد معاونت کی شرطوں سے علاحدہ کر لیا تھا انگریزی فوج اس کے خلاف روانہ کی۔ امیر خاں اپنے لشکر کو واپس لے گیا اور معاملے نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ منٹو نے بھی بڑی احتیاط برتی اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ امیر خاں کے ہلکر سے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ مرہٹوں سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب ہلکر نے امیر خاں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا تو منٹو نے اعتدال پسندی کے اصول کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی فوج مرہٹہ علاقے سے واپس بلالی۔

رنجیت سنگھ سے معاہدہ

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد پنجاب بدنظمی کا شکار ہو گیا۔ اس بدنظمی سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان کے ایک سردار چرت سنگھ اور اس کے بیٹے مہا سنگھ نے اپنی قوت بڑھا کر ستلج تک کے علاقوں پر اپنی حکومت قایم کر لی۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں ستلج پار کے پٹیالہ اور نابھا کے راجاؤں میں آپس

میں جھگڑا شروع ہوا تو رنجیت سنگھ نے مداخلت کا اچھا موقع دیکھا اور ستلج پار جا کر دونوں سے اپنا اقتدار منوایا اور اپنا باجگذار بنایا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ جمنا اور ستلج کے کل علاقے پر اپنا اقتدار منوانا چاہتا تھا۔ مغلوں کی کمزوری کے زمانے میں سندھیا کے فرانسیسی جنرل پیرون نے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے پر جو سرہند کہلاتا تھا مرہٹوں کا حلقۂ اثر قایم کر لیا تھا۔ ولزلی کے زمانے میں جب سندھیا کو انگریزوں نے شکست دی اور دلی کو اپنے تحت کر لیا تو قدرتی طور پر سرہند کے علاقے پر بھی انگریزی اثر قایم ہو گیا جب رنجیت سنگھ نے پٹیالہ اور نابھا کے معاملات میں مقتدر قوت کی حیثیت سے مداخلت کی تو یہاں کے راجاؤں نے مٹکاف کو جو دلی میں انگریزی ریزیڈنٹ تھا اس طرف متوجہ کیا اور حفاظت کے لیے اپیل کی۔ لارڈ منٹو کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ رنجیت سنگھ نے بھی اس دوران میں براہ راست گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ جمنا اور ستلج کے درمیان کا علاقہ میرے تحت ہے اس پر میرا قبضہ رہنے دیا جائے۔ اب منٹو کو یہ اہم فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ مجلس نظما کی ہدایتوں کے مطابق اس معاملے میں بھی بے تعلقی ظاہر کرے اور اس طرح رنجیت سنگھ کو سرہند پر اقتدار قایم کرنے دے یا یہ کہ سرہند کی ریاستوں کو برطانوی حمایت میں لے اور رنجیت سنگھ کو پنجاب کی سرحد سے باہر اپنا حلقۂ اثر وسیع نہ کرنے دے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو رنجیت سنگھ کے لئے ممکن ہوتا کہ وہ برطانوی سرحد سے بہت قریب اپنی فوج کے مرکز قایم کر لے۔ لیکن منٹو نے بڑی دلیری اور ہوشمندی سے کام لیا۔ اس نے رنجیت سنگھ سے گفتگو کے لئے مٹکاف کو بھیجا جو اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں میں قابل ترین افسر تھا۔ رنجیت سنگھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ سنہ ۱۸۰۷ء میں تلسٹ میں نپولین اور بادشاہ روس میں جو معاہدہ ہوا ہے اس میں بعض خفیہ شرطیں فرانسیسیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے میں سہولتیں بہم پہنچانے کے متعلق رکھی گئی تھیں۔ چنانچہ لارڈ منٹو کو اس ضمن میں بورڈ آف کنٹرول سے ہدایتیں ملی تھیں کہ وہ ہندوستان کی سرحد کے حکمراؤں سے مدافعانہ معاہدے کرنے کی کوشش کرے۔ رنجیت سنگھ نے ان حالات میں خیال کیا کہ وہ اس شرط پر

فرانسیسیوں کے خلاف اتحاد میں شرکت کرے گا کہ اس کو ستلج پار کی ریاستوں میں مداخلت کا حق دیا جائے۔ لیکن اس دوران میں نپولین کی تمام تر توجہ جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال کی طرف ہو گئی جس کی وجہ سے مشرقی سیاست کی صورت حال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور برطانوی شہنشاہیت کو جو خطرہ لاحق تھا وہ کم ہو گیا۔ چنانچہ مٹکاف نے رنجیت سنگھ سے لاہور میں گفت شنید شروع کی تو مشرق میں برطانوی سیاسی حیثیت نسبتاً بہتر ہو چکی تھی جب رنجیت سنگھ کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی کہ وہ انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں کے خلاف اتحاد میں اس وقت شریک ہوگا جبکہ انگریزی حکومت ستلج پار کی ریاستوں پر اس کے سیاسی تسلط کو تسلیم کرے تو مٹکاف نے صاف کہہ دیا کہ برطانوی حکومت نے اس کو اس شرط کے قبول کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے۔ مٹکاف نے برطانوی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ستلج پار کی ریاستیں برطانوی حلقۂ اثر میں آچکی ہیں اور برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ اس حلقۂ اثر کو برقرار رکھے۔ رنجیت سنگھ اس پر خفا ہوا اور ستلج پار کر کے اس علاقے کے بعض معاملوں کا تصفیہ کرنے کیلئے تین مہینے وہاں ٹھہرا رہا۔ مٹکاف اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ منٹو نے اس موقع پر ہمت اور استقلال سے کام لیا اور کرنل آکٹرلونی کے تحت جمنا کے پار لدھیانہ کی چھاونی کو مزید انگریزی فوج بھیجدی گئی تاکہ اگر جنگ کی نوبت آئے تو رنجیت سنگھ کے اچانک حملے کی مدافعت کی جا سکے۔ رنجیت سنگھ نے دیکھا کہ منٹو نے عدم مداخلت کی حکمت عملی کو خیرباد کہہ دیا ہے اور وہ مقابلہ کے لئے تیار ہے تو اس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء امرتسر میں ایک معاہدہ پر دستخط کر دئے جس کی رو سے وہ رضامند ہو گیا کہ ستلج پار کی ان ریاستوں پر اپنا تسلط قایم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا جو برطانوی حمایت میں آچکی ہیں۔ ان میں نابھا، پٹیالہ اور جیند کی بڑی ریاستوں کے علاوہ سولہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں یا زمینداریاں شامل تھیں برطانوی حکومت رنجیت سنگھ کے علاقے کے یا اس کی رعایا کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی اور اس کو ستلج کے شمال کے مقبوضات کا جائز حکمران

تسلیم کرے گی۔ رنجیت سنگھ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر کوئی یورپین قوت پنجاب کے راستے سے ہندوستان پر حملہ آور ہوگی تو وہ انگریزوں کی مدد کرے گا۔ اس معاہدہ کے بموجب انگریزوں کی شمال مغربی سرحد بجائے دریائے جمنا کے دریائے ستلج قرار پائی۔ لدھیانہ میں انگریزی فوج کی تعداد بڑھادی گئی اور وہ انگریزوں کی سب سے بڑی شمال مغربی چھاؤنی بن گیا۔

افغانستان کی سفارت

فرانس اور روس کے ۱۸۰۷ء کے اتحاد سے حکومت ہند کو قدرتی طور پر یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر نپولین نے مشرق میں برطانوی شہنشاہی کے خلاف خشکی کے راستے سے پیشقدمی کی تو وہ افغانستان میں سے ہوکر ضرور گزرے گا۔ چنانچہ منٹو نے الفنسٹن کے تحت کابل کو ایک سفارت روانہ کی تاکہ شاہ شجاع والیٔ افغانستان سے مداخانہ معاہدہ طے کرے۔ لیکن اس زمانے میں افغانستان اندرونی خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ شاہ شجاع پیشتر اس کے کہ انگریزی حکومت سے کوئی معاہدہ کرے مالی امداد کا طالب ہوا۔ الفنسٹن نے حکومت ہند کو سفارش کی کہ دس لاکھ روپیہ اسے دے دیا جائے تاکہ شاہ شجاع نئی فوج بھرتی کرکے اپنے اقتدار کو مستحکم کرسکے۔ لیکن چونکہ فرانسیسی حملے کا خطرہ اب جاچکا تھا اس لئے لارڈ منٹو اس رقم کو گوارا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ شاہ شجاع کو اپنے بھائی کے ہاتھوں سخت شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھاگ کر ہندوستان میں پناہگزیں ہوا۔ الفنسٹن کے کہنے کے مطابق اس وقت حکومت ہند دس لاکھ روپے دیدیتی تو اس کا قوی امکان تھا کہ شاہ شجاع شکست نہ کھاتا اور حکومت ہند اس تین کروڑ روپیے کے بار سے بچ جاتی جو تیس سال بعد شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کے لئے اسے برداشت کرنا پڑا اور جس کی وجہ سے اس کی نیک نامی اور وقار پر حرف آیا۔ الفنسٹن کی سفارت کا بس اتنا کارنامہ کہا جاسکتا ہے کہ خود اس نے افغانستان کے دوران قیام میں اس ملک کی تاریخ کے متعلق کافی مسالا جمع کرلیا۔ اس سے پہلے انگریزی میں اور کوئی مستند کتاب افغانستان کے متعلق موجود نہ تھی۔

ایران کی سفارت

ایران میں فرانسیسی سفارت کچھ عرصے سے انگریزی مفاد کے خلاف جوڑ توڑ کر رہی تھی۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے مالکم کو ۱۸۰۸ء میں روانہ کیا۔ مالکم فارسی جانتا تھا اور ولزلی کے عہد میں وہ پہلی مرتبہ سفارت پر ایران گیا تھا تو وہاں اس نے اپنے حسن اخلاق سے کافی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ ادھر انگلستان کے محکمۂ خارجہ نے سر ہارفرڈ جونس کو سفارت کے لئے منتخب کیا۔ سر ہارفرڈ جونس برطانوی حکومت کی جانب سے بوشہر میں قونصل کی خدمت انجام دے چکا تھا اور ایران کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب وہ انگلستان سے بمبئی پہنچا تو لارڈ منٹو نے اس کو ہدایت کی کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ مالکم کی سفارت کا نتیجہ نہ معلوم ہو جائے۔ اس دفعہ مالکم کی سفارت کو دربار ایران میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ ولزلی کے عہد میں اس کی پہلی ایرانی سفارت کو ہوئی تھی۔ فرانسیسی سفیر نے شاہ ایران کے پاس بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کے مشورہ پر مالکم کو شیراز سے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ مالکم کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور وہ اپنے عملے کے ساتھ ہندوستان واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کے بعد سر ہارفرڈ جونس طہران گیا۔ مالکم نے لارڈ منٹو کو مشورہ دیا کہ حکومت ایران آجکل پوری طرح سے فرانسیسی اثر میں ہے۔ اس کا ردعمل حکومت ہند کی جانب سے یہ ہونا چاہئے کہ خلیج فارس میں فوجی مظاہرہ کیا جائے اور بعض جزیروں پر قبضہ کرنے کی دھمکی دی جائے۔ سر ہارفرڈ جونس کو حکومت ہند نے تاکیدی احکام روانہ کئے کہ وہ فوراً ایران سے واپس چلا آئے لیکن اس کو چونکہ حکومت انگلستان نے سفارت پر بھیجا تھا اس لئے اس نے باوجود حکومت ہند کے احکام کے شاہ ایران سے ایک معاہدہ کیا کہ فرانسیسی سفارت طہران سے رخصت کر دی جائے گی اور پیرس سے سفیر ایران کو واپس طلب کر لیا جائے گا۔ منٹو نے حکومت ایران کو مطلع کیا کہ حکومت ہند سر ہارفرڈ جونس کی سفارت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کے ساتھ مالکم کو پھر دوبارہ طہران روانہ کیا تاکہ وہ اس معاہدہ کی

حکومت ہند کی طرف سے تصدیق کرے جو سرہارفرڈ جونس نے طے کیا تھا۔ سرہارفرڈ جونس اور مالکم میں آپس میں رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جس کی بنا پر حکومت انگلستان نے ان دونوں کو ایران سے واپس جانے کا حکم دے دیا اور دربار ایران میں سرگور آوزلے کو مستقل سفیر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت سے ایران کے ساتھ سیاسی تعلقات کا تعین بڑی حد تک حکومت ہند کے بجائے انگلستان کا محکمہ خارجہ کرنے لگا۔

سندھ کی سفارت

لارڈ منٹو نے تیسری سفارت سندھ روانہ کی جو ہندوستان کی مغربی سرحد پر فوجی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے یہ کوشش کی جا چکی تھی کہ سندھ کی حکومت کمپنی سے تجارتی تعلقات استوار کرلے لیکن اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ منٹو کے عہد حکومت میں سندھ میں غلام علی اکرم علی اور مراد علی یہ تینوں بھائی مختلف علاقوں پر حکمران تھے اور امیران سندھ کہلاتے تھے۔ سندھ کی سرحد مملکت ایران سے ملی ہوئی تھی اور اکثر سرحدی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ کچھ عرصے سے حکومت ایران برابر بلوچستان اور سندھ کی سرحد کے پاس اپنے مطالبے بڑھاتی جا رہی تھی۔ چنانچہ امیران سندھ کی خواہش پر لارڈ منٹو نے کپتان سیٹن اور مسٹر ہنگی اسمتھ کو سندھ روانہ کیا تاکہ وہ ان سے اتحاد کا معاہدہ طے کرے۔ بڑے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۳ راگست ۱۸۰۹ء کو یہ معاہدہ ہوا کہ امیران سندھ کا سفیر کلکتہ میں رہا کرے گا اور انگریزی سفیر امیران سندھ کے دربار میں حیدرآباد میں رہے گا۔ امیران سندھ نے وعدہ کیا کہ وہ کسی فرانسیسی کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھیں گے کمپنی کو سندھ میں تجارت کی بے روک ٹوک اجازت ہوگی۔

فرانسیسی مقبوضات

اس زمانے میں بحرالکاہل میں فرانسیسیوں اور ولندیزیوں (ڈچ) کی نوآبادیاں موجود تھیں۔ فرانس اور ہالینڈ میں جب لڑائی ہوئی تو اول الذکر نے ہالینڈ کی نوآبادیوں پر قبضہ کرلیا۔ جزیرہ ماریشس پر فرانسیسی حکومت کا پہلے سے قبضہ تھا۔ یہاں سے فرانسیسی جہاز راں انگریزی تجارتی جہازوں پر

بڑی آسانی سے حملے کرتے تھے اور مڈاگاسکر سے لے کر جاوا تک بحری نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالتے رہتے تھے۔ انگلستان کے تجارت پیشہ طبقے کی طرف سے وزارت وقت کو ان نقصانات کی جانب متوجہ کیا گیا جو انھیں فرانسیسی بحری قزاقوں سے برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس پر محکمۂ وزارت نے حکومت ہند کو اختیار دیا کہ وہ برطانوی تجارت کی حفاظت کے لیے مناسب تدبیر اختیار کرے۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے ایک زبردست بحری مہم ماریشس کے خلاف روانہ کی جس میں ۷۰ توپیں چڑھے ہوئے جہاز شریک تھے۔ تیرہ تین مستولوں کے جہاز اور ان کے علاوہ بے شمار چھوٹے جہاز اور توپیں چڑھی ہوئی کشتیاں تھیں۔ ان جہازوں پر گیارہ ہزار کا مسلح لشکر بھیجا گیا۔ فرانسیسی اس بحری مہم کی تاب نہ لا سکے۔ اور جزیرہ ماریشس کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

ماریشس پر قبضہ کرنے کے بعد مجلس نظار کی اجازت سے لارڈ منٹو نے جاوا کے خلاف بحری مہم بھیجی جس میں ۹۰ جہاز تھے جن پر بارہ ہزار کا لشکر کمانڈر ان چیف سر سیموول آک مٹی کے تحت حملہ کے لئے تیار تھا۔ اب تک حکومت ہند نے جتنی بھی بحری مہیں روانہ کیں ان میں یہ سب سے زبردست اور اہم تھی۔ خود لارڈ منٹو بطور رضا کار اس مہم میں شریک تھا۔ کرنل جلیسی نے پہلے ہٹا دیا اور پھر قلعہ کورنیلس کو ۲۶ اگست ۱۸۱۱ء فتح کر لیا جو سب سے زیادہ مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسی جنرل جان سین جسے جاوا کی مدافعت پر نپولین نے مامور کیا تھا جزیرہ کے مشرقی ساحل کی طرف بھاگ گیا لیکن جب اس نے کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو ہتھیار ڈال دئیے۔ جاوا کا نظم و نسق منٹو نے سر اسٹمفورڈ ریفلس کے سپرد کیا۔ مجلس نظما نے ہدایت کی تھی کہ جزیرہ جاوا کے تمام قلعوں کو فتح کرنے کے بعد مسمار کر دیا جائے اور انگریزی فوج سامان حرب دیسی باشندوں کو تقسیم کر کے اور جزیرے کو خالی کر کے ہندوستان واپس چلی آئے لیکن منٹو نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس وقت تک جب تک کہ یورپ میں صلح نہ ہو جائے منٹو نے مناسب خیال کیا کہ جاوا کو انگریزی حکومت کے ماتحت رہنے دے۔ ۱۸۱۴ء میں یورپ میں صلح ہونے کے بعد ڈچ لوگوں کو جب ان کے

مشرقی مفتوحات دے دیئے گئے تو سوائے جنوبی افریقہ کے کیپ کے باقی انھیں واپس دے دیئے گئے جن میں جاوا شامل تھا۔

ٹراونکور کی بغاوت

۱۸۰۸ء میں ٹراونکور کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل میکالے اور وہاں کے دیوان ویلو تمپی میں اس امر پر اختلاف ہوا کہ راجا ٹراونکور نے جو اپنی ذاتی فوج بھرتی کی ہے آیا ریاست میں حمایتی فوج کے ہوتے ہوئے اس کی کوئی ضرورت باقی بھی ہے یا نہیں چونکہ حمایتی فوج کے ضمن میں انگریزی حکومت کو جو سالانہ رقم واجب الادا قرار پائی تھی وہ کئی سالوں سے ادا نہیں ہوئی تھی اس لئے ریزیڈنٹ نے راجا اور دیوان پر زور دیا کہ حمایتی فوج کے علاوہ اور دوسری فضول فوج برطرف کردی جائے تو رقم کی ادائی ریاست کے خزانہ کے لئے آسان ہو جائے گی۔ ریزیڈنٹ نے راجا سے دیوان کی شکایت کی کہ جان بوجھ کر حمایتی فوج کے سلسلے میں جو رقم مقرر کی گئی ہے اس کی ادائی میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اس واسطے اس کو دیوان عہدہ سے الگ کر دیا جائے۔ راجا اس پر بادل ناخواستہ آمادہ ہوگیا لیکن دیوان ویلو تمپی نے ٹراونکور کی نائروں کی فوج کو ملا لیا اور اس زمانے میں اتفاق سے چند فرانسیسی بھی جو ٹراونکور میں موجود تھے انھوں نے بھی اس قسم کی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھوں نے یہ خبر مشہور کردی کہ اگر ہم تھوڑے دن انگریزوں کا مقابلہ کرلیں تو بہت جلد ہمیں سمندر کے راستے سے فرانسیسی کمک پہنچ جائے گی۔ کرنل میکالے نے مدراس سے مزید فوجی امداد طلب کی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ امداد پہنچے نائروں نے رات کے وقت ریزیڈنٹ کے مکان کو گھیرنے کی کوشش کی تاکہ اس کو قتل کر دیا جائے اور وہ چھپ کر دریا کے راستہ سے بھاگ گیا لیکن تیس انگریز سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ دیوان ٹراونکور نے جب دیکھا کہ اب انگریزی فوج کا مقابلہ کرنا ہوگا تو اس نے کوچین کے دیوان سے فوجی امداد طلب کی چنانچہ اس نے امداد بھیجی۔ حمایتی فوج کے کماندار کرنل شائرس نے

لے Thornton, History of the British Empire in India, Vol IV p. 148.

جب ٹراونکور پر حملہ کیا تو دیوان کی فوج نے پانچ گھنٹے تک مقابلہ کیا لیکن اسکے بعد اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دیلو تمپی کوچین بھاگ گیا۔ انگریزی فوج نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نے اپنے آپ کو حوالے کرنے کے بجائے خودکشی کر لی۔ انگریزی حکومت نے راجا کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ ایک دوسرا دیوان مقرر کر دیا جس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا کہ وہ انگریزی مفاد کے خلاف نہ جائے گا ٹراونکور اور کوچین کو عارضی طور پر گورنر مدراس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

منٹو کے گورنر جنرل ہونے کے بعد مجلس نظما نے سر جارج بارلو کو مدراس کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس نے تخفیف مصارف کے جوش میں انگریز فوجی افسروں اور سپاہیوں کے بھتہ میں کمی کر دی جس کی وجہ سے سرنگاپٹم اور حیدرآباد کی فوج بگڑ گئی اور عدول حکمی پر اتر آئی۔ مالکم اور دوسرے افسروں نے سر جارج بارلو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے حکم کو واپس لے لے لیکن اس نے بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا اور حکم کو واپس لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ لارڈ منٹو معاملہ کی تحقیقات کیلئے خود مدراس آیا۔ تحقیقات کے بعد سوائے اکیس افسروں کے باقی سب کو عام [illegible]

انگلستان میں پارلیمنٹ میں سر جارج بارلو پر سخت تنقیدیں کی گئیں اور حکومت برطانیہ کی اس پالیسی سے اختلاف کیا گیا کہ کمپنی کے اعلیٰ عہدوں پر ایسے لوگوں کو مقرر کیا جائے جنھوں نے ادنیٰ عہدوں سے ترقی کی ہو اس واسطے کہ ایسے اشخاص باوجود اپنی قابلیت کے بھی وہ عزت نہیں حاصل کر سکتے جو انگلستان کے اعلیٰ خاندان کا شخص حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ سر جارج بارلو کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔

۱۸۱۳ء کا قانون منشور

۱۸۰۸ء میں دارالعوام کی ایک مجلس تحقیق مقرر کی گئی تاکہ کمپنی کی مالی حالت اور دوسرے اہم امور کی نسبت تحقیقات کر کے پارلیمنٹ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ برابر چار سال کی چھان بین کے بعد اس مجلس نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں ہندوستانی مقبوضات کے طریق مالگزاری، عدالتی اور پولیس کے انتظام کے متعلق نہایت مفصل اور مفید معلومات جمع کر دی گئی تھیں۔ انگلستان کا تجارت پیشہ طبقہ کمپنی کے ہندوستانی ٹھیکہ کا سخت مخالف تھا۔ کمپنی کے نظار کی یہ کوشش تھی کہ بلا شرکت غیرے ہندوستان

کی تجارت کا ٹھیکہ انھیں کے پاس رہے۔ نپولین اعظم نے یورپ کی بیشتر بندرگاہوں میں انگریزی مال کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی؛ اس لئے انگریزی مال کی نکاسی بہت کم ہو گئی تھی اور انگلستان کے تجارت پیشہ لوگوں کے لئے سخت پریشانی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکہ کی تجدید کا زمانہ آیا تو انگلستان کے صنعتی شہروں کی طرف سے پارلیمنٹ کے سامنے محضر پیش کئے گئے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کی تجارت کا دروازہ بلا مزاحمت تمام انگریز تاجروں کے لئے کھول دیا جائے کہ بغیر اس کے ملک کی صنعت کی ترقی ممکن نہیں کمپنی کے نمائندوں نے اپنے مفاد و مراعات کو بچانے کی ہر چند کوشش کی اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ بغیر تجارتی ٹھیکہ کے کمپنی ہندوستان کی سیاسی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی لیکن پارلیمنٹ رائے عامہ سے مجبور تھی۔ اس مسئلہ پر بہت بحث ہوتی رہی۔ تجربہ کار لوگوں کی شہادتیں قلمبند کی گئیں۔ بوڑھے وارن ہسٹنگز نے بھی دارالعوام کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی کہ اگر انگریز تاجروں کو بے روک ٹوک ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تو اس کے نتیجے انگریز قوم کے لیے بہت برے نکلیں گے۔ سرجان شور، سرجان مالکم اور سرٹامس منرو جیسے تجربہ کار اور کارواں حاکموں نے بھی وارن ہیسٹنگز کی تائید کی لیکن انگلستان کی معاشی حالت کا اقتضایہ تھا کہ ہندوستان سے ساتھ تجارت کرنے کی عام اجازت ہونی چاہیے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ ہر بھیج جو اور دولت جو کو ہندوستان جانے کا موقع نہیں دینا چاہیئے بلکہ قیدیں لگانی چاہئیں اور صرف باعزت اور ذی وجاہت لوگوں کو ہندوستان جاکر تجارت کرنے کی اجازت دینی چاہیئے۔ اس ضمن میں مسیحی مبلغین کا معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ ولزلی اور خاصکر لارڈ منٹو نے اپنے عہد حکومت میں مسیحی مبلغین کی سرگرمیوں کو اچھا نہ سمجھا۔ منٹو نے ۱۸۰۸ء میں ایک عرضداشت کے ذریعہ سے صدر مجلس نظماء کو ان خطروں سے آگاہ کیا تھا جو ہندوستان میں مسیحی تبلیغ کے عام کرنے سے انگریزی حکومت کے لئے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مسیحی مبلغین کے حامیوں نے اس وقت جبکہ کمپنی کے مراعات کی تجدید کا مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش تھا اپنے مطالبات

پیش کئے اور کمپنی کی حکومت کا یہ فرض ٹھہرایا کہ وہ مسیحی تبلیغ کی ہندوستان میں ہر ممکن طور پر ہمت افزائی کرے۔ غرضکہ سمجھوتا اس پر ہوا کہ کمپنی کی حکومت مسیحیت کے پرچار کرنے والوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی اور انھیں اپنا کام کرنے کی آزادی رہے گی۔ کمپنی کی طرف سے جو شہادتیں مجلس تحقیقات کے سامنے دی گئیں ان سب میں پادریوں اور نجی تاجروں کے ہندوستان میں بے روک ٹوک گھس پڑنے کی سخت مخالفت کی گئی کئی سال بحث کے بعد ۱۸۱۳ء میں قانون منشور منظور ہوا جس کی اہم دفعات یہ ہیں۔

انگلستان کے تاجر براہ راست کمپنی کے توسط سے ہندوستان سے درآمد و برآمد کر سکیں گے۔ ہندوستان کی تجارت میں صرف چاء کی تجارت کا کمپنی کے پاس ٹھیکہ رہے گا چین کی کل تجارت پر کمپنی کا ٹھیکہ بدستور برقرار رہے گا۔ بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) سیاسی امور کے علاوہ کمپنی کے تجارتی معاملات کی بھی نگرانی کرے گا۔ کمپنی اپنی آمدنی میں سے ½ ۱۰ فی صدی منافع شرکائے کمپنی کو تقسیم کرے گی۔ مجلس نظما کو گورنر جنرل، کمانڈران چیف اور گورنروں کے تقرر کا حق حسب سابق حاصل رہے گا بشرطیکہ تاج کی رضامندی حاصل کر لی گئی ہو۔ وجی تعلیم کے نئے اڈس کمب کا مدرسہ رکھا جائے گا کوئی شخص اس وقت تک کمپنی کا محرر (رائٹر) مقرر نہ ہو سکے گا جب تک اس نے ہیلی بری کے مدرسہ میں چار میقاتیں نہ گذاری ہوں۔ یہ دونوں مدرسے بورڈ آف کنٹرول کے تحت ہوں گے۔ شاہی افواج بیس ہزار سے زیادہ سوائے غیر معمولی حالات کے ہندوستان نہ بھیجی جائیں گی جن کے خرچ کا بار کمپنی کے خزانہ پر رہے گا۔ حکومت ہند کو اختیار ہوگا کہ اپنی دیسی افواج کے لیے قاعدے اور ضابطے مقرر کرے جنگی سامان تیار کرائے اور ضرورت کے وقت کورٹ مارشل کا نفاذ کرے۔ پریسیڈنسیوں کی حکومت کو بورڈ آف کنٹرول کی منظوری لینے کے بعد اپنے علاقے کے باشندوں پر محصول لگانے اور نہ دینے کی صورت میں انھیں سزائیں دینے کا اختیار ہوگا۔ جو انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں رہنا چاہیں انھیں مجلس نظما سے اس کے لئے اجازت اور لائسنس حاصل کرنا ہوگا بغیر اس لائسنس کے وہ ہندوستان

میں سکونت اختیار کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ لائسنس لینے کے بعد بھی وہ ہندوستان میں رہنے کے اس وقت تک مجاز تصور کئے جائیں گے جب تک کہ انکا چال چلن اطمینان بخش رہے گا۔ ان پر ان شرطوں اور قیدوں کی پابندی لازمی ہوگی جو وقتاً فوقتاً ان پر عاید کی جائیں گی۔ اگر کوئی انگریز لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان چلا جائے گا تو اس پر ہندوستان کی عدالت میں کمپنی کی طرف سے مقدمہ چلایا جائے گا۔ وہ انگریز جو کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے شہروں کی حدود سے دس میل یا اس سے زیادہ فاصلہ پر سکونت اختیار کرنا چاہیں انھیں اپنے نام باقاعدہ عدالت میں رجسٹری کرانے ہوں گے۔ ہندوستان کے اہل علم کی ہمت افزائی اور تعلیمی ترقی کے لئے کمپنی کے میزانیہ میں سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم محفوظ کر دی جائے گی کلکتہ میں انگلی کن کلیسا کا ایک بشپ مقرر کیا جائے گا جس کے تحت تین آرچ ڈیکن ہوں گے۔ ان کلیسائی عہدہ داروں کی تنخواہیں کمپنی کے خزانہ سے ادا کی جائیں گی۔ پادری جو کمپنی کے مقبوضات میں سکونت اختیار کرنا چاہتے ہوں انھیں بھی لائسنس حاصل کرنے ہوں گے۔ انھیں اجازت ہوگی کہ دیسی لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو سدھارنے کے لئے انھیں ایسے علوم و فنون کی تعلیم دیں جو انکے لئے مفید ہوں۔ قانون منشور کی ایک دفعہ میں اس امر کی توثیق کی گئی ہے کہ کمپنی اہل ہند کے مذہبی معاملات میں پوری آزادی کے اصول کو تسلیم کرتی ہے اور کسی خاص مذہب کی موافقت میں جانبداری کا اظہار نہیں کرے گی اور اس کو مسیحی مبلغین کے کام سے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔

لارڈ منٹو اگرچہ عدم مداخلت کی حکمت عملی کا حامی تھا لیکن ہندوستان کے مخصوص حالات میں اس نے اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کی۔ اس نے مجلس نظماء کو یہ یقین دلا دیا کہ ہندوستان میں انگریزی قوت یا سیاسی اقتدار کو گھٹا کر یہ امید رکھنا عبث ہے کہ قیام امن کی کوئی صورت ممکن ہے۔ اس نے عدم مداخلت کو ایسی صورت میں کبھی روا نہ رکھا جبکہ انگریز قوم کی عزت پر حرف آنے کا اندیشہ ہو یا قومی نقصان ہوتا ہو۔ اس نے ٹراونکور، بندیلکھنڈ، سرہند اور ناگپور کے

جنوبی علاقوں پر پنڈاریوں کی یورش کے موقع پر قوت فیصلہ کا ثبوت دیا جو ایک ماہر نظم و نسق کے لئے از حد ضروری ہے۔ ہنٹو کی عادات سادہ تھیں اور وہ دلی کی شان و شوکت کو ور اس اہتمام کو جو گورنر جنرل کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے مضحکہ خیز سمجھتا تھا۔ اپنے ایک خط میں گورنر جنرل کی زندگی کا اس نے اس طرح سے نقشہ کھینچا ہے "کلکتہ میں میں نے جو پہلی رات گزاری تو میرے کپڑے پہننے کے کمرہ میں چودہ ڈھیلے ڈھالے سفید کپڑے پہنے ہوئے شخص موجود تھے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ان میں سے چند خواتین ہوتیں۔ جب میں نے دیکھا کہ جتنے اشخاص ہیں اتنے ہی صافے اور داڑھیاں ہیں تو میری دلی تمنا تھی کہ یہ داڑھی والی خادمائیں رخصت ہو جائیں۔ چنانچہ انہیں علحدہ کرنے میں مجھے بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی۔ اور اب مجھے اپنے کمرہ میں تنہائی میسر ہے اگرچہ پوری طرح سے نہیں۔ دروازے کھلے رہتے ہیں لیکن بعض اشخاص برابر اپنی نظر مجھ پر رکھتے ہیں۔ جب میں بستر میں ہوتا ہوں تو بھی میری نگرانی کی جاتی ہے۔ کمروں کے درمیان جو گزرگاہ ہے وہاں رات بھر کچھ لوگ پہرہ دیتے ہیں۔ تمام کمروں اور زینوں پر باڈی گارڈ کے سپاہی رہتے ہیں میں اپنے کمرہ سے ذرا ادھر اُدھر نکلا یا زینے پر گیا تو ہر طرف سے باقاعدہ فوجی سلاموں کی بھرمار ہونے لگتی ہے۔ چار پانچ آدمی سامنے ڈنڈے لئے ہوئے چلتے ہیں۔ اس قسم کی تکلیف دہ حماقتوں میں سے اکثر کو میں نے ختم کر دیا ہے لیکن ابھی بہت سی ایسی حماقتیں باقی ہیں جن سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے اور جن کی وجہ سے راحت اور آسائش گھر سے رخصت ہو جاتی ہے[1]"۔

---

[1] Thompson and Garratt, Rise and fulfilment of British Power in India, p. 249

گیارھواں باب

مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد میں سلطنت برطانیہ کی توسیع اور لڑائیاں

سر جارج بارلو اور لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں جہاں تک ہو سکا حکومت ہند نے لڑائی بھڑائی سے بچ کر امن واماں قایم رکھنے کی کوشش کی تاکہ ولزلی کے عہد میں سلطنت کی جو توسیع عمل میں آئی تھی اس پر اکتفا کر کے اندرونی نظم ونسق کو مستحکم بنیادوں پر قایم کیا جائے۔ منٹو کی زیادہ تر توجہ فرانسیسیوں کے ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کرنے اور فرانسیسی اثر کو زائل کرنے کے لئے مختلف دیسی حکمرانوں سے سیاسی اتحاد قایم کرنے میں صرف ہوئی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد محسوس کیا کہ دیسی والیان ملک ایک ایک کر کے برطانوی اقتدار کے جوئے کو اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ راجپوت ریاستوں کو بارلو اور منٹو نے مرہٹوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ پیشوا نے اگرچہ ولزلی کے زمانے میں عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا لیکن وہ دوسرے مرہٹہ حکمرانوں سے انگریزوں کے خلاف سازباز میں برابر مشغول تھا تاکہ مناسب موقع آتے ہی عہد معاونت کی پابندیوں کو ختم کر دے۔ ہلکر کے دربار میں پنڈاریوں کے سرگروہ امیر خاں نے اپنے قدم جمائے تھے۔ خود ہلکر کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اور اس کی فوجی قوت بہت کافی کمزور ہو گئی تھی۔ سندھیا کی فوجیں اپنے ہمسایوں پر

دستبرد کر کے اپنی قوت کو بڑھا رہی تھیں۔ پنڈاری لوگ وسط ہند میں لوٹ مار میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر بنگال اور بہار کی شمالی سرحد پر نیپال کی نئی طاقت نے زور پکڑا تھا اور آہستہ آہستہ کم و بیش دو سو برطانوی گاؤں پر جو سرحد پر واقع تھے قبضہ کر لیا تھا۔ منٹو کے زمانے میں نیپالیوں کی پیش قدمی برطانوی علاقے میں بہت بڑھ گئی۔ لیکن منٹو فرانسیسیوں کے خلاف خارجی سیاست کی کارروائیوں میں ایسا گھرا رہا کہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکا۔ ان حالات میں گرکھوں کی ہمت اور بڑھی اور انھوں نے سرن اور گورکھپور کے علاقے میں ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جو نواب اودھ نے ۱۸۰۱ء میں ولزلی کے عہد میں کمپنی کو منتقل کیے تھے۔ منٹو نے ۱۸۱۳ء میں ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن نیپال کی حکومت نے انکار کر دیا۔ کئی سال کی متواتر فتوحات سے گرکھوں کے دل میں گھمنڈ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ انکاری جواب کلکتہ اس وقت پہنچا جبکہ مارکوئس آف ہیسٹنگز اپنے عہدہ کا جائزہ لے چکا تھا۔ چنانچہ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے تمام متعلقہ کاغذات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس معاملہ میں حکومت نیپال کی صریح زیادتی ہے۔ اگر اس قسم کی کارروائیوں کی فوراً روک تھام نہ کی گئی تو انگریزی حکومت کا ہندوستان میں وقار جاتا رہے گا اور اس کی سخت ذلت ہوگی۔ چنانچہ اس نے حکومت نیپال سے آخری مطالبہ کیا کہ جو علاقے اس نے دبائے ہیں وہ پچیس روز کے اندر واپس کر دئے جائیں۔ جب گرکھوں نے اس مطالبہ کی تکمیل نہ کی تو لارڈ ہیسٹنگز نے گورکھپور کے مجسٹریٹ کو یہ حکم بھیجا کہ متعلقہ علاقوں میں سے گرکھوں کو زبردستی نکال دیا جائے۔[1]

لارڈ ہیسٹنگز نے یکم نومبر ۱۸۱۴ء کو حکومت نیپال کے خلاف جب اعلان جنگ کیا تو کمپنی کی حکومت کا خزانہ خالی تھا۔ مجلس نظما کا اصرار تھا کہ سالانہ جتنا سونا ہندوستان سے انگلستان بھیجا جاتا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے کمپنی کی حکومت کی ساکھ اس زمانے میں اس قدر گری ہوئی تھی کہ لڑائی کے لئے

لہ ۔ Marshman, History of India, Vol II, p. 287.

قرض لینا بھی مشکل تھا۔ اس واسطے کہ بازار میں نقد روپیہ بارہ روپئے سیکڑے پر قرض مل سکتا تھا اور حکومت کی ہنڈیاں دس روپئے سیکڑے کا بٹہ کھا رہی تھیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز جانتا تھا کہ گرکھوں سے لڑائی آسان نہ ہوگی۔ جب اور کوئی تدبیر نہ سوجھی تو اس نے نواب اودھ کی طرف نظر دوڑائی جس کے پاس اس وقت سات کروڑ روپیہ نقد جمع تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز سے نواب نے شکایت کی تھی کہ ریزیڈنٹ اس کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مداخلت کیا کرتا ہے اس پر گورنر جنرل نے نواب کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس ضمن میں کوئی مناسب صورت اختیار کرے گا۔ چنانچہ اس نے ریزیڈنٹ میجر بیلی کو لکھا کہ آئندہ وہ نواب کے ساتھ معاملات کے میں احتیاط برتا کرے۔ اس پر نواب وزیر نے شکریے کے طور پر گورنر جنرل کی خدمت میں ایک کروڑ روپے گزرانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نواب سے ملنے کے لئے لکھنؤ روانہ ہو گیا لیکن ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ نواب کا انتقال ہو گیا۔ لکھنؤ پہنچنے پر نواب کے جانشین فرزند نے ایک کروڑ کا نذرانہ پیش کیا۔ لیکن کلکتہ کونسل نے لارڈ ہیسٹنگز سے بے پوچھے اس رقم میں سے نصف پرانے قرضے ادا کرنے میں صرف کر دیا چنانچہ لارڈ موصوف نے نواب سے ایک کروڑ روپیہ بطور قرض لیا تاکہ نیپال کے خلاف اپنے فوج کشی کے منصوبوں کو بروئے کار لا سکے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے تیس ہزار فوج اور ۶۰ بڑی جنگی توپیں حکومت نیپال کے خلاف روانہ کر دیں۔ انگریزی فوج نے نیپال پر چار طرف سے حملہ کیا۔ انگریزی فوج پہاڑی قلعوں پر قبضہ کرنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی چاہتی تھی کہ چار طرف سے حملہ کرکے گرکھا فوج کا دھیان بٹایا جائے۔ ایک مہم دریائے ستلج کی طرف سے دوسرا مہم مشرقی سرحد کی طرف سے نیپال کے صدر مقام کھٹمنڈو کی طرف بھیجی گئی۔ دو مہمیں درمیانی علاقوں میں سے بھیجی گئیں۔ سب سے پہلے جنرل جلیسپی ساڑھے تین ہزار فوج کے ساتھ کلنگا پر حملہ آور ہوا جو مشہور قلعہ تھا۔ اس نے توپ خانہ سے قلعہ کو فتح کرنے کے بجائے ہلہ بول کر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرکھوں نے جن کی فوج کی تعداد صرف تین سو تھی اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جس وقت

جنرل جلیسی اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کو قلعہ کے پھاٹک کے قریب تھا تو ایک گولی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس سانحہ کے بعد جنرل مارٹنڈل جنرل جلیسی کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر جے ٹوک کا محاصرہ کیا لیکن وہاں بھی اسکو کامیابی نہیں ہوئی۔ جنرل مارلے اور جنرل وڈ کے تحت جو فوجیں قلب نیپال میں گھس جانے کے لئے بھیجی گئی تھیں ان کو بھی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان ناکامیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ انگریزی فوجیں نیپال کے پہاڑی راستوں اور حالات سے بالکل ناواقف تھیں اس لئے انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ گرکھے بڑی بہادری سے لڑے جس کی لارڈ ہیسٹنگز کو توقع نہ تھی۔ اگرچہ اس نے بہت کافی کمک روانہ کی لیکن حالات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے سوچا کہ اگر جنگ میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی تو یہ سلطنت برطانیہ کی ذلت سمجھی جائے گی۔ چنانچہ اس کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے اس قسم کی اطلاعیں پہنچ رہی تھیں کہ اُن دیسی والیانِ ملک نے بھی جنھوں نے پہلے انگریزی اقتدار کو مان لیا تھا نیپال میں انگریزوں کی شکست کی خبر سن کر فوجی مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ پیشوا نے اپنی سربراہی میں سندھیا، رنجیت سنگھ اور امیر خاں کے پاس سفیر بھیجے تاکہ انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ معاہدے ہو جائیں۔ لیکن آپس کی بے اعتباری کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔

ان حالات سے لارڈ ہیسٹنگز بہت متفکر ہوا لیکن وہ اپنے ارادہ کا پکا تھا۔ اس نے جنرل اکڑلونی کو مزید کمک پہنچائی تاکہ وہ ستلج کی طرف سے گرکھوں کے سپہ سالار امر سنگھ کے خلاف پیشقدمی کرے۔ اکڑلونی نے بھی جنگلوں میں حصار بنانے کی تدبیر جنگ پر عمل کیا جس سے گرکھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ بجائے یلغار کرنے کے آتش بازی سے اس نے نالاگڑھ۔ ترا گڑھ۔ رام گڑھ اور ملوں کے مشہور قلعوں کو تسخیر کیا۔ نہایت صبر آزما اور محنت طلب حالتیں بڑی بہادری سے یہ فتحیں حاصل کی گئیں۔ برف باری کی یہ حالت تھی کہ توپوں کیلئے پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے راستہ نکالنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔ بڑی قابلیت سے اکڑلونی نے امر سنگھ کو اس قلعہ پر گھیر لیا

کہ کھٹمنڈو سے اس کو کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ امر سنگھ نے مجبور ہو کر مصالحت پر آمادگی ظاہر کی۔ اکٹرلونی نے اپنے دشمن کی بہادری کا خیال کر کے امر سنگھ کو اجازت دے دی کہ وہ قلعہ سے نکل جائے اور کھٹمنڈو جا کر دونوں حکومتوں میں مصالحت کی کوشش کرے۔ کھٹمنڈو میں اس زمانہ میں جو مجلس تولیت تھی اس نے اب محسوس کیا کہ اس کے پہاڑی قلعے ایک ایک کر کے انگریزوں کے ہاتھ میں چلے گئے تو اب سوائے اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں کہ مصالحت کر لی جائے چنانچہ سگولی کے مقام پر ۲ دسمبر ۱۸۱۵ء انگریزی حکومت کی طرف سے یہ شرائط پیش ہوئے کہ دریائے کالی کے مغربی علاقوں میں جو راجا اور زمیندار آباد ہیں ان پر حکومت نیپال کو اقتدار حاصل نہ رہے گا۔ سکم انگریزوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی ترائی میں جہاں جہاں گرکھوں نے قبضہ کر لیا ہے اس سے وہ دستبردار ہو جائیں گے اور یہ علاقے انگریزی حکومت کے تحت رہیں گے۔ کھٹمنڈو میں انگریزی ریزیڈنٹ رہا کرے گا۔ حکومت نیپال کے نمائندوں نے ان شرطوں پر سگولی میں دستخط کر دیے اور وعدہ کیا کہ مجلس تولیت سے باقاعدہ ان شرطوں کی توثیق کرا کے صلح نامہ کا مسودہ واپس کر دیا جائے گا۔ لیکن معہدۂ صلح نامہ واپس نہیں کیا گیا۔ امر سنگھ نے کھٹمنڈو میں مجلس تولیت کو مشورہ دیا کہ اہل نیپال کو زمین کے چپے چپے پر لڑنا چاہیے اور صلح نامہ کی توثیق کسی طرح مناسب نہیں۔ جب اس کی اطلاع لارڈ ہیسٹنگز کو ہوئی تو اس نے نیپال کی سرحد پر بیس ہزار فوج بطور کمک روانہ کر دی تاکہ جنرل اکٹرلونی کی قیادت میں کھٹمنڈو پر کاری ضرب لگائی جائے۔ چنانچہ جنرل اکٹرلونی نے گرکھوں کے دارالحکومت کی طرف پیشقدمی شروع کر دی اور وہاں سے ۵۰ میل جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں گرکھا فوج مقابلہ کو آئی لیکن اس کو شکست فاش ہوئی۔ اب گرکھوں کا دم خم ٹوٹ گیا۔ مجلس تولیت نے صلح نامہ سگولی کی تصدیق کر کے جنرل اکٹرلونی کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت سے آج تک حکومت نیپال اور حکومت ہند میں برابر صلح قایم ہے اور ہزاروں گرکھے انگریزی فوجوں میں بھرتی ہوتے ہیں یہ بڑے جیوٹ اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ انھوں نے انگریزوں کی ہمیشہ مصیبت کے وقت مدد کی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے وقت گرکھوں کی ایک

زبردست فوج انگریزوں کی مدد کو آئی۔ اسی طرح بعد میں مختلف جنگوں میں انھوں نے حکومت ہند کا ساتھ دیا اور ۱۸۱۶ء کے معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ انھوں نے اپنے اور انگریزی حکومت کے صحیح مقام کو جان اور پہچان لیا۔ جس طرح انھوں نے انگریزوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اسی طرح انگریزوں نے بھی ان کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ نیپال، چین اور برطانوی ہند کے درمیان شمال میں ایک قدرتی حد فاصل ہے جسے دونوں حکومتیں علی حالہ برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

پنڈاری اور مرہٹے

انگریزی حکومت کی گرکھوں سے لڑائی کے وقت وسط ہند میں بدامنی خوب زوروں پر تھی۔ عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ کمپنی کی حکومت کمزور ہو گئی ہے اس لئے غارتگر گروہوں کے حوصلے خوب بڑھ رہے تھے۔ پنڈاریوں کے زبردست گروہ کا گذارہ شمشیر زنی اور لوٹ مار پر تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں انگریزی حدیں اور برطانوی حمایت کے حلقۂ اثر کے بڑھ جانے کی وجہ سے بہت سی دیسی فوجیں ٹوٹ گئی تھیں۔ چنانچہ کم وبیش پانچ لاکھ پیشہ ور سپاہی بے لگام چھوڑ دئیے گئے تھے کہ بدنظمی اور بے ترتیبی کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے پیٹ پالیں۔ بعض دیسی رئیسوں کو انھوں نے دبا لیا اور بعض رئیسوں نے ان کی ہمت افزائی کی۔ وسط ہند میں کوئی ایک ایسی مقتدر قوت نہیں تھی جو ان جنگ بازوں پر قابو پا سکتی۔ پنڈاریوں کے سردار امیر خاں کے پاس تیس ہزار کا لشکر اور ایک زبردست توپ خانہ تھا۔ وہ اس کے بل بوتے پر سارے وسط ہند میں ادھر سے ادھر نقل و حرکت کرتا اور مختلف والیان ریاست کی آپس کی لڑائیوں میں کبھی ایک کا ساتھ دیتا اور کبھی دوسرے کا۔ وہ علاقے بھی جنھوں نے برطانوی حمایت قبول کر لی تھی پنڈاریوں کی لوٹ مار سے محفوظ نہ تھے۔ ہلکر، بھونسلا اور سندھیا نے پنڈاریوں سے خفیہ معاہدے کر لئے تھے جن کے باعث انھیں ان سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن دوسرے سب ان کی دستبرد کا شکار رہا کرتے تھے۔ مرہٹہ سرداروں کو توقع تھی کہ اگر آئندہ کبھی انگریزوں سے لڑائی کی نوبت آئی تو یہ پنڈاریوں کے منظم اور

مسلح گروہ ان کی مدد کریں گے۔ پنڈاریوں کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے جس زمانے میں حکومت ہند گرکھوں سے لڑائی میں مشغول تھی انگریزی علاقوں پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دئیے۔ چنانچہ انھوں نے بنگال اور مدراس کے بعض ضلعوں کو بری طرح سے لوٹا کھسوٹا۔

نیپال کی جنگ کے بعد لارڈ ہیسٹنگز نے مجلس نظما کو نہایت زوردار الفاظ میں لکھا کہ جب تک انگریزی حکومت وسط ہند میں غارت گروں کی سرکوبی نہ کرے اس وقت تک برطانوی علاقوں کا امن و امان خطرے میں رہے گا۔ مرہٹوں کی سرحد کے پیچھے راجپوتوں کی ریاستیں تھیں جو اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں اور زبردست غارت گروں کی دراز دستیوں کی روک تھام ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان میں سے بعض ریاستوں نے حکومت برطانیہ سے بہ اصرار درخواست کی تھی کہ انھیں اپنے زیر حمایت لے لے لارڈ ہیسٹنگز کو مجلس نظما سے یہ ہدایت دی گئی کہ پنڈاریوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے اس واسطے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو انگریزی حکومت کو سندھیا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے الجھنا پڑے گا۔ اکتوبر ۱۸۱۵ء میں پنڈاریوں نے نربدا کو عبور کر کے سرکار نظام کے علاقوں کو جنوب کی طرف دریائے کرشنا تک خوب لوٹا اور مال غنیمت سے لدے پھندے وسط ہند واپس ہوئے۔ فروری ۱۸۱۶ء میں انھوں نے شمالی سرکار پر چڑھائی کی۔ گنتور کو جی بھر کے لوٹا اور آس پاس کے علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جب کلکتہ اس کی خبر پہنچی تو گورنر جنرل نے سمندر کے راستے سے فوج بھیجی لیکن پنڈاری اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لے پتا ہو چکے تھے۔ یورش میں پنڈاری پچیس لاکھ سے زیادہ کا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے۔

راجا ناگپور سے معاہدہ

لارڈ ہیسٹنگز نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت کو رگھوجی بھونسلا راجا ناگپور سے اتحاد قایم کرنا چاہیے اس لئے کہ شمالی سرکار اور بنگال پر پنڈاریوں کی یورش اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جبکہ انکی فوجیں راجا ناگپور کے علاقوں میں سے گذریں۔ لیکن راجا عہد معاونت کی

شرطیں ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ ۲۲۔ مارچ ۱۸۱۶ء کو رگھوجی بھونسلا کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا پرساجی جانشین ہوا۔ یہ لڑکا اندھا، رعشہ کا مریض اور فاتر العقل تھا۔ دوبار ناگپور میں سازشوں کا بازار گرم تھا جن کا حال ہمیں ناگپور کے انگریز ریزیڈنٹ مسٹر جنکنس کے خطوں سے معلوم ہوا ہے۔[1] آخر رگھوجی بھونسلا کا بھتیجا مدھوجی بھونسلا جو اپا صاحب کے نام سے مشہور ہے نظم ونسق پر حاوی ہو گیا اور ریاست کا متولی بن گیا۔ انگریز ریزیڈنٹ نے لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا کہ اگر اس وقت ہم اپا صاحب کا ساتھ دیں تو ہم عہد معاونت کی تمام شرطیں جنھیں رگھوجی نے ماننے سے انکار کیا تھا اس سے منوا سکتے ہیں چنانچہ جنکنس کو حکومت ہند نے مجاز گردانا کہ وہ اپا صاحب سے اس ضمن میں بات چیت شروع کر دے۔ ۲۷ مئی ۱۸۱۶ء کو اپا صاحب نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دئے جس کی رو سے چھ ہزار پیدل اور رسالہ کی ایک رجمنٹ کا مناسب توپ خانہ کے ساتھ ناگپور میں رہنا طے ہوا جس کا خرچ دربار ناگپور کے ذمہ ہوگا۔ اپا صاحب نے یہ پابندی بھی مان لی کہ وہ دوسرے والیان ملک سے جنگ نہیں کرے گا اور دوسرے حکمرانوں سے کوئی جھگڑا پیش آجائے گا تو انگریزی حکومت کا تصفیہ قطعی تصور ہوگا۔ ناگپور دربار دوسرے درباروں سے کسی قسم کا سیاسی تعلق نہیں رکھے گا۔ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے راجا تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج رکھ سکے گا لیکن اس کی نگرانی انگریز ریزیڈنٹ کے ذمہ ہوگی۔ اس معاہدہ کو اس وقت تک خفیہ رکھا گیا جب تک کہ کرنل واکر کی ماتحتی میں انگریزی حمایتی فوج ناگپور نہ پہنچ گئی۔ راجا ناگپور سے انگریزی حکومت کا یہ معاہدہ سیاسی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ بقول مالکم[2] "اس زمانے کے ہندوستان کے حالات میں اس عہد معاونت سے زیادہ باعث خوش قسمتی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اسکی وجہ سے مرہٹہ قوم کے اتحاد پر کاری ضرب لگ گئی۔"

[1] Jenkins to Moira (Lord Hastings), despatches of 25th March, No. 1 and 29th March, No. 2, (Bengal consultations, 15th April, 1816)

[2] Malcolm, Political History of India, Vol. I, p. 465.

لارڈ ہیسٹنگز نے بورڈ آف کنٹرول کو متعدد بار اس جانب متوجہ کیا کہ پنڈاریوں کا استیصال برطانوی حکومت کے استحکام کے لئے ازبس ضروری ہے۔ لیکن کیننگ جو بورڈ آف کنٹرول کا اس زمانے میں صدر تھا پنڈاریوں کے خلاف اقدامی کارروائی کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے لارڈ ہیسٹنگز کو مشورہ دیا کہ چونکہ پنڈاریوں کے خلاف لڑائی لڑنے میں اندیشہ ہے کہ کہیں برطانوی حکومت کو مرہٹوں کے ساتھ بھی نہ الجھنا پڑے اس لئے مناسب یہی ہے کہ عام جنگ کی جوکھم میں پڑے بغیر کوشش کرنی چاہئے کہ پنڈاریوں کے بعض سرغنوں کو توڑ لیا جائے تاکہ ان کی مدد سے دوسروں کو جو زیادہ خطرناک ہیں گرفتار کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ ہندوستان کے حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب شمالی سرکار پر پنڈاریوں کی یورش اور سفاکی کی اطلاع انگلستان پہنچی تو کیننگ اور بورڈ آف کنٹرول نے اپنی رائے بدل دی۔ کیننگ نے بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت سے لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا کہ بورڈ ان تجویزوں کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور انھیں منظور کرتا ہے جو گورنر جنرل نے پنڈاریوں کے استیصال کے متعلق پیش کی ہیں۔ اس ضمن میں گورنر جنرل کو جو ہدایتیں دی گئیں ان میں اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی کہ بورڈ آف کنٹرول ان فوجی کارروائیوں کو نہیں روکنا چاہتا جو برطانیہ کا اقتدار قائم رکھنے اور بے پناہ مخلوق کی حمایت اور حفاظت کے لیے اختیار کی جائیں۔ اگر سندھیا اور ہلکر کا کوئی لگاؤ ان پنڈاریوں سے انگریزی حکومت اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ثابت ہو جائے تو ان دونوں کو بھی برطانوی حکومت کا دشمن اور مخالف سمجھنا چاہئے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں کے خلاف جنگ کی تیاری نہایت وسیع پیمانے پر کی اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑائی آخر مرہٹوں کے خلاف رنگ اختیار کرے گی۔ سندھیا اور ہلکر کے یہاں پنڈاریوں کی مستقل فوجیں رہا کرتی تھیں واصل محمد خاں اور کریم خاں جو پنڈاریوں کے بڑے سرغنا تھے سندھیا کی

ملازمت میں رہ چکے تھے اور بعد میں بھی سندھیا کے دربار میں ان کا اثر کام
کرتا رہا۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نے سندھیا کو مطلع کر دیا کہ انگریزی حکومت
پنڈاریوں کی یورشوں سے تنگ آکر ان کے خلاف فوج کشی کرنا چاہتی ہے۔
اس سے خواہش کی گئی کہ وہ اس کام میں انگریزی حکومت کے [illegible]
اور ہنڈیا اور اسیرگڑھ کے قلعوں پر انگریزی [illegible] مرکز قائم کرنے کی اجازت دے۔ سندھیا
کے دربار میں پنڈاریوں کے جو کارکن موجود تھے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ
سندھیا اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرے۔ انھوں نے سندھیا کو یہ بھی باور کرایا کہ اگر پنڈاری
فنا کر دیئے گئے تو خود اسکی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ پنڈاری ہمیشہ ضرورت کے
وقت اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کو تیار تھے۔ اگر وہ باقی نہ رہے تو سندھیا
اپنی سیاسی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ سندھیا نے شروع میں لارڈ
ہیسٹنگز کو کوئی قطعی جواب نہیں دیا اور کوشش کی کہ بات کو ٹال جائے لیکن
پیشتر اس کے کہ سندھیا کوئی فوجی تیاری کرتا انگریزی فوجوں نے دریائے جمنا
پار کر کے گوالیار کی طرف نقل وحرکت شروع کر دی۔ سندھیا نے دیکھا کہ
انگریزوں نے ناگپور کے وسیلے حاصل کر لئے ہیں اور لارڈ ہیسٹنگز کی حکمت عملی
ولزلی کی حکمت عملی سے ملتی جلتی ہے اس واسطے مناسب یہی ہے کہ مصالحت کر لی جائے چنانچہ
۵ نومبر ۱۸۱۷ء اس نے باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ پنڈاریوں کے خلاف
اتحاد عمل کا وعدہ کر لیا۔ سرجی ارجن گاؤں کے معاہدہ کی ۹ دفعہ منسوخ قرار دی
گئی جس کے مطابق انگریزی حکومت کو اس اختیار سے محروم کیا گیا تھا کہ وہ
راجپوت حکمرانوں سے معاہدے کر سکے۔ سندھیا اسیر گڑھ کے قلعہ سے بھی
دستبردار ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی وسط ہند اور راجپوتانہ کے ۱۹ والیان
ریاست کے وکیل انگریزی حکومت کے ریزیڈنٹ سر چارلس مٹکاف کے پاس
دہلی آئے تاکہ انگریزی حکومت کی حمایت حاصل کریں۔ ان والیان ریاست
میں جنھوں نے برطانوی حمایت قبول کی نواب بھوپال، راجا جے پور، راجا جودھپور،
راجا کوٹہ اور راجا بوندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
اب لارڈ ہیسٹنگز نے تینوں احاطوں (پریسیڈنسیوں) کی فوجیں طلب کیں

جن کی تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔ اس فوج کو شمالی اور جنوبی کمان میں تقسیم کیا گیا۔ شمالی فوج کا صوبہ شمال مغربی (موجودہ یو۔ پی) کی طرف سے خود لارڈ ہیسٹنگز کی ماتحتی میں بڑھنا طے ہوا اور جنوبی فوج سر تھامس ہسلاپ کے تحت رکھی گئی۔ ان فوجوں کے پیش نظر ایک تو یہ مقصد تھا کہ پنڈاریوں کا استیصال کیا جائے اور دوسرے یہ بھی کہ مرہٹہ ریاستوں پر نظر رکھی جائے کہ وہ اپنی غیر جانبداری سے دستبردار نہ ہوں۔ انگریزی فوجوں نے پنڈاریوں کے مرکزوں پر حملے کئے اور پورے وسط ہند میں ان کے خلاف ایک گھیرا سا قایم کر لیا جس میں سے نکل کر وہ نہ جا سکے۔

پیشوا

جس وقت انگریزی حکومت گرکھوں کے خلاف لڑائی لڑ رہی تھی تو پیشوا نے ہلکر۔ سندھیا اور امیر خاں سے کمپنی کے خلاف خفیہ معاہدے کئے جن کا منشا، یہ تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف سب مل کر لڑیں تاکہ اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو اور ولزلی کے زمانے میں مرہٹوں نے جو شرطیں کمپنی کی بالادستی کے متعلق مان لی ہیں وہ ختم کر دی جائیں۔ پیشوا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس طرح وہ مرہٹہ برادری میں اپنا کھویا ہوا اثر پھر سے قائم کرے۔ جب لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فوج کشی کی تو پیشوا نے بھی فوجی تیاری شروع کر دی اور انگریز ریزیڈنٹ کو یہ باور کرایا کہ وہ فوجی تیاری اس لئے کر رہا ہے کہ پنڈاریوں کے خلاف انگریزوں کی امداد کر سکے۔ پیشوا کے دربار میں اس زمانے میں ترمبک جی نے بڑا اقتدار پیدا کر لیا تھا جو انگریزوں کا سخت دشمن تھا وہ برابر پیشوا کو اکساتا رہتا تھا کہ انگریزوں کا جوا اتار پھینکے۔ جب گنگا دھر شاستری جو مہاراجہ گیکواڑ کا وزیر تھا بعض رقمی معاملوں کے تصفیہ کے لیے پونا آیا تو ترمبک راؤ کے اشارہ پر اس کو قتل کر دیا گیا۔ گنگا دھر شاستری انگریزی حکومت کے زیر حفاظت تھا۔ چنانچہ پونا کے انگریز ریزیڈنٹ الفنسٹن نے اس معاملہ کی تحقیقات کرائی تو ترمبک جی کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس نے پیشوا سے درخواست کی کہ ترمبک جی کو انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کو تھانہ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا

لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھیس بدل کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد پیشوا کی انگریزوں کے خلاف ریشہ دوانیاں اور بڑھ گئیں، اگرچہ بظاہر وہ ان کے ساتھ دوستی کے دعوے کرتا تھا۔ الفنسٹن کی نظر سے وہ تمام خفیہ کارروائیاں پوشیدہ نہیں تھیں جو پیشوا کچھ عرصہ سے کر رہا تھا اور جن کی تہ میں ترمبک جی کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل کے ایما پر اس نے پیشوا کو مجبور کیا کہ وہ ایک معاہدے کے مسودے پر دستخط کرے جس کی وجہ سے پیشوا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے دربار سے تمام والیانِ ملک کے وکیلوں کو نکال دے جن کے ذریعہ سے وہ انگریزوں کے خلاف سازشیں کیا کرتا تھا۔ اگر کسی والی ملک کے ساتھ پیشوا کے جھگڑے ہیں تو وہ سب انگریزی حکومت کی طرف رجوع ہونے چاہئیں۔ ساگر اور بندیلکھنڈ پر جو اس کو حقوق حاصل ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو جائے مرہٹہ برادری کے اعلیٰ سردار کی حیثیت سے اگر پیشوا کے کوئی دعاوی ہوں تو ان سے بھی دستبردار ہو جائے۔ پیشوا کوشش کر کے ترمبک جی کو گرفتار کرا کے انگریزی حکومت کے حوالے کرے۔ چنانچہ پیشوا نے اعلان کیا کہ جو شخص ترمبک جی کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کرے گا اسکو دو لاکھ روپیہ نقد اور ایک گاؤں انعام میں دیا جائے گا جس کی سالانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہوگی۔ پیشوا اور اس کے وزیروں نے ان تعزیری شرائط کی سختی کو کم کرانے کی کوشش کی اور بتایا کہ انگریزی حکومت اپنے معاہدوں کی پابندی کے متعلق پیشوا کے ساتھ بمقابلہ دوسرے والیان ملک کے زیادہ سختی برتتی ہے لیکن الفنسٹن کو اصرار تھا کہ اگر اس معاہدہ پر فوراً دستخط نہ کئے گئے تو پیشوا کو انگریزی حکومت کا دشمن سمجھا جائے گا۔ اس معاہدہ کی شرطیں اس قدر سخت تھیں کہ بورڈ آف کنٹرول نے بھی ان پر اعتراض کیا۔[1]

ظاہری طور پر پیشوا نے انگریزوں سے اچھے تعلقات رکھے لیکن درپردہ اس نے اپنے ایلچی ہلکر، سندھیا اور بھونسلا کے پاس بھیجے اور ان سے اپیل کی

[1] Mehta, Lord Hastings and the Native States, p. 88

کہ مرہٹہ برادری کو تنہا ہونے سے بچائیں۔ اس نے اپنی دولت اس کام میں بے دریغ صرف کی قلعوں کی مرمت کرائی اور بحری بیڑے کو منظم کیا تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ اس نے اپنے سپہ سالار گوکھلے کو ایک کروڑ روپیہ دیا تاکہ نئے سپاہی بھرتی کئے جائیں۔ جاگیرداروں کی ہر طرح تالیف قلب کی گئی تاکہ ان کے ذریعہ سے بھی فوج کی بھرتی میں مدد ملے۔ اس نے انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو بھی لالچ دے کر ملانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مسٹر الفنسٹن انگریز ریزیڈنٹ مقیم پونا نے جب یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو وہ احتیاطاً پونا سے باہر کھڑکی چلا گیا اور بمبئی سے مزید انگریزی فوج بلا بھیجی لیکن اس مزید فوج کے آجانے کے بعد بھی انگریزی فوج کی کل تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ برخلاف اس کے پیشوا کے پاس اس وقت اٹھارہ ہزار فوج تھی۔ پیشوا نے سندھیا ہلکر بھونسلا اور امیر خاں سے طے کر لیا تھا کہ جب وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کرے تو وہ سب کے سب انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں۔

۵ ہر اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیشوا نے مسٹر الفنسٹن کو تحکمانہ پیغام بھیجا جس میں ان خاص شرطوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی جن کے بموجب وہ انگریزی حکومت سے تعاون کرنے کو آمادہ ہے۔ لیکن یہ شرطیں ان تمام شرطوں کو منسوخ کرتی تھیں جو وہ پہلے عہد معاونت کے ذریعہ تسلیم کر چکا تھا۔ مرہٹہ افواج نے پونا میں ریزیڈنسی کی عمارت کو آگ لگا دی اور شہر سے کھڑکی کی طرف کوچ کر دیا گیا۔ جنرل بر اور جنرل اسمتھ نے کھڑکی کے قریب پیشوا کی فوج کا مقابلہ کیا اور شاندار فتح حاصل کی۔ جنرل اسمتھ نے وہاں سے سیدھا پونا کا رُخ کیا۔ دوسرا مقابلہ کرنے کی باجی راؤ کو ہمت نہیں ہوئی۔ شہر پونا پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح پیشوا کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ باجی راؤ کا جنرل اسمتھ اور جنرل پرزلر نے پیچھا کیا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا بھاگا پھرتا رہا۔ ایک ایک کرکے اس کے سارے مشہور قلعوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ باجی راؤ نے

راجا ستارا کو اپنے ساتھ حراست میں رکھا اس واسطے کہ اس کو اندیشہ تھا کہیں انگریز اس کی ساری حکومت اس کے حوالے نہ کر دیں۔ باپو گوکھلے پیشوا کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ اس نے اور تازہ دم فوج بھرتی کی تاکہ انگریزوں سے آخری مقابلہ کیا جائے۔ ترمباک جی نے جو آخر تک پیشوا کے ساتھ رہا اس کی ڈھارس بندھائی کہ آخر میں جیت انھیں کی ہوگی۔ پیشوا نے جنرل اسمتھ کا راستہ کاٹ کر پونا کی طرف کوچ کیا تاکہ اپنی تازہ دم فوج کے بل پر اس شہر کو جس پر ایک صدی سے اس کے گھرانے کی حکومت تھی پھر قبضہ کرے۔ کورے گاؤں کے مقام پر کمپنی کی فوج نے باپو گوکھلے کو سخت شکست دی۔ یہاں سے پیشوا پھر جنوب کی طرف چل دیا۔ اچانک جنرل اسمتھ نے آشٹی کے مقام پر اس کو جا لیا۔ باپو گوکھلے لڑائی میں مارا گیا۔[1] مرہٹہ فوج میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہونا شروع ہو گئی۔ انگریزی فوج نے آشٹی کے مقام پر راجا ستارا کو پیشوا کی نظر بندی سے چھڑا لیا۔ پیشوا چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ شمال کی طرف بھاگا۔ دریائے تاپتی کو پار کر کے وہ نربدا کے شمال میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن انگریزی فوجوں کے دستے تمام گھاٹوں پر متعین تھے۔ جب پیشوا نے کوئی مفر نہ دیکھا تو سر جان مالکم کو لکھا کہ وہ کوشش کر کے انگریزی حکومت سے اس کے قصور معاف کروا دے۔ لیکن لارڈ ہیسٹنگز پیشوا کے علاقوں کی ضبطی کے متعلق پہلے ہی الفنسٹن کو لکھ چکا تھا۔ چنانچہ الفنسٹن نے اس کا اعلان کر دیا کہ پیشوا اور اس کے خاندان کو تخت پونا سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا۔ حکومت پونا کے تحت جو ملک تھا اس میں سے پندرہ لاکھ سالانہ آمدنی کے علاقوں پر راجا ستارا کی حکومت قایم کر دی گئی باقی ملک کو کمپنی کے احاطۂ بمبئی میں ملا لیا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز کی رائے تھی کہ باجی راؤ کو دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے لیکن سر جان مالکم نے[2]

---

[1] Tharnton, History of the British Empire in India, Vol. IV p. 503.

[2] Kaye, Life of Malcolm, Vol. II, p. 237

اس سے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی اور بٹھور ضلع کانپور میں دریائے گنگا کے کنارہ اس کو رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ بعد میں عرصے تک زندہ رہا اور کمپنی کے خزانے سے ڈھائی کروڑ روپیہ وظیفے کی شکل میں وصول کیا۔ ترمبک جی کو گرفتار کرکے بنارس کے قریب چنار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہ زندگی بھر قید ہی میں رہا۔

واقعات ناگپور

اپا صاحب کے خلاف دربار ناگپور میں سازش کا سلسلہ جاری رہا۔ اور وہ خود بھی سازش کرنے میں کسی سے کم نہ تھا۔ چنانچہ اس نے یکم فروری ۱۸۱۷ء راجا کو قتل کرا کے خود راج گدی پر قبضہ جمایا۔ باجی راؤ نے اس کو خلعت سے سرفراز کیا۔ مسٹر جنکنس نے جو اس زمانے میں ناگپور میں ریزیڈنٹ تھا اپا صاحب کو ہر چند سمجھایا کہ وہ باجی راؤ کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئے اور انگریزوں سے اتحاد قایم رکھے لیکن جب باجی راؤ نے جنگ شروع کی تو اس نے بھی انگریزوں کے خلاف فوج کشی کی اور سیتابلدی کے مقام پر شکست کھائی۔ جنکنس نے اس شرط پر اپا صاحب کو گدی پر رہنے دیا کہ اپنی فوج توپیں اور ان تمام قلعوں کو انگریزی حکومت کے حوالے کر دے جن کی فوجی لحاظ سے انھیں ضرورت ہو اور ایسے لوگوں کو وزیر مقرر کرے جن پر انگریزوں کو بھروسا ہو۔ برار، گاول گڑھ اور سہاگ پور کے زرخیز علاقے انگریزی حکومت کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ ان شرطوں پر اپا صاحب نے صلح کر لی لیکن یہ صلح کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتی رہی۔ اس نے باجی راؤ سے خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور چاندہ کے مقام پر اپنی فوج کے ساتھ باجی راؤ سے ملنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سارے منصوبے کی خبر برٹش ریزیڈنٹ کو مل گئی۔ اس نے اپا صاحب کو گرفتار کرا لیا۔ ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو لکھا کہ اس کا ثبوت فراہم ہو گیا ہے کہ سابق راجا پرسوجی بھونسلا کو اپا صاحب نے قتل کرایا ہے اس لئے اب اپا صاحب راج گدی کا مستحق نہیں نیز اس نے اپنے ان سیاسی تعلقات سے جو باجی راؤ کے ساتھ ہیں یہ بات

ثابت کر دی ہے کہ انگریزی حکومت کبھی بھی اس پر بھروسا نہیں کر سکتی چنانچہ مناسب صورت یہ ہوگی کہ رگھوجی بھونسلا کے نواسے کو ناگپور کی راج گدی پر بٹھا دیا جائے۔ آپا صاحب انگریزوں کی قید سے بھاگ گیا جبکہ اس کو کرنل براؤن الہ آباد لے جا رہا تھا۔ اس نے وسط ہند کے گونڈ قبیلوں کی فوج بھرتی کی تاکہ مقابلہ پر آئے لیکن اس کی غیر منظم جمعیت منتشر کر دی گئی۔ آپا صاحب نے بھاگ کر رنجیت سنگھ کے پاس پنجاب میں پناہ لی۔ رنجیت سنگھ نے انگریزی حکومت سے استصواب کرنے کے بعد اس کو اپنی پناہ میں لے لیا لیکن اس کی حیثیت ایک سیاسی قیدی کی تھی۔ آیندہ آٹھ سال تک ناگپور کا انتظام انگریز عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہا۔

ہلکر

سنہ ۱۸۱۱ء میں جسونت راؤ ہلکر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ تلسی بائی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن فوجی سردار اس کے خلاف ہو گئے۔ چنانچہ تلسی بائی کو قتل کرا دیا گیا اور نوجوان ملہر راؤ کو فوجی سرداروں نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ جو مرہٹہ سردار اس وقت اندور کے درو بست پر حاوی تھے وہ انگریزی حکومت کے سخت دشمن تھے۔ باجی راؤ کی فوج کشی کی خبر سن کر انھوں نے بھی اپنے لشکروں کا رخ دکن کی طرف پھیر دیا۔ مہد پور کے مقام پر دسمبر سنہ ۱۸۱۷ء میں سر تھامس ہسلاپ کی انگریزی فوج سے ہلکر کے لشکر کا مقابلہ ہوا۔ سر جان مالکم اور سر تھامس ہسلاپ کو کامیابی ہوئی۔ ملہر راؤ ہلکر کو جس کی عمر اس وقت صرف گیارہ سال تھی انگریزوں نے اپنی حراست میں لے لیا۔ مندسور کے مقام پر سر جان مالکم نے ہلکر کے وزیر تانتیا جوگ سے معاہدہ طے کیا جس کی رو سے ہلکر نے عہد معاونت تسلیم کر لیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اندور میں انگریزی فوج رہے گی۔ کوہ ستپورہ کے جنوب میں جن علاقوں پر ہلکر کو دعویٰ تھا اس سے وہ دستبردار ہو جائے گا۔ ان میں خاندیس کے علاقے بھی شامل تھے۔ راجپوتانہ کی ریاستوں کے معاملوں میں

لہ Auber, Rise and Progress of the British Power in India, Vol. II, p. 541.

ہلکر آئندہ سے کسی قسم کا دخل نہیں دے گا اور نہ ان پر اس کے کوئی مطالبات باقی رہیں گے۔ دوسرے والیان ریاست سے سیاسی تعلقات نہیں رکھے جائیں گے اور اگر کسی دوسری ریاست سے ہلکر کا کوئی جھگڑا ہوگا تو کمپنی فیصلہ کرے گی۔ ہلکر کی فوج منتشر کر دی گئی سوائے تین ہزار رسالہ کے جو انگریزی حمایتی فوج کے ساتھ ملا دیا گیا۔

اگرچہ سندھیا نے ۱۸۱۷ء کے معاہدہ کے مطابق اسیر گڑھ کے قلعہ کو کمپنی کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چونکہ فوراً اس قلعہ پر قبضہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے سندھیا کے قلعہ دار ہی اس پر قابض رہے۔ اسیر گڑھ کے قلعدار جسونت راؤ لار نے انگریزی فوج پر جب کہ وہ پیشوا کا پیچھا کرتی ہوئی اس کے قلعہ کے قریب سے گزری تو گولیاں چلوا دیں۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت کو اس کی بھی اطلاع ملی تھی کہ اسیر گڑھ کا قلعہ دار پنڈاریوں کی خفیہ امداد کر رہا ہے۔ چنانچہ گورنر جنرل نے سندھیا کو اس واقعہ کی طرف متوجہ کیا۔ سندھیا نے محض دکھاوے کے لیے قلعدار کو برطرف کر دیا لیکن درپردہ اس کو شہ دے دی کہ قلعہ پر قابض رہے۔ اس پر گورنر جنرل نے حکم دے دیا کہ اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا جائے۔ جنرل ڈوٹن کی ماتحتی میں فروری ۱۸۱۹ء میں محاصرہ شروع ہوا۔ اسیر گڑھ کا قلعہ ہندوستان کے ناقابل تسخیر قلعوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ اسیر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ قلعہ میں سندھیا کے دستخط سے ایک خط ملا جس میں قلعدار کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ باجی راؤ کی ہر طرح سے مدد کرے اور انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ اگرچہ گورنر جنرل کے پاس کافی ثبوت موجود تھا کہ اسیر گڑھ کے معاملہ میں سندھیا نے فریب سے کام لیا جس کی بنا پر وہ اس کو گدی سے برطرف کر سکتا تھا لیکن اس نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور اس کی ریشہ دوانیوں کو نظر انداز کر دیا۔[1] اسیر گڑھ

[1] Kaye, Life of Malcolm, Vol, II, p. 286-98

کی فتح کے بعد مرہٹوں کی تیسری جنگ کا خاتمہ ہوا۔

مرہٹہ قوت کو توڑنے کے ساتھ ساتھ انگریزی فوجیں پنڈاریوں کا برابر پیچھا کرتی رہیں۔ سندھیا کے ساتھ معاہدہ ہو جانے کے بعد امیر خاں کو لارڈ ہیسٹنگز نے یہ شرط پیش کی کہ اگر وہ اپنی فوج کو برخاست کرکے ڈیڑھ سو توپوں کو جو اس کے پاس تھیں انگریزوں کو مقررہ قیمت پر حوالے کر دے تو اس کو ان علاقوں کا رئیس بنا دیا جائے گا جو اس وقت اس کے قبضہ میں تھے۔ شروع میں تو امیر خاں اس شرط کو ماننے کو تیار نہیں ہوا لیکن جب اس نے اپا صاحب اور پیشوا باجی راؤ کی بربادی کی خبر سنیں تو اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے ماتحت اس کو ٹونک کا والی ریاست تسلیم کیا گیا جس کی آمدنی اس زمانے میں پندرہ لاکھ تھی۔ دوسرے پنڈاری سرغناوں میں کریم خاں اور واصل خاں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور مصالحت کی درخواست کی۔ کریم خاں کو گورکھپور کے قریب جاگیر دی گئی۔ واصل خاں نے زہر کھا کر جان دی۔ سر جان مالکم نے چیتو کا جنگلوں میں پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بیس ہزار ساتھیوں کو پیچھا کرکے منتشر کر دیا گیا۔ لیکن چیتو گرفتار نہ ہو سکا کہا جاتا ہے کہ اسیر گڑھ کے قریب کے جنگل میں جہاں وہ جا کر چھپا تھا کسی جنگلی جانور نے اس کو ہلاک کر دیا[1]۔ پنڈاریوں کے خلاف جو کارروائی کی گئی وہ تمام پردیسی فوج کے ذریعہ سے کی گئی جس کی سربراہی میں انگریز افسر تھے۔ اس طرح پنڈاریوں کے خانہ بدوش لٹیرے جتھوں سے وسط ہند کو نجات ملی۔ ان میں سے بہت سوں نے معافی مانگ کر امن و سکون کی زندگی اختیار کر لی۔ اگر برطانوی حکومت واقعی پورے ملک کی قوت بالادست بننا چاہتی تھی تو اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلانے والے عناصر کا پوری طرح سے استیصال کرے۔ لارڈ ہیسٹنگز نے

[1] Fortesque, A History of the British Army, XI, p. 177 -

صحیح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ یہ مقصد سیاسی نامہ و پیام سے نہیں حاصل ہو سکتا بلکہ فوجی ذریعوں ہی سے اس کا حصول ممکن تھا۔ چنانچہ فوجی تنظیم کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ جس وقت لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف فوجی پیش قدمی کا قصد کیا تو اس وقت برطانوی حکومت کے دشمنوں کے پاس ڈیڑھ لاکھ سوار اور پیدل فوج میدان میں لائی جا سکتی تھی اور بعد میں واقعی لائی گئی۔ لیکن کمپنی کی ہندوستانی فوج نے انگریز افسروں کے تحت اس زبردست فوجی خطرہ کی ہمیشہ کے لئے روک تھام کر دی۔ وسط ہند اور مالوہ کے علاقے تقریباً ایک صدی کی سیاسی ابتری کی وجہ سے ویران ہو گئے تھے۔ باضابطہ انتظام قائم ہونے سے وہ گاؤں جو اُجڑ گئے تھے پھر سے آباد ہونے لگے اور رعایا کی خوشحالی بڑھی۔

لارڈ ہیسٹنگز نے مرہٹوں کی قوت کو توڑ کر وہ کام پورا کیا جس کا بیڑا لارڈ ولزلی نے اٹھایا تھا۔ پیشوائی کے عہدہ کو ختم کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ مرہٹہ برادری پھر کبھی کسی مرکز کے تحت سر نہ اٹھا سکے اور انگریزی بالادستی کے لئے خطرہ نہ بن سکے۔ اب سوائے پنجاب اور سندھ کے انگریزی حکومت کا اقتدار تمام ہندوستان نے مان لیا تھا۔ اہل ہند کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ ان کے ملک کا اقتدار ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا اور انگریزی کمپنی اکبر اور اورنگ زیب کے تاج و تخت کی مالک بن گئی[1]۔ لارڈ ہیسٹنگز نے بجائے ولزلی کے حمایتی اصول کے ماتحتی کے اصول کے مطابق والیان ریاست کو برطانوی سیاسی اتحاد میں شریک کیا۔ راجپوتانہ اور مالوہ کی ریاستوں سے جو معاہدے کئے گئے ان سب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر والیٔ ملک نے برطانوی بالادستی کو صاف طور پر تسلیم کیا۔ انگریزی حکومت کو حق حاصل ہو گیا کہ اگر اس کو فوجی امداد کی ضرورت ہوئی تو اتحاد کرنے والی ریاست کی فوج کو کمپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق استعمال کر سکے گی۔ فوج کی تعداد کا

[1] Marshman, History of India, Vol. II, p. 345-346.

کوئی تعین نہیں کیا گیا تاکہ پوری فوج کو کمپنی اپنے اغراض کے لئے استعمال کر سکے اور اس کے اخراجات اسے نہ اٹھانے پڑیں۔ چونکہ وسط ہند اور مالوہ کی ابتری کی ایک بڑی وجہ وہاں کے مختلف والیان ملک کی باہمی رقابتیں تھیں جن کی وجہ سے جنگ اور غارت گری کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لئے برطانوی حکومت کو قوت بالادست کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ ان کے جھگڑوں میں پنچ بن کے جھگڑے چکا دے۔ ان ریاستوں کے خارجی معاملات کلیتاً کمپنی کے تحت آ گئے لیکن لارڈ ہیسٹنگز چاہتا تھا کہ ان کے اندرونی نظم و نسق میں کمپنی کے نمائندے جہاں تک ہو سکے مداخلت نہ کیا کریں۔[1] اس میں شبہہ نہیں کہ راجپوتانہ کی متعدد ریاستوں کو برطانوی اتحاد میں شریک ہونے سے اس بدامنی سے نجات ملی جو مرہٹوں کی یورشوں کے سبب سے ان کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن سندھیا کے ساتھ لارڈ ہیسٹنگز نے جو معاہدہ کیا اس میں اس خراج کی رقم کی ادائی کا ذمہ لیا جو راجپوتانہ کی ریاستوں سے اس کو ملا کرتی تھی۔ چونکہ سندھیا ان ریاستوں پر سے اپنے سیاسی حقوق سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو رہا تھا اس لیے لارڈ ہیسٹنگز نے اس وقت کے سیاسی حالات کے مدنظر اس کے حق خراج کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ اس کی وصولیابی کی ذمہ داری انگریزی حکومت نے اپنے ہاتھ لے لی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ان ریاستوں کے ساتھ برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات کا جس نہج پر تعین کیا اب تک کم و بیش ان تعلقات کی نوعیت وہی چلی آ رہی ہے جو اس کے عہد میں تھی۔ برطانوی اقتدار اب راس کماری سے ستلج کے کنارہ تک قایم ہو گیا۔

ولزلی کے زمانے میں کمپنی کی قوت ملک کی دوسری سیاسی طاقتوں کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن لارڈ ہیسٹنگز نے دیسی والیان ملک سے

---

[1] Private Journal of Marquis of Hastings, Vol. I, p. 54.

جو معاہدے کئے ان میں کمپنی کی بالادستی صراحت کے ساتھ مذکور تھی۔ ولزلی کے زمانے کے معاہدوں میں جو بعض ایسی دفعات تھیں جن سے والیان ملک کے حقوق اقتدار متاثر ہوتے تھے ان کی پابندی پر کمپنی نے اصرار نہیں کیا۔ چنانچہ عہد معاونت کی رو سے والیان ریاست کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ دوسری ریاستوں سے بغیر کسی کی حکومت کے استصواب کے سیاسی تعلقات قایم کریں لیکن پیشوا معاہدہ کرنے کے بعد بعض دوسرے مرہٹہ درباروں کو اپنے وکیل بھیجتا تھا اور ان کے وکیلوں کو اپنے دربار میں باریاب کرتا تھا۔ جوں جوں کمپنی کی سیاسی قوت ملک میں مستحکم ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ کمپنی ان دفعات کی پابندی پر اڑنے لگی جن سے معاہدہ کرنے والی ریاستوں کے حقوق مقتدرانہ متاثر ہوتے تھے۔ سیاسی حالات کے بدلنے کے ساتھ معاہدوں کی توجیہ میں بھی فرق پیدا کیا جانے لگا۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نے سندھیا اور ہلکر کو صاف لکھ دیا تھا کہ بارلو کے زمانے میں ان سے جو معاہدے ہوئے ہیں جن کی رو سے کمپنی کی حکومت راجپوتانہ کے والیان ریاست سے سیاسی تعلقات نہیں قایم کر سکتی تھی اب منسوخ تصور ہونے چاہئیں اس واسطے کہ اب انگریزی حکومت کی مصلحتوں کا یہ اقتضا ہے کہ وہ ان سے سیاسی تعلقات قایم کرے۔ غرض کہ لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں دیسی والیان ملک کو اندرونی نظم و نسق کے جو اختیارات دیئے گئے وہ انگریزی حکومت نے اپنی مرضی سے دیئے تھے، اس شرط پر کہ وہ کمپنی کی بالادستی کو تسلیم کریں۔ آئندہ سے والیان ریاست اپنے حقوق کا ماخذ اور منبع قوت بالادست کو سمجھنے لگے اور انگریزی اقتدار نے ایک امر تسلیم شدہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاہدوں کی اہمیت اور آہستہ آہستہ قوت بالادست اور دیسی ریاستوں کے باہمی تعلقات کا تعین عمل درآمد اور روایتوں پر مبنی قرار پایا۔ لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں دیسی

ریاستوں کے مسئلہ نے فوجی نوعیت کے بجائے خانگی، سیاسی حیثیت اختیار کرلی یہ نوعیت اس وقت سے آج تک برقرار ہے۔

حکومت ہند اور سرکار نظام

دسمبر ۱۸۰۸ء میں میر عالم کے انتقال پر منیر الملک کو نواب سکندر جاہ نے مدار المہام مقرر کیا تو لارڈ منٹو گورنر جنرل ہند نے اس شرط پر ان کی مدار المہامی قبول کی کہ وہ نظم و نسق کے تمام اختیارات راجا چندو لال کے سپرد کر دیں جس نے انگریزی حکومت کا خاص اعتبار حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت سے راجا چندو لال نے دولت آصفیہ کے در و بست میں پورا دخل حاصل کر لیا۔ جب نواب سکندر جاہ نے راجا چندو لال کو اس کی فضول خرچی اور بدانتظامی کی وجہ سے علٰحدہ کرنے کا خیال کیا تو گورنر جنرل نے صاف کہہ دیا کہ اس کی علٰحدگی سے دونوں حکومتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا۔ اور اگر سرکار نظام کے معاملوں کا انجام دینا کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر انگریزی حکومت بھروسا نہیں کرسکتی تو ممکن ہے کہ انگریزی حکومت کے لئے ناگزیر ہو جائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگرانی کیلئے کوئی دوسرا طریق کار اختیار کرے بجائے اس طریق کار کے جواب تک کافی خیال کیا گیا تھا۔ جس زمانے میں پنڈاری اور مرہٹے وسط ہند میں اُدھم مچا رہے تھے تو سر ہنری رسل ریزیڈنٹ حیدرآباد نے دیکھا کہ امانتی فوج سے ممالک محروسہ سرکار عالی کی سرحدوں کی حفاظت ممکن نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ فوج کی نئی تنظیم کی جائے۔ لیکن اس تنظیم کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے زبردست فوج درکار ہوگی۔ لارڈ ہیسٹنگز کا خیال تھا کہ اس فوج کو جو حیدرآباد میں رہے گی اور جس کے خرچ کا بار سرکار نظام پر ہوگا انگریزی مفاد کے لئے

لے Kays, Life of Metcalf, Vol. II, p. 7.

کے Memoirs and Correspondence of General Fraser, p. 358

سہولت کے ساتھ استعمال کیا جا سکے گا اور انگریزی حکومت اس کے ذریعے سے بہت کچھ خرچ سے بچ جائے گی۔ اس کے خیال میں یہ بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر معدلت کے اصول کی نظری بحث کی خاطر انگریز اپنے مفاد کو قربان کر دیں اپنی ایک اور تحریر میں لارڈ ہیسٹنگز نے لکھا ہے کہ "یہ امر واقعہ ہے کہ اس فوج پر ہمارا قابو اس حکمران کے مقابلے میں زیادہ ہے جو ان کے اخراجات کی پابجائی کرتا ہے"۔ چونکہ اعانتی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی اس لئے اس میں بے چینی اور شورش کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ رسل نے فوج کی جدید تنظیم کی جو رسل بریگیڈ کے نام سے موسوم ہے۔ شمالی سرکاروں کی نو لاکھ روپیے سالانہ پیشکش کی رقم سے ریزیڈنٹ نے سرکار نظام سے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ اس میں سے پہلے فوج کی تنخواہ کی ادائی کی جائے۔ یہی رسل بریگیڈ بعد میں حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لفٹنٹ پیمر اس کا کمانڈر مقرر ہوا جس نے اس کی کارکردگی میں وہی معیار قائم کر دیا جو برطانوی ہند کی فوج کا تھا۔ اس کنٹنجنٹ کا اچھا خاصہ حصہ اورنگ آباد میں رہتا تھا جو جغرافی لحاظ سے مرہٹوں کی سرحد سے قریب ہونے کے باعث اہم تھا۔ پنڈاریوں کے گروہ اکثر یہاں تک لوٹ مار کرتے ہوئے چکر لگاتے تھے۔ دو ہزار فوج حیدرآباد میں توپ کے ساتھ پر رہتی تھی تاکہ اگر ریاست کے کسی حصہ میں بغاوت ہو تو اس کو فوراً یہاں سے بھیجا جا سکے۔ ۱۸۱۷ء میں جنگ مرہٹہ شروع ہوئی تو حسب معاہدہ سرکار نظام نے اپنی فوج کمپنی کی حکومت کی مدد کے لیے بھیجی۔ مرہٹوں کی جنگ کے بعد ۱۸۲۲ء میں سر چارلس مٹکاف نے سرکار نظام سے معاہدہ کیا جس کی رو سے شمال و مغربی ضلعے جو اصل میں سرکار نظام کے تھے اور جن پر پیشوا اور بھونسلا قابض ہو گئے تھے حکومت سرکار عالی کو واپس کر دیئے گئے۔ پیشوا کو سرکار نظام سے چوتھ وصول کرنے کا جو حق حاصل تھا وہ باقی نہیں رہا اس واسطے کہ خود پیشوائی کا ہمیشہ

لہ Hyderabad Papers, p. 9

کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

انگریزی ریزیڈنٹ سر ہنری رسل نے گورنر جنرل سے مشورے کے بعد جو جدید فوجی تنظیم کی اس کے اخراجات کی پابجائی کے ضمن میں اس کی بھی ضرورت تھی کہ سپاہ کو پابندی سے وقت پر تنخواہ ملا کرے۔ چنانچہ اس بنا پر ریزیڈنٹ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ خاص طور پر مالگزاری وصول کرنے کا جو طریقہ رائج تھا اس پر اس نے اپنی نگرانی قایم کر لی۔ رسل بریگیڈ کے اخراجات ادا کرنے کے لئے حکومت سرکار عالی کو قرضدار ہو جانا پڑا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں ایک انگریزی ساہوکارے کی کمپنی پامر اینڈ کمپنی کے نام سے قایم ہوئی اس کے قیام میں راجا چندو لال کا بھی ہاتھ تھا اور بعض دیسی ساہوکاروں نے بھی جن میں بنکا دی داس سب سے بڑا سرمایہ دار تھا اس میں اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ لیکن زیادہ تر سرمایہ انگریز سرمایہ داروں کا تھا۔ اس کمپنی کا مقصد یہ تھا کہ بنک کاری اور لین دین کے علاوہ تجارتی اغراض کے لئے دکن کے مادی وسیلوں سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ کمپنی برار کی روئی اور دریائے گوداوری کے کنارے کے جنگلوں کی لکڑی کی تجارت بھی کرتی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز کا ایک قریبی عزیز سر ولیم رمبولڈ نامی اس ساہوکارے کے کاروبار میں شریک ہو گیا۔ فوج کے اخراجات کے لئے جب روپیے کی ضرورت ہوتی تو راجا چندو لال بلا تکلف پامر اینڈ کمپنی سے ۲۴ فی صدی سود پر قرض لے لیتے۔ قرض کا یہ سلسلہ اسی طرح سے کئی سال تک چلتا رہا۔ حالانکہ ۱۷۹۷ء کے قانون منظورہ پارلیمنٹ کی رو سے کسی یوروپین کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی والی ریاست سے بغیر گورنر جنرل کی خاص اجازت کے روپیے پیسے کا لین دین کر سکے۔ پامر اینڈ کمپنی کو لارڈ ہیسٹنگز نے سر ہنری رسل ریزیڈنٹ حیدرآباد کی سفارش پر کاروبار کرنے اور سرکار نظام سے لین دین کی بطور خاص اجازت دے دی تھی لیکن یہ اجازت اس شرط پر دی گئی تھی کہ سرکار نظام اگر پامر اینڈ کمپنی سے قرض لے گی تو اس کی ادائی کی ذمہ داری برطانوی

حکومت پر نہ ہوگی۔[1] پامر اینڈ کمپنی پابندی سے کنٹنجنٹ کی تنخواہ کی ادائی
کرتی تھی جس کی تعداد سات ہزار تھی اور راجا چندو لال کو حکومت کے لئے
بھی جب کبھی قرضے کی ضرورت ہوتی تو پامر اینڈ کمپنی قرض دے دیا کرتی تھی
اس قرض کی ادائی بھی نقدی کی شکل میں جو مالگزاری سے وصول ہوتا اور کبھی
زمینیں رہن رکھ کے ہو کرتی تھی۔ لیکن پوری ادائی کبھی نہیں ہوتی تھی اور
قرض کا کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ ہوتے ہوتے کمپنی کا قرض جمع
ہوکر ساٹھ لاکھ روپے تک پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ کہ سرکار عالی پامر اینڈ کمپنی کے
قرض سے زیر بار ہوگئی بلکہ کمپنی کا سیاسی اثر ریاست کے معاملات میں بڑھنے لگا۔
جب ان حالات کی اطلاع انگلستان میں مجلس نظماء کے ارکان کو ہوئی تو انھوں
نے کمپنی کے قیام اور اس کے طریق کار پر سخت اعتراض کئے۔ چونکہ لارڈ ہیسٹنگز کا
عزیز سر ولیم رمبولڈ بھی کمپنی [illegible] میں شریک تھا اس لئے گورنر جنرل
کی ذات پر بھی پارلیمنٹ [illegible] نکتہ چینی ہوئی اور اس سے اس
ضمن میں جواب طلب کیا گیا [illegible] گورنر جنرل کو ہدایتیں بھیج دیں کہ
پامر اینڈ کمپنی کے توسط سے انگریزی فوج کی تنخواہوں کی ادائی کا طریقہ فوراً
بند کر دینا چاہئے۔[1] دسمبر ۱۸۲۰ء کو سر ہنری رسل کی جگہ سر چارلس مٹکاف
حیدرآباد کا ریزیڈنٹ ہوکر آیا۔ وہ بڑا تجربہ کار اور ہوشمند شخص تھا۔ حالات
کا جائزہ لینے پر اس نے محسوس کیا کہ مالگزاری کی وصولیابی میں پامر اینڈ کمپنی
کو جو عمل دخل حاصل ہوگیا ہے اس سے بدانتظامی بڑھنے کے سوا اور کوئی
نتیجہ نہ نکلے گا۔ اس کو یہ اندیشہ تھا کہ عام انتظامی ابتری سے ریاست
حیدرآباد بہت جلد بالکل دیوالیہ ہو جائے گی۔ ملک کی مالی حالت پہلے ہی
سے خراب تھی۔ کنٹنجنٹ کے اخراجات کے بارے روز بروز حالت
اور بھی زیادہ بدتر ہو رہی تھی۔ اس کو یہ معلوم کرکے تعجب اور رنج ہوا کہ خود
ریزیڈنسی کے عہدہ داروں کا دامن پامر اینڈ کمپنی کے لین دین کی آلائش

۱؎ Letter of Governor-General to the Resident, 13th Sept 1822 (Hyderabad Papers, p. 18[illegible]).

سے پاک نہیں ہے۔ وہ اصولی آدمی تھا۔ اس نے اس کی سنی ان سنی نہیں کی کہ اگر وہ پامر اینڈ کمپنی کا زور توڑنے کی کوشش کرے گا تو یہ گورنر جنرل کو ناگوار ہوگا۔ چنانچہ اس نے مالگزاری کی وصولیابی پامر اینڈ کمپنی کے ہاتھ سے نکال لی اور اس کام کے لئے بعض انگریز عہدہ دار مقرر کر دئے جو ہندوستانی متاجروں کے عمل تعاون سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔[1]

پامر اینڈ کمپنی کے متعلق سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے جو واجبات ہیں ان کی ادائی کلکتہ میں ۶ فیصدی شرح سود پر قرض لے کر کی جائے اور پامر اینڈ کمپنی کو چونکہ آئندہ اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا اس لیے چودہ لاکھ روپیہ زائد نفع اور ہرجانے کے اس کو ادا کر دیے جائیں۔ پامر اینڈ کمپنی کے شرکا نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ سر ولیم رمبولڈ نے اپنا سارا اثر اور رسوخ استعمال کر کے گورنر جنرل کو اپنے موافق کر لیا اور اس کو یہ باور کرا دیا کہ سر چارلس مٹکاف نے یہ تمام معاملہ اس لئے اٹھایا ہے کہ وہ اس کے خلاف ذاتی مخالفت رکھتا ہے۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے پہلے تو مٹکاف کے مراسلوں کو ڈیڑھ سال تک کسی کارروائی کے بغیر ڈالے رکھا۔ اس نے مٹکاف کو لکھا کہ سرکار نظام کے اندرونی انتظام میں ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چونکہ پامر اینڈ کمپنی کا معاملہ اندرونی انتظام کی نوعیت رکھتا ہے اس واسطے ہمیں اس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ لیکن مٹکاف نے گورنر جنرل کو یہ توجہ دلائی کہ پامر اینڈ کمپنی کا معاملہ اب محض ایک تجارتی کمپنی کا معاملہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے انگریزی حکومت بدنام ہو رہی ہے پھر خود گورنر جنرل کے طرز عمل میں تضاد پایا جاتا تھا۔ اس نے رسل کو جبکہ وہ مٹکاف سے پہلے حیدرآباد کا ریزیڈنٹ تھا ہدایت کی تھی کہ وہ اندرونی انتظام میں سرکار نظام کو مشورہ دے اور اپنے اثر کو استعمال کرتے۔[2] جب انگلستان میں اس معاملے کی نسبت چرچا

[1] Kaye, Life of Metcalf, Vol. II, p. 30-32

[2] Metcalf to Russell, 22nd January, 1820, No. 14, Bengal

ہونے لگا تو گورنر جنرل نے مٹکاف کو لکھا کہ راجا چندو لال نے گزشتہ زمانے میں انگریزی حکومت کی جو خدمتیں انجام دی ہیں انکو بھلایا نہیں جا سکتا۔ بھلا اب انگریزی حکومت کے لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ راجا چندو لال کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ لیکن جب مجلس نظماء نے اس معاملے کے ضمن میں گورنر جنرل سے جواب طلب کیا تو اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت انگریزی حکومت اور پامر اینڈ کمپنی کا سرکار نظام پر قرض ملا کر ایک کرڑور سات لاکھ تک پہنچ چکا تھا۔ حکومت ہند نے یہ سب قرض اس شرط پر ادا کر دیا کہ شمالی سرکار کی سالانہ پیشکش پر سرکار نظام کو آئندہ کوئی حق نہیں رہے گا۔ پامر اینڈ کمپنی کا کاروبار بہت جلد بیٹھ گیا اور وہ دیوالیہ ہو گئی۔

سر چارلس مٹکاف نے ریاست حیدرآباد کی مالی حالت درست کرنے کے سلسلے میں کنٹنجنٹ کے اخراجات کی زیادتی پر بھی اعتراض کیا اور بتایا کہ اس کا وجود دولت آصفیہ کے لیے بے سود ہے۔ اس سے انگریزی حکومت کو کتنا ہی فائدہ کیوں نہ ہو لیکن دولت آصفیہ کو کوئی فائدہ نہیں جو اس کے اخراجات کا بار اٹھانے پر مجبور ہے۔[1] کنٹنجنٹ کا قیام کسی معاہدے کے ذریعے وجود میں نہیں آیا بلکہ ریزیڈنٹ اور راجا چندو لال کے درمیان سمجھوتے کا نتیجہ ہے جسے انگریزی حکومت کی حمایت حاصل تھی اور جو خود اپنی حفاظت کے لئے انگریزی فوج کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ کنٹنجنٹ کے افسروں کو ان کی تنخواہ کے علاوہ الاونس بھی دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں ان الاونسوں کی مقدار ساڑھے تیرہ لاکھ روپیے تھی۔ معمولاً کنٹنجنٹ کی وجہ سے ۳۸ لاکھ روپیے سالانہ سرکار عالی کو خرچ کرنا پڑتا تھا حالانکہ اعانتی فوج کے اخراجات کے ضمن میں سرکار نظام میسور کی آخری جنگ کے بعد ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے بموجب انگریزی حکومت کو علاقے سپرد کر چکی تھی۔

اندرونی انتظام | اگرچہ لارڈ ہیسٹنگز کو اپنے عہد حکومت میں زبردست

[1] Memoirs and Correspondence of General Fraser, p 74-76

فوجی مہموں کا انتظام کرنا پڑا اور توسیع مملکت کے منصوبے سوچنے پڑے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اندرونی انتظام کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی۔ اس نے حکومت ہند کی مالی حالت کو باوجود ان چڑھائیوں کے جو گرکھوں، پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف کرنی پڑیں کبھی خراب نہ ہونے دیا۔ حکومت ہند کی مالی ساکھ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کے تمسکات جن کی قیمت لارڈ ہیسٹنگز کے اپنے عہدہ گورنر جنرلی کا جائزہ لیتے وقت بارہ روپیہ سیکڑے کا بٹہ کھا رہی تھیں اس کی ہندوستان سے روانگی کے وقت چودہ روپیہ بڑھوتری پر فروخت ہورہی تھیں۔ اس کے عہد میں حکومت ہند کی آمدنی میں چھ کروڑ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا اور مستقل مصارف تقریباً چار کروڑ بڑھے اس طرح دو کروڑ سالانہ کی بچت ہونے لگی۔ پیشوائی کے خاتمے کے بعد احاطۂ بمبئی میں نہایت زرخیز زمینیں شامل کی گئیں۔ مدراس میں سرٹامس منرو نے رعیت واری طریقہ مالگزاری کے وصول کا رائج کیا۔ لارڈ ہیسٹنگز دوامی بندوبست کی خوبیوں کا قائل نہ تھا لیکن بنگال بہار اور اوڑیسہ میں یہ طریقہ ایسا ٹھوس بنیاد پر قائم تھا کہ اس میں ترمیم ممکن نہ تھی۔ اگرچہ وہاں بھی دوامی بندوبست کے مستقل انتظام کے ایسے قاعدے اور ضابطے نافذ کئے گئے جن کے بموجب کاشتکاروں کو موروثی حق حاصل ہوگیا۔ ان قاعدوں کی وجہ سے زمیندار اُن موروثی کاشت کاروں کو اپنی زیر کاشت زمین سے بے دخل نہیں کرسکتا تھا جو پابندی سے لگان ادا کرتے ہوں۔ موروثی زمینوں پر لگان میں اضافہ صرف خاص حالات میں ممکن تھا۔ ان قاعدوں سے دوامی بندوبست کی خرابیوں کو تھوڑا بہت کم کرنے کی کوشش کی گئی۔

لیکن ان سے اس انتظام میں کوئی بنیادی تبدیلی ممکن نہ تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں اس بات پر نظم و نسق کے بڑے ماہروں کو شبہ ہونے لگا تھا کہ دوامی بندوبست تمام ہندوستان کے لئے مالگذاری وصول کرنے کا

بہترین طریقہ ہے۔ بورڈ آف کنٹرول نے بھی حکومت ہند کو ہدایت کی تھی کہ دوامی بند وبست کے طریقے کو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں نافذ نہ کیا جائے بلکہ ہر جگہ کے مقامی حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کے لئے موزوں طریقہ کار تجویز کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں سر تھامس منرو نے مدراس میں رعیت واری طریقہ رائج کیا۔ اس طریقہ میں یہ ہوتا تھا کہ ہر کھیت کی مقررہ شرح کے مطابق تشخیص کی جاتی تھی۔ ہر کھیت کا قابض براہ راست حکومت کو تشخیص شدہ رقم ادا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ جب تک وہ مقررہ رقم حکومت کو ادا کرتا رہے اس وقت تک اس کو حکومت بھی بے دخل نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں اس کو خود یہ اختیار تھا کہ اپنے زیر تصرف علاقے میں سے کسی علاقے سے دستبردار ہو جائے۔ اگر وہ اس زمین کو زرخیز بنانے کے لئے اپنا سرمایہ لگاتا تاکہ کھیت کی پیداوار میں اضافہ ہو تو ایسی صورت میں حکومت اپنی مقررہ رقم میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ منرو نے کارنوالس کے خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ تجربہ نے انھیں مفید نہیں ثابت کیا اس لئے ان پر ملک کے دوسرے حصوں میں عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رعیت واری طریقے میں یہ سہولت تھی کہ رعایا کا حکومت سے براہ راست تعلق قایم ہو جاتا تھا اور زمیندار کے درمیانی وسیلہ کی حاجت نہیں رہتی تھی۔ جس طرح منرو نے مدراس میں رعیت واری طریقہ رائج کیا اسی طرح ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے بمبئی کے صوبے میں اس طریقے کو نافذ کیا جس سے رعایا کو بہت فائدہ ہوا۔

لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں ہندوستانی منصفوں اور صدر امینوں کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ کارنوالس نے کلکٹر اور مجسٹریٹ کے اختیارات الگ الگ کر دئے تھے تاکہ عدالتی انتظام اور مالگزاری کا انتظام گڈمڈ نہ ہو لیکن مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد میں کلکٹر کو عدالتی اختیارات پھر حاصل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کلکٹر کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ۱۷۹۳ء میں اس کے اختیارات جو گھٹا دئے گئے تھے اور بعض صورتوں میں چھین لئے گئے تھے وہ پھر دوبارہ اس کو حاصل ہو گئے۔ گاؤں میں پنچایت اور چوکیداری کے طریقے کو رائج کیا گیا۔ ضلع کے ججوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ پٹواری اور قانون گو کے عہدے دوبارہ

قایم کئے گئے تاکہ رعایا سے مالگزاری وصول کرنے میں سہولت ہو۔ آگرہ کے صوبے میں نئے اصول پر بندوبست کیا گیا۔ جس میں اگرچہ زمیندار کا وسیلہ باقی رہا لیکن یہ بندوبست دوامی نہیں تھا بلکہ اس میں آئندہ تبدیلی ممکن تھی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے تحت سرجان مالکم سر تھامس منرو سر تھامس منکاف اور ادنٹ اسٹورٹ الفنسٹن کے سے قابل عہدہ دار موجود تھے جنھوں نے برطانوی انتظام میں بہتری پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز میں اگرچہ وارن ہیسٹنگز یا لارڈ ولزلی کی سی جدت نہ تھی لیکن اس کی اعلیٰ درجہ کی توجہ اور انتظامی قابلیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ انگریزوں میں سب سے زیادہ اولوالعزم اور کامیاب گورنر جنرلوں میں بجا طور پر شمار کیا جاتا تھا۔ وہ نہایت محنتی تھا اور عام طور پر روزانہ آٹھ گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ نو سال تک برابر اس نے اسی طرح کام کیا۔ پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف اس نے جس وسیع پیمانے پر فوج کشی کا خاکہ تیار کیا اس کی مثال برطانوی ہند کی فوجی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ اس نے نہ صرف منصوبہ تیار کیا بلکہ اس کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ بھی پہنایا۔ اس کے زمانے میں پہاڑی آرام گاہیں نہ تھیں جیسی کہ بعد میں بنائی گئیں جہاں موسم گرما گزارنے کے لیے گورنر جنرل اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار جایا کرتے ہیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے شہر کلکتہ کو خوشنما بنانے کی طرف خاص توجہ کی۔ سڑکیں چوڑی کی گئیں بیچ بیچ میں چوراہے اور فوارے بنائے گئے اور شہر کی صفائی اور رونق بڑھانے کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے انگریزی اخباروں کو حکومت پر رائے زنی کرنے کی اجازت دی جو یقیناً ایک لبرل قسم کا اقدام تھا۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز نے پامر اینڈ کمپنی کے معاملہ کی وجہ سے استعفا دے دیا اور انگلستان روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس مالکان (کورٹ آف پروپرائٹرز) میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مارکوئس آف ہیسٹنگز کی خدمتوں کا اعتراف کرنے کے ضمن میں اس کے لئے زر نقد کی صورت میں بھی کچھ رقم منظور کرنی چاہیے۔ اس تجویز کے پیش ہونے پر

مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ آخر مجلس انتظامیہ کے صدر مسٹر رسل کی یہ ترمیم منظور ہوئی کہ "اگرچہ گورنر جنرل کی نیت کو کسی بد دیانتی سے منسوب کرنے کے وجوہ موجود نہیں ہیں۔ مگر مجلس مالکان (کورٹ آف پروپرائٹرز) ان تمام مراسلت سے اتفاق رائے ظاہر کرتی ہے جو مجلس نظماء سے حیدر آبادی لین دین کے معاملہ کے متعلق لارڈ ہیسٹنگز کو بھیجے تھے۔ ان مراسلوں میں لارڈ ہیسٹنگز پر صاف صاف الزام لگایا گیا تھا" کہ اس نے پامر اینڈ کمپنی کے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے کمپنی کے اثر و اقتدار کو استعمال کیا جو ایسے شخص کے لئے جو گورنر جنرل کے اعلیٰ عہدہ پر کمپنی کی طرف سے مامور ہو زیب نہیں دیتا۔ غرضکہ بجائے انعام ملنے کے لارڈ موصوف کو لعنت کا سزاوار قرار دیا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول نے لارڈ ہیسٹنگز کی قابلیت اور تندہی کا اعتراف کیا۔ حکومت انگلستان نے اس کو ۱۸۲۴ء میں مالٹا کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد نیپلز کے سمندر کے قریب اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۲۶ء میں حکومت وقت نے اس کے خاندان کو بیس ہزار پونڈ کا عطیہ دیا تاکہ اس لعنت و ملامت کی تھوڑی بہت تلافی ہو سکے جو اس کے خلاف ہوئی تھی۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز کے استعفے کے بعد مجلس نگران نے جارج کیننگ کو اس کا جانشین نامزد کیا لیکن وہ انگلستان سے روانہ ہونے والا ہی تھا کہ لارڈ لنڈن ڈیری کا انتقال ہو گیا اور اسکو وزارت خارجہ کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ نئے گورنر جنرل کے ہندوستان پہنچنے تک مسٹر ایڈم نے جو گورنر جنرل کی کونسل کے سینیر رکن تھے گورنر جنرل کے فرائض انجام دئے۔ اس نے پریس کی آزادی پر پابندیاں لگائیں تاکہ حکومت پر نکتہ چینی نہ کی جا سکے۔ لارڈ ایمہرسٹ یکم اگست ۱۸۲۳ء کو بہ حیثیت گورنر جنرل ہندوستان پہنچ گیا۔ وہ دربار چین میں انگریزی سفیر کی خدمت انجام دے چکا تھا اور مشرقی سیاست کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے اس انتظام کی ذمہ داری سنبھالی ہی تھی کہ اسے برما کی سیاست میں الجھنا اور اعلان جنگ کرنا پڑا

پہلی جنگ برما النگ پایا نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں برما میں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا صدر مقام آوا تھا۔ بنگال اور برما کے درمیان جو قبائلی علاقے تھے ان کی سرحد کے متعلق حکومت برما میں کچھ عرصے سے اختلاف چلا آتا تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے زمانے میں حکومت برما نے مطالبہ کیا کہ ڈھاکہ، مرشد آباد اور چٹاگانگ برما کے حکمران کو واپس دینا چاہئے۔ یہ دعویٰ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ گزشتہ زمانے میں اراکان کے حکمرانوں نے بنگال کے بعض مشرقی علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ لیکن چونکہ مارکوئس آف ہیسٹنگز دوسرے اہم مسائل کے حل کرنے میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ وہ برما کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ دونوں حکومتوں میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کاچھار کی ریاست کو انگریزی حکومت نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ حکومت برما کو یہ ناگوار تھا۔ چنانچہ حکومت برما کی فوجوں نے کاچھار اور اس کے علاوہ منی پور کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ برمی فوجوں کا افسر اعلیٰ مہابندولہ بڑا حوصلہ مند شخص تھا اپنی کامیابیوں سے اس کا اور اس کی فوج کا گھمنڈ بڑھ گیا تھا۔ اس نے چٹاگانگ کے مشرقی ساحل پر جزیرہ شاہ پوری پر بھی قبضہ کر لیا جو انگریزوں کے تحت تھا۔ اس جزیرہ میں جو انگریزی چوکیاں قایم تھیں وہ برطرف کر دی گئیں اور انگریزی جھنڈے کی جگہ حکومت برما کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے یہ خبر سن کر حکومت برما کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزی فوج نے برمی فوج کو شکست دے کر جزیرہ شاہ پوری پر قبضہ کر لیا۔ ادھر مہابندولہ نے چٹاگانگ کے قریب انگریزی سرحد پر حملہ کر دیا۔ مشرقی بنگال میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن مہابندولہ اس جانب رخ نہ کر سکا اس واسطے کہ اسے آوا طلب کر لیا گیا۔

برمی لوگوں کو کبھی اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ انگریزی فوج سمندر کے راستہ سے رنگون پر اتنے جلد پہنچ جائے گی۔ انگریزی فوجوں نے سر آرچی بلڈ کیمپ بل کی سرکردگی میں بے مزاحمت کے رنگون پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چونکہ

بارش کا موسم شروع ہو گیا تھا اس لئے انگریزی فوج کو چھ مہینے رنگون میں ٹھہرنا پڑا۔ بارش کی کثرت کا یہ حال تھا کہ ایسی حالت میں انگریزی فوج کے لئے اندرون ملک بڑھنا ممکن نہ تھا۔ اگست ۱۸۲۴ء میں جب موسم ٹھیک ہوا تو انگریزی فوج نے تناسرم کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ مہا بندولہ ۶۰ ہزار کا لشکر لے کر مقابلے کے لئے بڑھا۔ گھنے جنگلوں اور دلدل کی وجہ سے انگریزوں کو جو اس ملک سے ناواقف تھے بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ برمی فوج نیم مسلح تھی اور قواعد دانی سے بھی ناواقف تھی لیکن وہ بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے جنگل میں مچان بنا لیتے تھے۔ برطانوی فوج کی رسد انھوں نے بالکل بند کر دی۔ مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے انگریزی فوج میں بیماری اور موت کا بازار گرم ہو گیا آب و ہوا کی خرابی اور غذا کی کمی سے سر آرچی بلڈ کیمپ بل کی گیارہ ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار ایسے بچے جو کام کے قابل تھے۔ اس اثنا میں کلکتہ سے کمک پہنچ گئی اور انگریزوں نے پیگو پر قبضہ کر لیا۔ دونابیو کے مقام پر سر کیمپ بل نے مہا بندولہ کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ اس خبر سے برمی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ انگریزی فوج نے آگے بڑھ کر پروم پر بھی قبضہ کر لیا۔

لارڈ ایمہرسٹ نے بڑی عقلمندی کی کہ برمی فوج کا دھیان بٹانے کے لئے اس نے اراکان کی طرف خشکی کے راستے سے جنرل رچارڈس کی سرکردگی میں لشکر روانہ کر دئے تھے۔ ایک لشکر کاچھار اور منی پور کی طرف سے بڑھا اور دوسرا سیدھا اراکان کی طرف روانہ ہوا۔ آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے ان لشکروں کے بہت سے آدمی ضائع ہو گئے

اگرچہ برمی فوجوں کی اس لشکر کشی کی وجہ سے دھیان کچھ ضرور بٹا لیکن انگریز کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل کر سکے۔ سر آرچی بلڈ کیمپ بل کو دونابیو کی کامیابی کے بعد مزید کمک اور سامان رسد پہنچ گیا۔ چنانچہ انگریزی فوج برما کے صدر مقام آوا کی طرف بڑھی۔ لارڈ ایمہرسٹ

سے سر آرچی بلڈ کیمپ بل کو ہدایت کردی تھی کہ برمیوں میں صلح کا میلان پایا جائے تو اس کا خیر مقدم کرتا۔ لیکن شاہ برما کو معلوم ہوا کہ وہ جو برابری کا معاہدہ کرنا چاہتا ہے وہ ممکن نہیں تو اس نے انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کی آخری کوشش کی۔ چالیس ہزار کی ایک فوج نے پردم پر چڑھائی کردی مگر اس فوج کو انگریزوں نے شکست فاش دی۔ انگریزی فوجیں جب شاہ برما کے صدر مقام سے چالیس میل مقام یندبو پر جا پہنچیں تو برمیوں نے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ ۲۴ فروری ۱۸۲۶ء کو صلح نامے پر دستخط ہو گئے۔ اس کی رو سے طے ہوا کہ آئندہ سے شاہ برما منی پور، کاچھار اور آسام کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ اراکان اور تناسرم کے ساحلی صوبے انگریزوں کو حوالے کئے جائیں گے۔ تمام قیدیوں کو دونوں طرف سے رہا کیا جائے گا۔ شاہ برما ایک کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرے گا۔ دربار آوا میں انگریزی ریزیڈنٹ رہا کرے گا۔ غرضکہ ان شرطوں سے انگریزوں نے برما کے ساحلی علاقہ پر اپنے قدم جمالئے۔ رنگون شاہ برما کو واپس کردیا گیا۔ لیکن ساحلی علاقے پر قبضہ حاصل ہو جانے سے انگریزی تجارت کے لئے دروازہ کھل گیا۔

بارکپور کی بغاوت بنگال میں بارکپور کے مقام پر جو ہندوستانی فوج تھی اس نے برمائی جنگ میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا اس لئے کہ اسے اپنی تنخواہ کی کمی کی شکایت کے ساتھ یہ بھی شکایت تھی کہ کسی دوسری جگہ جانے میں باربرداری کا خرچ سپاہیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو تنخواہ کی کمی دوسرے باربرداری کا خرچ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہی کو بہت کم بچتا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسر اعلیٰ کے پاس مودبانہ محضر پیش کیا اس میں اپنی دشواریوں کی نسبت توجہ دلائی۔ افسر اعلیٰ نے بجائے اس کے کہ اس معقول مطالبے پر غور کرتا اسکو سرکشی پر محمول کیا۔ محضر روانہ کرنے والوں کو اطلاع دے دی گئی کہ انہیں حکومت

سے کسی قسم کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ سپاہیوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوگیا اور انھوں نے قسمیں کھائیں کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ اپنے مطالبات سنوا کر رہیں گے اور جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جائیں گے اس وقت تک برما کوچ نہیں کریں گے۔ کمانڈر ان چیف نے دو گورہ پلٹنوں کے ذریعہ ہندوستانی سپاہیوں پر جبکہ وہ پریڈ کے لئے جمع تھے توپوں کے منہ کھول دئے۔ بہت سے حواس باختہ ہوکر بھاگے اور بہت سارے مارے گئے۔ سپاہیوں کے سرغنوں کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی ان سپاہیوں کے پاس اگرچہ کارتوس موجود تھے لیکن انھوں نے اپنی بندوقوں کو بھرا نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ مقابلہ کرنے کا نہیں تھا۔ بعد میں جو فوجی تحقیق کی گئی تحقیق کرنے والوں نے یہ رائے قایم کی کہ سپاہیوں کی ذہنیت بس باغیانہ ہو چکی تھی کہ اس وقت سوائے فوجی کارروائی کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ تحقیق کرنے والے فوجی تھے اس لئے وہ اپنے محکمہ کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتے تھے۔ بلاشبہ لارڈ ایمہرسٹ پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ اس نے ہندوستانی سپاہیوں کے جائز مطالبوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا ورنہ ان کی شکایتیں اس قدر معمولی اور معقول تھیں کہ اگر معاملہ فہمی سے کام لیا جاتا تو خونریزی کی نوبت نہ آتی

بھرت پور

۱۸۲۴ء میں جب بھرت پور کے راجا بلدیو سنگھ کی حالت خراب ہوئی تو اس نے دہلی کے انگریز ریزیڈنٹ سر اکٹرلونی کو بلاکر وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے کمسن بیٹے بلونت سنگھ کو راج گدی ملنی چاہئے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کا بھتیجا درجن سال گدی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی واسطے وہ انگریزی حکومت کو بیچ میں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا اندیشہ درست نکلا۔ اس کے انتقال پر درجن سال نے فوج کو اپنے قابو میں لے کر کمسن بلونت سنگھ کو بھی نظر بند کر لیا۔ سر ڈیوڈ اکٹرلونی نے درجن سال کی اس پوری کارروائی کو ناجائز

قرار دیا۔ اگرچہ درجن سال نے اب تک یہی دعوے کیا تھا کہ وہ کمسن راجا کا ولی بن کر حکومت کا انتظام سنبھالنا چاہتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی نیت درست نہیں تھی۔ اکٹرلونی کو یہ خطرہ تھا کہیں وہ نوجوان راجا کو قتل نہ کردے چنانچہ اس نے اعلان کردیا کہ درجن سال کی حرکت سراسر ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ سولہ ہزار انگریزی فوج سو توپوں کے ساتھ بھرت پور کی طرف روانہ کردی گئی تاکہ حقدار کو اس کا حق دلوائے۔ لارڈ ایمہرسٹ کو اکٹرلونی کی یہ کارروائی ناگوار گذری اور اس نے اپنے خیالات ایسے تحکمانہ لہجے میں ظاہر کئے جو اکٹرلونی کو سخت ناگوار گزرے۔ گورنر جنرل چاہتا تھا کہ جو فوج بھرت پور بھیجی گئی ہے وہ فوراً بلالی جائے لیکن اکٹرلونی اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے گورنر جنرل کو نہایت تلخ جواب دیا اور اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگیا۔ اس کو اپنی ذلت کا ایسا صدمہ ہوا کہ دو مہینے بعد وہ میرٹھ میں انتقال کرگیا۔

سر ڈیوڈ اکٹرلونی نے جب انگریزی فوج بھرت پور بھیجی تو درجن سال نے اعلان کردیا کہ وہ مدارالمہامی کے فرائض ادا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں لیکن جب لارڈ ایمہرسٹ کے حکم سے انگریزی فوج واپس بلالی گئی تو اس نے گدی پر اپنا دعوے قایم کیا اور اپنے ہم خیال امیروں اور فوجی افسروں کو آمادہ کرلیا کہ اس کی تائید کریں۔ چنانچہ بہت کافی فوج اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ اس زمانے میں سر ڈیوڈ اکٹرلونی کی جگہ سر چارلس مٹکاف دہلی کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تھا اس نے کلکتہ جاکر گورنر جنرل کو بتایا کہ کمپنی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ محض غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے طوائف الملوکی کو دیکھے اور ملک کو اس قتل اور لوٹ مار کے بھوت کے حوالے کردے جس سے اس نے بڑی محنت سے نجات دلائی ہے۔ سر چارلس مٹکاف کا خیال تھا کہ اگر بھرت پور کو انگریزوں نے فتح کرلیا تو انھیں اہل ہند کی نظروں میں وہ عزت و احترام حاصل ہوجائے گا جسے وہ جنرل لیک کے زمانے میں ناکام رہ کر کھو چکے تھے

اور لوگوں کے دلوں پر جس کا نقش اب تک موجود تھا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے مٹکاف کی تائید کی اور یہ طے ہوا کہ اگر فہمایش سے کام نہ چلے تو درجن سال کو راہ راست پر لانے کے لئے فوج کشی کی جائے۔

چنانچہ مٹکاف کے حکم سے بیس ہزار فوج اور سو قلعہ شکن توپیں بھرت پور روانہ کر دی گئیں۔ لارڈ کمبر میر کمانڈر ان چیف نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں اپنا مستقر بھرت پور کے قلعے کے سامنے قایم کیا۔ کئی دن تک گولہ باری کی گئی آخر کار ایک بڑی زبردست سرنگ میں ساڑھے بارہ من بارود بھر کر آگ لگا دی گئی۔ ایسا زبردست دھاکہ ہوا کہ قلعہ کی فصیل اڑ گئی۔ درجن سال نے مقابلہ کیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اب اس نے بچ کر نکل جانا چاہا لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ اور بنارس بھیجکر پانچ سو روپیہ ماہوار اس کا وظیفہ کر دیا گیا۔ وہ پچیس سال تک وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندہ رہا۔ سر چارلس مٹکاف اور لارڈ کمبر میر نے کمسن بلونت سنگھ کو گدی پر بٹھا دیا۔ لیکن قلعہ کی فتح کے بعد فاتحوں نے ریاست کے خزانے اور زر و جواہر پر قبضہ کر کے مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر لیا۔ لارڈ کمبر میر کے حصہ میں چھ لاکھ کی رقم آئی۔ بھرت پور کی تسخیر سے کمپنی کا رعب سارے راجپوتانہ میں قایم ہو گیا۔

برما کی کامیابی کے صلہ میں لارڈ ایمہرسٹ کو ارل کے منصب عالی سے سرفراز کیا گیا۔ اگرچہ وہ ذہن اور سیرت کی صلاحیتوں کے مد نظر بلند خصوصیتیں نہیں رکھتا تھا لیکن چونکہ برما کی جنگ باوجود شروع کی ناکامیوں کے کئی سال بعد کامیابی کے ساتھ اس کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچی اس لئے مجلس نظما اور انگلستان کی حکومت وقت نے اس کو خطاب سے سرفراز کیا۔ اس کے عہد میں جو اندرونی انتظام کی ترقی ہوئی اس میں دراصل اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ مدراس میں سر تھامس منرو اور بمبئی میں مسٹر الفنسٹن کی کوششوں کی بدولت انتظامی اصلاحیں ہوئیں۔ جنگ برما کی وجہ سے حکومت ہند کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اس پر دس کروڑ قرض کا اضافہ ہو گیا تھا۔ لارڈ ایمہرسٹ

فروری ۱۸۲۸ء میں انگلستان روانہ ہو گیا اور گورنر جنرل کی کونسل کے سینیر رکن مسٹر بیل نے لارڈ ولیم بنٹنک کے آنے تک حکومت ہند کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا۔

بارھواں باب

لارڈ ولیم بنٹنگ اور ملکی اصلاحیں

۱۸۰۶ء میں جب ویلور میں بغاوت ہوئی تو اس وقت لارڈ ولیم بنٹنگ احاطۂ مدراس کا گورنر تھا۔ مجلس نظماء نے اس کو اس لئے گورنری کے عہدہ سے ہٹا دیا کہ بے اس کے کمپنی کی حکومت پر رعایا کو بھروسا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس معزولی سے بنٹنگ کے احساسات کو بڑا دکھ ہوا اور اس نے مجلس نظماء کے سامنے اپیل بھی کی۔ چنانچہ مجلس نظماء نے اپنے فیصلہ کو حق بجانب بتایا لیکن ساتھ ہی بنٹنگ کی بے لوثی راست بازی اور خدمت خلق کے شوق کا اعتراف کرتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ مدراس کی گورنری سے معزولی اس کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں سمجھا جائے گا اور حکومت انگلستان ملک اور قوم کے نفع کی خاطر اس کو کسی دوسری موزوں خدمت پر مامور کردے گی۔ چنانچہ اس کو اسپین اور اٹلی میں اہم فوجی خدمتیں سپرد کی گئیں جنہیں اس نے بڑی قابلیت اور محنت سے انجام دیا۔ بعد میں ۱۸۲۷ء میں اس نے لارڈ ایمہرسٹ کے عہد حکومت کے ختم ہونے پر ہندوستان کی گورنر جنرلی کا عہدہ قبول کرلیا اور جولائی ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچ گیا۔

میزانیہ کا توازن

لارڈ ولیم بنٹنگ لبرل خیالات کا شخص تھا۔ وہ جنگ

اور ملک گیری سے زیادہ انتظامی اصلاحات کو اہمیت دیتا تھا۔ اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد سب سے پہلے اس نے حکومت ہند کی مالی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ جنگ برما کی وجہ سے حکومت ہند کا خزانہ دس کروڑ روپیے کے قرضے سے زیر بار تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ کے عہد حکومت میں انتظام کی توسیع کی وجہ سے بھی اخراجات بڑھ گئے تھے اور حکومت ہند کے میزانیہ میں ایک کروڑ سالانہ کا گھاٹا برابر کئی سال سے آرہا تھا۔ چنانچہ بنٹنگ نے سول اور فوجی محکموں میں تخفیف مصارف کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے دو کمیٹیاں مقرر کیں تاکہ اس ضمن میں پوری چھان بین کے بعد اپنی تجویزیں پیش کریں۔[1] اس سے پہلے کہ فوجی محکمے کے متعلق تحقیق کرنے والی کمیٹی اپنی سفارشیں پیش کرے مجلس نظما (بورڈ آف ڈائرکٹرز) نے فوجی افسروں کے بھتہ کو نصف کرنے کے احکام گورنر جنرل کو بھیج دئے۔ دراصل بھتہ کو کم کرنے کے متعلق مجلس نظما نے مارکوئس آف ہیسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ کے عہد میں بھی احکام بھیجے تھے۔ لیکن ان دونوں نے دوبارہ غور کے لئے ان احکام کو انگلستان واپس کر دیا تھا۔ بنٹنگ چونکہ خود بھی حکومت کے مالی توازن کو قایم کرنے کی تائید میں تھا اس لئے اس نے مجلس نظار کے احکام کی تعمیل کا حکم دے دیا۔ فوجی افسر مدت سے بھتہ کو اپنی تنخواہ کا جزو سمجھنے لگے تھے۔ انھوں نے مجلس نظار کے احکام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ کمانڈران چیف لارڈ کمبرمیر نے احکام کو انصاف کے خلاف ٹھہرایا۔ اس پر مجلس نظار نے یہ تجویز منظور کی کہ اگر کمانڈران چیف نے بطور خود اپنا استعفیٰ داخل نہ کر دیا تو اسے فوراً خدمت سے الگ کر دیا جائیگا۔ چنانچہ لارڈ کمبرمیر مستعفی ہو گئے اور کمانڈران چیف کا عہدہ بھی گورنر جنرل کے عہدہ میں ملا دیا گیا۔ کلکتہ کے انگریزی اخباروں میں بنٹنگ کے خلاف توہین آمیز مضامین شائع ہونے لگے۔ مجبور ہو کر حکومت ہند کو احکام صادر

---

[1] Beveridge, Comprehensive History of India, Vol. III, p 195.

کرنے پڑے کہ اگر کسی اخبار میں آئندہ فوجی افسروں کے بھتہ کے ضمن میں کوئی مضمون یا تنقید شائع ہوگی تو حکومت اس کے خلاف سخت تعزیری کارروائی کرے گی۔ اس سلسلے میں بنٹنگ انگریزی فوجی طبقہ میں بہت بدنام ہوگیا۔ لیکن اس کے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ مجلس نظما کے احکام کو جو تیسری مرتبہ ڈیوک آف ولنگٹن وزیر اعظم انگلستان کے پورے اتفاق رائے کے ساتھ بھیجے گئے تھے کھٹائی میں ڈال دیتا۔ بھتہ کے علاوہ سپاہیوں کی تعداد میں کمی کی گئی اور اس طرح فوجی اخراجات میں تقریباً ایک کروڑ روپے سالانہ کی بچت نکالی۔ سول محکموں میں بھی تخفیف ہوئی۔ بعض سررشتے توڑ دئے گئے اور بعض صورتوں میں کئی سررشتے ملاکر ایک عہدہ دار کے تحت کر دئے گئے۔ اس طرح سول محکموں کے اخراجات میں چھ فی صدی کی کمی ہوئی۔

فوجی اور سول محکموں کے اخراجات میں تخفیف کے علاوہ بنٹنگ نے حکومت کی آمدنی بڑھانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ رابرٹ برڈ کی نگرانی میں شمال مغربی صوبے کے زرخیز علاقوں میں مالگزاری کی جدید تشخیص کرائی گئی اور اس طرح آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اس صوبے کے انتظام مالگزاری کے لیے الہ آباد میں ایک علحدہ بورڈ آف ریونیو قائم کیا گیا۔ لارڈ ولزلی نے جب ان علاقوں کا الحاق کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ دس سال بعد وہاں بھی دوامی بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن مجلس نظما نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بنٹنگ نے تیس سال کے لئے جمع بندی کا ضابطہ نافذ کیا۔ اس انتظام کی خوبی اس کی سادگی میں مضمر تھی۔ پنج سالہ بندوبست کی وجہ سے جس کی مجلس نظما نے اجازت دی تھی کاشتکار زمین کو زرخیز بنانے پر روپیہ خرچ کرنے کو حماقت سمجھتا تھا۔ جب بندوبست کی تجدید کا وقت آتا تھا تو کنویں اور زیر کاشت رقبہ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دئے جاتے تھے۔ بنٹنگ نے پنج سالہ بندوبست اور دوامی بندوبست دونوں کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے تیس سالہ بندوبست

کا ضابطہ نافذ کیا جو نتیجے کے اعتبار سے کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ ان زمینوں پر بھی لگان عاید کیے گئے جو اب تک عطیوں یا معافیوں کے نام سے ہر قسم کے سرکاری مطالبوں سے مستثنیٰ رہی تھیں۔ اگرچہ کارنوالس کے عہد سے اس قسم کی معافیوں اور عطیوں کے متعلق مال کے افسروں کو تحقیق کرنے کی تاکید کی گئی تھی لیکن اس ضمن میں ہر ہر قدم پر ایسی دشواریاں پیش آئیں کہ کام کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بنٹنگ کے ہندوستان آنے سے چند ہفتے پہلے حکومت ہند نے مال کے افسروں کی ایک کمیٹی مقرر کردی تھی تاکہ وہ عطیوں اور معافیوں کے جھگڑوں کی اپیل سنے اور فیصلہ کرے جو قطعی سمجھا جائے گا۔ بنٹنگ نے کمیٹی کے کام میں جس دلچسپی کا اظہار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام عرصے سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا وہ بہت جلد تکمیل کو پہنچنے لگا۔ عام طور پر زمینوں کے قبضے والوں کو بے دخل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان پر مالگزاری عاید کردی جاتی تھی جس کی وجہ سے حکومت کی آمدنی میں کم و بیش ۳۰ لاکھ روپیے سالانہ کا اضافہ ہوا۔ افیون کے ٹھیکہ سے بھی آمدنی بڑھائی گئی۔ وارن ہیسٹنگز اور سر جان شور کے عہد سے بنگال میں افیون بیچنے کا ٹھیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے جب وسط ہند کے وسیع علاقوں میں امن و امان قایم کیا تو وہاں افیون کی کاشت بڑے پیمانے پر ہونے لگی اس واسطے کہ یہاں کی زمین اس کے لئے خاص طور پر موزوں تھی۔ چنانچہ وسط ہند اور مالوہ کے دیسی والیان ملک کے علاقوں سے افیون کی بڑی مقدار دیو اور دامن کے پرتگیزی بندرگاہوں کو جانے لگی جہاں سے پرتگیز جہاز راں اسے چین لے جاکر بیچتے تھے۔ یا دیسی تاجر راجپوتانہ کے ریگستانی راستوں سے افیون کی بڑی مقدار صندوقوں میں بھر بھر کے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچا دیتے تھے جو اس وقت امیران سندھ کے تحت تھا۔ یہاں پرتگیزی تاجر خریدنے کو موجود رہتے تھے۔ اس طرح کمپنی کو تجارتی مقابلہ کے سبب چین کے بازاروں میں افیون کی تجارت میں نقصان ہو رہا تھا اور وہ من مانے دام نہیں حاصل کرسکتی تھی۔ لارڈ ایمہرسٹ کے زمانے میں

ہلکر سے افیون کی کاشت اور فروخت کے متعلق سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ لیکن سندھیا اور راجا جے پور نے اس قسم کا کوئی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بنٹنگ یہ نہیں چاہتا تھا کہ افیون کی تجارت کے سلسلے میں حکومت ہند کوئی ایسی کارروائی کرے جو وسط ہند اور راجپوتانہ کے والیان ملک کو ناگوار گزرے۔ سرجان مالکم کی تجویز کے بموجب آخر یہ سمجھوتہ ہوا کہ وسط ہند اور راجپوتانہ سے جو افیون کراچی بھیجی جاتی ہے وہ سب بمبئی بھیجی جائے جہاں تاجروں کو اختیار ہوگا کہ چاہیں تو کمپنی کے ہاتھ افیون فروخت کر دیں اور چاہیں براہ راست برآمد کریں چونکہ کراچی بھیجنے میں خرچ زیادہ پڑتا تھا اور اس کے مقابلہ میں بمبئی تک لانے میں نسبتہً کم خرچ ہوتا تھا اس واسطے لازم قرار پایا کہ افیون کے تاجر مقررہ وزن کے ہر صندوق پر اجازت نامہ کی فیس ادا کریں جو کسی حالت میں بھی اس رقم سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے جو کراچی بھیجنے کی صورت میں زیادہ خرچ کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح افیون کی خرید فروخت پر کمپنی کو قابو حاصل ہوگیا اور حکومت کے خزانہ میں بھی اضافہ ہوا۔ دیسی ریاستوں کو بھی اس کی شکایت کا موقع نہ رہا کہ ان کے اندرونی معاملوں میں کمپنی دخل دیتی ہے۔[1]

عدالتی انتظام

صوبہ جاتی عدالتوں کا انتظام عرصے سے اصلاح طلب تھا۔ خاص کر صوبۂ شمال مغربی کی عدالتوں کے اعلیٰ حکام سال میں دو مرتبہ دورہ پر جاتے تھے۔ سوائے چند مستثنیٰ حکام کے اکثر حکام بے پروائی سے معاملات کی تحقیقات کرتے تھے۔ ملزموں کو دورہ پر آنے والے حکام کے انتظار میں مہینوں حوالات میں رکھا جاتا تھا۔ حکام کی بے پروائی کی وجہ سے ان کے فیصلے اکثر متضاد ہوتے تھے جن کے سبب سے ماتحت عدالتوں کے لئے سخت پریشان کن نظیریں قائم ہو جاتی تھیں۔ ان عدالتوں میں انصاف رسانی میں دیر لگتی تھی اور دادرس زیر بار ہوتے تھے۔ بنٹنگ نے ان عدالتوں کو موقوف کر کے مقامی عدالتیں قایم کیں اور ان پر ججوں کو

---

[1] Beveridge, III, p. 199

مقرر کیا۔ ان ججوں کی نگرانی کے لئے کمشنروں کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا جو خود دورے کرکے رعایا کی ضرورتوں اور شکایتوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے۔ کارنوالس کو ہندوستانیوں پر بھروسا نہیں تھا اس لئے اس نے تمام اعلیٰ انتظامی عہدوں پر انگریزوں کو رکھا تھا۔ بنٹنگ نے محسوس کیا کہ نظم ونسق میں کارکردگی بڑھانے کے لئے اعلیٰ عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس نے ان نئے عہدوں پر قابل ہندوستانیوں کو مقرر کیا۔ خاص طور پر عدالتی انتظام میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے اس لئے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی رسموں، رواج اور قانون کو بہتر سمجھ سکتے تھے۔ اس اصلاح سے یہ فائدہ ہوا کہ کام جلد ہونے لگا اور انتظامی اخراجات بھی زیادہ نہیں پڑے اس لئے کہ ہندوستانی عہدہ دار مقابلتہً کم تنخواہ پر قناعت کرتے تھے۔ بنٹنگ نے مقامی ابتدائی عدالتوں کے اختیارات میں اضافہ کردیا تاکہ اہل معاملہ کو آسانی ہو اور ان کی اپیل کے لئے الہ آباد میں ایک صدر عدالت قایم کردی۔ ہندوستانیوں کو انتظامی شعبوں کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنے میں سرچارلس مٹکاف کی رائے کا بھی بنٹنگ پر بڑا اثر ہوا۔ مٹکاف کا خیال تھا کہ "اہل ہند کے لئے موجودہ حالات میں بہترین طریق حکومت وہ ہے جس میں سادگی ہو اور مصنوعی ادلوں سے پاک ہو۔ اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے بہترین طریق حکومت وہ ہے جس میں تصادم کے عناصر بالکل نہ ہوں اور حکومت کی وحدت برقرار رہے۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ ہر ضلعے میں دیسی عہدہ داروں کو مقرر کیا جائے۔ ان کی نگرانی انگریز حکام کریں جن کے تحت عدالت، مال اور پولیس کے محکموں کی شاخیں ہوں جو ضلع میں پھیلی ہوئی ہوں۔ ان انگریز حکام کے اوپر کمشنر ہوں اور کمشنروں کے اوپر ایسے بورڈ جو براہ راست حکومت کے تحت ہوں اور اس سے راست تعلق رکھتے ہوں"۔ مٹکاف کا بھی بنٹنگ کی طرح یہ خیال تھا کہ انگریز قوم کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہندوستان میں ایسی حکومت قایم کرے جو رعایا کی

بھلائی کا پورا دھیان رکھے۔ سر چارلس مٹکاف کو ہندوستان کے حالات کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ بنٹنگ نے اس تجربہ سے اپنے اصلاحی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

ستی کی رسم کی موقوفی

ستی کی رسم ہندوستان میں قدیم سے رائج تھی۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں اس کی روک تھام کی کوشش کی گئی لیکن پوری طرح یہ رسم مٹ نہ سکی۔ فرانسیسی سیاح تیورنئیر نے جو اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ مغل حکام نے اس رسم کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن پھر بھی چھپے چوری سے ستی کی رسم منائی جاتی ہے اور بیوہ اپنے شوہر کے مرنے پر زندہ آگ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اطالوی سیاح منوچی نے بھی جو اسی زمانے میں ہندوستان آیا تھا لکھا ہے کہ اورنگ زیب کا حکم تھا کہ کسی عورت کو زندہ نذر آتش ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ لیکن مغل سلطنت کے زوال کے بعد ستی کی رسم ملک بھر میں بے روک ٹوک جاری ہو گئی۔ چنانچہ ۱۷۲۴ء میں مارواڑ کے راجا اجیت سنگھ کے انتقال پر ۶۴ عورتیں آگ کی بھینٹ چڑھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ چنانچہ سکھ سرداروں کے انتقال پر کئی کئی عورتیں جل کر بھسم ہو جاتی تھیں اور اس کو ایک قسم کا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں بعض مقامی انگریز عہدہ داروں نے گورنر جنرل کی توجہ اس بری رسم کی روک تھام کے لئے منعطف کرائی۔ ولزلی نے اس معاملہ کو کلکتہ کی عدالت العالیہ کے سامنے پیش کر دیا جس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ چونکہ یہ رسم مذہبی عقیدہ پر مبنی ہے اس لئے اس میں دخل دینا مناسب نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ایسے قاعدے وضع کئے گئے جن کے بموجب اگر بیوہ کی عمر سولہ سال سے زائد ہو اور وہ حاملہ نہ ہو اور مقامی حکام کو اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ اپنی خوشی

---

[1] Tavernier, Travels in India, II, p. 162, 163; Fryer, A New Account, ed. Crooke, (Hakluyt Society); Vol. I, p. 244.

سے ستی ہونا چاہتی ہے تو اسے ستی ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ ستی ہونے کے وقت پولیس کا ایک شخص موجود رہتا تھا تاکہ وہ اطمینان کرے کہ ستی ہونے والی عورت پر دباؤ تو نہیں ڈالا جا رہا ہے۔ لیکن پولیس کی یہ نگرانی محض برائے نام تھی۔ اکثر پولیس کے آدمی کو کچھ لے دے کر خاموش کر دیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۸۱۸ء میں صرف بنگال میں ۸۳۹ ستی کے واقعات ہوئے اور سنہ ۱۸۲۸ء میں ۴۶۳ بیوائیں ستی ہوئیں۔ مسٹر اور نے جو جنوبی بنگال کے کئی ضلعوں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اعلیٰ عہدہ پر کئی سال تک مامور تھا اپنی یادداشت میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ستی خوشی سے بہت ہی کم ہوتی تھی۔ ستی ہونے والی پر ہر قسم کے معاشری اثرات ڈالے جاتے تھے اور اس کو مختلف طریقوں سے اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ وہ بیچاری بوکھلاہٹ میں اپنی رضامندی کا مجبور ہو کر اظہار کر دیتی تھی[۱]۔

بنٹنگ نے سنہ ۱۸۲۹ء میں اپنے مشیروں میں سے بعض کے اختلاف کے باوجود ایک قانون منظور کیا جس کے بموجب ستی کی رسم کو قطعی منع قرار دیا گیا۔ اس قانون میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی کہ جو کوئی کسی بیوہ کو ستی ہونے پر آمادہ کرے گا وہ قتل کا ملزم قرار پائے گا۔ بنٹنگ جانتا تھا کہ ہندوستانیوں کے کسی مذہبی معاملہ میں دخل دینے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے کہ مدراس کی گورنری کے زمانے میں اس کو اس کی نسبت تھوڑا بہت تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے اس موقع پر بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ سر چارلس منکاف اگرچہ بنٹنگ کا اس باب میں ہم نوا تھا لیکن اس کو بھی یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ستی کو قانوناً ممنوع قرار دینے سے شورش نہ ہو جائے۔ انگریزوں میں اس زمانے کے مشہور مستشرق ولسن نے بنٹنگ کے قانون کی صاف طور پر مخالفت کی۔ بنٹنگ نے بڑی عقلمندی یہ کی کہ خود ہندوؤں کے ایک طبقہ کو جو اگرچہ بہت کم تعداد میں تھا اپنا ہم خیال بنا لیا

---

[۱] J. Peggs, India cries to humanity (Second Edition, 1839), p. 14.

تاکہ حکومت پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ وہ رعایا کے مذہبی معاملوں میں دخل دیتی ہے۔ بنگال کے مشہور مصلح راجا رام موہن رائے ستی کی رسم کے خلاف تھے۔ سر چارلس مٹکاف اور بعض دوسرے انگریز عہدہ داروں کو جو عام شورش کا خطرہ تھا وہ درست نہیں نکلا۔ کلکتہ کے بعض کٹر مذہبی ہندوؤں نے اس قانون کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جو رد ہو گئی۔ اس کے بعد لوگ ستی کی موقوفی کے ایسے عادی ہو گئے کہ کسی نے بھی اس رسم کی تائید میں آواز بلند نہیں کی۔ بنٹنگ کی اصلاح سے ہزاروں ہندو بیواؤں کی جان بچ گئی جو اکثر اپنی مرضی کے خلاف آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔

ٹھگی کی روک تھام

ٹھگوں کے جتھے قدیم سے وسط ہند میں موجود تھے۔ لوٹ مار ان کا پیشہ تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے وسط ہند کے پنڈاریوں کا خاتمہ کر دیا تھا جو مسلح فوجی قسم کے ڈاکو تھے لیکن ان کے خاتمہ کے بعد بھی لٹیروں کی ایک اور ٹولی باقی رہی جو ٹھگ کہلائے جاتے تھے۔ ٹھگ مسافروں کو دھوکے سے مار کر ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے۔ یہ لوگ راہ چلتے مسافروں کے دوست بن کر ان کا اعتماد حاصل کر لیتے تھے اور پھر موقع پا کر انھیں بے رحمی سے قتل کر ڈالتے تھے اور گڑھوں میں جو پہلے سے تیار رکھے جاتے تھے انھیں دفن کر دیتے تھے۔ ان کی ٹولیاں بھیس بدل کر وسط ہند اور دکن کے جنگلوں میں ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں۔ ان کے خاص اشارے ہوتے تھے جنھیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ملک میں چونکہ اب تک پولیس کا ایسا انتظام نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے اس لئے ٹھگوں کی دست برد کی پوری طرح روک تھام کرنا دشوار تھا۔ بنٹنگ نے مسٹر سلیمن کو جو ایک نہایت تجربہ کار افسر تھا ٹھگوں کی بیخ کنی کے لیے مامور کیا، اور ایک علٰحدہ محکمہ ٹھگی کے انسداد کے لیے قایم کر دیا۔ ابتدائی چھ سالوں میں ڈیڑھ ہزار ٹھگ پکڑے گئے۔ مسٹر سلیمن اور اس کے عملے نے بڑی محنت اور سرگرمی سے چن چن کر ٹھگوں کو گرفتار کیا اور انھیں سخت سزائیں دیں۔ چھ برس کی مسلسل کوشش کے بعد اودھ سے لیکر حیدرآباد تک کا سارا علاقہ ٹھگوں سے پاک ہو گیا۔

ان کے سرغنوں کو پھانسی دے دی گئی اور نوعمر بچوں کو زراعت کا کام سکھانے کا انتظام کیا گیا تاکہ وہ لوٹ مار کے بجائے آئندہ پرامن زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں۔ بنٹنگ نے یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ ٹھگی کی روک تھام میں خواہ کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف ہو جائے وہ اس سے دریغ نہ کرے گا۔ وہ اپنے اس ارادے میں پوری طرح کامیاب ہوا[1]۔

شاہی منشور کی تجدید ۱۸۳۳ء

۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو شاہی منشور عطا کیا گیا تھا اس کی میعاد ۱۸۳۳ء میں ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء میں پارلیمنٹ نے منتخبہ مجالس مقرر کیں تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کی چھان بین کر کے اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں۔ بادشاہ جارج چہارم کے انتقال، پارلیمنٹ کی برخاستگی اور لارڈ ولنگٹن کی وزارت کی جگہ ارل گرے کی لبرل وزارت کا قیام ایسے واقعات تھے جن کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملوں کی طرف پارلیمنٹ کچھ عرصے تک توجہ نہ کر سکی۔ لیکن اس دوران میں منتخبہ مجالس نے شہادتوں کے ذریعے کافی مواد اکٹھا کر لیا تھا اور کمپنی کے معاملات کے متعلق ملک میں جو رجحان پائے جاتے تھے ان سے وہ بخوبی واقف ہو چکی تھیں۔ آخر ۱۸۳۳ء میں مجلس نظارت کے صدر چارلس گرانٹ نے منشور کی تجدید کا مسئلہ ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا۔ پارلیمنٹ نے خاص طور پر چین کی تجارت کے اجارہ اور ہندوستان میں کمپنی کے طریق حکومت کی نسبت توجہ کی۔ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد منشوری قانون منظور ہوا جس میں مندرجہ ذیل اہم امور طے پائے:۔

آئندہ بیس سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ہندوستانی مقبوضات پر متصرف رہے گی۔ لیکن وہ حکومت ہند کی خدمت کے فرائض ہز مجسٹی ملک معظم اور ان کے جانشینوں اور وارثوں کی جانب سے بطور کفالت انجام

[1] ٹھگی کے متعلق تفصیل ملاحظہ ہو سلیمن کی کتاب۔ Rambles and Recollections

دے گی۔ ہندوستان میں کمپنی کو جو چائے کی تجارت کا اجارہ حاصل تھا وہ ختم کر دیا جائے گا۔ کمپنی آئندہ سے چین کی تجارت کی بھی اجارہ دار نہیں رہے گی بلکہ انگلستان کے تاجروں کو اجازت ہوگی کہ وہ اس ملک کے ساتھ براہ راست تجارت کریں۔ کمپنی کو چاہئے کہ جلد سے جلد ہندوستان میں اپنے کاروبار کو ختم کر دے۔ آئندہ سے وہ حکومت ہند کی آمدنی میں سے ½ ۱۰ فیصدی کی حقدار ہوگی جس سے اس کا قرضہ بے باق کیا جائے گا۔ جن حصہ داروں کا سو پونڈ کا کمپنی میں حصہ ہوگا انھیں دو سو پونڈ دیے جائیں گے اور اس غرض کے لئے بیس لاکھ پونڈ کمپنی پارلیمنٹ کو ادا کرے گی تاکہ آئندہ یہ رقم سود در سود سے اتنی ہوجائے کہ حصہ داروں کے مطالبے پورے ہو سکیں۔

ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کا سیول اور فوجی نظم و نسق گورنر جنرل اور اس کے ارکان کونسل کے سپرد ہوگا جو آئندہ سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کہلائے گا۔ اعلیٰ عہدوں کے تقرر کے اختیارات مجلس نظماء کو بدستور حاصل رہیں گے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد بجائے تین کے چار ہوگی۔ ایک رکن وضع قانون کے لئے ہوگا جس کا کمپنی کے ملازموں میں سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بمبئی اور مدراس کی پریسی ڈنسیوں کے گورنروں کی کونسل میں ارکان کی تعداد دو ہوگی۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ اگر مناسب سمجھے تو پریسی ڈنسی کی حکومت گورنر کے سپرد کر دے اور ارکان کونسل کو ان کے فرائض سے سبکدوش کر دے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ہندوستان کے کل برطانوی مقبوضات کے لئے وضع قوانین کا اختیار حاصل ہوگا۔ صوبوں کے گورنر اپنے اپنے علاقوں کے لئے جو ضابطے نافذ کرنا چاہیں ان کے مسودے پہلے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی منظوری کے لئے پیش کرنا ہوں گے۔ اگر پریسی ڈنسیوں کی حکومت کو وضع قانون کے حق سے محروم نہ کیا جاتا تو ہندوستان کے کل برطانوی مقبوضات میں ایک مشترک اور یکساں قانون نافذ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے گورنروں کو قاعدے اور ضابطے بنانے کی اجازت دی گئی تھی تاکہ ان کے

کام میں بھی رکاوٹ نہ پڑے۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مجاز گردانا گیا کہ

(الف) کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جو قانون یا قواعد نافذ ہیں ان میں ترمیم یا تبدیلی کر سکے۔

(ب) کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جتنی بھی عدالتیں ہیں چاہے وہ شاہی منشور سے قایم ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، ان میں اپنے منظور کیے ہوئے قوانین کو نافذ کرے۔

(ج) ہندوستانی مقبوضات کے تمام حصوں۔ مقامات۔ اور اشیاء پر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین کا اطلاق ہوگا۔ کمپنی کی حدود میں جو لوگ بھی آباد ہوں چاہے وہ انگریز ہوں یا ہندوستانی کمپنی کے ملازم ہوں یا نہ ہوں یا وہ انگریز جو ان دیسی والیان ریاست کے ملازم ہوں جن کے ساتھ کمپنی کا معاہدہ ہو چکا ہے ان سب پر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین کا اطلاق ہوگا۔

اس کے ساتھ اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی کہ مندرجہ ذیل امور کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو وضع قانون کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(الف) گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کوئی ایسا قانون وضع کرنے کا حق نہیں رکھتا جس کی رو سے ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کی دفعات یا ان قوانین کی دفعات کی خلاف ورزی۔ تنسیخ۔ تبدیلی یا التواعمل میں آنے کا اندیشہ ہو جو تاج یا کمپنی کے فوجی افسروں یا سپاہیوں کی فراری بہ حالت جنگ یا ان کی بغاوت کو فرو کرنے کے متعلق وضع کیے گئے ہیں۔

(ب) کوئی ایسا قانون نہیں وضع کیا جا سکے گا جس سے تاج کے اختیارات یا پارلیمنٹ کا اقتدار یا کمپنی کا اساسی دستور یا اس کے حقوق یا برطانیہ کے غیر تحریری دستور کا کوئی حصہ متاثر ہوتا ہو۔

(ج) ایسے قوانین وضع نہیں کیے جا سکیں گے جن کے متعلق پہلے سے مجلس نظماء سے منظوری نہ حاصل کر لی گئی ہو یا جن کی بدولت ان عدالتوں کو

جو شاہی منشوروں کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور دوسری عدالتوں کو یہ حق حاصل ہو جائے کہ وہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کے ان افراد کو جو یورپ میں پیدا ہوئے ہیں یا ان کی اولاد میں سے ہیں کسی فرد کو سزائے موت دینے کا حکم دے۔

(د) ان عدالتوں کو جو شاہی منشوروں کے ذریعہ قائم ہوئی ہیں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین سے توڑا نہیں جا سکتا۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے تمام منظور کردہ قوانین پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کی غرض سے پیش کئے جائیں گے۔ پارلیمنٹ کو یہ حق رہے گا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے لیے براہ راست قانون وضع کر سکے یا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے قوانین کو منسوخ کر دے۔

کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کیلئے جو قوانین وضع کئے جائیں گے ان کی ترتیب و تدوین کا کام حکومت ہند کرے گی تاکہ اس کے تمام مقبوضات میں یکساں عدالتی نظام قایم ہو۔ ان قوانین کی پابندی سب باشندوں پر جو کمپنی کے مقبوضات کی حدود میں آباد ہیں بلا لحاظ طبقہ اور بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ یورپین ہیں یا ہندوستانی لازمی ہوگی۔ باشندوں کے رسم و رواج کا وضع قانون کے وقت خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ جن مقامات میں رسم و رواج بمنزلۂ قانون رہے ہیں وہاں رسم و رواج کو تسلیم کرنا چاہئے اور اگر موقع ہو تو اس میں مناسب تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔

اس منشوری قانون میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ہدایت کی گئی ہے کہ قوانین کی تدوین کے لئے زیادہ سے زیادہ پانچ رکنوں کا ایک کمیشن (انڈین لا کمیشن) مقرر کیا جائے جس کا کام یہ ہوگا کہ کمپنی کے موجودہ مقبوضات میں جتنے عدالتی ضابطے نافذ ہوں ان کے متعلق پوری چھان بین کرے اور رواجی قوانین کے متعلق بھی تحقیق کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے غور کے لئے پیش ہوگی۔ میکالے اس کمیشن کا رکن تھا۔ اس کمیشن کی سفارشیں بعد میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوئیں جن پر تعزیرات ہند بھی قرار پائی۔

۱۸۳۳ء کے منشوری قانون میں اس امر کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کے ہر فرد کو جو انگلستان میں پیدا ہوا ہو اس کی اجازت ہوگی کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جہاں چاہے رہے یا ان میں سے ہو کر گزر سکے لیکن اس کا فرض ہوگا کہ اپنا نام اور مقام کا پتہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے اور ہندوستان آنے کی جو غرض ہے اس کے متعلق تردگیری کے متعلقہ افسروں کو آگاہ کر دے۔ جو شخص انگلستان میں پیدا ہوا ہے اس کا مجاز ہوگا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جائداد خرید سکے۔ لیکن گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اختیار ہوگا کہ ان لوگوں کا داخلہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں ممنوع قرار دے جن کی نسبت اس کو خیال ہو کہ ان کا یہاں آنا یا رہنا مناسب نہ ہوگا۔ ایسے انگریز جو بلا اجازت نامہ (لائسنس) لئے ہوئے ہندوستان آئیں گے وہ قانوناً سزا کے مستوجب ہوں گے۔ یورپین لوگوں کا اگر کہیں دیسی باشندوں سے میل جول بڑھے تو اس صورت میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مجاز ہوگا کہ جلد سے جلد ایسے قوانین وضع کرے جن سے دیسی باشندوں کی حفاظت ہو سکے اور ان کی ذات پات۔ مذہب اور رسوم کی ہتک نہ ہو۔ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کا کوئی دیسی باشندہ اور نہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کا کوئی فرد جو انگلستان میں پیدا ہوا ہو اور اس وقت ہندوستان میں رہتا ہو اپنے مذہب۔ جائے پیدائش۔ نسل اور رنگ یا ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے کمپنی کے تحت اعلیٰ عہدوں پر مامور ہونے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ دیسی لوگوں کو کمپنی کی ملازمت میں شریک کیا جائے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ذمہ داری کا اہل ثابت کریں۔

اس منشوری قانون کے بعد سے حکومت ہند جو قانون بنائے گی وہ بجائے ریگولیشن کے ایکٹ کہلائیں گے۔ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں وہ پارلیمنٹ کے منظور شدہ قوانین کی طرح موثر ہوں گے بشرطیکہ مجلس نظما اور بورڈ آف کنٹرول کی منظوری ان کے متعلق لے لی گئی ہو۔ مجلس نظما اور بورڈ آف کنٹرول

کو اختیار ہوگا کہ جو قانونی مسودے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی جانب سے پیش ہوں انھیں نامنظور کردے۔ لیکن ایسی صورتیں بہت کم پیش آئیں۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے اختیارات کا لحاظ کرنا اس لئے اور بھی ضروری ہوگیا کہ انگریزوں کی تعداد ہندوستان میں بڑھ گئی تھی اور نئے انتظامی معاملوں میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں جنھیں بہ حیثیت مقامی اعلیٰ عہدہ دار کے وہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ کونسل کے معمولی اجلاسوں میں اگر گورنر جنرل کے علاوہ صرف ایک رکن موجود ہو تو نصاب پورا سمجھا جائے گا اور اگر قانون وضع کرنا ہو تو گورنر جنرل کے علاوہ تین ارکان کونسل کی موجودگی لازمی قرار پائی۔ گورنر جنرل بنگال اب گورنر جنرل ہند کہلانے لگا۔ بنگال کی ایسٹ پریسی ڈنسی کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا اور صوبہ شمال مغربی کا انتظام بنگال سے علاحدہ کردیا گیا۔ اس منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد مجلس نظما کو تجارتی کاروبار کے انتظام سے بڑی حد تک آزادی حاصل ہوگئی اور اس سے سیاسی معاملوں پر توجہ کرنے کا موقع ملا چنانچہ آئندہ پچیس سال میں مجلس نظما نے حکومت و سیاست کے معاملوں میں جس قوت عمل، معاملہ فہمی اور اعتدال پسندی کا ثبوت دیا وہ ہر طرح قابل تعریف ہے۔

انگریزی تعلیم کا رواج

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اپنے ہندوستانی مقبوضات میں رہنے والے ہندوستانیوں کی تعلیم کا شروع میں کوئی خاص انتظام نہیں کیا اس لئے کہ اس کے پیش نظر اس ملک میں تمدنی معاملوں کو ترقی دینا نہ تھا بلکہ محض نفع کمانا۔ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ میں عربی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قایم کیا تھا اور جوناتھن ڈنکن نے جو بنارس میں کمپنی کا ریذیڈنٹ تھا وہاں سنسکرت کالج قائم کیا۔ ان دونوں اداروں کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ سے انگریز عدالتی حکام کو اسلامی شریعت اور ہندوؤں کے شاستروں کی توضیح کرنے کے لئے موزوں ہندوستانی مل سکیں۔ کمپنی کی حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی کہ ہندوستانیوں کو عدالت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرے۔ چونکہ انگریز حکام ہندوؤں اور مسلمانوں کے

تو واقف نہیں جانتے تھے اس لئے عربی اور سنسکرت جاننے والے ہندوستانیوں کو کمپنی کی ملازمت کے دائرے میں لینے کی ضرورت ہوئی۔ لیکن کلکتہ اور بنارس کے دونوں اداروں نے کوئی خاص ترقی نہیں کی کمپنی کی حکومت نے یہ کیا کم کیا کہ انھیں قائم رکھا۔ ان اداروں کے علاوہ بعض پریسیڈنسیوں میں خیراتی مدرسے قایم ہو چکے تھے جو مسیحی مبلغوں کے زیر انتظام تھے اور جنھیں کمپنی مالی امداد دیا کرتی تھی۔ ان خیراتی مدرسوں کے پیش نظر یہ تھا کہ کمپنی کے جو غریب ہندوستانی ملازمین ہیں ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور چپکے چپکے انھیں مسیحیت کی طرف مائل کیا جائے۔

۱۸۱۳ء کے منشوری قانون میں پہلی مرتبہ کمپنی کی حکومت نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے لئے مخصوص کئے اس وقت بعض انگریز ارباب اقتدار کی ایک جماعت کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان سکھائی اور انھیں عیسائی مذہب کی طرف رغبت دلائی چاہئے کیونکہ بغیر اس کے ان کی حالت سدھارنے کی اور کوئی موثر تدبیر نہیں ہو سکتی لیکن اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو خود ان کے علوم و فنون کی تعلیم دینی چاہئے۔ وہ اس بات کے خلاف تھا کہ کمپنی کی حکومت مسیحی مبلغین کے ذریعہ اہل ہند میں مسیحی تعلیم پھیلانے کی کوشش کرے اس سے اندیشہ تھا کہ کمپنی کے سیاسی مفاد کو کہیں ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ منشوری قانون میں ایک لاکھ کی منظوری اس غرض کے لئے دی گئی تھی کہ ذی علم ہندوستانیوں کی ہمت افزائی کی جائے اور مغربی علوم کی ترویج کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ رقم اگرچہ بالکل ناکافی تھی لیکن اس کی منظوری سے یہ پتا چلتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کی حکمت عملی میں اب تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور وہ اہل ہند کے اخلاقی فلاح و بہبود کو بھی ایک حد تک اپنے پیش نظر رکھنے لگی تھی۔ ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد انگلستان کی تاریخ میں جو زمانہ گزرا اس میں ہمیں اصلاحی رجحانوں کا نشوونما

ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔ دراصل نہیں لبرل اصلاحی خیالات کا عکس ہمیں کمپنی کے ہندوستانی نظم و نسق میں بھی آئندہ دسالوں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں مجلس نظما نے لارڈ ایمہرسٹ کو لکھا کہ اہل ہند کی تعلیمی ترقی کے لئے اگر کسی قسم کی تجویزیں پیش کی جائیں تو وہ ان پر ہمدردی سے غور کرے گی خود اہل ہند میں ایک ایسی جماعت اس زمانہ میں پیدا ہوگئی تھی جو مشرقی علوم کے بجائے مغربی علوم و فنون کی ترویج کو زیادہ اہمیت دیتی تھی جن میں راجا رام موہن رائے برہمو سماج کے بانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجا رام موہن رائے نے لارڈ ایمہرسٹ کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اس امر پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظم قائم کرنا چاہئے جس میں ریاضی فلسفہ کیمیا۔ علم الابدان اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان کی سیاسی اہمیت کو تھوڑا بہت محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے ذریعہ صراحت کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی ہندوستانی اپنی ذات پات یا مذہب کی وجہ سے کمپنی کے اعلیٰ عہدوں سے محروم نہیں رکھا جائے گا بشرطیکہ وہ اس کی قابلیت رکھتا ہو منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد حکومت ہند نے تعلیم عامہ کی جو جنرل کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ارکان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ آیا سرکاری امداد صرف ان مدارس کو دینی چاہیے جن میں مغربی علوم کی انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ہوتی ہے یا ان مدرسوں کو بھی دینی چاہئے جن میں صرف مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم و فنون کی تعلیم دینے سے اہل ہند کو زیادہ اور حقیقی فائدہ ہوگا اور دوسرے فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ فارسی یا سنسکرت کے ذریعہ قدیم علوم کی تعلیم زیادہ مفید ہوگی اسلئے بغیر اس کے اہل ہند اپنی تہذیب کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان میں سے ایک فریق اورنٹیلسٹ اور دوسرا انگلسسٹ کہلاتا تھا۔ پہلے کی سربراہی ڈاکٹر ولسن

کر رہا تھا اور دوسرے کی حمایت میں میکالے، میٹکاف، سر چارلس ٹریولین اور رسل کالون گورنر صوبہ شمال مغربی جیسے ذی وجاہت و ذی اثر اشخاص شامل تھے۔ میکالے بہ حیثیت گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانونی کے جب ہندوستان آیا تو اس کو تعلیمی کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اس نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کی نسبت ایک یادداشت تیار کی جس میں اس نے صاف صاف اپنے خیالات ظاہر کر دیے ہیں۔ اس یادداشت میں اس نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی فوقیت کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی زبانیں جدید تمدن کے خیالات سے عاری ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ وہ سائنس کے نظریوں کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ برخلاف اس کے انگریزی زبان کو نہ صرف یہ کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ حاصل ہے بلکہ وہ تمام حقیقی علوم و فنون کے خزانوں کی کنجی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مدرسے جن میں مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی ہے اور جنھیں حکومت امداد دیتی ہے بند کر دینے چاہئیں۔ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ مثال دیتا ہے کہ ہم ایک مقام کی آب و ہوا کو اچھا سمجھ کر وہاں صحت گاہ قایم کرتے ہیں۔ اب اگر فرض کرو کہ وہاں کی آب و ہوا امید کے موافق اچھی نہ ہو تو کیا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ایسی حالت میں بھی صحت گاہ کو وہاں برقرار رکھیں۔ محض اس وجہ سے کہ ہم نے اسے وہاں قایم کر دیا ہے۔ ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں علم و ادب نام کو بھی نہیں۔ عربی اور فارسی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ "یورپ کے کتب خانہ کی ایک چھوٹی سی الماری کی کتابوں میں ہمیں جو علم ملتا ہے اس کی قدر و قیمت ہندوستان اور عرب کے مجموعی علم و ادب سے زیادہ ہے" اس نے مشرقی زبانوں کی غلط تاریخ ۔ نحو ما بعد الطبعیات اور مہمل طبعیات کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے۔ ٹریولین اور مٹکاف دونوں میکالے کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء فیصلہ کیا کہ بجائے فارسی

کے انگریزی زبان حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی جائے اور آئندہ سے صرف
ان مدرسوں کو سرکاری امداد دی جانا چاہیئے جن میں انگریزی
زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو۔ اس طرح
انگریزی تعلیم کے حامیوں کی مشرقی تعلیم کی قدر وقیمت جتانے والوں کے
مقابلہ میں جیت ہوئی اور اس وقت سے آج تک کم و بیش وہی تعلیمی نظام
ہندوستان میں رائج رہا ہے جس کی داغ بیل میکالے کی یادداشت سے
پڑی تھی۔ ہندوستان میں ایک مناسب تعلیمی نظام قائم کرنے کے متعلق جو بحث
گزشتہ کئی سالوں سے چلا آرہا تھا اس کا فیصلہ میکالے کی غیر معمولی جادو بیانی
اور ذاتی اثر نے اس جماعت کے حق میں کرا دیا جو انگریزی زبان اور مغربی علوم
کی حمایت کر رہی تھی

۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں پہلا میڈیکل کالج کھولا گیا جس میں جراحی اور
دواؤں کے مغربی طریقوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس درسگاہ میں انگلستان
کی اعلیٰ سندیں رکھنے والے استاد مقرر کئے گئے۔ حکومت نے بڑی فیاضی
سے وہ تمام قیمتی آلات کالج میں بہم پہنچائے جن کے باعث یہ درسگاہ اسی
قسم کی یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال
تھا کہ مذہبی اور اعتقادی وجوہ کی بنا پر یہ کالج کامیاب نہیں رہے گا۔ لیکن
ان کا یہ خیال غلط نکلا۔ چند سال میں ہندوستانی طلبہ کی بڑی تعداد اس کالج
میں داخل ہوئی اور مغربی فن طب کا رواج روز بروز اس ملک میں بڑھنے لگا۔
بعض ہندوستانی طلبہ نے اپنی طب کی تعلیم کی اس درسگاہ میں تکمیل کر کے
انگلستان کا سمندر پار سفر کیا تاکہ مزید معلومات اور تجربہ حاصل کریں۔

میکالے کا یہ خیال کہ انگریزی زبان کو اہل ہند مغربی علوم و فنون کے
حاصل کرنے کا وسیلہ بنائیں گے بڑھتے بڑھتے عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ ہندوستانیوں
نے انگریزی تعلیم اس لئے حاصل کرنا شروع کی کہ اس سے روزی کے دروازے
کھل جاتے تھے اور ملازمتیں حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ جیمز مل نے
میکالے کی یادداشت کے سرکاری طور پر منظور ہونے کے بعد یہ پیشین گوئی کی تھی

C. E. Trevelyan, On the Education of the People of India 1838, p 33 ـ۱

کہ ہندوستانیوں کے تعلیمی اصول کو اس طرح ایکا ایکی بدل دینے سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں نکلے گا کہ ہندوستانی نوجوانوں پر انگریزی تہذیب وتمدن کا ایک ہلکا سا اوپری رنگ چڑھ جائے جسے وہ حقیقی علوم کی تحصیل کا وسیلہ نہیں بنائیں گے بلکہ ملازمت کے حصول کا ایک پروانہ۔ جیمز مل کا خیال حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ پھر اس کے علاوہ اس تعلیمی نظام پر جو میکالے کی یادداشت پر مبنی قرار دیا گیا اور ایک اعتراض یہ ہے کہ انگریزی کبھی بھی ہندوستانیوں کی قومی زبان نہ آج سے سو برس پہلے ہوسکتی تھی اور نہ آج ہوسکتی ہے۔ اس لئے یہ زبان قومی تعلیم کا وسیلہ کبھی بھی نہیں بن سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہندوستان کی وسیع آبادی میں صرف کچھ لوگ اس زبان پر پورا عبور حاصل کرسکیں گے۔ خود میکالے نے بھی یہ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ انگریز ہندوستان کی پوری آبادی کی تعلیم کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ وہ صرف یہ کرسکتے ہیں کہ ایک محدود جماعت کو انگریزی تعلیم دیں جو عوام اور حاکم طبقہ کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کرسکے۔ یہ جماعت اپنے رنگ روپ کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن اپنے ذوق، ذہنیت اور فکری طریق کے اعتبار سے انگریزوں سے مماثلت رکھے گی۔ انہیں کے توسط سے مقامی زبانوں کو شائستہ اور شستہ بنایا جائے گا تاکہ یہ زبانیں عوام میں مغربی خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بن سکیں۔ غرض خود میکالے نے یہ تسلیم کیا کہ انگریزی زبان سوائے ایک محدود طبقہ کے اہل ہند کی قومی زبان کبھی نہیں بن سکے گی جس کے ذریعے سے عوام کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ پھر میکالے کا یہ خیال بھی غلط نکلا کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات چھن چھن کر عوام تک پہنچیں گے اور ان کی زندگی کی سطح کو بلند کریں گے۔ ہوا یہ کہ چونکہ انگریزی تعلیم ملازمت کے لئے حاصل کی گئی نہ کہ علمی پیاس بجھانے کے لئے اس لئے مغربی

ا؎ Thompson and Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule in India, p. 316

تعلیم پائے ہوئے طبقہ نے ملک کے عوام سے الگ تھلگ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس ملک میں جہاں اور بہت سی ذاتیں تھیں وہاں انگریزی تعلیم یافتوں کی ایک ذات اور بن گئی جس کی پوری توجہ "تعلیم" سے زیادہ "ڈیانت" پر رہی۔ غرض کہ اس تعلیمی نظام سے افراد کو فائدہ ہوا ہو تو ہوا ہو لیکن قومی اعتبار سے اتنا فائدہ نہ ہوا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ قومی لحاظ سے ہندوستان کا تعلیمی معیار پچھلی ایک صدی میں دنیا کے دوسرے متمدن ملکوں کے مقابلہ میں انتہا درجہ پست رہا اور اب بھی ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک اس تعلیمی نظام پر عاید ہوتی ہے جو میکالے کی یادداشت کے بموجب بنٹنگ نے ہندوستان میں رائج کیا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ انگریزی زبان کی ترویج سے اہل ہند کو بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ چاہے وہ ایک محدود طبقہ ہی کو کیوں نہ ہو لیکن مغربی ادب اور سائنس سے جو واقفیت حاصل ہوئی اس کا اثر لازمی طور پر قومی شعور پر پڑا۔ کسی قومی زبان کے موجود نہ ہونے کے باعث ملک کے ایک حصہ کے ہندوستانی دوسرے حصوں کے ابنائے وطن سے انگریزی کے ذریعے خیال کا تبادلہ کرنے لگے۔ لیکن سب سے زیادہ فائدہ اس نئی تعلیمی حکمت عملی سے انگریزی حکومت کو حاصل ہوا۔ اسے اب اپنے دفتروں کے کام کے لئے کم تنخواہ پر انگریزی جاننے والے ملنے لگے۔ بنٹنگ نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اگر معمولی معمولی عہدوں پر بھی انگریزوں کو رکھا گیا تو حکومت کا مالیہ اتنا زیر بار ہو جائے گا کہ اس کو سنبھالنا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کی یہ تجویز گہری مصلحت پر مبنی تھی کہ کارنوالس کی حکمت عملی کے خلاف اہل ہند کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا جائے بشرطیکہ عام اصول حکومت کا تعین اعلیٰ انگریز افسر کرتے رہیں۔ نئے تعلیمی نظام سے اہل ہند کے اوسط طبقہ کے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی۔ میکالے اور بنٹنگ کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام پر ہندوستان میں گزشتہ سو سال سے زائد سے عمل ہو رہا ہے، اگرچہ اس

دوران میں اس میں کبھی کبھی تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ حکومت نے مشرقی علوم کی حوصلہ افزائی بنٹنک کے جانے کے بعد ہی شروع کردی تھی اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ بے اس کے کمپنی اپنے آپ کو سخت پیچیدگیوں میں پھنسا لے گی۔ چنانچہ لارڈ آکلینڈ نے اس امر کا یقین دلایا کہ مشرقی علوم کے جو مدرسے ہیں ان کی امداد کی جائے گی تاکہ اعلیٰ قابلیت کے استادوں سے استفادہ کیا جا سکے۔ نیز اس بات کی وضاحت کی گئی کہ وسطانی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے لئے مادری زبان کا استعمال مناسب ہے۔

خارجی حکمت عملی بنٹنک اور رنجیت سنگھ کی ملاقات۔ لارڈ ولیم بنٹنگ کا عہد حکومت وہ زمانہ ہے جبکہ روس کی قوت وسط ایشیا میں روز بروز بڑھ رہی تھی اور انگریزی حکومت کو بجا طور پر اس کی طرف سے بڑا کھٹکا تھا کہ کہیں وہ ہندوستان کی سرحد تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کی تربیت یورپین اصول کے مطابق کرائی تھی اور خود اس کی نگرانی اپنے ذمہ لی تھی۔ اس نے دو فرانسیسی افسروں ونتورا اور الارد کو جو نپولین کی فوج میں افسروں کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اپنی ملازمت میں لے لیا تھا۔ پنجاب کے دوسرے سرداروں کو نیچا دکھانے کے بعد اس نے کشمیر اور افغانستان کی سرحد کے علاقے جن میں پشاور شامل تھا فتح کر لئے تھے۔ اگرچہ سید احمد شہید اور شاہ محمد اسمٰعیل نے رنجیت سنگھ کے خلاف سرحد کے پٹھانوں کو جہاد کے لئے ابھارا اور شروع میں انھیں کچھ کامیابی ہوئی لیکن مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سکھ فوجوں نے انھیں شکست دی اور وہ دونوں جنگ میں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد رنجیت سنگھ کی گرفت پشاور اور دوسرے سرحدی علاقوں پر مضبوط ہو گئی اور وہاں کے رہنے والوں پر اس نے بڑے ظلم ڈھائے[1]۔ اس کی سالانہ آمدنی تقریباً ڈھائی کروڑ روپے

[1] Henry Lawrence An Adventurer in the Punjab, Ch II.

تھی اور کہا جاتا ہے کہ دس کروڑ سے زائد روپیہ اس کے خزانہ میں نقد موجود
تھا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزی قوت اور وسیلوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ
۱۸۰۹ء میں اس نے امرتسر کے مقام پر انگریزوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا
جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا کہ وہ ستلج کے پار اپنا مرکز قایم کرنے کی
کوئی کوشش نہیں کرے گا کمپنی کی حکومت بھی رنجیت سنگھ سے بگاڑ نہیں
چاہتی تھی اس لئے کہ وہ ملک کے دوسرے حصوں میں اپنا اقتدار مستحکم
کرنے کی فکر میں تھی۔ بنٹنک کے عہد حکومت میں مجلس نگران (بورڈ آف
کنٹرول) کے صدر نے بادشاہ ولیم چہارم کے ایماء پر رنجیت سنگھ کو چند
اعلیٰ قسم کے گھوڑے بطور تحفہ کے روانہ کئے۔ اس کے چند مہینے بعد اکتوبر ۱۸۳۱ء
میں دریائے ستلج کے کنارہ روپڑ کے مقام پر بنٹنک اور رنجیت سنگھ کی ملاقات
ہوئی۔ دونوں طرف سے انواع واقسام کے قیمتی تحفے پیش کئے گئے۔ ایک
ہفتہ تک دید باز دید اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہا جس کا مقصد صرف
یہ تھا کہ کمپنی اور رنجیت سنگھ کے درمیان سیاسی تعلقات مضبوط کئے جائیں
اور ان میں دوستی ہمیشہ برقرار رہے۔ بعض موٴرخوں کا خیال ہے کہ محض دوستی کو
مضبوط کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی دید اور باز دید کی غالباً ضرورت نہ تھی۔
ممکن ہے کہ افغانستان کے معاملے بنٹنک اور رنجیت سنگھ دونوں کی بحث
میں آئے ہوں[۱]۔ ہم جانتے ہیں کہ شاہ شجاع اس زمانے میں لدھیانہ میں
انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ روپڑ میں
رنجیت سنگھ اور بنٹنک کی اکتوبر ۱۸۳۱ء میں جب ملاقات ہوئی تو اس سے
کچھ پہلے شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ سے اپنا افغانستان کا کھویا ہوا تخت
واپس لینے کے متعلق سیاسی بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس میں شبہ نہیں
شاہ شجاع نے جب بنٹنک کو اس ذہن میں براہ راست لکھا تھا تو اس نے
اس کے معاملے میں دخل دینے سے انکار کیا تھا۔ بنٹنک کو حکومت انگلستان

---

[۱] H. Beveridge A Comprehensive History of India, Vol III, p. 228

سے صرف یہ ہدایتیں ملی تھیں کہ وہ وسط ایشیا اور افغانستان کے سیاسی حالات سے باخبر رہے۔ ممکن ہے کہ شاہ شجاع رنجیت سنگھ کے توسط سے انگریزی حکومت کو آمادہ کرانا چاہتا ہو کہ وہ اس کا تخت و تاج واپس دلانے میں اسے مدد دے۔ لیکن اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء میں شاہ شجاع نے سندھ کے امیروں کی تھوڑی بہت امداد سے قندھار پر چڑھائی کی لیکن امیر دوست محمد خاں نے اس کو شکست دے کر قلات کی طرف بھگا دیا جہاں سے وہ لدھیانہ واپس آگیا اور مناسب حالات کا انتظار کرنے لگا۔

سندھ کے امیروں سے معاہدہ

امیران سندھ کے علاقوں پر کچھ عرصے سے رنجیت سنگھ کا دانت تھا۔ دریائے سندھ کے کنارہ شکارپور کی تجارتی منڈی کی ساکھ اس زمانے میں مشہور تھی اور وسط ایشیا سے لے کر بنگال تک وہاں کے تاجروں کی ہنڈیاں چلا کرتی تھیں۔ رنجیت سنگھ یہ بھی جانتا تھا کہ سندھ کے امیروں کے پاس فوج ناکافی ہے اور خزانہ میں بیس کروڑ سے زائد رقم جمع ہے۔ ان تمام معاملوں کی اطلاع برنس کے ذریعہ سے حکومت ہند کو پہنچ چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنٹنک اور رنجیت سنگھ کی ملاقات کے دوران میں سندھ کا معاملہ بھی زیر بحث آیا ہوگا اس لئے کہ ملاقات کے دو مہینے بعد بنٹنک نے کرنل پوٹنگر کو سندھ کے امیروں کی خدمت میں تجارتی معاہدہ کی غرض سے روانہ کیا تاکہ معاملے ایک فیصل شدہ صورت اختیار کرلیں اور سندھ میں رنجیت سنگھ کے اقدام کا راستہ بند ہو جائے۔ سندھ کے امیروں نے شروع میں کرنل پوٹنگر کی درخواست کو شبہہ کی نظر سے دیکھا اس واسطے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر کمپنی سے کسی قسم کا تعلق قائم ہو گیا اور کچھ رعایتیں دے دی گئیں تو آئندہ کے مطالبوں [illegible] ایک سلسلہ [illegible] جائے گی۔ لیکن زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے آخر انھوں نے ۱۸۳۲ء میں تجارتی معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور دریائے سندھ میں کمپنی کو جہازرانی کی اجازت مل گئی۔ یہ بھی طے ہوا کہ انگریزی مال پر امیرانِ سندھ [illegible]

اس کا تعین کر دیا جائے گا۔ محصول کی رقم برائے نام تھی۔ معاہدہ میں یہ شرط بھی رکھی گئی کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مقبوضات کا احترام کریں گے اور الحاق کی غرض سے دست درازی نہیں کریں گے۔ لیکن اس شرط پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس معاہدے کے گیارہ سال بعد سندھ کا پورا علاقہ برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا جو کمپنی کے سیاسی اخلاق پر ایک بدنما دھبہ رہے گا۔ بنٹنک نے خاص طور کرنل ویڈ کو اپنی جانب سے رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا تاکہ سندھ کے معاہدے کے متعلق اگر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو تو اس کو دور کر دے۔ رنجیت سنگھ کو یقین دلایا گیا کہ سندھ کی جہاز رانی سے اس کے مفاد کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اودھ کے معاملات کچھ عرصے سے اودھ کے معاملات میں خرابی پیدا ہو رہی تھی نواب نصیر الدین کا زیادہ وقت عیش و عشرت میں گزر رہا تھا۔ انتظام کی ابتری اس درجہ پر پہنچ گئی کہ بڑے بڑے زمینداروں نے مالگزاری ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بغیر فوج کشی اور تشدد کے محاصل وصول نہیں ہو سکتے تھے۔ بنٹنک نے خود اودھ کا دورہ کیا اور وہاں کی بدنظمی کا اس کو یقین ہو گیا تو اس نے نواب کو صاف الفاظ میں آگاہ کیا کہ اگر جلد اصلاح کی صورت نہ نکلی تو ملک کا انتظام اس کے ہاتھ سے لے لیا جائے گا۔ اس فہمائش کا یہ اثر ہوا کہ نواب نے میر مہدی علی خاں کو جسے اس نے برطرف کر دیا تھا وزارت سپرد کی۔ میر مہدی علی خاں پر انگریزی حکومت کو بھروسا تھا۔ اس نے معاملات کی درستی میں اپنی خداداد قابلیت کو صرف کیا اور نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اصلاح کی۔ چونکہ انگریزی رزیڈنٹ کی اس کو حمایت حاصل تھی اس لئے اس نے نواب کے ذاتی اخراجات اور محل کی فضول خرچیوں میں بھی کمی کی جو نواب کو بہت ناگوار ہوئی۔ چنانچہ نواب نے اس کے خلاف یہ الزام لگا کر کہ اس نے نواب بیگم کی بندہ کا تذکرہ مناسب ادب و آداب سے نہیں کیا اور نواب کے والد یا جد کی تصویر کی توہین کی اس کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ بجائے نواب کی مرضی کے خلاف وزیر کی تائید

نہیں کر سکتا تھا۔ میر مہدی علی خاں استعفیٰ دینے کے بعد برطانوی علاقہ میں رہنے لگا۔ اودھ کی بدانتظامیوں کے متعلق بنٹنک نے مجلس نظما کو پورا کچا چٹھا لکھ بھیجا چنانچہ مجلس نظما نے اس کو مجاز گردانا کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو اودھ کو برطانوی ہند میں ملحق کرے اور نواب کی گزر بسر کے لئے وظیفہ مقرر کردے۔ لیکن بنٹنک نے صرف اتنا کیا کہ مجلس نظما سے جو مراسلہ اسے موصول ہوا تھا اس کے خلاصے سے نواب کو مطلع کر دیا اور اس کے ساتھ اس نے توقع ظاہر کی کہ بہت جلد اودھ میں ایسی انتظامی اصلاحیں کی جائیں گی جن سے رعایا کی فلاح اور بہبود کی ترقی ہوگی۔ اودھ کے معاملوں میں آئندہ اور زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور بیس سال بعد ڈلہوزی نے اس کو برطانوی ہند میں ملحق کر لیا۔

حیدرآباد کے امراء اور پامر اینڈ کمپنی

پامر اینڈ کمپنی کا سرکار نظام پر جو قرض تھا اس کی ادائی حکومت ہند نے شمالی سرکار کے لگان یا پیش کش کی رقم سے کر دی تھی لیکن حکومت کے قرضے کے علاوہ پامر اینڈ کمپنی کی بعض امراء پر بھی بڑی بڑی رقمیں قرض تھیں۔ سر چارلس مٹکاف نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کی حیثیت سے پامر اینڈ کمپنی کی زیادہ ستانیوں کا اچھی طرح سے بھرم کھول دیا تھا۔ خود انگلستان میں بھی رائے عامہ اس ساہوکارہ کے سخت خلاف ہوگئی تھی۔ چنانچہ مجلس نظما (کورٹ آف ڈائرکٹرز) نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ چونکہ پامر اینڈ کمپنی نے پارلیمنٹ کے منظور کئے ہوئے اس قانون کی خلاف ورزی کی ہے جس کی رو سے اس کی صراحت کی گئی تھی کہ ہز مجسٹی ملک معظم کی حکمرانی میں رہنے والا کوئی فرد یکم اگست ۱۷۷۴ء کے بعد سے ہندوستان میں ۱۲ فی صدی شرح سود پر قرض دینے کا مجاز نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو اس کا قرضہ منسوخ سمجھا جائے گا اور اسے اس ضمن میں مطالبہ کا کوئی حق نہیں رہیگا لیکن پامر اینڈ کمپنی نے جب اس معاملہ کی انگلستان کی عدالت میں اپیل کی تو ججوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجلس نظما نے جس قانون کا حوالہ دیا ہے، اس کا اطلاق

برطانوی ہند کے لئے ہے نہ کہ خود مختار والیان ملک کے علاقوں کے لئے۔
مجلس نظما نے جب یہ اعلان کر دیا کہ پامر اینڈ کمپنی کے قرض کے مطالبے ناجائز ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مقروض لوگوں کو ایک بہانہ مل گیا اور وہ قرض کی ادائی میں ٹالم ٹول کرنے لگے۔ حیدرآباد میں منیر الملک پر قرضہ کی بڑی رقم تھی۔ پامر اینڈ کمپنی نے کوشش کی کہ حکومت ہند کے ذریعہ سے سرکار نظام پر زور ڈلوائے کہ مقروض امرا کا قرض ادا کیا جائے۔ مجلس نظما نے پامر اینڈ کمپنی کے قرضہ کے ناجائز ہونے کا اعلان کر دیا۔ بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) اس اعلان کے خلاف تھا۔ اس اختلاف نے سخت صورت اختیار کر لی۔ جولائی ۱۸۳۲ء میں مجلس نظما نے گورنر جنرل کو بھیجنے کے لئے مراسلہ کا یہ مسودہ تیار کیا کہ پامر اینڈ کمپنی کے قرضوں کی وصولیابی میں حکومت ہند کو مطلق دلچسپی نہیں لینی چاہئے بورڈ آف کنٹرول نے مراسلہ کی عبارت اس طرح بدل دی کہ رزیڈنٹ حیدرآباد کو اختیار دینا چاہئے کہ وہ پامر اینڈ کمپنی کے قرضے وصول کرنے میں جو اثر استعمال کر سکتا ہے کرے۔ اس پر مجلس نظما نے بڑی نکتہ چینی کی آخر اس تو تو میں میں کا یہ نتیجہ ہوا کہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ مارچ ۱۸۳۲ء میں بورڈ آف کنٹرول نے مجلس نظما کو پامر اینڈ کمپنی کے قرضوں کے متعلق دوسرا مسودہ تیار کرنے کی ہدایت دی۔ یہ مسودہ جب تیار کر کے بورڈ کو بھیجا گیا تو اس کو بھی رد کر دیا گیا۔ آخر بورڈ آف کنٹرول نے من مانے طور پر اپنی ذمہ داری پر یہ فیصلہ کر دیا کہ چونکہ معاملہ حکومت برطانیہ اور سرکار نظام دونوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے بورڈ کی رائے قطعی ہوگی۔ اس مراسلہ میں سرکار نظام کے سامنے تصفیہ کی دو صورتیں پیش کی گئیں۔ یا تو معاملہ ایک کمیشن کے سپرد کیا جائے جو تحقیق کر کے اپنی تنقیحیں پیش کرے یا ثالثی کے ذریعہ فیصلہ کر دیا جائے۔ کمیشن کی صورت میں ارکان کو گورنر جنرل نامزد کرے گا اور ثالثی کی صورت میں بھی ثالث کو وہی مقرر کریگا۔ سرکار نظام سے توقع کی جائے گی کہ جلد سے جلد اس معاملہ کا تصفیہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ سرکار نظام کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ مجلس نظما نے غلطی سے پامر اینڈ کمپنی کے جائز مطالبوں کے خلاف اعلان

کر دیا اس لئے سرکار نظام کے ایک اندرونی معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت ہوئی جس کی نوعیت سفارش کی تصور کرنی چاہئیے۔

مجلس نظماء نے بورڈ کے اس رویہ کو آئین کے خلاف بتایا اور یہ استدلال کیا کہ بورڈ کو یہ حق تو ہے کہ مجلس نظماء کے کسی ایسے مراسلہ کے الفاظ میں ترمیم یا تبدیل کرسکے جس کا تعلق ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کے سول، فوجی یا مالی معاملات سے ہو۔ بورڈ صلح، جنگ یا دیسی والیان ملک سے سیاسی گفت و شنید میں مجلس نظماء سے بے مشورہ کئے راست احکام بھیج سکتا ہے لیکن اگر کوئی ایسی صورت نہ ہو تو اس کو ایسا کرنے کا آئینی حق حاصل نہیں ہے مگر پامر اینڈ کمپنی کے قرضے کی وصول یابی کا معاملہ متذکرہ بالا شقوں میں سے کسی کے تحت نہیں آسکتا اس لئے بورڈ آف کنٹرول مجاز نہیں کہ اس ضمن میں راست احکام بھیجے۔ چونکہ بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز دونوں اپنی اپنی رائے پر اڑے ہوئے تھے اس لئے معاملہ شاہی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے بورڈ آف کنٹرول کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ سے بورڈ آف کنٹرول کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اور چونکہ قانون کے الفاظ میں ابہام پایا جاتا تھا اس لئے پارلیمنٹ میں اس کی ترمیم اس حد پر کردی گئی کہ بورڈ آف کنٹرول کو تمام پبلک نوعیت کے معاملوں میں قطعی احکام نافذ کرنے کا دستوری اختیار حاصل ہوگیا۔ بورڈ آف کنٹرول کے منشاء کے بموجب پامر اینڈ کمپنی کے قرضے جو حیدرآباد میں تھے ان میں سے بیشتر رزیڈنٹ کے اثر سے وصول ہوگئے اور جو رہ گئے وہ رہ گئے[1]۔

الحاقات اگرچہ لارڈ ولیم بنٹنک کی حکمت عملی توسیع سلطنت کی نہ تھی پھر بھی بعض الحاقات اسکے عہد حکومت میں کئے گئے۔ شمال مشرقی بنگال کے کوہستانی علاقہ میں کچار کی ریاست کا راجا ۱۸۳۰ء میں قتل کردیا گیا۔ ریاست میں ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ رعایا کی خواہش کے بموجب اس ریاست کو بنٹنک نے انگریزی عملداری میں شامل کرنیکا حکم دیدیا۔ ایک وجہ اس ریاست کے الحاق کی یہ تھی کہ انگریز سرمایہ داروں

[1] Beveridge, A Comprehensive History of India Vol III, p. 218

نے چائے کی کاشت میں ایک کروڑ روپے سے زیادہ کا سرمایہ یہاں لگایا۔ یہاں کا کوہستانی علاقہ چائے کی کاشت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ چونکہ چائے کا استعمال انگلستان اور یورپ کے دوسرے حصوں میں بہت بڑھ رہا تھا اس لیے اس کی کاشت میں آئندہ اور زیادہ منافع کی توقع تھی۔ کچار کے علاوہ جنوبی ہند میں کورگ کی ریاست کا بھی لحاظ ہوا جو ساحل مالابار پر ریاست میسور اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔ اس ریاست کو انگریزوں نے ٹیپو سلطان سے بچایا تھا اور انگریزی حکومت نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہاں کچھ عرصہ سے بڑی بد انتظامی پھیلی ہوئی تھی۔ راجا بڑا بدمزاج اور بے رحم تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے متعدد افراد کو مروا ڈالا جب گورنر مدراس نے سمجھایا تو راجا نے نہایت گستاخانہ جواب دیا۔ آخر گورنر جنرل کے حکم سے راجا کو ہٹا کے کورگ کی ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ یہ علاقہ قہوہ کی کاشت کے لئے خاص طور پر موزوں تھا اور بہت سے انگریز سرمایہ داروں نے اس میں اپنا سرمایہ لگایا۔ کورگ کا انتظام ایک چیف کمشنر کے سپرد کر دیا گیا۔

میسور میں اس زمانہ میں راجا کرشن راج کی حکومت تھی جو ظالم اور رعایا کی بھلائی کا کچھ خیال نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دیوان پورنیا کو الگ کر دیا اور خود حکومت کا کاروبار چلانے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔ سرطامس منرو گورنر مدراس نے ہر چند راجا کو سمجھایا کہ اپنے معاملے درست کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا۔

اس کے عہد حکومت میں اعلیٰ عہدے بکنے اور رعایا پر نئے نئے محاصل لگائے جانے لگے۔ آخر تنگ آکر رعایا نے بغاوت کر دی۔ انگریزی فوج کی مدد سے بغاوت فرو کی گئی اور ایک اعلان کر دیا گیا کہ جس شخص کو شکایت ہو وہ برطانوی حکام کے روبرو پیش کرے۔ رعایا نے انگریز حکام پر بھروسا کیا اور اپنی شکایتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ انگریزی حکومت کو جب ریاست میسور کے اصل حالات کا براہ راست علم ہوا تو بنٹنک نے باوجود

اس کے کہ وہ عدم مداخلت کے اصول کا قائل تھا عارضی طور پر میسور کے پورے علاقے کو برطانوی اقتدار کے تحت کر لینے کا اعلان کر دیا۔ راجا کے لئے چار لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جتنی مالگزاری وصول کی جائے گی اس کا ۱/۵ حصہ اس کے لئے خاص کر دیا گیا۔ ریاست میسور کا انتظام آئندہ پچاس سال تک انگریزی حکومت کے تحت رہا۔ بعد میں لارڈ رپن کے عہد حکومت میں ریاست جائز وارث کو واپس کر دی گئی۔

لارڈ ولیم بنٹنک اگرچہ امن و سلامتی کی حکمت عملی کا دعویدار تھا اور چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں جہاں تک ہو سکے کسی قسم کا دخل نہ دے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی اس پالیسی سے بے جا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور بعض ریاستوں میں انتظامی ابتری پھیل گئی ہے تو اس نے عدم مداخلت کے اصول کو ترک کر دیا۔ اس نے جے پور جودھپور اودے پور کوٹہ، بوندی اور مرہٹوں میں بھونسلا، ہلکر اور گیکواڑ کے معاملات میں موثر طور پر دخل دیا تاکہ وہاں کی انتظامی ابتری دور ہو کر رعایا کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔

مغل شہنشاہ کی شکایتیں اس زمانے میں بہادر شاہ مغلوں کا آخری بادشاہ لال قلعہ میں حکمران تھا۔ اس کی حیثیت انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار کی رہ گئی تھی۔ اگرچہ ظاہری شاہی اختیارات اسے حاصل تھے لیکن حقیقت میں دہلی کے انگریز رزیڈنٹ کے رحم و کرم پر اس کا انحصار تھا۔ اس کو انگریزی حکومت سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ جن علاقوں کی آمدنی اس کے لئے خاص کر دی گئی تھی ان کے لگان میں جب اضافہ ہوا تو وہ چاہتا تھا کہ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا جائے۔ انگریزی حکومت کو غالباً اس جائز مطالبہ کو ماننے میں انکار نہ ہوتا لیکن اختلاف اس بات پر ہوا کہ بہادر شاہ جس چیز کو اپنا ذاتی حق سمجھتا تھا اسے انگریزی حکومت اپنی عنایت جتانا چاہتی اور یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ حقیقت میں انکا وظیفہ خوار ہے۔[1]

---

[1] Beveridge, A Comprehensive History of India III, p. 212

بہادر شاہ نے انگریزی حکومت کے اس برتاؤ کو اپنی ذلت خیال کیا اور راجا رام موہن رائے کو آمادہ کیا کہ وہ انگلستان جاکر اس کے معاملہ کو ارباب اقتدار کے روبرو پیش کرے۔ حکومت ہند کو اس پوری کارروائی کی مطلق اطلاع نہیں دی گئی۔ راجا رام موہن جب ۱۸۳۱ء میں انگلستان پہنچے تو حکومت انگلستان نے انھیں بہادر شاہ کا بھیجا ہوا سفیر ماننے سے انکار کیا جب تک کہ وہ حکومت ہند کی توثیق نہ حاصل کریں۔ راجا رام موہن رائے نے باوجود ان تمام دشواریوں کے جو نوکر شاہی اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ پیش کیا کرتی ہے بہادر شاہ کے معاملہ میں انگلستان کی رائے عامہ کی ہمدردی حاصل کرلی لیکن حکومت انگلستان اور بورڈ آف کنٹرول نے بہادر شاہ کی کارروائی کو غیر ضابطہ قرار دیا اور اس لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ راجا رام موہن رائے کی قابلیت اور سیرت اعلیٰ تھی یہ برہمو سماج کے بانی تھے۔ انگلستان کے سفر کے دوران میں انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کا اپنی تقریروں میں اظہار کیا جنھیں بہت پسند کیا گیا ستمبر ۱۸۳۳ء میں وہ بیمار میں مبتلا ہوئے اور برسٹل کے مقام پر ان کا انتقال ہوا غرضکہ بہادر شاہ کو راجا رام موہن رائے کی سفارت سے جو انگلستان بھیجی گئی تھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا بلکہ الٹا نقصان یہ ہوا کہ لارڈ ولیم بنٹنک اس بالا بالا کارروائی پر بہت بگڑا۔ چنانچہ شمالی ہند کا جب وہ دورہ کر رہا تھا تو دہلی بھی گیا لیکن معمول کے خلاف بہادر شاہ سے ملاقات نہیں کی اور اس طرح اپنی ناراضی ظاہر کی۔ ہندوستان میں عام طور پر بہادر شاہ کے ساتھ ہمدردی اس لئے اور بھی کی گئی کہ انگریزی رزیڈنٹ اپنے اقتدار کو ہر وناکس[2] پر جتانا چاہتا تھا بنٹنک نے اسکو واپس بلاکر دوسرا رزیڈنٹ مقرر کر دیا۔

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان جہازوں کی

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان دخانی جہازوں کی آمد و رفت ۱۸۳۴ء

۲ Auber, Rise and Progress of the British Power in India, II, p. 622

آمد و رفت میں اس زمانے میں کم و بیش ایک طرف سے پانچ مہینے لگ جاتے تھے۔ مئی ۱۸۲۳ء میں کلکتہ کی پبلک نے ان جہازرانوں کے لئے جو انگلستان اور ہندوستان کے درمیان بحری سفر کو جلد طے کرسکیں چندہ کرکے انعام مقرر کئے۔ چندہ کرنے والوں نے اعلان کیا کہ اگر کوئی جہاز ایک طرف سے بحری سفر ۷۰ دن میں طے کرے تو اسکو خاص طور پر انعام دیا جائے گا۔ کپتان جونسن نے اپنے جہاز انٹرپرائز کے ذریعہ کوشش کی کہ راس امید کے گرد ہوکر اپنے سفر کو ۷۰ دن میں طے کرسکے لیکن اس کو ایک سو تیرہ دن لگ گئے۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے اس معاملہ میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور مجلس نظما سے پوچھ گچھ کے بعد ۲۰ ہزار روپیہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مسافت کم کرنے کی تجویز کو فروغ دینے کے لئے خاص کردیا[1]۔ چنانچہ بحر قلزم کے راستہ سے تجربہ کرنے کا ارادہ کیا گیا اور چارسوٹن کا ایک دخانی جہاز جو بمبئی میں بنایا گیا تھا سوئز روانہ ہوا۔ بمبئی سے سوئز تک کا سفر ایک مہینے میں طے ہوگیا۔ نہر سوئز ابھی نہیں کھدی تھی۔ خشکی کا تھوڑا سا سفر کرنے کے بعد بحر قلزم سے انگلستان تک سفر کیا گیا۔ اسی طرح تین تجربے کئے گئے۔ حکومت ہند اس نتیجہ پر پہنچی کہ بحر قلزم کے راستہ سے ہندوستان اور انگلستان کی بحری مسافت ۵۵ روز میں آسانی سے طے کی جاسکتی ہے۔ پارلیمنٹ نے بھی اس مسئلہ کی طرف توجہ کرکے یہ تجویز منظور کی کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان دخانی جہازوں کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ قائم کرنا قومی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ اس تجربہ میں خرچ کافی ہو رہا تھا اس لئے مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) نے سرد مہری سے کام لیا جس کی وجہ سے وہی پرانے راس امید کے راستے سے بحری آمد و رفت ہونے لگی۔ آخر کار جب نہر سوئز ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تو انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مسافت تین ہفتوں میں اور بعد میں

---

[1] Auber, Rise and Progress of the British Power in India II. p. 641

اس سے بھی کم عرصے میں طے ہونے لگی۔

سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل کی حیثیت سے۔

لارڈ ولیم بنٹنک کی صحت کچھ عرصے سے خراب رہنے لگی تھی۔ اس نے مجلس نظما کو ۱۸۳۵ء میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد مستعفی ہونے والا ہے۔ چنانچہ مسٹر الفنسٹن کے انکار کرنے پر مجلس نظماء نے سر چارلس مٹکاف کو جو صوبہ آگرہ کا گورنر تھا عارضی طور پر گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ وہ اس زمانے کے سب سے زیادہ قابل اور تجربہ کار انگریز عہدہ داروں میں شمار ہوتا تھا۔ مجلس نظما کی یہ خوشی تھی کہ سر چارلس مٹکاف کو بعد میں مستقل طور پر گورنر جنرل کر دیا جائے لیکن بورڈ آف کنٹرول نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور یہ استدلال پیش کیا کہ گورنر جنرل کے عہدہ پر کمپنی کے کسی ملازم کا فائز ہونا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ یہ عہدہ کسی اعلیٰ درجہ کے انگریز مدبر کے لیے خاص ہونا چاہیے۔ ابھی یہ مسئلہ حکومت انگلستان کے زیر غور ہی تھا کہ کس کو بنٹنک کا جانشین بنایا جائے سر چارلس مٹکاف کے بعض عمل اصول سے جو اہل ہند کے حق میں مفید تھے انگلستان کے قدامت پسند طبقے اس سے ناراض ہو گئے۔

اخباروں کی آزادی

سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل ہونے کے بعد ان امتناعی احکام کو منسوخ کر دیا جو اخباروں پر لارڈ ولزلی کے زمانے سے عاید کئے گئے تھے اور جن کی وجہ سے اخباروں کی تنقید کرنے کی آزادی چھن گئی تھی۔ لارڈ ولیم بنٹنک نے اپنے عہد حکومت میں نظم و نسق کی اکثر غیر ضروری قیدوں کو ہٹا دیا تھا۔ چنانچہ مٹکاف کی رائے میں اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ اخباروں کو تنقید کرنے کے حق سے محروم رکھا جائے۔ اصل میں ولزلی نے سنہ ۱۸۰۱ء میں فوجی اور انتظامی اغراض کے تحت اخباروں پر قیدیں لگائی تھیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے یہ اصول مقرر کیا کہ اگر کوئی انگریز اخبار نویس قواعد کی خلاف ورزی کرے تو اسکو انگلستان واپس بھیجد یا جائے گا۔ چنانچہ اس اصول پر بعد میں عمل بھی ہوا۔ سر چارلس مٹکاف کا خیال تھا کہ بنٹنک نے اگرچہ عملی طور پر ہر قسم کی سیاسی پابندیوں سے بیزاری

ظاہر کی تھی لیکن قانونی طور پر سیاسی پابندیاں موجود تھیں اور خاص طور پر اخبارات پر جنھیں دور کرنا چاہئے ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے نافذ ہونے کے بعد انگریزوں کو ہندوستان میں آزادی کے ساتھ رہنے اور بسنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ دو سال کے عرصے میں جو انگریز کلکتہ اور دوسرے بڑے شہروں میں تجارتی اغراض کے لئے ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ انھیں آزادئ تحریر و تقریر کے وہی حقوق اس ملک میں بھی ملنے چاہئیں جو انھیں دوسرے برطانوی مقبوضات میں حاصل تھے۔ سر چارلس مٹکاف ہمیشہ سے لبرل رجحانات کا شخص تھا۔ اس نے اپنی عارضی گورنر جنرلی کے زمانے میں ایک ضابطہ نافذ کیا جس کی رو سے اخباروں پر قیدیں لگانے والے اگلے قوانین منسوخ کر دیے گئے اور مطبعوں کو خیالات کی اشاعت کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس نے دیسی زبانوں میں بغیر کسی اجازت نامہ کے اخبارات شائع کرنے کی اجازت دیدی اور اس طرح نامہ نگاروں اور اخبار کے مدیروں پر اظہار خیال کی پہلی سی روک ٹوک نہ رہی۔ اس اصلاح کی وجہ سے انگریزی اور دیسی اخباروں کو اس کا موقع ملا کہ اپنے خیالات بے کسی خوف کے حکومت کے سامنے پیش کر سکیں اور اس کی انتظامی کارروائیوں پر تنقید کر سکیں۔ سر چارلس مٹکاف کی اس اہم اصلاح پر انگلستان کے قدامت پسند انگریز اس سے بہت ناراض ہو گئے اور اس طرح اس کی آئندہ ترقی کی راہ بند ہو گئی۔ چنانچہ گورنر جنرل اور مجلس نظما میں اس مسئلہ پر اختلاف ہو گیا جس کے باعث سر چارلس مٹکاف کو گورنر جنرل کے عہدے پر مستقل نہیں کیا گیا۔ لبرل جماعت کے با اثر اشخاص نے بھی سر چارلس مٹکاف کے طرز عمل کو ضرورت سے زیادہ ترقی پسند سمجھا۔ چنانچہ لبرل وزارت نے اس کے بجائے لارڈ آکلینڈ کو مستقل گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ مٹکاف صوبہ آگرہ کی گورنری پر واپس چلا گیا۔ لیکن جب مدراس کی گورنری خالی ہوئی اور مجلس نظما نے اس کے حقوق کا کوئی خیال نہ کیا تو وہ مستعفی ہو گیا۔ اس کا امکان ہے کہ اگر آکلینڈ کی جگہ مٹکاف کو گورنر جنرل مقرر کیا جاتا تو پہلی جنگ افغانستان کے افسوس ناک واقعات

پیش نہ آتے۔ مجلس نظماء نے ایک نہایت تجربہ کار اور کاردان افسر کی خدمتوں کو کھو دیا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کی خدمتیں حاصل کیں جو ہندوستان کے مسائل سے بالکل ناواقف تھا۔ شکاف کی قابلیت کی قدر افزائی بعد میں اس کو کناڈا کا گورنر جنرل بنا کر کی گئی۔

تیرھواں باب

افغانستان اور پنجاب کے معاملے

لارڈ آکلینڈ ۱۸۳۶ء
ن ۱۸۴۲ء

لارڈ آکلینڈ نے انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے مجلس نظماء کی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی بڑی آرزو ہے کہ
ورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ کروڑوں ہندوستانیوں
و اچھی حکومت کی برکتوں سے آشنا کرے اور تعلیم کو ترقی دینے کے
سیلے مہیا کرے۔ چنانچہ اپنا عہد حکومت شروع کرنے کے بعد اس نے
یک حد تک اپنی ان آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ لیکن
ونکہ لارڈ آکلینڈ کو خود اپنی ذات اور اپنی رائے پر بھروسا نہ تھا اسلئے
س سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی انتظامی اصلاحوں کی تکمیل کرتا جنگ
فغانستان کا واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے انگریزی حکومت کو ایسی
لت اٹھانی پڑی کہ پہلے کبھی ہندوستان میں نہیں اٹھائی تھی۔

لارڈ آکلینڈ نے میکالے سے مشورہ کرنے کے بعد جو قانونی رکن
ھا یہ قانون منظور کیا کہ آئندہ صدر عدالت کو اپیل کے پورے اختیارات

ملنے چاہئیں اور اس کا اختیار سماعت صرف دیسی باشندوں کے مقدموں تک ہی نہ ہو بلکہ یورپین باشندوں کے مقدمے بھی اس کے روبرو پیش ہوا کریں گے۔ اب تک قاعدہ یہ چلا آتا تھا کہ یورپین باشندوں کے مقدمے کی اپیل کلکتہ کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوا کرتی تھی۔ میکالے نے اس کی طرح وضاحت کی کہ "اگر صدر عدالت اس لائق ہے کہ رعایا کے زیادہ حصے کی دادرسائی کے فرائض انجام دے سکے تو کوئی وجہ نہیں کہ مٹھی بھر آدمیوں کو اس کی سماعت کی حدوں سے باہر رکھا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی اعلیٰ ترین عدالت پر بھروسا نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں ہم ہندوستان کے دیسی باشندوں سے بھی یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اس پر بھروسا رکھیں"۔ غرضکہ حکومت ہند نے جب بذریعہ قانون صدر عدالت کے اختیارات میں توسیع کی تو کلکتہ کے یورپین باشندوں نے اس کو اپنی توہین خیال کیا اور میکالے کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ لیکن لارڈ آکلینڈ نے میکالے کی پوری طرح تائید کی اور قانون مذکور نافذ ہو گیا۔ میکالے یورپین باشندوں کی اس مخالفت سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ وہ مستعفی ہو کر انگلستان چلا گیا۔ اس نے تعزیرات ہند کے لئے بہت کافی مواد مرتب کیا جسے بعد میں اس کے جانشینوں نے استعمال کر کے اس کے کام کی تکمیل کی۔

تعلیمی امور میں لارڈ ولیم بنٹنک جس نئی پالیسی کی داغ بیل ڈال گیا تھا اس کو ترقی دینے کی لارڈ آکلینڈ نے پوری کوشش کی اور میکالے کے مشورہ کے مطابق سرکاری مدرسوں میں انگریزی تعلیم کی توسیع اور ترویج کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ بنٹنک کے عہد میں کلکتہ میں جو میڈیکل کالج قایم ہوا تھا اسی طرح کے میڈیکل کالج مدراس اور بمبئی میں بھی قایم کئے گئے۔

دیسی ریاستیں

لارڈ آکلینڈ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں دخل دینے کے اصول کا قائل تھا۔ جولائی ۱۸۳۷ء میں جب نصیر الدین حیدر والی اودھ کا انتقال ہوا تو اس کی جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا

بادشاہ بیگم جسے جانشین بنانا چاہتی تھیں اس کو انگریزی رزیڈنٹ کرنل جان لو نواب بنانے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نواب نصیرالدین حیدر کے چچا نصیرالدولہ کو جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزی فوج کی مدد سے نصیرالدولہ کو تخت نشین کرادیا۔ بادشاہ بیگم اور اس کے حامیوں کو گرفتار کرکے کانپور بھیج دیا گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے احکام کے بموجب نئے والیٔ اودھ نے حکومت برطانیہ سے اپنے معاہدے کی تجدید کی جس کے بموجب انگریزی فوج کے اخراجات میں اضافہ کیا گیا اور نظم و نسق کے معاملوں میں بھی حکومت ہند کی دخل دہی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔[۱]

اودھ کے علاوہ لارڈ آکلینڈ نے ریاست ستارہ، اندور اور کرنول کے اندرونی معاملوں میں دخل دیا۔ ستارہ کے راجا کو برطرف کرکے اس کے بھائی شاہ جی کو گدی پر بٹھایا۔ اندور کے راجا نے حکومت ہند کا اشارہ پاکر اپنے وزیروں کو بدل دیا اور بہتر انتظام کی کوشش کی۔ نواب کرنول نے انگریزی دخل دہی کی مخالفت کی تو حکومت مدراس کے حکم کے بموجب اس کے خلاف فوج کشی کرکے اس کو الگ کر دیا گیا اور اس کی ریاست احاطہ مدراس میں شامل کرلی گئی۔

افغانستان کے امور نپولین اعظم کے زوال کے بعد یورپ میں صرف روس کی قوت ایسی تھی جو ایشیا میں انگریزی شہنشاہیت کی مدمقابل بن سکتی تھی۔ خاص کر وسط ایشیا پر روسی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہندوستان کی شمال مغربی سرحد روسی فوجوں کی زد میں آگئی تھی۔ روسیوں نے دریائے جیحون کے کنارہ پر قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرلیا تھا اور روسی مدبر ایران اور افغانستان میں اپنا اثر بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ روسی خطرہ کے باعث انگریزی حکومت

[۱] Beveridge, A Comprehensive History of India Vol. III, p. 266.

کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ افغانستان کے معاملوں سے جہاں روسی اثر آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا چشم پوشی کرسکے۔ ۱۸۳۷ء میں الگزنڈر برنس حکومت افغانستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قایم کرنے کی غرض سے کابل پہنچا۔ وہ اس سے پہلے بھی افغانستان، ایران اور وسط ایشیا کا سفر کرچکا تھا تاکہ ان علاقوں کی سیاسی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ لارڈ آکلینڈ نے دوست محمد خاں والیٔ افغانستان کے نام جو خط دیا اس میں تجارت کے اقتصادی فائدوں کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "آپ کی روشن خیالی کے آگے یہ بات واضح ہوگئی کہ تجارت پر قوموں کی فلاح و ترقی کا دارومدار ہوتا ہے۔ تجارت کے ذریعہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ اپنے زائد از ضرورت مال کا تبادلہ کرتی ہے۔ اس طرح قومی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور تمدن کی آسائشیں اور برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ برطانوی حکومت کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ ان ملکوں میں جو سلطنت برطانیہ کے پڑوس میں ہیں تمدن کی آسائشوں اور برکتوں کو وسعت دے۔ انگریزی حکومت صرف اپنے واسطے منافع نہیں چاہتی بلکہ وہ چاہتی ہے کہ ایشیا کے تمام ملکوں کی فلاح اور بہبود کی ترقی ہو اور ان میں امن وامان قایم ہو۔"[1]

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ برنس کی سفارت محض تجارتی اغراض کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کی تہ میں سیاسی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ چنانچہ خود برنس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند رسمی ملاقاتوں کے بعد اس کی گفتگو کا موضوع سیاسی معاملات رہے۔ امیر دوست محمد خاں کے پیش نظر اس زمانے میں رنجیت سنگھ سے پشاور کا شہر واپس لینا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت رنجیت سنگھ پر اثر ڈال کر اس کو پشاور واپس دلا دے۔ لیکن برنس نے بتایا کہ برطانوی حکومت دوسری خودمختار

[1] Beveridge, A Comprehensive History of India Vol. III, p. 297

ریاستوں کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ رنجیت سنگھ پر کسی قسم کا سیاسی اثر ڈالا جائے۔ برنس کی سیاسی گفت و شنید ابھی جاری ہی تھی کہ شاہ ایران اور روس کے سفیر بھی کابل پہنچ گئے۔ امیر دوست محمد خاں نے برنس کو پھر یقین دلایا کہ اگر انگریزی حکومت رنجیت سنگھ سے پشاور واپس دلانے کا وعدہ کرے تو وہ حکومت ایران اور حکومت روس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہیں قایم کرے گا اور ایران اور روسی سفیروں کو سرسری ملاقات کے بعد رخصت کر دے گا۔ برنس نے لارڈ آکلینڈ کو افغانستان کے اصلی حالات سے آگاہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ امیر دوست محمد خاں کے دوستانہ پیشکش کو قبول کرے اور اس کے ساتھ سیاسی ارتباط قایم کرنے کے متعلق ہدایتیں روانہ کرے۔ امیر دوست محمد خاں نے لارڈ آکلینڈ کے جواب کے انتظار میں روسی سفیر وِکٹووِچ کو اب تک باریابی کا موقع نہیں دیا تھا تاکہ برنس کے ساتھ جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہ ہو۔ لیکن لارڈ آکلینڈ اور اس کی کونسل کے ارکان نے امیر دوست محمد خاں کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ گورنر جنرل کی طرف سے امیر دوست محمد خاں کو جو خط بھیجا گیا اس کا انداز تحکمانہ تھا جس کی وجہ سے افغانستان کے حکمران خاندان کے ہر فرد کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت اور حقارت کی آگ بھڑک اٹھی۔ برنس کابل سے ہندوستان واپس آ گیا۔ اس کی واپسی کے بعد روسی سفیر وِکٹووِچ کا دربار کابل میں بڑی عزت و شان کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ غرضکہ لارڈ آکلینڈ کی پالیسی سے افغانستان کی خارجی سیاست بڑی حد تک روس کے زیر اثر آ گئی۔ روسی سفیر نے رنجیت سنگھ کے خلاف شاہ ایران اور روسی حکومت کی مدد کا دوست محمد خاں کو یقین دلایا بشرطیکہ وہ انگریزی حکومت سے بے تعلق ہو جائے۔

اسی اثناء میں شاہ ایران نے شہر ہرات پر چڑھائی کر دی جو مغربی افغانستان کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کا حکمران کامران شاہ بڑا ظالم اور

عیش پسند تھا۔ روسی اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ روسی سفیر مقیم طہران سمونوچ نامی چاہتا تھا کہ ہرات پر اہل ایران کا قبضہ ہو جائے تاکہ روسی اثر مغربی افغانستان تک اس طرح بالواسطہ پہنچ جائے۔ ہرات کا محل وقوع فوجی نقل و حرکت کے اعتبار سے وسط ایشیا میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ انگلستان کی ہدایت کے بموجب انگریزی سفیر مقیم طہران مسٹر ایم نیل نے شاہ ایران کو ہرات پر چڑھائی کرنے سے باز رکھنا چاہا لیکن شاہ پر روسی اثر اتنا غالب تھا کہ اس نے اس کی ایک نہ سنی اور پچاس ہزار فوج اور پچاس توپیں لے کر نومبر ۱۸۳۷ء میں ہرات کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ محصورین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ شاہ ایران چاہتا تھا کہ کسی بہانے سے محاصرہ اٹھالے لیکن روسی اثر کی وجہ سے وہ جو چاہتا تھا نہیں کر سکتا تھا۔ حکومت انگلستان کے ایما پر لارڈ آکلینڈ نے خلیج فارس میں بمبئی کے ساحل سے بحری بیڑا بھیجدیا تاکہ شاہ ایران کو بتا دیا جائے کہ اگر اس نے ہرات کا محاصرہ فوراً نہ اٹھا لیا تو اسے برطانوی حکومت کی سخت ناخوشی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شاہ ایران جو محاصرہ اٹھانے کے لئے بہانے کی تلاش میں تھا اس کو اب تو بڑا اچھا بہانہ مل گیا۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۸۳۸ء کو ایرانی لشکروں کو ہرات سے واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ اس ناکام محاصرہ کی وجہ سے شاہ ایران اور اس کے روسی مشیروں کی بڑی سبکی ہوئی۔

لیکن روسی ریشہ دوانی افغانستان میں برابر جاری رہی۔ روسی سفیر ویکیٹوچ نے والئ افغانستان اور ملک کے دوسرے با اثر لوگوں سے اپنے تعلقات بڑھالئے تھے اور ان تعلقات سے سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وسط ایشیا اور ایران اور افغانستان میں روسی اثر کے بڑھنے سے برطانوی حکومت کو سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ برطانوی کابینہ نے اعلان کر دیا کہ ہمارے مشرقی مقبوضات کی حفاظت اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ایسے حکمران کا اقتدار قایم ہو جو ہمارا ہمدرد ہو اور اسطرف

سے حملے کی صورت میں مداخلت کرنے پر آمادہ ہو بجائے ایسے حکمران کے جو ہماری مخالف قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح سے کھیلے۔ اس اعلان کے ساتھ لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ کو برطانوی کابینہ نے حکم دیا کہ وہ افغانستان کے معاملوں میں ایسی قطعی مداخلت کرے کہ انگریزی قوم کے مفاد کا پوری طرح سے تحفظ ہو جائے۔ لارڈ پامرسٹن نے آکلینڈ کو افغانستان کی غیر تشفی بخش حالت کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ وسط ایشیا کی طرف سے دشمن کے قدم بڑھانے کی جو آہٹ سنائی دے رہی ہے اس کی طرف سے بے توجہی نہ برتے۔ گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کی یہ رائے تھی کہ جب تک دوست محمد خان کو افغانستان کے تخت و تاج سے الگ کر کے شاہ شجاع کو جو انگریزوں کا دوست تھا اقتدار نہ دلایا جائے اس وقت تک افغانستان کے معاملات میں یکسوئی کی امید رکھنا بیکار ہے۔ چنانچہ جون ۱۸۳۸ء میں حکومت ہند، رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع میں اتحاد ثلاثہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ شاہ شجاع افغانستان کا حکمران ہونے کے بعد روسیوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ انگریزی حکومت اور رنجیت سنگھ فوجی مدد سے اسکو تخت افغانستان پر بٹھائیں گے۔ رنجیت سنگھ نے فوجی مدد اس شرط پر دینا منظور کی کہ شاہ شجاع دربار لاہور کے اقتداری حقوق اس تمام علاقے پر تسلیم کرے گا جو دریائے انڈس کے پار واقع ہے اور جس میں پشاور بھی شامل ہے۔ غرضکہ اتحاد ثلاثہ کے طے ہو جانے کے بعد دوست محمد خاں کے خلاف فوج کشی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

جب اتحاد ثلاثہ کی شرطوں کا انگلستان میں علم ہوا تو بعض حلقوں میں اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ چنانچہ الفنسٹن نے جو افغانستان کے حالات سے بخوبی واقف تھا صاف طور پر اپنے بیان میں کہہ دیا کہ شاہ شجاع برطانوی سنگینوں کے بل بوتے پر زیادہ عرصے تک تخت افغانستان پر نہیں بٹھایا جا سکے گا۔ لارڈ وِلزلی اور لارڈ ولیم بنٹنک نے افغانستان پر فوج کشی کرنے کے منصوبے کو سخت حماقت سے تعبیر کیا۔ ڈیوک آف ولنگٹن نے جو

مشرق کے حالات سے نہ صرف باخبر تھا بلکہ عملی فوجی تجربہ رکھتا تھا پیشین گوئی کردی تھی کہ افغانستان میں اگر انگریز کوئی حکومت قایم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھیں اس کے لئے تیار ہو جانا چاہئے کہ وہاں ہمیشہ فوج کشی کرتے رہیں اس واسطے کہ بے اس کے ان کی بنائی ہوئی حکومت قایم نہیں رہ سکے گی۔ لیکن لبرل وزارت اس پر تلی ہوئی تھی کہ افغانستان کے معاملہ میں قطعی یکسوئی ہو جانی چاہئے اور اس کی صورت سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتی تھی کہ وہاں ایسے شخص کو برسر اقتدار کیا جائے جو انگریز قوم کو اپنا محسن سمجھتا ہو۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر سر جان ہاب ہاوس نے افغانستان پر مہم روانہ کرنے کی باقاعدہ اجازت گورنر جنرل کو روانہ کردی۔ فوج کشی شروع ہونے سے پہلے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے اعلان کیا کہ فوجی اجتماع کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہرات کا جو محاصرہ ایرانی فوجوں نے روسی ایما پر کر رکھا ہے اس کو بے اثر بنا دیا جائے اور ایرانی فوج کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ محاصرہ اٹھالے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہرات کا محاصرہ اُٹھ چکا تھا اور روسی خطرہ بڑی حد تک دور ہو گیا تھا اس واسطے کہ برطانوی حکومت کے احتجاج پر روسی حکومت نے اپنے سفیر کو افغانستان سے واپس بلا لیا تھا۔ لیکن باوجود اس کے نومبر ۱۸۳۸ء میں حکومت ہند نے اعلان کیا کہ اگرچہ ہرات کا محاصرہ اٹھ چکا ہے لیکن برطانوی حکومت نے شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ یہ بڑی بے عزتی کی بات ہوگی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی فوج کا افغانستان پر حملہ کسی اعتبار سے بھی حق بجانب نہیں تھا۔ دوست محمد خاں بحیثیت حکمران کے اپنے اہل ملک کی نظروں میں وقعت رکھتا تھا۔ اس لئے افغانستان کی سیاسی افراتفری اور انتشار کو بڑی حد تک اپنی دور اندیش پالیسی کی بدولت دور کر دیا تھا۔ ایک آزاد حکمران کی طرح اس کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی مصلحتوں کے مدنظر چاہے روس کے ساتھ اور چاہے ایران سے دوستانہ معاہدے کرے۔ انگریزی حکومت کو وسط ایشا کا چودھری کس نے بنایا تھا کہ وہ جو حکم دے اسی کے مطابق افغانستان چلے۔ پھر برطانوی حکومت دوست محمد خاں

کے مقابلہ میں جس شخص کو افغانستان کے تخت و تاج کے لئے کھڑا کر رہی تھی وہ افغانیوں کی نظر میں اخلاقی حیثیت سے گرا ہوا تھا۔ شاہ شجاع کمزور کیرکٹر کا شخص تھا۔ وہ انگریزوں اور سکھوں کا وظیفہ خوار تھا۔ غیور افغان یہ کیس طرح گوارہ کر سکتے تھے کہ ایسے شخص کو اُن پر اُن کی مرضی کے خلاف مسلط کیا جائے۔

نومبر ۱۸۳۸ء میں پنجاب میں فیروز پور کے مقام پر برطانوی سپاہ اور رنجیت سنگھ کی فوجوں کا اجتماع ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ بڑا ہوشیار تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ افغانستان کے خلاف جنگی کارروائیوں کے لئے پنجاب کو مرکز بنایا جائے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے اشارہ پر پنجاب کے بجائے سندھ کو جنگی کارروائیوں کا مرکز قرار دیا گیا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں دشواری تھی۔ لیکن لارڈ آکلینڈ کو اپنے وفادار دوست رنجیت سنگھ کے اصرار پر یہ بات ماننی پڑی۔ اس لئے اپنے سکرٹری میک ناٹن کے ذریعے سندھ کے انگریزی سفیر کو کہلا بھیجا کہ سندھ کے امیروں کو اطلاع دے دی جائے کہ موجودہ فوجی ضرورتوں کے مدنظر معاہدہ کی وہ دفعہ جس میں دریائے انڈس کی راہ سے جنگی ساز و سامان بھیجنے کی ممانعت کی گئی ہے اسوقت تک معطل سمجھنی چاہئے جب تک کہ افغانستان کی مہم سر نہ ہو جائے۔ میک ناٹن نے امیران سندھ سے مطالبہ کیا کہ وہ شاہ شجاع کو پچیس لاکھ روپے ادا کریں جو پیشکش کا بقایا ان پر عرصے سے چلا آرہا تھا۔ سندھ کسی زمانے میں کابل کا باجگزار تھا لیکن اب مدت سے وہ خود مختار ہو گیا تھا۔ شاہ شجاع کو پنجاب آکر جب روپے کی ضرورت ہوئی تو اس نے امیران سندھ سے تیس لاکھ روپیہ اس شرط پر طلب کیا تھا کہ آئندہ وہ وہاں سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جائے گا اگر اس کو یہ رقم ادا کر دی گئی۔ چنانچہ سندھ کے امیروں کے پاس شاہ شجاع کی تحریر مع اس کی مہر اور دستخط کے موجود تھی جس میں اس نے فارغ خطی لکھ دی تھی۔ اس دستاویز کو دیکھ کر مطالبہ میں کوئی جان باقی نہیں رہی۔ میک ناٹن کی جب یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی تو اس نے امیران سندھ کو عہد معاہدت کرنے پر مجبور کیا جس کی رو سے تین لاکھ روپے سالانہ فوجی اخراجات کے ضمن میں واجب الادا

ٹھیرایا گیا۔ شروع شروع میں تو سندھ کے امیروں نے اس معاہدہ کو ماننے سے انکار کیا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایسا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں تو انھوں نے دستخط کر دیے اور پہلے سال کی مقررہ رقم بھی ادا کر دی[1]۔

دریائے انڈس کو پار کرنے کے بعد شمالی ہند کی انگریزی فوج سر ولبی کاٹن کی سر کردگی میں اور بمبئی کی فوج سر جان کین کے ماتحت افغانستان میں داخل ہوئی درہ بولان کے راستے سے قندھار پر چڑھائی کر دی گئی۔ ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء شاہ شجاع کی قندھار میں تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اگرچہ سفر میں انگریزی فوجوں کو سخت مصیبت اٹھانی پڑی لیکن افغانوں نے ان کا اب تک کہیں مقابلہ نہیں کیا۔ دوست محمد خاں کے بیٹے حیدر خاں نے غزنی میں قلعہ بند ہو کر مزاحمت کی ٹھانی۔ اس کے پاس چھ مہینے کی رسد موجود تھی۔ لیکن شاہی خاندان کا ایک افسر انگریزوں سے مل گیا اور قلعہ کا سارا حال انھیں بتا دیا۔ چنانچہ ایک کمزور مقام پر فصیل میں رخنہ ڈال دیا گیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ دوست محمد خاں نے یہ خبر سن کر کابل خالی کر دیا اور بخارا کی طرف چلا گیا۔ ۷ اگست ۱۸۳۹ء کو شاہ شجاع بڑی شان و شوکت کے ساتھ کابل میں داخل ہوا۔ کرنل آوٹ رم نے دوست محمد خاں کا کچھ دور پیچھا کیا لیکن پھر اس خوف سے کہ کہیں آگے بڑھنے میں مصیبتیں نہ ہوں واپس آ گیا۔ شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کے بعد انگریزی افواج کو جن کے ساتھ ۶ ہزار سکھ فوجیں بھی تھیں ہندوستان واپس آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن حکومت ہند نے احکام صادر کیے کہ اگر شاہ شجاع کو بے یار و مددگار کابل میں چھوڑ کر برطانوی فوج واپس گئی تو پھر اس پر جلا وطنی لازمی ہو جائے گی اور برطانوی حکومت کی سخت ذلت ہو گی۔ اس لیے جب تک حالات میں پائیداری نہ ہو جائے انگریزی فوجوں کو افغانستان میں ٹھہرنا چاہیے۔

---

[1] Thornton, The History of the British Empire in India Vol VI p. 411.

شاہ شجاع کو تخت افغانستان پر بیٹھے ہوئے اب دو سال گزر چکے تھے۔ دوست محمد خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن اس سے افغانوں کی عداوت اور ان کے بڑھے ہوئے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ افغانوں میں حب وطن کا جذبہ بھڑک اٹھا تو ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ شورش اور جنگ کا بازار گرم ہو گیا۔ انگریزوں نے اس کو فرو کرنے کے لئے جتنی سختی کی اتنی ہی افغانوں کی بیزاری اور دشمنی بڑھتی گئی۔ اُدھر انگریزی فوجوں کے ذخیرے کم ہو گئے تھے۔ کئی سالوں کی لشکرکشیوں سے وہ تھک گئی تھیں۔ اور ان کی قیادت ایسے افسروں کے ہاتھوں میں آگئی تھی جو اس کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ انگریزی فوج کا بڑا حصہ کابل میں تھا اور فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں غزنی، قندھار اور جلال آباد میں تھیں۔ ان فوجی ٹکڑیوں کی حالت محصورین کی ہو گئی۔ آس پاس کے علاقوں کے افغانوں نے انھیں گھیر لیا۔ آخر میکناٹن نے فیصلہ کیا کہ کابل خالی کر دیا جائے لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ سردی کا موسم آن پہنچا تھا۔ پہاڑی راستے برف سے اٹے پڑے تھے۔ یوں معمول حالات میں بھی وہ دشوار گزار تھے اور اب تو اور بھی زیادہ دشوار گزار ہو گئے تھے۔ وہ ابھی اسی حیص بیص میں تھا کہ راتوں رات افغانوں نے کابل پر حملہ کر دیا۔ برنس مارا گیا۔ جنرل الفنسٹن بجائے اس کے کہ حملہ آوروں کا فوراً مقابلہ کرے ٹال مٹول کرتا رہا اور جنگ سے کتراتا رہا۔ آخر کرنل کمبل جو شاہ شجاع کی حفاظت پر مامور تھا حملہ آوروں کے مقابلے پر آیا۔ لیکن افغانوں نے اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب تک میکناٹن کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ افغانوں کی قوت اور ان کے جوش کا شدت کیا ہے۔ لیکن اب اس کی آنکھیں کھلیں اس نے جنرل سیل اور جنرل ناٹ کو پیغام بھیجے کہ فوراً کابل پر پیش قدمی کریں۔ جنرل سیل اس وقت گندا مک میں بہت تھوڑے جنگی سامان کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ اس لیے بجائے کابل جانے کے جلال آباد کا رخ کیا تاکہ ہندوستان سے فوجی نقل و حرکت کا

تعلق بالکل منقطع نہ ہو جائے۔ جنرل ناٹ اس وقت قندھار میں تھا۔ اس کی حالت جنرل سیل سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس نے سوچا کہ اسکا کابل جانا بے سود ہو گا اس واسطے کہ اس کے پاس جنگی سامان بالکل نہیں تھا۔ اس دوران میں کابل میں انگریز افسروں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ ہر طرف سے رسد کٹ گئی۔ کمک کہیں سے ملی نہیں۔ غرضکہ ان حالات میں مجبور ہو کر میکناٹن نے وہ سب شرطیں مان لیں جو افغان سرداروں نے پیش کیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ جلد سے جلد تمام انگریز فوجوں کو ہندوستان واپس بھیجدیا جائے گا۔ دوست محمد خاں کو رہا کر کے اس کو تخت افغانستان پر بٹھا دیا جائے گا۔ شاہ شجاع کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ چاہے تو انگریزی فوج کے ہمراہ ہندوستان چلا جائے یا افغانستان میں رہے۔ آخری صورت میں اس کو گزر بسر کے لئے وظیفہ کر دیا جائے گا۔ چار انگریز افسر بطور یرغمال افغان سرداروں کے حوالے کئے جائیں گے۔ افغانوں نے انگریزی فوج کی واپسی کے وقت رسد پہنچانے کا وعدہ کیا۔ باوجود اس معاہدہ کے جو میکناٹن اور افغان سرداروں کے درمیان طے ہوا دونوں اپنی اپنی کارروائیوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں لگے رہے۔ میکناٹن نے اپنے میر منشی موہن لال کے ذریعہ بعض افغان سرداروں کو دوست محمد خاں کے بیٹے محمد اکبر خاں کے خلاف کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ محمد اکبر خاں کو کہلا بھیجا کہ اگر وہ شاہ شجاع کی بادشاہت کو مان لے تو اس کو انگریز وزیر بنانے کو تیار ہیں۔ برطانوی حکومت فوراً تیس لاکھ روپیہ یک مشت محمد اکبر خاں کو فوجی اخراجات کی پابجائی کے لئے دے گی اور سالانہ چار لاکھ روپے بطور نذرانہ دیا کرے گی۔ محمد اکبر خاں نے میکناٹن کو مجلس مشاورت میں طلب کیا۔ جب وہ تین انگریز افسروں کے ساتھ پہنچا تو انھیں قتل کرا دیا گیا۔ انگریزی فوج میں سخت انتشار اور سراسیمگی پھیل گئی۔ میجر پوٹنگر نے میکناٹن کے سفارتی عہدہ کو قبول کیا۔ اس نے بھی مجبور ہو کر افغان سرداروں کی شرطیں اسی طرح تسلیم کریں جس طرح سے میکناٹن نے تسلیم کی تھیں۔ افغانوں نے مزید شرطیں پیش کیں کہ انگریزی فوج کے پاس جتنی نقد رقم اور

جتنا بھی سامان ہے وہ سب ان کے حوالے کر دیا جائے اور جتنے شادی شدہ افسر تھے وہ یرغمال کے طور پر اپنے بال بچوں کے ساتھ کابل میں چھوڑ دئے جائیں۔ ۱۹ جنوری ۱۸۴۲ء کو صلح نامہ پر دستخط ہوئے جس پر اٹھارہ افغان سرداروں نے اپنی مہریں ثبت کیں۔ اس صلح نامے پر دستخط ہونے کے دو روز بعد سولہ ہزار انگریزی فوج کابل سے روانہ ہوئی۔ راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا لیکن پھر بھی کوشش تھی کہ نقل و حرکت جتنی تیزی سے ممکن ہو کرنی چاہئے۔ کابل کے باہر پہنچتے ہی افغانوں نے پہاڑوں میں چھپ کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ انگریزی فوج میں انتہائی بے ترتیبی اور ابتری پیدا ہو گئی۔ غرضکہ افغانوں نے راستے کے ہر درے کی پوری طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ محمد اکبر خاں برابر انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے رہا اور میجر پوٹنگر سے کہہ کر انگریز عورتوں اور بچوں کو تباہی سے بچا لیا۔ گندمک تک پہنچتے پہنچتے گیارہ ہزار فوج میں سے صرف بیس افسر اور دو سو گورہ سپاہی باقی رہ گئے۔ ان کا تھکا ماندہ قافلہ جب جلال آباد کی طرف انتہائی بے کسی کی حالت میں روانہ ہوا تو صرف ایک ڈاکٹر برائیڈن کے علاوہ باقی سب کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جلال آباد پر جنرل سیل نے بڑی بہادری سے اب تک اپنا قبضہ قایم رکھا تھا۔

اس تباہی اور شکست کی خبر جب انگلستان پہنچی تو ہل چل مچ گئی۔ اگرچہ اس تمام مصیبت کا سبب انگریز سپہ سالار اور افسروں کی باہمی نا اتفاقی اور نا اہلی تھی لیکن انگلستان کی رائے عامہ نے لارڈ آکلینڈ کو اس ساری خرابی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ چنانچہ مجلس نگران نے اس کو فوراً واپس آنے کا حکم بھیج دیا اور اس کی جگہ لارڈ ایلن برا کو گورنر جنرل مقرر کر کے ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ لارڈ ایلن برا مجلس نگران کا صدر رہ چکا تھا اور اس لئے ہندوستان کے حالات اور آئین حکومت کا براہ راست علم رکھتا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر وہ چاہتا تھا کہ افغانوں سے لڑائی فوراً موقوف کر دی جائے۔ لیکن سر دست وہ اب اس اصول پر عمل نہ کر سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی فوجوں کو افغانستان سے واپس بلانے سے پہلے وہاں انگریزوں کے کھوئے ہوئے وقار کو قایم

کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ جنرل پولک نے درۂ خیبر سے گزر کر جلال آباد کی گھری ہوئی فوج کو کمک پہنچائی اور جنرل ناٹ نے غزنی پر حملہ کرکے شہر کو جلا دیا اور قلعہ کو مسمار کر ڈالا۔ پولک اور ناٹ کی فوجیں کابل تک بڑھتی چلی گئیں۔ کابل میں جو انگریزی قیدی تھے انھیں رہا کیا گیا۔ کابل کے بازار توپوں سے اڑا دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ افغانوں کو مرعوب کیا جائے اور انگریزوں کی پچھلے دنوں جو بے رعبی ہوئی تھی اس کی تلافی ممکن ہو لیکن اس قسم کی کارروائیوں کا افغانوں پر الٹا ہی اثر ہوا۔ ان میں انگریزوں کے خلاف اور زیادہ نفرت پھیل گئی۔ شاہ شجاع کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کا بیٹا فتح جنگ جنرل پولک کی پناہ میں آگیا تھا جنرل پولک نے کابل پر دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد بالا حصار میں باقاعدہ اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی تھی۔[1] لیکن جب فتح جنگ کو معلوم ہوا کہ انگریزی فوج زیادہ دنوں تک کابل میں ٹھہرنے والی نہیں تو اس نے جنرل پولک کے ساتھ ہندوستان جانے کی خواہش کی اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا۔ جب وہ تاج شاہی کے لئے آمادہ نہ ہوا تو اس کے چھوٹے بھائی شاہ پور کو افغانستان کا حکمران تسلیم کیا گیا لیکن وہ بھی انگریزی فوج کی واپسی پر پشاور چلا گیا۔

اس دوران میں لارڈ ایلن برا انگریزی فوج کی کابل تک پیش قدمی سے اندیشہ مند تھا۔ اگرچہ یہ کمک کی فوج کافی ساز و سامان سے لیس ہو کر ہندوستان سے روانہ ہوئی تھی لیکن افغانستان کے حالات کچھ ایسے پیچیدہ تھے کہ گورنر جنرل کو اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا کہ یہ فوج عرصے تک افغانوں سے لڑ سکے گی۔ غزنی اور کابل کی شاندار کامیابیوں کے ساتھ گورنر جنرل کو یہ بھی اطلاع پہنچی تھی کہ قندھار کے قریب جنرل آکلینڈ کی فوج کو سخت شکست کھانی پڑی اور وہ کوئٹہ کی جانب پسپائی کی حالت میں روانہ

[1] Cambridge History of India Vol V p. 519

ہو چکی تھی۔ غرضکہ افغانستان کے حالات ایسے غیر یقینی تھی کہ الن برا جلد سے جلد انگریزی فوجوں کو ہندوستان بلالینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کمانڈران چیف کو اس کے متعلق احکام بھجدیے۔ جنرل پولک اور جنرل ناٹ دونوں اس کے خلاف تھے کہ انگریزی فوجوں کو فوراً ہندوستان واپس بلا لیا جائے اس واسطے کہ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے افغانستان کی صورت حالات پر پوری طرح قابو پالیا ہے۔ اگر اس وقت واپسی ہوئی تو اس کا مطلب شکست سمجھا جائے گا اور ایشیا میں انگریزوں کے اقتدار اور وقار کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ چنانچہ دونوں جنرلوں نے فوری واپسی کے احکام کو کچھ عرصے کے لیے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب انھیں معلوم ہو گیا کہ گورنر جنرل نے فوجیں واپس بلانے کے متعلق جو ارادہ کرلیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو واپسی کا انتظام کیا گیا۔ اہل ہند کو اپنی کامیابی اور فتح مندی کا یقین دلانے کیلئے انگریزی فوج محمود غزنوی کے مقبرہ کے صندلی دروازوں کو اپنے ساتھ لیتی آئی جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ سومناتھ سے انھیں لے گیا تھا۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط تھا۔ غرضکہ واپسی پر ان دروازوں کی شہرت کا شمالی ہند میں خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا "تاکہ انگریزی فتح مندی کا لوگوں کو یقین ہو جائے۔ لیکن تشہیر کی یہ سب تدبیریں ناکام رہیں۔ برطانوی حکومت کی جنگِ افغانستان میں جو بے رعبی ہو چکی تھی اب اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔

لارڈ الن برا نے افغانستان سے واپس آنے والی فوج کا استقبال فیروزپور میں کیا۔ وہاں ایک بڑا جشن منایا۔ دریائے ستلج کے کنارے سیکڑوں ہاتھیوں کا جلوس نکالا گیا۔ واپس آنے والے افسروں کے شامیانوں پر پھریرے اڑائے گئے جن پر ان مقامات کے نام جلی حروف میں لکھے گئے تھے جہاں جہاں انھوں نے افغانوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اس موقع پر گورنر جنرل نے ایک اعلان کیا جس میں بڑے فخر سے بیان کیا گیا کہ انگریزی سپاہ اپنے ہمراہ افغانستان سے سومناتھ کے کواڑ لائی ہے اور آٹھ صدی پہلے کی توہین کا بدلہ لے لیا گیا۔

عملی طور پر لارڈ الن برا نے افغانستان کے معاملے میں یکسوئی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا کہ حکومت ہند حکومت افغانستان سے دوستانہ تعلقات قایم کرنا چاہتی ہے۔ وہ افغانستان کی ہر اس حکومت کو تسلیم کرنے کو تیار ہے جسے افغانی لوگ پسند کرتے ہوں۔ چنانچہ امیر دوست محمد خاں کو رہا کر دیا گیا۔ وہ سنہ ۱۸۴۳ء کے شروع میں افغانستان پہنچ گیا اور اپنی حکومت کی تنظیم شروع کر دی۔ اس وقت افغانستان کو برطانوی حلقۂ اثر میں لانے کا اصول ترک کر دیا گیا۔ لیکن چالیس سال بعد حکومت ہند نے پھر اس قسم کی غلطی کی جس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت جب لارڈ الن برا سے امیر دوست محمد خاں کی رخصتی ملاقات ہوئی تو لارڈ موصوف نے اس سے ہندوستان اور اس کے حکمرانوں کے متعلق رائے دریافت کی۔ امیر صاحب نے سادگی سے کہا کہ آپ کی قوت کے وسیلے حیرت انگیز ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ باوجود ان وسائل دولت کے اس کی کیا ضرورت ہوئی کہ ایک مفلوک الحال اور سنگلاخ خطے پر چڑھائی کر کے مجھے وہاں کی حکومت سے محروم کیا جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ لارڈ آکلینڈ اور انگلستان کی لبرل حکومت نے افغانستان پر چڑھائی کر کے انتہائی کوتاہ نظری کا ثبوت دیا۔ چار سال کی لگاتار پریشانیوں میں سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوا کہ تقریباً بیس ہزار جانیں کھپ گئیں اور کوئی بیس کروڑ روپے کے قریب ضائع ہو گئے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کی افغانی پالیسی سے برطانوی اقتدار اور وقار کو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا میں سخت صدمہ پہنچا۔ حکومت ہند کا یہ فرض تھا کہ وہ انگلستان کی حکومت کو ان تمام خطروں اور دشواریوں سے آگاہ کرتی جو افغانستان میں پیشقدمی کرنے سے لازمی طور پر پیدا ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ حکومت انگلستان روس کے خوف سے افغانستان میں اقدامی پالیسی چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنی خارجی مصلحتوں کے آگے ہندوستان کے مفاد کی پروا نہیں کی اور ان مشکلوں کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جو اس میں پوشیدہ تھیں لیکن پھر بھی

حکومت ہند اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ اس نے پوری طرح اپنا نقطہ نظر حکومت انگلستان کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ممکن ہے کہ حکومت ہند کو وہ ذلت نہ اٹھانی پڑتی جو اسے برداشت کرنی پڑی۔

سندھ کا الحاق

جنگ افغانستان کے موقع پر لارڈ آکلینڈ نے سندھ کے حکمرانوں کو مجبور کیا کہ وہ معاہدے کے ذریعے امدادی فوج اپنے علاقے میں رکھیں۔ جنگ کے دوران میں سندھ فوجی نقل و حرکت کا مرکز بنا دیا گیا اور یہاں کے حکمرانوں نے اس وقت بھی انگریزی حکومت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی جب کہ وہ افغانستان میں سخت مصیبت میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے برطانوی حکومت نے سندھ کے حکمرانوں کی نیک نیتی کی قدر نہیں کی۔ جنگ افغانستان میں سندھ کو مرکز بنانے سے برطانوی حکومت کو جو سہولتیں حاصل ہوئیں ان کی وجہ سے اس کی نیت بگڑی اور سندھ پر وہ للچائی نظریں ڈالنے لگی۔ افغانستان سے فوجیں واپس بلانے کے فیصلے کے ساتھ لارڈ الن برا ارادہ کر چکا تھا کہ پچھلے چند سال میں انگریزوں نے سندھ میں جو قابل قدر حیثیت حاصل کر لی ہے اس سے بھی دستبردار نہ ہونا چاہئے اور جن مقاموں پر انگریزی فوجوں نے عارضی قبضہ کر لیا تھا وہاں مستقل قبضہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کئی حیلے تراشے گئے۔

لارڈ الن برا نے جنگ افغانستان کے بعد یہ دعوی کیا کہ سندھ کے امیروں نے برطانوی حکومت کی جیسی مدد کرنی چاہئے تھی ویسی نہیں کی اور افغانوں سے درپردہ ساز باز کیا۔ لیکن ان الزاموں کی باقاعدہ جانچ نہیں کی گئی۔ انھیں دیدہ و دانستہ مبہم رکھا گیا تاکہ بغیر کسی قسم کی تحقیقات کے حکومت ہند من مانے طور پر امیران سندھ کے ساتھ برتاو کرے۔ سر چارلس نیپیر نے جسے گورنر جنرل نے ۱۸۴۲ء میں سندھ فوجی اور سیاسی نظم و نسق کے کامل اختیارات کے ساتھ اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجا تھا امیران سندھ کو قصوروار ٹھہرایا اور ان پر غداری کا الزام لگایا۔ سر چارلس نیپیر نے یک طرفہ فیصلہ کر دیا کہ امیران سندھ نے ۱۸۳۹ء کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی کی ہے جو ان کے اور برطانوی حکومت کے

درمیان طے ہوا تھا۔ اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ اگر ہم اپنے معاہدوں کی لفظی پابندی کے پیچھے پڑے رہیں گے تو ہم سندھ میں اپنی قوت اور اثر کو کبھی بھی نہیں بڑھا سکیں گے۔ چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ انگریزی حکومت کو چاہئے کہ فوراً ان مقاموں پر قبضہ کر لے جہاں اس وقت اس کے فوجی مرکز قائم تھے۔

گورنر جنرل نے سر چارلس نیپیر کو اختیار دے دیا کہ وہ سندھ کے امیروں سے ایک نیا معاہدہ کرے۔ اس معاہدہ کی رو سے ۳ لاکھ سالانہ کی ادائی کے بجائے جو امدادی فوج کے ضمن میں امیران سندھ ادا کیا کرتے تھے ان علاقوں کو انگریزی عملداری میں ملا لیا گیا جہاں انگریزی فوجوں کے مرکز بنائے گئے تھے۔ انھیں سکہ سازی کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ یہ بھی لازم کیا گیا کہ دریائے سندھ میں جو برطانوی جہاز چلیں انھیں ہر قسم کی رسد اور ایندھن وغیرہ مہیا کیا جائے۔ امیروں نے سکہ سازی کے حق سے محروم ہونا گوارا نہ کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ برطانوی حکومت ان کی تباہی پر تلی ہوئی ہے تو انھوں نے بھی لڑنے کی تیاری شروع کر دی صحرائے سندھ میں قلعہ امام گڑھ کا محل وقوع فوجی لحاظ سے اہم تھا۔ چنانچہ سر چارلس نیپیر نے سب سے پہلے اس قلعہ کی تسخیر کا عزم کیا تاکہ امیران سندھ پر واضح ہو جائے کہ وہ برطانوی حکومت کی قوت اور وسیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ انگریزی فوجیں جب چار دن کی ریگستانی مسافت طے کرنے کے بعد اس قلعہ میں پہنچیں تو اس کو خالی پایا۔ مقابلے کے لیے فوج تو کجا چڑیا تک نہ تھی۔ بارود خانہ میں جو بارود تھی اس کے ذریعہ قلعہ کو اڑا دیا گیا۔ بالائی سندھ کے علاقوں کو ضبط کر کے سر چارلس نیپیر نے حکم جاری کر دیا کہ یہاں کی رعایا سوائے برطانوی حکومت کے کسی دوسرے کو کسی قسم کا محصول نہ ادا کرے۔ میجر آؤٹرم کے کہنے پر سندھ کے امیروں نے معاہدے کے مسودے پر دستخط کر دیے۔

سر چارلس نیپیر کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے سندھ کی رعایا میں انگریزوں کے خلاف انتقامی جذبات بھڑک اٹھے! اگرچہ امیران سندھ نے میجر آؤٹرم کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ حیدرآباد میں قیام نہ کریں پر وہ نہ مانا۔

وہ اپنے ریزیڈنسی کے مکان میں ٹھہرا رہا۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے تین دن بعد ریزیڈنسی پر مسلح سندھیوں نے ہلّہ بول دیا۔ میجر آؤٹرم نے بہادری سے مقابلہ کیا اور ریزیڈنسی سے نکل کر دریا ئے سندھ کے ایک انگریزی جہاز میں پناہ لی۔ اس واقعہ کے بعد سر چارلس نیپئر نے جنگ کا اعلان کر دیا میانی کے مقام پر سندھ کے امیروں کی ۳۰ ہزار فوج کو اس نے شکست دی اور حیدر آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد امیر خیر پور کو دوابا کے مقام پر شکست کھانی پڑی۔ دونوں معرکوں میں سندھی افواج نے بڑی بہادری اور استقلال کا ثبوت دیا۔ لیکن انگریزی فوج کی جنگی مہارت کے لیے ان کی ایک نہ چلی۔ سندھ کے امیروں کی گرفتاری کے بعد شیر محمد اور دوسرے سرداروں نے کچھ عرصے تک جنگ کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام ہوئے۔ حیدر آباد کو انگریزی فوجوں نے خوب دل کھول کر لوٹا۔ خود سر چارلس نیپئر کے حصے میں سات لاکھ روپیے سے زائد آئے۔ سر چارلس نے امیروں کو معزول کر دیا ۵ مارچ ۱۸۴۳ء بذریعہ اعلان سندھ کے پورے علاقے کو برطانوی عملداری میں ملحق کر دیا گیا۔ اعلان میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی کہ چونکہ خیر پور کے امیر میر علی مراد نے انگریزوں کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی اور لڑائی میں ان کا معاون رہا اس لئے اس کے علاقے کو چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں وہ بطور والی ملک حکومت کرے گا۔ امیر خیر پور کے علاقے میں شکار پور اور بھکر کے شہر بھی شامل تھے۔

سندھ کا الحاق جن حالات میں کیا گیا ان کو کسی صورت میں بھی حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ مجلس نظما نے سندھ کے الحاق کی پالیسی کو قابل ملامت قرار دیا اور مجلس نظماء کے صدر سر جان ہاب ہاؤس نے صاف صاف کہا کہ اگر خود لارڈ ایلن برا کو سندھ کے حالات کا حقیقی علم ہوتا تو وہ سر چارلس نیپئر کی جارحانہ حکمت عملی کی ہرگز تائید نہیں کرتا۔ دراصل سر چارلس نیپئر نے واقعات

ا۔ Beveridge A Comprehensive History of India, Vol. III p 470.

کو اتنا توڑ مروڑ کر پیش کیا اور امیران سندھ کی غداری کے الزام کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ گورنر جنرل صحیح رائے قائم نہ کر سکا۔ سر جیمس آوٹرم اس زمانے میں سندھ کا ریزیڈنٹ تھا۔ وہ بھی سر چارلس نیپئر کی پالیسی کے خلاف تھا لیکن سر چارلس کے سامنے اس کی رائے کی کوئی وقعت نہیں سمجھی گئی۔ سر چارلس نیپئر نے جان بوجھ کر بہت سی اطلاعیں گورنر جنرل کو نہ بھیجیں اس لئے کہ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح سندھ پر اسی کے ہاتھوں برطانوی قبضہ ہو جائے

سر چارلس نیپئر کو قانونی اور اخلاقی نوعیت کی بحثوں سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سندھ پر برطانوی حکومت قایم ہو گئی، تو اس سے انگریزوں کو فائدہ پہنچے گا اور خود وہاں کی رعایا کا بھی اسی میں فائدہ ہے۔ اس نے اپنے روزنامچے میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "ہم کو ان امیروں پر دباؤ ڈالنے کیلئے حیلہ بازی سے کام لینا چاہئے...... جو حکومت زیادہ زبردست ہے وہ کمزور کو ہضم کر جائے گی...... ہم کو سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم ضرور کر کے رہیں گے۔ یہ نہایت مفید لیکن پاجی پن کی حرکت ہو گی۔ لیکن ایسی حرکت ہو گی جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ میری جو حیثیت اس وقت یہاں ہے اسے میں خود اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہمیں یہاں آنے کا کیا حق تھا جب کہ ہمارے جسموں پر افغانی برش کا لگایا ہوا ہرکول اب تک لگا ہوا ہے۔" لہ

سر چارلس نیپئر نے سندھ کے الحاق کے بعد وہاں ملکی انتظام میں غیر معمولی قابلیت اور جفاکشی سے کام لیا۔ ممکن ہے کہ انگریزی عملداری کے تحت ملک میں بہتر انتظام ہوا ہو۔ لیکن پھر بھی کسی حیثیت سے ان کارروائیوں کو حق بجانب نہیں ٹھرایا جا سکتا جو سر چارلس نیپئر نے الحاق کے لئے اختیار کیں۔ سندھ کے امیروں نے درحقیقت انگریزی حکومت کے ساتھ برابر دوستانہ تعلقات قایم رکھے تھے اور برطانوی حکومت نے کھلم کھلا وعدے کئے تھے کہ ان کے مقبوضات محفوظ رہیں گے اور ان کی حکومت برقرار رکھی جائے گی۔ سر چارلس نیپئر اور لارڈ النبرا نے امیران سندھ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ برطانوی سیاسی

لہ The life and opinions of general C P. Napier ed by Sir W. Napier, Vol. II, p. 218 and 290.

اخلاق پر ہمیشہ ایک بدنما دھبا رہے گا۔

گوالیار میں مداخلت

۱۸۴۳ء میں جن کوجی سندھیا کے انتقال پر اس کی بیوہ تارا بائی نے اٹھارہ سال کے ایک لڑکے کو گود لیا جس کا نام گیاجی رکھا گیا۔ اس کو حکومت ہند نے بھی راجا تسلیم کر لیا۔ انگریزی حکومت ماماجی کو مدار المہام رکھنا چاہتی تھی جسے رانی ناپسند کرتی تھی۔ چنانچہ ماماجی کو جلاوطن کر دیا گیا جو برطانوی حکومت کو ناگوار ہوا۔ رانی اور اس کے کم عمر بالک کی طرف سے داداجی نے ریاست کے پورے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملکی انتظام میں فوجی اثر بہت بڑھ گیا۔ اس وقت ریاست گوالیار میں فوج کی تعداد تیس ہزار پیدل اور دس ہزار سواروں پر مشتمل تھی جو زیادہ تر راجپوتوں اور پٹھانوں جیسی جنگ جو نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تربیت یوروپین اصول کے مطابق ہوئی تھی۔ ریاست کی آمدنی کا زیادہ حصہ اس فوج کے خرچ میں نکل جاتا تھا اور اکثر اوقات سپاہیوں کی تنخواہوں کا حکومت پر بقایا رہتا تھا۔ ریاست کے انتظام میں ہر طرف ابتری بڑھتی جا رہی تھی۔ لارڈ ایلن برا نے ریزیڈنٹ کو لکھا کہ وہ داداجی کو مدار المہامی سے الگ کر دے۔ داداجی کا دوسرے فوجی افسروں سے اختلاف تھا۔ انھوں نے فوج کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس میں انھیں پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ گورنر جنرل نے داداجی کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھ کے ریزیڈنٹ کو حکم بھیجا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن رانی نے گورنر جنرل کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔

لارڈ ایلن برا نے گوالیار کے معاملات کی نسبت ایک مفصل یادداشت تیار کی جس میں یہ امر واضح کیا گیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں قوت بالادست کی حیثیت رکھتی ہے اور اس حیثیت سے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کے حدود اثر میں جو دیسی ریاستیں واقع ہیں ان میں سے کسی میں بدنظمی پیدا ہو تو مداخلت کرے۔[1] برطانوی حکومت شمالی ہند اور جنوبی ہند کے درمیان اپنے

---

[1] Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 477.

رسل و رسائل کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ضروری خیال کرتی ہے کہ گوالیار کی ریاست میں جو وسط ہند میں واقع ہے امن و امان قائم رکھے۔ امن و امان کے قیام کے لئے لازمی ہے کہ اس وقت گوالیار میں جو فوج ہے اس کو موقوف کر دیا جائے۔

گوالیار کے فوجی سرداروں کا زور توڑنے کے لئے ایلن برا نے کمانڈران چیف سر ہیو گف کے سرکردگی میں فوج کشی کا حکم دے دیا گوالیار کے فوجی سرداروں نے انگریزی فوج کا مہاراج پور اور پنیار کے قلعوں پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ ریاست گوالیار کے ساتھ برطانوی حکومت کا ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے ریاست کے معاملات میں ریزیڈنٹ کا اثر اور اقتدار بہت بڑھ گیا۔ رانی کو حکومت کے کاروبار سے بے تعلق ہونا پڑا اور اس کی تین لاکھ روپیے سالانہ پنشن مقرر ہوگئی۔ مہاراجہ کی کم عمری کے زمانے تک ایک مجلس تولیت کو ریاست کا انتظام سپرد کیا گیا جو ریزیڈنٹ کی مرضی کے مطابق انتظام کرے گی۔ اگر مجلس تولیت کے ارکان میں سے کوئی فوت ہو جائے تو حکومت ہند اس کی جگہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص کو نامزد کرے گی۔ ریاست میں فوج کی تعداد ۹ ہزار رہے گی تاکہ اندرونی امن قایم رکھنے میں ضرورت کے وقت اس سے مدد لی جاسکے اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی دس ہزار امدادی فوج بھی رہے گی جس کے خرچ کا بار ریاست گوالیار کے خزانہ پر ہوگا۔ غرضکہ عملی حیثیت سے ریاست گوالیار کا انتظام برطانوی حکومت کی نگرانی میں آگیا۔

کچھ عرصہ سے لارڈ ایلن برا اور مجلس نظماء کے درمیان خط و کتابت میں تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ الحاق سندھ اور گوالیار کے معاملات میں گورنر جنرل نے جو پالیسی اختیار کی اس کو مجلس نظما نے اچھا نہیں سمجھا۔ پارلیمنٹ میں لبرل جماعت نے بھی ایلن برا کی پالیسی پر تنقید کی آخر ۱۲ اپریل ۱۸۴۴ء کو مجلس نظماء نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ ایلن برا کو انگلستان بلا لیا جائے۔ لارڈ پیل نے اسی روز پارلیمنٹ میں لارڈ میکالے کے سوال کے

جواب میں اس فیصلے سے ارکان پارلیمنٹ کو آگاہ کر دیا۔ لارڈ ہارڈنگ کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا جو ڈیوک آف ولنگٹن کی ماتحتی میں نپولین کے خلاف یورپین جنگوں میں قابل قدر حصہ لے چکا تھا۔ جنگ واٹرلو میں وہ زخمی ہو کر فوج کے کام کا نہیں رہا۔ اس نے انگلستان واپس آکر پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کی اور سیاست میں حصہ لینے لگا۔ چنانچہ محکمہ جنگ کی معتمدی اور آئرلینڈ کے معتمد کی حیثیت سے اس نے عمل نظم و نسق کا تجربہ بھی حاصل کیا۔

لارڈ ہارڈنگ

لارڈ ہارڈنگ کو گورنر جنرل مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو فوجی معاملات اور عملی نظم و نسق دونوں کا تجربہ تھا۔ دراصل لارڈ ایلن برا کے عہد ہی میں حکومت ہند یہ محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو ستلج پار کے سکھوں سے معاملات طے کرنے کے لیے لڑنا پڑے گا۔ چنانچہ مجلس نظما اور انگلستان کے مقتدر حاکموں سے وہ پیچیدگیاں پوشیدہ نہ تھیں جو سکھ حکومت کی بے راہ روی سے حکومت ہند کو پیش آنے والی تھیں۔ لارڈ ولنگٹن کی سفارش پر ان حالات سے عہدہ برا ہونے کے لئے لارڈ ہارڈنگ کا گورنر جنرل کے عہدہ پر تقرر کیا گیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے ہندوستان پہنچنے کے بعد ان حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جو پنجاب میں رونما ہو چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوت ہونے کے بعد سے پنجاب میں بڑی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں ایک منضبط حکومت قایم کر لی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہا اس نے انگریزی حکومت سے کسی قسم کا بگاڑ نہیں کیا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ہی پنجاب میں کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو حالات پر پوری طرح قابو پا سکتی۔ اس کا بیٹا کھڑک سنگھ اس کا جانشین ہوا لیکن چند مہینے کے بعد وہ مر گیا اور اس کی جگہ شیر سنگھ تخت پر بیٹھا جس کے حلالی ہونے میں بھی لوگوں کو شبہہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں وزیروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے قتل لگاتار ہوتے رہے ۱۸۴۳ء میں شیر سنگھ قتل ہوا اور ہر طرف ابتری پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ نے جو تربیت یافتہ فوج

چھوڑی تھی وہ ان سرداروں کے ہاتھ میں آگئی جو دور اندیش اور تدبیر حکومت سے بے بہرہ تھے۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کی بیوہ رانی چندن کنور کے بیٹے دلیپ سنگھ کو راج گدی پر بٹھا دیا۔ رانی کا بھائی جواہر سنگھ اور لال سنگھ نظم و بست پر حاوی ہوگئے۔ انھوں نے سپاہ کو خوش کرنے کے لئے ان کی تنخواہوں میں خاطرخواہ اضافہ کیا۔ یہ دونوں بڑے ہشیار تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر فوج کو کسی حوصلہ مندی کے مشغلے میں مصروف نہ رکھا گیا تو خود ان کی خیر نہیں۔ پہلے تو فوج کو اشارہ کیا گیا کہ جموں پر یورش کرکے گلاب سنگھ سے خراج وصول کیا جائے۔ چنانچہ گلاب سنگھ کو گرفتار کرکے لاہور لایا گیا اور اس سے ایک کروڑ روپیہ وصول کیا گیا۔ اسی اثنا میں رنجیت سنگھ کے ایک دوسرے بیٹے پیشورا سنگھ نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تو جواہر سنگھ نے بغاوت فرو کردی اور پیشورا سنگھ کو قتل کرا دیا۔ لیکن جواہر سنگھ کی اس حرکت کو بعض فوجی سرداروں نے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ ان کی جواہر سنگھ سے ذاتی مخالفتیں بھی ہوں گی۔ چنانچہ جواہر سنگھ کو میاں میر کے میدان میں فوجیوں نے قتل کر ڈالا۔ رانی چندن کنور کو اپنے بھائی کے مارے جانے کا بڑا دکھ ہوا لیکن وہ کچھ نہ کرسکی۔ اس نے لال سنگھ کو اپنا وزیر اعظم اور تیج سنگھ کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور ان دونوں کے ذریعے سے فوج پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔ رانی کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں فوجی سرداروں کی مختلف جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش میں بالکل تباہ نہ ہوجائیں۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر اور سپہ سالار کے مشورے سے فوج کا دھیان بٹانے کے لئے اجازت دے دی کہ ستلج پار کے علاقوں پر قبضہ کرلیا جائے۔ رانی اور اس کے مشیروں کا خیال تھا کہ اگر فوج نے نیا ملک فتح کرلیا تو اسے دربار لاہور کی عملداری میں شامل کرلیا جائے گا اور اگر فوج نے شکست کھائی تو اس کی طاقت بالکل ٹوٹ جائے گی اور اس سے پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ غرضکہ دونوں صورتوں میں دربار لاہور کا فائدہ تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ شکست کھانے کی صورت میں بھلا سکھ حکومت کیسے غیر متاثر

رہ سکتی تھی۔ پھر برطانوی حکومت کی قوت اور وسیلوں کا رانی اور اس کے مشیروں نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ یا ممکن ہے کہ ان کا خیال ہو کہ برطانوی حکومت ستلج پار کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے جو پہلے سکھ حکومت کے تحت تھے کوئی اقدامی کارروائی سکھوں کے خلاف نہیں کرے گی۔ فوجی سرداروں میں مذہبی جوش ایسا تھا کہ انھوں نے بے سوچے انگریزی حکومت سے بگاڑنے اور قوت آزمائی کرنے کی ٹھان لی۔

پنجاب میں جو آپا دھاپی رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پھیلی اس سے انگریزی حکومت بے خبر نہ تھی۔ ایلن برا کے عہد میں فیروزپور کی چھاؤنی میں فوج کی تعداد بڑھا کر سترہ ہزار کردی گئی تھی جسے لارڈ ہارڈنگ نے بہت ناکافی تصور کیا۔ چنانچہ اس کے حکم کے بموجب فوج کی تعداد آہستہ آہستہ چالیس ہزار کردی گئی اگرچہ یہ سب کارروائی بالکل خاموشی سے کی گئی لیکن ممکن ہے کہ اس اجتماع کی خبر سکھ سرداروں کو پہنچ گئی ہو اور انھوں نے خیال کیا ہو کہ اس سے پہلے کہ انگریزوں کی طرف سے جارحانہ کارروائی شروع ہو وہ خود کیوں نہ پیش قدمی کردیں۔

سکھوں کی پہلی لڑائی

دسمبر ۱۸۴۵ء میں تقریباً ایک لاکھ فوج نے دریائے ستلج کو پار کرکے انگریزی علاقے میں خندق بندی شروع کردی۔ اگرچہ فیروزپور کی چھاؤنی میں انگریزوں کی فوج کی تعداد کافی تھی لیکن پھر بھی انھوں نے سکھوں کے دریا پار کرنے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ جب لارڈ ہارڈنگ کو سکھوں کے ستلج پار کرنے کی خبر پہنچی تو اس نے دربار لاہور کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور ان سکھ علاقوں کو جو دریائے ستلج کے جنوبی جانب واقع تھے بحق سرکار کمپنی ضبط شدہ قرار دیا۔ چند دن کے اندر وہ خود مقابلے کے لئے فیروزپور پہنچ گیا۔ پہلا معرکہ مُدکی کے مقام پر ہوا۔ لال سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ اور سر ہیوگف کمانڈر ان چیف بیس ہزار فوج اور ۴۲ توپوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں تو اس نے مُدکی کے قریب انھیں روک دیا۔ سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ایک انگریزی جرنیل

دشمن کی آتش باری کے سامنے نہ ٹھیر سکی۔ بڑی مشکل سے اس رجمنٹ کی بھگدڑ کو روکا گیا۔ فیروز پور سے کمک پہنچ جانے کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو شکست دی۔ اس کے بعد فیروز شہر، علی وال اور سوبراؤن کے مقاموں پر سکھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ لیکن انگریزوں کو اپنی فتحمندی کی قیمت بہت کچھ جان اور مال سے ادا کرنی پڑی اس واسطے کہ سکھوں نے جس قواعد دانی اور بہادری کا ثبوت دیا اس پر برطانوی افسروں کو بڑی حیرت تھی۔ ان لڑائیوں میں انگریزوں نے بڑی چالاکی سے گلاب سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان کے ذریعے سے سکھ فوج کی سب خبریں انھیں ملتی رہتی تھیں۔ سوبراؤن کی پسپائی کے بعد سکھ فوج نے دریا پر کشتیوں کا پل بنا کر بھاگنا چاہا لیکن انگریزی آتش باری سے دس ہزار آدمی دریا کی تہ میں پہنچا دیے گئے۔ بڑی تعداد گرفتار ہوئی۔ انگریزی فوجیں لاہور کی طرف بڑھنے لگیں۔ سکھ سرداروں نے سوچا کہ اب مقابلہ بیکار ہے۔ چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور معاہدہ لاہور پر دستخط ہو گئے۔

لاہور کا معاہدہ

جس وقت انگریزی فوج کی پیش قدمی لاہور کی طرف ہو رہی تھی تو قصور کے مقام پر گلاب سنگھ کی سرکردگی میں سکھوں کا ایک وفد گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گورنر جنرل نے ان تحفوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو وفد کی جانب سے بھجوائے گئے تھے۔ گلاب سنگھ نے خواہش ظاہر کی کہ انگریزی فوجیں لاہور پر قبضہ نہ کریں لیکن لارڈ ہارڈنگ نے اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اور صاف طور پر کہلا بھیجا کہ معاہدے کی شرطیں چاہے جو کچھ بھی طے ہوں لیکن معاہدے پر دستخط لاہور ہی میں ہوں گے[1]۔ لاہور پہنچ کر لارڈ ہارڈنگ نے ۲۲ فروری ۱۸۴۶ء کو ذیل کا اعلان شائع کیا۔

[1] Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 498.

"آج برطانوی فوجوں نے قلعہ لاہور کے داخلہ والے پھاٹک پر بادشاہی مسجد اور حضوری باغ پر قبضہ کر لیا ہے۔ قلعہ کا باقی حصہ اس واسطے چھوڑ دیا گیا کہ وہاں مہاراجہ کا قیام ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ آنجہانی کے خاندان والے رہتے ہیں جو زمانہ دراز تک برطانوی حکومت کا حلیف تھا۔ ان حالات میں قلعہ کے اندر محلات میں سپاہ نہیں رکھی جائے گی۔ برطانوی حکومت کی تیغ والی فوج نے سکھ لشکر کو منتشر کر ڈالا اور میدان میں کامیابی حاصل کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں جو کامیابیاں ہوئیں ان کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی ملے برطانوی حکومت کو ان معاہدوں پر بھروسا تھا جو اس کے اور سکھ دربار میں ہوئے تھے اور جن کی بناء پر دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات عرصے سے قایم تھے۔ چنانچہ اس بناء پر برطانوی حکومت نے پنجاب کی سرحد پر صرف اتنی فوج رکھی جتنی کہ دفاع کے لئے ضروری خیال کی گئی لیکن جب ہمارے علاقوں پر بغیر کسی اشتعال کے ایکایکی حملہ کر دیا گیا تو ہمیں بھی جارحانہ کارروائی کرنا پڑی۔ چنانچہ انگریزی فوج نے اپنے قابل اور ممتاز قائد کی ماتحتی میں ساٹھ دن کے اندر اندر سکھوں کو پے در پے چار مقامات پر شکست دی۔ ان سے ۲۲۰ توپیں چھین لیں اور اب وہ سکھوں کی راجدھانی لاہور میں پہنچ کر ان پر صلح کی شرطیں عاید کر رہی ہے جن کی بنا پر امید ہے کہ برطانوی صوبوں کی حفاظت کا انتظام ہو جائے گا اور ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے گا جو حال میں پیش آئے ہیں۔"[1]

اعلان کے دوسرے روز یعنی ۲۳ فروری ۱۸۴۶ء کو گورنر جنرل نے ایک دربار کیا جس میں مہاراجہ دلیپ سنگھ اور بڑے بڑے سرداروں نے شرکت کی۔ اس دربار میں معاہدہ پر باقاعدہ دستخط ہوئے۔ معاہدہ سولہ دفعات پر مشتمل تھا جن میں سے اہم یہ تھیں۔ انگریزی حکومت دلیپ سنگھ کو سکھوں کا حکمران تسلیم کرتی ہے۔ لیکن ملک کا عملی انتظام انگریزی ریذیڈنٹ سر ہنری لارنس کے ایما

[1] Beveridge, Ibid., Vol. III, p. 499.

پر وزیر اعظم انجام دے گا۔ لال سنگھ کو وزیر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ ایک سال کے لئے لاہور میں انگریزی فوج متعین کی گئی تاکہ نئے انتظامات کو روبعمل لانے میں اگر کوئی دشواری پیش آئے تو اس کو استعمال کیا جا سکے۔ یہ بھی طے ہوا کہ دربار لاہور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرے گا جن میں سے ۵۰ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جائے گی اور باقی ایک کروڑ کے معاوضہ میں دوآبہ کا وہ تمام علاقہ برطانوی حکومت کے حوالہ کیا جائے گا جو دریائے بیاس اور ستلج کے درمیان واقع ہے اور جس میں جالندھر شامل ہے۔ کشمیر جموں اور ہزارا کے کوہستانی ضلعے بھی برطانوی حکومت کو حوالے کرنے ہوں گے۔ خالصہ فوج کو توڑ دیا جائے گا۔ دربار لاہور کو اس کی اجازت ہوگی کہ اپنے اندرونی انتظاموں کے لئے بیس ہزار پیدل اور بارہ ہزار سوار رکھ سکے۔ لڑائی میں جتنی توپیں سکھوں نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیں وہ سب حکومت ہند کو حوالہ کرنا ہوں گی۔ چنانچہ برطانوی حکومت کو شمالی ہند میں رعب قایم کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اب سکھوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا ان ڈھائی سو توپوں کا ایک جلوس تیار کیا گیا اور ان کے ساتھ اور باقی مال غنیمت جو سکھوں کی لڑائی میں ملا تھا شان وشوکت کے ساتھ ترتیب دیا گیا اور پھر یہ جلوس پنجاب سے کلکتہ تک منزل بہ منزل پہنچا جہاں اس کے استقبال کے لئے زبردست فوجی انتظامات کئے گئے۔

معاہدہ کی دفعہ (۱۲) اور (۱۳) کی رو سے گلاب سنگھ کو کشمیر کا خودمختار حکمران تسلیم کیا گیا اور اس کی بھی صراحت کردی گئی کہ اگر گلاب سنگھ اور دربار لاہور میں جھگڑے ہوں تو حکومت ہند ان کا تصفیہ کرنے کی مجاز ہوگی۔ چنانچہ اس ضمن میں گلاب سنگھ سے ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء امرتسر میں ایک علحدہ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے کشمیر اور جموں پر اس کی اور اس کے بعد اس کے خاندان کی حکومت کو انگریزی حکومت نے تسلیم کر لیا جس کے معاوضہ میں گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ ۵۰ لاکھ اس وقت جب کہ اس معاہدہ کی باقاعدہ ولایت سے توثیق ہو کر آجائے گی اور ۲۵ لاکھ یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو۔

کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے گلاب سنگھ کی حکومت ماننے سے انکار کر دیا لیکن سر ہنری لارنس نے بذات خود اس کے خلاف فوج کشی کی۔ اس کے ساتھ دس ہزار تو وہ سکھ فوج تھی جس نے تھوڑے ہی دن ہوئے انگریزی حکومت کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اور تھوڑی سی گورا فوج تھی جو لاہور میں ٹھہرائی گئی تھی۔ شیخ امام الدین نے اس فوج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ اس نے اپنی صفائی میں لال سنگھ کی تحریر پیش کی جس میں اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو کشمیر کو حوالے کرنے میں دیر کرنا اور اگر ضرورت ہو تو جنگ کرکے مقابلہ کرنا۔ یورپین فوجی افسروں اور سکھ سرداروں کا ایک کمیشن اس معاملہ کی تحقیق کے لئے مقرر کیا گیا جس نے واضح شہادتوں کی بناء پر لال سنگھ کو ملزم قرار دیا۔ چنانچہ لال سنگھ کو جلاوطن کرنے کا حکم دے دیا گیا لیکن اس کی گزر بسر کے لئے پنشن مقرر کر دی گئی۔

دسمبر ۱۸۴۶ء میں سر ہنری لارنس نے ایک اور معاہدہ کیا جس پر مہاراجہ دلیپ سنگھ نے دستخط کر دئے۔ اس معاہدہ کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ سر ہنری لارنس اس درباری پارٹی کا زور بالکل توڑ دینا چاہتا تھا جو رانی چندن کنور کی سرکردگی میں اب بھی انگریزوں کے خلاف سازباز کرتی رہتی تھی اور ان کے عمل دخل کو بری نظروں سے دیکھتی تھی۔ لال سنگھ کو جلاوطن کرنے کے بعد ضرورت اس کی ہوئی کہ نظم ونسق کو چلانے کے لئے جدید انتظامات عمل میں لائے جائیں۔ چنانچہ جدید معاہدہ کی رو سے آٹھ سکھ سرداروں کی ایک مجلس تولیت (ریجنسی کونسل) قایم کی گئی تاکہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی کم عمری کے زمانے میں ملک کے در و بست کو چلا سکے۔ وہ انگریزی فوج جو پہلے صرف ایک سال کے لئے لاہور میں رکھی گئی تھی اس کے رہنے کی مدت آٹھ سال کر دی گئی جب کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بالغ ہو کر نظم ونسق کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ انگریزی فوج میں سوار، پیدل اور توپ خانہ سب ہی کچھ تھا تاکہ اپنے مستقر لاہور سے پنجاب کے ہر ضلع میں سرکشی یا بغاوت کی صورت میں پہنچ سکے۔ جالندھر اور فیروزپور میں بھی فوجی دستے متعین کر دئے گئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ مجلس تولیت کی صدارت سر ہنری لارنس نے اپنے دونوں بھائیوں

جارج لارنس اور جان لارنس کے علاوہ سویلین عہدہ داروں کی ایک جماعت تیار کی جنھوں نے بڑی محنت اور ہمدردی سے پنجاب کے انتظام کو سنبھالا اور رعایا میں بھی ہردلعزیزی حاصل کی۔ سرہنری لارنس کے زیر ہدایت و نگرانی پنجاب میں جو انتظام کیا گیا اس سے اگرچہ براہ راست انگریزی حکومت کا اقتدار اس علاقے پر نہیں قایم ہوا لیکن آئندہ کے لئے حصول اقتدار کا راستہ صاف ہوگیا۔ لاہور کے صلح نامے کے بعد لارڈ ہارڈنگ کو پوری طرح اطمینان تھا کہ اب عرصے تک ہندوستان میں انگریزی فوج کو کسی قوت کے مقابلہ کرنے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن اس کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس کے جانشین لارڈ ڈلہوزی کو سکھوں سے پھر جنگ کرنا پڑی جس کے بعد پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہوگیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے اپنے ساڑھے تین سال کے عہد حکومت میں زیادہ تر پنجاب میں سکھ فوج کا زور توڑنے اور پھر وہاں اچھے انتظامات کرنے کی طرف توجہ کی لیکن باوجود فوجی نوعیت کے انتظامات میں معروف رہنے کے اس نے سول نظم ونسق کی ترقی کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں دریائے گنگ سے نہر جاری ہوئی اور رڑکی میں انجنیرنگ کالج قایم ہوا۔ سڑکوں کی طرف توجہ کی گئی۔ مغلوں کے زمانے سے شمالی ہند میں جو بڑی سڑک (گرانڈ ٹرنک روڈ) چلی آتی تھی اس کی مرمت کرائی گئی۔ اس نے ستی دخترکشی بچوں کو بھینٹ چڑھانے کی بری رسموں کو مٹانے کی عملی تدبیریں اختیار کیں اور تعلیم کی اشاعت اور توسیع کے لئے بھی کوشش کی۔ لارڈ ہارڈنگ کو اندرونی نظم ونسق پر زیادہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن پھر بھی بعض اہم اصلاحات اس کے عہد حکومت میں عمل میں آئیں جن سے اس کی عام حکمت عملی کی ترقی پسندی کا پتہ چلتا ہے۔

چودھواں باب

لارڈ ڈلہوزی کا عہد حکومت

لارڈ ڈلہوزی کا جب ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے تقرر ہوا تو اس وقت اس کی عمر تقریباً ۳۶ سال کی تھی۔ اس وقت تک برطانوی ہند کے جتنے گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے ان میں سے کسی کی اتنی کم عمر نہ تھی بلکہ اکثر ان میں ادھیڑ عمر کے لوگ تھے جو زمانہ کا گرم و سرد سہہ چکے تھے۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی کی عقل وفراست میں باوجود کم عمری کے تجربہ کار بوڑھوں کی سی پختگی اور جوانوں کی سی ان تھک قوت عمل موجود تھی۔ اسے ہندوستان آنے سے قبل علی نظم ونسق کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی محنت، دور اندیشی اور انتظامی قابلیت کا سکہ اپنے ملک میں بھی بٹھا دیا تھا۔ سر رابرٹ پیل کی آخری کابینہ میں اس کو محکمۂ بورڈ آف ٹریڈ کی صدارت دی گئی۔ سر رابرٹ پیل کے بعد جب لارڈ جان رسل نے اپنی لبرل کابینہ قایم کی تو اس نے بھی لارڈ ڈلہوزی کو شریک کار کے طور پر اپنے ساتھ رکھنا چاہا لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا اس واسطے کہ یہ اصولی طور پر معیوب ہوتا۔ ۱۸۴۷ء میں لارڈ جان رسل نے لارڈ ہارڈنگ کی جگہ ہندوستان کی

گورنر جنرل کا عہدہ ڈلہوزی کو پیش کیا جو اس نے اپنے قائد سر رابرٹ پیل کی مرضی حاصل کرنے کے بعد قبول کر لیا اور ۱۲ جنوری ۱۸۴۸ء کو کلکتہ پہنچا۔ باوجود ہندوستان کے حالات سے بڑی حد تک بے خبر ہونے کے بہت جلد وہ اپنی فطری معاملہ فہمی اور نکتہ رسی سے اس ملک کے نظم و نسق کے مسائل کی تہ کو پہنچ گیا اور جزویات پر حاوی ہو گیا۔

سکھوں کی دوسری جنگ

ڈلہوزی کو کلکتہ پہنچے ہوئے ابھی چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ پنجاب میں خلفشار پیدا ہوا اور اس کو سکھوں کے خلاف ہتیار اٹھانے پڑے۔ سر ہنری لارنس رخصت بیماری پر انگلستان گیا ہوا تھا اور اس کی جگہ سر فریڈرک کری دربار لاہور میں ریزیڈنٹ کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اسی اثناء میں ملتان کے صوبہ دار مول راج نے دربار لاہور کی اطاعت سے انکار کر دیا اور جو مقررہ مالیہ ادا کرنا چاہیے تھا وہ ادا نہیں کیا۔ جب اس کو حساب صاف کرنے کو لکھا گیا تو اس نے مستعفی ہونا چاہا۔ چنانچہ اس کا استعفاء منظور کرنے کے بعد دربار لاہور نے خان سنگھ کو اس کی جگہ ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ سر فریڈرک کری نے ایک سول افسر مسٹر ایگنیو اور ایک فوجی افسر لفٹیننٹ اینڈرسن کو ساڑھے تین سو سکھ سپاہیوں کے بدرقے کے ساتھ خان سنگھ کے ہمراہ ملتان روانہ کر دیا۔ چنانچہ یہ جماعت ۱۸ مارچ ۱۸۴۸ء کو ملتان پہنچ گئی۔ مول راج دونوں برطانوی افسروں کے پاس خود آیا اور خواہش ظاہر کی کہ نئے صوبہ دار یا حاکم کی جانب سے اس کو ایک رسید مل جانی چاہیے جس میں یہ تحریر ہو کہ اس کو انتظام سپرد کر دیا گیا۔ لیکن انگریز افسروں نے اصرار کیا کہ پہلے گزشتہ چھ سال کا مالگزاری کا حساب انھیں سمجھایا جائے۔ بہت کچھ بحثا بحثی کے بعد مول راج اس پر آمادہ ہوا لیکن اس کے مشیروں نے اس کو باور کرایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو رعایا کی نظر میں اس کی بڑی ذلت ہوگی۔ جب دونوں انگریز افسر مختلف انتظامی محکموں کے معائینے کے بعد جو نئے صوبیدار یا حاکم کو سپرد کئے جانے والے تھے قلعہ سے باہر نکلے تو دو خفیہ قاتلوں نے ان کو مار گرایا اور ان کے سر کاٹ کر مول راج کے پاس

لے گئے۔ مول راج نے عام اعلان کر دیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ فرنگیوں سے خلاف مزاحمت کرے گا جو سکھ سرداروں کی مجلس تولیت کی آڑ میں پنجاب پر قابض ہو گئے ہیں۔ مجلس تولیت کے خلاف بے اطمینانی اور بے اعتمادی تو پہلے ہی سے تھی اس نے اب عام شورش کی شکل اختیار کر لی۔ سر فریڈرک کری نے ایک زبردست فوج لفٹننٹ ایڈورڈز کی کمک کے لئے روانہ کی جو اگنیو اور اینڈرسن کے قتل ہونے کی خبر پاکر تین سو سوار کے ہمراہ ملتان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کی یہ فوج اور اس کے وسیلے اتنے نہ تھے کہ وہ ملتان کے قلعہ پر قبضہ کر سکتا۔ اس نے سر فریڈرک کری کو تاکیدی خطوط بھیجے کہ بڑی تعداد میں سپاہ روانہ کی جائے لیکن کمانڈران چیف سر ہیو گف گرمی کے موسم میں ملتان پر چڑھائی کرنے کے خلاف تھا۔ آخر سر فریڈرک کری نے اپنی ذمہ داری پر جنرل وِش کی ماتحتی میں سات ہزار فوج اور قلعہ شکن توپیں ملتان روانہ کر دیں۔ دربار لاہور کی جانب سے ایک سکھ فوج شیر سنگھ کی سرکردگی میں ملتان روانہ کی گئی لیکن یہ فوج مول راج سے مل گئی۔ مول راج نے اس اثناء میں قلعہ کے استحکامات میں کافی اضافہ کر لیا۔ ۳۰ر دسمبر ۱۸۴۸ء کو لفٹننٹ ایڈورڈ اور لاہور سے آئی ہوئی انگریزی کمکی فوج نے ملتان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن کچھ روز بعد یہ محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور تھوڑے فاصلے پر انگریزی فوج نے مورچہ بندی کر لی۔ شیر سنگھ ملتان سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ میں خالصہ فوج ہر منزل پر بڑھتی جاتی تھی۔ اس وقت اگر شیر سنگھ چاہتا تو شہر لاہور پر آسانی سے اس کا قبضہ ہو جاتا لیکن اس نے غلطی کی کہ لاہور کی طرف بڑھنے کے بجائے دریائے چناب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ملتان کے فساد نے بڑھتے بڑھتے ایک بڑی قومی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ شیر سنگھ کے ساتھی چتر سنگھ نے جو اس زمانے کا مشہور سکھ سردار تھا والئی افغانستان امیر دوست محمد خاں سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اس کو پشاور واپس دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ وہ اس وقت انگریزوں کے خلاف ان کی مدد کرے۔ چنانچہ امیر دوست محمد خاں مدد پر آمادہ ہو گیا۔ سکھ فوج نے پشاور خالی کر دیا اور میجر جارج لارنس کو بھی انگریزی دستوں کے ساتھ شہر خالی کر دینا پڑا۔ امیر دوست محمد خاں نے اپنے بڑے بیٹے محمد اکرم خاں کے ماتحت

دس ہزار افغان فوج مدد کے لئے بھیجدی۔

۱۰ر اکتوبر ۱۸۴۸ء ڈلہوزی نے سکھوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اپنی کلکتہ والی تقریر میں اس نے کہا: "اگلی مثالوں سے کوئی نصیحت حاصل کئے بغیر سکھ قوم نے دوبارہ جنگ کی خواہش کی ہے۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ ہم لڑیں گے اور انھیں برطانوی انتقام سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔" ڈلہوزی نے بنگال فوج کی سترہ ہزار کمک فوراً پنجاب بھجوادی۔ بمبئی کی طرف سے بھی انگریزی فوجیں پہنچ گئیں۔ نومبر ۱۸۴۸ء میں برطانوی افواج کا پڑاؤ فیروزپور کے مقام پر ہوا اور لارڈ ہیوگف کمانڈر ان چیف نے قیادت اپنے ذمہ لی۔ خود ڈلہوزی بھی موقع جنگ پر پہنچ گیا۔ جلیانوالہ کے مقام پر سکھوں اور انگریزی فوج میں زبردست معرکہ ہوا۔ سکھ فوج بڑی بے جگری سے لڑی۔ انگریزی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے دو ہزار آدمی کام آئے۔ سکھوں کا بھی نقصان ہوا لیکن نہ اس قدر۔ ان کی طاقت کو کوئی زبردست ضرب نہیں لگی۔ انگریزی فوج میں ایسی ابتری پھیل گئی کہ سکھوں نے ان کی توپوں کی بڑی تعداد کو رات کی تاریکی میں چھین لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ جنگ غیر فیصلہ کن رہی۔ سکھ فوج اپنے مورچوں پر ڈٹی رہی لیکن جنرل وہش کمانڈر ان چیف کی مدد کے لئے پہنچ گیا تو سکھ فوج گجرات کی طرف بڑھنے لگی۔ جب انگلستان میں جلیانوالہ کے نقصانات کی اطلاع پہنچی تو ارباب حکومت کو پریشانی ہوئی۔ مجلس نظماء نے لارڈ ہیوگف کی جگہ سر چارلس نیپیئر کو کمانڈر ان چیف مقرر کردیا جو فوراً انگلستان سے روانہ ہوگیا۔ لیکن اس کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے سکھوں کی لڑائی ختم ہوچکی تھی۔

جلیانوالہ کی لڑائی کے بعد گجرات کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں انگریزوں کے کمانڈر ان چیف لارڈ ہیوگف نے سکھ فوج کو قطعی طور پر شکست دی اور اسے منتشر ہونے پر مجبور کردیا۔ سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن انگریزوں کے توپ خانہ کا ان کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ ان کی تمام توپوں اور دوسرے ساز و سامان پر انگریزی فوج نے قبضہ کرلیا۔ اب اس کا امکان باقی نہ تھا کہ سکھ پھر منظم ہوکر مقابلہ پر آسکیں۔ ملتان کے قلعہ پر بھی انگریزی

فوج نے قبضہ کر لیا۔ مول راج کو گرفتار کر لیا گیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے مجلس نظما سے دریافت کئے بغیر اپنی ذمہ داری پر پنجاب کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا۔ اب اس کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ یہ کرتا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تخت و تاج کو برائے نام برقرار رکھتے ہوئے برطانوی عملداری پنجاب میں قایم کرنے کی کوشش کرتا۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ وہ پنجاب کو برطانوی عملداری میں شامل کر لے۔ اول الذکر حالت میں اندیشہ تھا کہ سکھوں میں اپنی حکومت کا گھمنڈ باقی رہتا اور پھر تھوڑے دن بعد وہ آویزش پر آمادہ ہو جاتے۔ بقول لارڈ ڈلہوزی "اگر ہم سکھوں کے پاس تھوڑا بہت اقتدار بھی رہنے دیں گے تو وہ اپنی قومیت کے احساس کو باقی رکھیں گے اور اس طرح سازشوں کا بازار گرم رہے گا۔ ہمیں اس صورت میں بھی وہ تمام جانفشانی کرنی ہو گی اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا پڑے گا جو اس وقت اٹھانا پڑتا جب کہ پنجاب ہماری عملداری میں شامل ہوتا۔ اور اس کے ساتھ بڑی خرابی ہوگی کہ ہم ملک کی آمدنی میں خاطر خواہ نہ اضافہ کر سکیں گے اور نہ وہ فائدے حاصل کر سکیں گے جو اس صورت میں ممکن ہیں جب کہ براہ راست ہمارا قبضہ مان لیا جائے۔" چنانچہ حکومت ہند کو آئے دن کی لڑائی بھڑائی سے بچانے کے لئے لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے جس کے بموجب وہ اپنے اقتداری حقوق سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گیا۔ اس نے کوہ نور مشہور ہیرا جو شاہ شجاع نے اس کے باپ رنجیت کو دیا تھا بطور نذر ملکہ وکٹوریہ کے لئے پیش کر دیا۔ اس نے اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ گورنر جنرل جہاں چاہے اس کے قیام کا انتظام کر دے۔ پانچ لاکھ روپیے سالانہ اس کی گزر بسر کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ جن سرداروں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ مول راج پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور اس کو حبس دوام کی سزا دی گئی۔ مگر موت نے اس کو جلد ہی رہائی دلائی۔ جس تاریخ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے معاہدہ پر دستخط کئے اسی روز ڈلہوزی نے مندرجہ ذیل اعلان

پنجاب کے الحاق کی بابت شائع کیا۔

"حکومت ہند اس سے پہلے یہ اعلان کر چکی ہے کہ وہ کسی فتح کی آرزومند نہیں۔ لیکن یہ تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں پوری طور پر کرے اور جو لوگ اس کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کے مفاد کی نگہداشت کرے۔ اس مقصد کے لئے نیز اس واسطے بھی کہ حکومت ہند کو آئے دن کی زبردستی کی لڑائیوں سے بچایا جائے گورنر جنرل یہ خیال کرتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر ان لوگوں کو برطانوی اقتداری حلقہ میں شامل کرلے جن پر خود ان کی حکومت کو کوئی قابو نہیں رہا ہے اور جنھیں کوئی سزا بھی ظلم و زیادتی سے نہیں روک سکتی اور نہ دوستی کے اظہار سے وہ صلح و امن پر مائل ہو سکتے ہیں۔"[1]

اہل پنجاب سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ جن لوگوں نے جنگ میں انگریزوں کی مدد کی تھی انھیں انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ تین کمشنروں کی ایک کونسل قایم کی گئی جسے اس نئے صوبے کے نظم ونسق کے پورے اختیارات سپرد کئے گئے۔ کونسل کی صدارت کے لئے سر ہنری لارنس کو جو چیف کمشنر تھے نامزد کیا گیا۔ چونکہ کچھ عرصے بعد لارڈ ڈلہوزی اور سر ہنری لارنس میں پالیسی کے متعلق اختلاف ہو گیا اس لئے گورنر جنرل نے سر ہنری کے چھوٹے بھائی سر جان لارنس کو چیف کمشنری کے عہدہ پر مامور کرکے بورڈ کو توڑ دیا۔ سر ہنری لارنس کو اودھ میں ریزیڈنٹ کی خدمت پر بھیجدیا گیا۔ سر ہنری لارنس ڈلہوزی کی مرضی کے خلاف سکھ سرداروں کی زیادہ دلجوئی کرنا چاہتا تھا۔ بعض دفعہ وہ ان سرداروں کی اس قدر حمایت کرتا تھا کہ اس سے کسانوں کے حقوق کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ڈلہوزی اور سر جان لارنس چاہتے تھے کہ کسانوں کو زیادہ رعایتیں دی جائیں کہ وہی آبادی کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور اس قسم کا کوئی انتظام پنجاب میں نہ کیا جائے جو تجربے سے دوسرے صوبوں میں بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی پر اس کی اور اس کے چھوٹے بھائی

---

[1] Marshman, p. 469.

سرجان لارنس کی آپس میں نہیں بنی۔ گورنر جنرل نے چھوٹے بھائی کا ساتھ دیا اور اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسی کو پنجاب کے چیف کمشنر کے عہدہ پر منتخب کیا۔

ڈلہوزی نے ہندوستان کے دوسرے حصوں سے چن چن کے اچھے اچھے اور تجربہ کار انگریز سیولین پنجاب کا انتظام سنبھالنے کے لئے مقرر کئے۔ مالگزاری کی تشخیص اور نیا بندوبست عمل میں آیا۔ اس موقع پر برطانوی حکومت نے ان تمام انتظامی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کی جو بنگال اور دوسرے صوبوں کے ابتدائی انتظام میں ہوئی تھیں اور جن کے نتیجے بڑے دیرپا ثابت ہوئے پنجاب میں عام طور پر اراضی کے لگان میں تخفیف کر دی گئی اور اراضی کے قابضوں کو پٹے پر زمینیں اٹھا دی گئیں جن میں سے بعض کی میعاد تیس سال قرار دی گئی۔ سکھ فوج کے اکثر افراد نے کاشتکاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ تجارتی مال کی ایک ضلع سے دوسرے ضلع کو جو درآمد و برآمد ہوتی تھی اس پر سے ہر قسم کے محصول اٹھائے گئے کہ ان سے تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ ٹھگی، ڈکیتی اور غلامی کی روک تھام کی گئی۔ آبپاشی کے لئے نہروں کی ایک اسکیم منظور کی گئی اور نہروں کی کھدائی کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا گیا۔[1] پولیس کا عمدہ انتظام کیا گیا تاکہ رعایا امن و امان سے زندگی بسر کر سکے۔ تعلیم کے لئے مدرسے کھولے گئے۔ پنجاب کو ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر ضلع میں ایک حاکم مقرر کیا گیا جسے وسیع عاملانہ اختیارات حاصل تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ڈلہوزی نے پنجاب میں جن عہدہ داروں کو مقرر کیا انھوں نے بڑی قابلیت سے اپنے فرائض ادا کئے اور اس صوبے کی آئندہ رفاہ اور فلاح بہت کچھ ان کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ لیکن پنجاب میں جو کچھ بھی اصلاحیں ہوئیں ان میں لارڈ ڈلہوزی کو گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کا دماغ ہی اس حکومت کی مشین کے کل پرزوں کو چلاتا رہا جو پنجاب میں قائم

---

[1] Marshman, p. 472.

ہوئی۔ وہ ہر تفصیل پر نگرانی رکھتا تھا۔ اور چونکہ اسے اپنی ذات اور اپنی قابلیت پر پورا بھروسا تھا اس لئے وہ اپنی رائے کے سامنے کسی دوسرے کی رائے کو وقعت نہیں دیتا تھا۔ پنجاب کی رعایا کو نئے انتظامات سے بہت فائدے حاصل ہوئے۔ وہی لوگ جو کچھ دنوں پہلے انگریزی حکومت کے جانی دشمن تھے اب خیر خواہ اور دوست بن گئے۔ اور بڑے وقت میں سرکار انگریزی کی ستائش کے قابل خدمتیں انجام دیں۔

پنجاب کے الحاق سے انگریزی حکومت کی سرحد افغانستان تک پہنچ گئی بسشہ ۱۸۵۵ء میں ڈلہوزی نے افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خاں سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانوی ہند اور افغانستان میں دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے۔ سرحد پر قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا گیا جن میں ذخیرے کافی رکھے گئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ ان سب قلعوں کو سڑکوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ سرحدی علاقوں میں امن وامان قایم رکھنے کے لئے نو نئی رجمنٹیں بھرتی کی گئیں۔ ایک نئی گرد آور فوج بھی رکھی گئی جو سواروں پر مشتمل تھی تاکہ جرائم کی روک تھام کی جائے۔

دوسری جنگ برما کی

برما کی حکومت کچھ عرصے سے انگریز تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہی تھی صلح نامہ ینڈبو کی شرطوں میں جو پہلی جنگ برما کے بعد تسلیم کی گئی تھیں یہ شرط بھی تھی کہ انگریزی مال کے خلاف کوئی خاص قیدیں نہیں لگائی جائیں گی۔ لیکن حکومت برما نے اس کی خلاف ورزی کی بسشہ ۱۸۵۱ء میں رنگون کے انگریز تاجروں نے حکومت ہند کو ایک محضر بھیجا جس میں اپنی شکایتیں پیش کیں اور بتایا کہ جب تک ان کے جان ومال کی حفاظت کا حکومت ہند ذمہ نہ لے وہ برما میں ہرگز نہیں رہیں گے۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے کموڈور لمبرٹ کو مقرر کیا جسے ہدایت کی گئی کہ وہ گفت وشنید کے دوران میں بڑی معاملہ فہمی اور احتیاط سے کام لے۔ چنانچہ لمبرٹ نے رنگون کے برمی گورنر کو ایک خط بھیجا جس میں بتلایا گیا کہ انگریز تاجروں کو جو نقصان

اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی ہونی چاہئے۔ لیکن جب رنگون کے گورنر نے لمبرٹ کے خط کو توجہ کے لائق نہ سمجھا اور اس کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا تو اس نے شاہ برما کو اسی مضمون کا ایک خط بھیجا کہ رنگون کے گورنر کو خدمت سے برطرف کر دینا چاہئے اس واسطے کہ اس کی وجہ سے انگریزی حکومت اور برمی حکومت کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس خط کا اثر ہوا۔ رنگون کے گورنر کا تبادلہ کر کے اس کی جگہ دوسرا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن جب لمبرٹ نے اس سے گفت و شنید کی کوشش کی تو اس نے بھی وہی ناروا برتاؤ کیا اور ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی اطلاع جب کلکتہ کونسل کو ہوئی تو بادشاہ برما سے اس برتاؤ پر اظہار افسوس کے لئے لکھا گیا۔ لیکن جب حکومت برما اس کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو ۱۰ فروری ۱۸۵۲ء کو اعلان جنگ کر دیا گیا اور فوج کشی کی تیاری شروع ہو گئی۔ چونکہ کمانڈر ان چیف اس وقت سندھ میں تھا اس لئے فوج کشی کا سارا انتظام ڈلہوزی نے خود اپنی نگرانی میں کرایا۔ ایک ہفتہ کے اندر انگریزی فوجی بیڑا رنگون پہنچ گیا۔ رنگون پر برمی فوج نے مقابلہ کیا لیکن جنرل گوڈوین نے بڑی قابلیت سے رنگون کے مندر پر قبضہ کر لیا جہاں بڑی زبردست قلعہ بندی کی گئی تھی۔ اب رنگون سے جنرل گوڈوین پروم پر چڑھائی کرتے ہوئے ذرا ہچکچا رہا تھا کہ ڈلہوزی خود رنگون پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر وہ اس بات پر اڑ گیا کہ پروم پر فوراً پیشقدمی کر کے قبضہ کر لینا چاہئے۔ ڈلہوزی کی رائے ٹھیک نکلی اور بغیر کسی نقصان کے پروم پر برطانوی جھنڈا لہرانے لگا۔ چونکہ شاہ برما نے لارڈ ڈلہوزی سے کسی قسم کی گفت و شنید کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے لارڈ ڈلہوزی کو اب خود ہی اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ برما کے اندرونی حصوں میں فوج کشی اس لئے مناسب نہیں تھی کہ اول تو اس کے لئے جتنا ساز و سامان چاہئے وہ نہیں تھا اور دوسرے اس لئے کہ اس نے اتنے اہم اقدام کے لئے حکومت انگلستان اور مجلس نظما سے بھی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی مفاد کی حفاظت کا انتظام برقرار رکھنے کے لئے

اس کی ضرورت ہے کہ جنوبی برما میں پیگو کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ اس طرح برما سمندر سے کٹ جائے گا اور آیندہ لازمی طور پر کچھ عرصے بعد پورا علاقہ برطانوی سیادت ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ لارڈ ڈلہوزی نے حکومت برما سے صلح کی گفت و شنید کی اور آخر یہ طے ہو گیا کہ پیگو کا ساحلی علاقہ انگریزی عملداری میں شامل کر لیا جائے۔ حکومت برما نے کانفرنس کر کے باقاعدہ معاہدہ کرنے کے بجائے اس طریقہ کو پسند کیا کہ گورنر جنرل اپنے اعلان کے ذریعہ ان امور کو مشتہر کر دے جو طے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ پیگو کے الحاق کی تجویز کو حکومت برطانیہ نے بھی پسند کیا اور اس کا ایک الگ برطانوی صوبہ بنا دیا گیا جس کا صدر مقام رنگون مقرر ہوا۔ شمالی اور وسط برما میں دربار آوا کی حکومت برقرار رہی۔ رنگون بہت جلد انگریزی تجارت کا زبردست مرکز بن گیا اور شہر کو بڑی ترقی ہوئی خاص طور پر چاول اور عمارتی لکڑی بڑی مقدار میں رنگون سے درآمد ہونے لگے۔ نئے صوبہ کا انتظام میجر آرتھر فائر کے سپرد کیا گیا جس نے اپنے فرائض کو بڑی قابلیت اور مستعدی سے پورا کیا۔[1]

اصول بازگشت

ڈلہوزی برطانوی شہنشاہیت کے اصول کا زبردست علمبردار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے جس حصے میں بھی انگریزی حکومت قایم ہوئی وہاں وہ عوام کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں جو دیسی ریاستیں رہ گئی ہیں ان میں سے کسی نہ کسی بہانے سے جو بھی برطانوی عملداری میں شامل ہو سکیں انھیں بے ہچکچائے شامل کر لینا چاہئے کہ اس سے وہاں کی رعایا کا فائدہ ہے۔ وہاں کی رعایا کا مفاد مقصود ہو یا نہ ہو لیکن اس طرح ڈلہوزی انگریزی راج کی حدود کو بڑھانا چاہتا تھا تاکہ ملک کا وہ حصہ بھی جو اب تک بعض مخصوص تاریخی اور سیاسی حالات کی وجہ سے برطانوی سیادت کے تحت نہیں آسکا تھا وہ بھی اس کے تصرف میں آجائے۔ مسٹر ہنٹر کا خیال ہے کہ ڈلہوزی نے اپنی طرف سے اس ضمن میں کوئی

[1] Marshman, p. 475.

خاص اقدام نہیں کیا بلکہ حکومت ہند جن اصول پر چل رہی تھی ان کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کو بڑھانے کے لئے الحاقی پالیسی اختیار کرتا۔ اس نے انیسویں صدی کے لارڈ ولزلی والے ہندوستان اور تاج برطانیہ کے تحت والے ہندوستان کے درمیان ایک طرح سے اتصالی کڑی کا کام کیا۔ درحقیقت مجلس نظماء اور انگلستان کے وہ سب لوگ جو ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے عرصے سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ والیان ملک کو کٹ پتلی کے طور پر سامنے رکھ کر درپردہ انتظامی مشین انگریزی حکومت کے اشارے پر چلے۔ انگریزی راج نے والیان ملک کو ایسی قوت حاصل کرنے میں مدد دی جس پر ذمہ داری کی کوئی روک نہیں تھی ان حالات میں بدانتظامی لازمی نتیجہ تھی۔ چنانچہ اب ان حالات میں برطانوی حکومت کو یہ اخلاقی حق پہنچتا تھا کہ وہ لوگوں کی بھلائی کی خاطر اگر مناسب سمجھے تو ان ریاستوں میں سے جسے چاہے اور جسے ایسا کرنے کے لئے اسباب ہوں اپنی عملداری میں ملا لے۔ چنانچہ اس نے اپنے خیالات ایک سرکاری کاغذ میں اس طور پر ظاہر کئے ہیں:-

"کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ اس بات کو ناپسند نہیں کرتا ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی حکومت کی حدوں کو بڑھائیں ایسی صورت کے کہ علاوہ اس کے ہم اپنی حفاظت نہ کر سکتے ہوں۔ یا اپنے علاقوں میں امن وامان نہ رکھ سکتے ہوں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی شخص[لہ] اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ ہمیں ان ریاستوں کو اپنی عملداری میں شامل کرنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کرنا چاہئے جبکہ حکمرانوں کے فوت ہونے پر وہاں کوئی جائز وارث نہ ہو تاکہ ہم اپنی سلطنت کو مستحکم کر سکیں۔ اس طرح ہماری عملداری کے مختلف حصوں کے درمیان چھوٹی موٹی ریاستیں باقی نہ رہیں گی جو ہمارے لئے سوائے کمزوری اور پریشانی کے قوت کا موجب کبھی بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایسا کرنے میں ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری آمدنی بڑھے گی اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جن کے مفاد کی نگرانی ہم اپنے طریق حکومت ہی سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔۔۔ حکومت کا یہ فرض ہے

لہ Dalhousie, by Sir W. W. Hunter, p. 124.

اور اس کی پالیسی بھی اس وقت یہی ہے کہ ایسے ہر موقع پر جو ہمیں ملے ہم دیانتداری کے ساتھ وہی کریں جسے ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا موقع پیش آئے جب ہمیں اپنے طریق کار کے صحیح ہونے کی نسبت ذرا سا بھی شبہہ ہو تو ایسی صورت میں اقدام سے ہمیں بچنا چاہئے لے

ڈلہوزی نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اصول بازگشت بنایا جس کی رو سے جن والیان ملک کا کوئی حقیقی وارث نہ ہو ان کے علاقوں کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ خاص طور سے ان ریاستوں پر جو براہ راست کمپنی کے ماتحت تھیں یا کمپنی ان کو وجود میں لانے کی ذمہ دار تھی اس اصول کو برتا گیا۔ عملی طور پر اس اصول کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی والئ ملک لاولد مر جائے تو بجائے اس کے کہ وہ کسی کو متبنیٰ کر کے اس کو اپنا جانشین بنائے اس ریاست پر سرکار کمپنی کا قبضہ و تصرف تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ ڈلہوزی سے پہلے ہندو والیان ملک کو یہ حق حاصل تھا کہ لاولد ہونے کی شکل میں وہ کسی کو اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنا لیں اور اس کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیں۔ یہ اصول ہندو دھرم شاستر کے مطابق تھا اور ترکوں اور مغلوں کے عہد میں بھی اس کو تسلیم کیا گیا تھا۔ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے عہد مغلیہ کے نظم و نسق کی بہت سی باتوں کو اختیار کیا تو اس اصول کو بھی تسلیم کیا۔ ڈلہوزی پہلا گورنر جنرل ہے جس نے یہ شرط لگائی کہ چونکہ برطانوی حکومت سارے ملک کی بالادست قوت ہے اس لئے لے پالک کرنے کا حق اسی وقت استعمال کیا جا سکے گا جب کہ اس سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو۔ لیکن اس نے یہ طے کیا کہ سرکار کمپنی ریاستوں کی رعایا کی بھلائی کی خاطر اس وقت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس قسم کی اجازت نہ دی جائے اس لئے کہ انگریزی حکومت رعایا کے لئے ہندوستانی رئیسوں کی حکومت سے ہر حالت میں بہتر ہے۔ اس کی صراحت کر دی گئی کہ اس اصول کا اطلاق ان ریاستوں پر نہیں کیا جائیگا جن کی فرمانروائی

لے Hunter, p. 127

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے قبل سے چلی آرہی ہے۔ اس اصول کے تحت ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان آٹھ چھوٹی بڑی ریاستوں کو انگریزی عملداری میں لے لیا گیا۔ ان میں ستارا، جھانسی، جیت پور، سنبھل پور، باگھٹ، مداولا، اودے پور (جنوبی بنگال) اور ناگپور شامل ہیں۔ خصوصاً ریاست ناگپور کا رقبہ موجودہ زمانے کے صوبہ متوسط سے کچھ تھوڑا ہی کم تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مارکوئس آف ہسٹنگز نے انگریزی ریزیڈنٹ سر رچرڈ جنکنس کی نگرانی میں ناگپور کے نابالغ راجا کو تیسری جنگ مرہٹہ کے بعد بحال کر دیا تھا۔ انگریزی ریزیڈنٹ کی نگرانی ختم ہونے کے بعد یہاں بد انتظامی پھیل گئی۔ ۱۸۵۳ء میں آپا صاحب کے متبنیٰ کا انتقال ہو گیا اور اس نے کوئی صلبی وارث نہیں چھوڑا۔ چونکہ اس نے اپنی زندگی میں کسی کو گود نہیں لیا تھا اس لئے ناگپور کی ریاست جو کمپنی کے ماتحت تھی اور ۱۸۱۸ء میں آپا صاحب کے متبنیٰ کو عطا کی گئی تھی، ضبط کر لی گئی۔ اس وقت ناگپور میں منسل حکومت ہند کی طرف سے رزیڈنٹ کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس نے ڈلہوزی کی اصول بازگشت کی پالیسی سے اختلاف کیا۔ اس نے ڈلہوزی کو لکھا کہ ہمیں چاہئے کہ متوفی راجہ کی بیواؤں میں سے کسی کو یہ حق دیں کہ وہ کسی کو گود لے لے اور ہم اس کو راجا تسلیم کر لیں۔ لیکن ڈلہوزی اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ راجا نے جو ذاتی ملکیت چھوڑی تھی وہ اس کی بیواؤں کو تقسیم کر دی گئی۔ جواہرات وغیرہ کو فروخت کر کے ایک "بھونسلا فنڈ" قائم کیا گیا تاکہ بیواؤں کو اس کے سود سے وظیفے دیئے جائیں۔ جس طریقے سے رانیوں سے جواہرات وغیرہ حاصل کئے گئے وہ قابل اعتراض تھا اور اس کے متعلق انگلستان میں بھی ڈلہوزی پر نکتہ چینی کی گئی۔ بعض ایسے والیان ملک تھے جن کی حکومت برائے نام تھی۔ نواب کرناٹک راجا تنجور اور پیشوا کا متبنیٰ نانا صاحب کے وہ حقوق و مراعات جنھیں کمپنی پہلے تسلیم کر چکی تھی منسوخ قرار پائے۔ راجپوتانہ میں ریاست کرولی کو بھی ڈلہوزی اصول بازگشت کے تحت ضبط کرنا چاہتا تھا لیکن مجلس نظماء نے اس کی منظوری دینے سے انکار کر دیا اس واسطے کہ یہ ریاست قدیم سے چلی آرہی تھی اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی ضبطی کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ ڈلہوزی

کی اس حکمت عملی سے ہندوستانی والیان ریاست کو اپنے اپنے متعلق خدشے پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرنے لگا کہ اس کے حقوق اور املاک محفوظ نہیں ہیں۔ بعض والیان ملک جو متبنیٰ بنانے کے حق سے محروم کر دیئے گئے تھے اپنی رعایا میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر رعایا نے ان کا ساتھ دیا۔ غدر کے اسباب میں اصول بازگشت کا اطلاق ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے عام طور پر انگریزی حکومت کے خلاف نفرت اور بدگمانی پیدا ہو گئی۔

خود انگریزوں میں بعض ایسے منصف مزاج لوگ موجود تھے جو ڈلہوزی کی پالیسی کو حق بجانب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ سر ہنری لارنس، آوٹرم، کلارک، سلی مین اور لوئے نے ڈلہوزی سے اختلاف کیا لیکن وہ ایسا خود رائے تھا کہ اپنے سامنے کسی کی سننے والا نہ تھا۔ ان سب لوگوں نے بتایا کہ ملک کے عوام کے لئے دیسی والیان ملک کی حکومت ایک غیر ملکی حکومت کے مقابلے میں بہتر ہے اس لئے کہ ان میں ہندوستانی لوگوں کو اعلیٰ ترین نظم ونسق کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے مواقع ملتے ہیں جو اس وقت برطانوی حکومت کے تحت ناپید تھے۔

الحاق اودھ

اودھ کا الحاق اصول بازگشت کے تحت نہیں ہوا بلکہ اس بنا پر کہ وہاں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی شمالی ہند میں اودھ کی ریاست بڑی سیاسی اہمیت رکھتی تھی اور رقبہ میں کافی وسیع تھی۔ اس کے تحت جو علاقے تھے وہ ہندوستان کی سب سے زیادہ زرخیز زمینوں پر مشتمل تھے۔ ڈلہوزی اس ریاست کو انگریزی راج میں ملا لینے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اودھ کے حکمران نواب واجد علی شاہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ رعایا کی فلاح وبہبود کا جیسا چاہئے ویسا خیال نہیں رکھتا اور عیش وعشرت میں اپنا سارا وقت صرف کرتا ہے۔ اس لئے اودھ کا نظم ونسق سرکار کمپنی کے تحت آ جانا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں اودھ کا مالی انتظام اس زمانے میں بہت بگڑا ہوا تھا اور فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن یہ کوئی معقول عذر نہ تھا جس کی بنا پر ریاست اودھ کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر اودھ کے رہنے والوں کی خوشحالی برطانوی ہند کے

باشندوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اودھ کے آس پاس کے انگریزی علاقے چھوڑ کر بہت سے لوگ ریاست اودھ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔[1] اودھ کی زرخیزی اور آبادی کو دیکھ کر اودھ کے انگریز رزیڈنٹ کرنل سلی مین کے منہ میں پانی بھر آیا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس کو حکم دیا تھا کہ وہ اودھ کا دورہ کرکے اور وہاں کے حالات کی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کرنل سلی مین نے جو یادداشت مرتب کی اس میں نواب اودھ کی بدعنوانیوں، فضول خرچی اور نااہلی کو ظاہر کیا گیا۔ لیکن باوجود اس کے اس کی قطعی رائے تھی کہ اودھ کی ریاست برطانوی ہند میں ملحق نہیں کرنا چاہئے اس واسطے کہ ایسا کرنے سے دیسی سپاہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت وانتقام کی آگ بھڑک اٹھے گی اور برطانوی حکومت کو مالی اعتبار سے اتنا زیر بار ہونا پڑے گا کہ ریاست اودھ جیسی دس ریاستوں کی آمدنی بھی اس کے لئے کافی نہ ہوگی۔[2] اس کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ اس کا خیال تھا کہ باوجود ہر قسم کی بد انتظامی کے اودھ کی اصلاح ممکن ہے۔ وہ ڈلہوزی کی الحاقی حکمت عملی کا سخت مخالف تھا۔ کرنل سلی مین کے بعد آوٹرم کو اودھ کا ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس نے بھی اودھ کی بد انتظامی کی رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی لیکن وہ بھی کرنل سلی مین کی طرح اس بات کا حامی تھا کہ انگریزی حکومت کو اگلے معاہدوں کے مطابق ریاست اودھ کو باقی رکھنا چاہئے اور اس کے نظم ونسق کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔

لارڈ آکلینڈ کے زمانے میں ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد اس کے چچا نصیر الدولہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو معاہدہ ہوا

[1] Keene, History of India, Vol. II, p. 116.

[2] Thompson and Garrat, Rise and fulfilment of British Rule in India, p. 406.

اس میں ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی تجدید عمل میں آئی تھی جس کے بموجب انگریزی حکومت نے اودھ کی تقریباً نصف سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ ریاست اودھ کی فوجی حفاظت کا ذمہ کمپنی پر ہوگا۔ اس معاہدے میں نواب اودھ پر یہ بھی لازم کیا گیا تھا کہ اس کا فرض ہے کہ اپنے علاقے میں اچھا انتظام کرے اور کمپنی کے مقرر کئے ہوئے عہدہ داروں کے مشورے سے کام کرے۔ ۱۸۳۷ء کے معاہدے میں اس کی صراحت کی گئی تھی کہ اگر اودھ کے بعض ضلعوں میں نواب اچھا انتظام کرنے میں ناکام رہا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا فرض تصور کرے گی کہ ان ضلعوں کو عارضی طور پر اپنے زیر انتظام لے لے۔ ان ضلعوں کے نظم ونسق کے اخراجات وضع کرنے کے بعد جو آمدنی بچے گی وہ حکومت اودھ کے خزانے میں داخل کی جائے گی۔ ۱۸۳۷ء کے معاہدے کی ان دفعوں سے لارڈ ڈلہوزی نے اپنی الحاقی حکمت عمل کا جو جواز ثابت کیا ہے وہ قانونی اور منطقی طور پر صحیح نہیں۔

۱۸۳۷ء کے معاہدے کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کمپنی کی فوج جو اودھ میں رہتی تھی اس میں اضافہ کر دیا جائے اور جو مزید اخراجات اس کی وجہ سے عاید ہوں ان کا بار دربار اودھ کے خزانے پر ہوگا۔ لیکن معاہدے کے بعد نواب اودھ کے ملکی انتظام میں بہتری کی صورت پیدا ہو گئی اور ادھر مجلس نظامت نے گورنر جنرل پر اعتراض کیا کہ ان اخراجات کا بار دربار اودھ پر نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ نواب نے فوج بڑھانے کے لئے ہم سے خواہش نہیں کی بلکہ ہم خود اپنی ملکی مصلحتوں سے اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجلس نظامت نے اس دفعہ کو جس سے مزید اخراجات نواب پر عائد کئے گئے تھے منسوخ قرار دیا اور بتایا کہ ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی رو سے ہم نے تقریباً نصف ریاست اودھ پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو باقی ماندہ ریاست کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ اب فوجی حفاظت کے ضمن میں ہم کوئی اور بار نواب اودھ پر نہیں ڈال سکتے۔ لارڈ آکلینڈ، لارڈ ایلنبرا اور لارڈ ہارڈنگ کے زمانے میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ۱۸۳۷ء کا معاہدہ پورا منسوخ نہیں ہوا بلکہ صرف

اس دفعہ کو مجلس نظما نے منسوخ کیا ہے جس کی رو سے مزید اخراجات کا بار دربار اودھ پر عائد ہوتا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ استدلال پیش کیا کہ ۱۸۳۷ء کا پورا معاہدہ مجلس نظما نے منسوخ کر دیا لیکن غلطی سے نواب اودھ کو صرف اس دفعہ کے منسوخ ہونے کی اطلاع دی گئی جس سے اس پر مزید اخراجات کا بار پڑتا تھا اور اس کو دوسری دفعوں کی منسوخی کی اطلاع نہیں دی جا سکی۔[1] چنانچہ انگریزی ریزیڈنٹ مقیم لکھنؤ کو اس کے بموجب ہدایتیں بھیجدی گئیں۔ مسٹر بیورج نے اپنی تاریخ میں یہ بڑی پتے کی بات لکھی ہے کہ اگر یہ پورا معاہدہ منسوخ ہو گیا تھا تو ۱۸۴۵ء میں سرکاری طور پر جو معاہدوں کا مجموعہ شائع ہوا اس میں اس کو بغیر کسی صراحت کے کیوں شامل کیا گیا گورنر جنرل بڑی ہٹ دھرمی سے اپنی بات کی پچ کرتا رہا اور ریزیڈنٹ کو لکھا۔

"اگر شاہ اودھ ۱۸۳۷ء کے معاہدے کا ذکر کرے اور دریافت کرے کہ انگریزی حکومت کس لئے اودھ میں معاہدے کے خلاف کرنا چاہتی ہے تو کہہ دیا جائے کہ اس معاہدے کا وجود باقی نہیں ہے مجلس نظما نے جب معاہدہ کا متن اس کو منظوری کے لئے بھیجا اس وقت اس کو منسوخ قرار دیا۔ چنانچہ دربار لکھنؤ کو اس وقت مطلع کیا گیا تھا کہ اس معاہدے کی بعض دفعیں جن کی رو سے فوج کے مزید اخراجات کا بار عاید ہوتا تھا منسوخ کر دی گئیں۔ اس وقت اس امر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ معاہدے کی دوسری دفعوں کی منسوخی کی بھی اطلاع دی جاتی اس لئے کہ یہ دفعیں کوئی عملی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ بعد میں بھی اس ضمن میں غفلت برتی گئی اور دربار اودھ کو مطلع نہیں کیا گیا۔ ریزیڈنٹ کو اختیار ہے کہ وہ نواب سے کہہ دے کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو افسوس ہے کہ بلا ارادہ اس قسم کی غفلت ہوئی۔"[2]

[1] Beveridge, Vol. III, p. 548.

[2] Beveridge, p. 549.

غرضکہ ڈلہوزی نے ۱۸۳۷ء کے معاہدے کے مضمرات سے بچنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ نہایت نازیبا اور خلاف انصاف تھا۔ معاہدے کی رو سے انگریزی حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھی کہ دخل دے کر نظم و نسق کو درست کرنے کی تدبیریں اختیار کرتی اور نواب کے اعمال پر ایسی حد بندی کرتی کہ وہ نظم و نسق کو خراب نہ کر سکتا۔ اگر بفرض محال ۱۸۳۷ء کا معاہدہ منسوخ قرار دیا جائے تو بھی ۱۸۰۱ء کے معاہدے کی رو سے انگریزی حکومت پر فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ اودھ کی آدھی ریاست پر قبضہ کرنے کے عوض وہاں امن و امان قایم رکھے اور اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے اس کی حفاظت کرے۔ اس معاہدے میں اس کا کہیں اشارہ بھی نہیں کہ کسی صورت میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی اس کی مجاز ہو سکے گی کہ وہ اودھ کے پورے علاقے کو دبا بیٹھے۔ پھر لارڈ ڈلہوزی کا یہ دعوی کہ اودھ کا الحاق وہاں کی رعایا کی فلاح و بہبود کی خاطر ضروری ہو گیا تھا بے بنیاد ہے۔ اودھ کی کل رعایا بلا امتیاز طبقہ و مذہب کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے حکمران کو چاہے وہ کیسا ہی بے پروا اور ان کے مفاد سے غافل کیوں نہ ہو، ہٹا کے انھیں انگریزی حکومت کے تحت کر دیا جائے۔ چنانچہ الحاق کے ایک سال بعد غدر کے موقع پر اودھ کی رعایا نے سب سے زیادہ انگریزوں کے خلاف عداوت اور نفرت کا اظہار کیا جس سے ڈلہوزی کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر اودھ کی رعایا واقعی انگریزی راج سے اسی طرح مطمئن ہوتی جیسی کہ پنجاب کی رعایا تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ غدر کے وقت وہاں اس قدر شدید مخالفت ظاہر ہوتی اور وہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا مرکز بن جاتا۔

ڈلہوزی نے ۱۸۵۶ء میں مجلس نظماء سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کر کے اودھ کا الحاق کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے ۱۵ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور کلکتہ روانہ کر دیا۔ نواب سے اس کی معزولی کے ضمن میں ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا لیکن نواب واجد علیشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اعلان کے ذریعہ یہ کارروائی عمل میں آئی

ورنہ انگریزی حکومت کو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ جو کچھ کیا گیا وہ خود حکمران کی رضامندی سے کیا گیا۔ نواب اودھ کے تعلقات انگریزی حکومت سے ہمیشہ اچھے رہے تھے۔ نوابوں نے ہر زمانے میں برطانوی حکومت کی برے وقتوں میں امداد کی تھی۔ نوابان اودھ کی دوستی کا یہ صلہ دیکھ کر کمپنی کی حکومت سے شمالی ہند کے لوگوں کا رہا سہا اعتبار بھی جاتا رہا۔ چنانچہ سیاسی اعتبار سے الحاق اودھ زبردست غلطی تھی۔ اس کا خمیازہ سال بھر بعد ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کو بھگتنا پڑا۔

برار کی حوالگی

حیدرآباد کے انگریزی ریزیڈنٹ سر ہنری رسل نے گورنر جنرل مارکوئس آف ہسٹینگز سے مشورے کے بعد حیدرآباد میں جدید فوجی تنظیم کی اور حیدرآباد کنٹنجنٹ قایم ہوئی۔ اس فوج کی تنظیم کی اصل وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت یہ محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو مرہٹوں کے خلاف فیصلہ کن لڑائی لڑنا پڑے گی۔ چنانچہ خود مارکوئس آف ہسٹینگز کا یہ خیال تھا کہ اس جدید فوج کو جس کے اخراجات کا بار سرکار نظام پر ہوگا مرہٹوں کے خلاف آسانی سے استعمال کیا جا سکے گا اور انگریزی حکومت اس کی وجہ سے بہت کچھ خرچ سے بچ جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لیکن کنٹنجنٹ بعد میں بھی برقرار رکھا گیا۔ انگریز افسروں کو تنخواہ کے علاوہ الاؤنس بھی دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں الاؤنس کی رقم ساڑھے تیرہ لاکھ ہوئی تھی۔ عموماً اس کی وجہ سے حکومت سرکار عالی کے خزانے پر ۴۲ لاکھ روپے سالانہ کا بار پڑتا تھا۔ حالانکہ اعانتی فوج کے اخراجات کے ضمن میں حکومت نظام میسور کی آخری جنگ کے بعد انگریزی حکومت کو علاقے سپرد کر چکی تھی۔ اب اس کے بعد سرکار نظام پر مزید فوجی اخراجات کا بار ڈالنا معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ لیکن راجہ چندو لال کا زمانہ تھا۔ وہ ریزیڈنٹ کے اشارے پر چلتے تھے۔ اس طرح معاملات چلتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۳۵ء میں فریزر ریزیڈنٹ ہو کر حیدرآباد آیا۔ اس نے حکومت ہند کی توجہ کنٹنجنٹ کی فضول خرچیوں کی طرف مبذول کرائی اور بتایا کہ یہ انگریزی حکومت کے لیے ایک بدنمائی اور بدنامی کی بات ہے۔ اس نے راجا چندو لال کی بھی مخالفت کی اور حکومت ہند کو

ان کی بد انتظامی کی نسبت کئی مرتبہ توجہ دلائی۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء میں ان کی جگہ ان کے بھتیجے راجا رام بخش پیشکار مقرر ہوئے جو تین سال تک اس خدمت پر رہے۔ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی عرصے سے ریزیڈنٹ کو کرنا پڑ رہی تھی جس کے سبب سے سرکار نظام پر حکومت ہند کا سودی قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔ نواب سراج الملک نواب سیف جنگ ابن امجد الملک اور نواب شمس الامرا کی مدار المہامی کے زمانے میں قرضہ برابر بڑھتا رہا۔ ملک کی مالی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے جنرل فریزر کو لکھا جو اس وقت حیدرآباد میں ریزیڈنٹ تھا کہ حکومت ہند کا ریاست حیدرآباد پر قرضہ بڑھتا جا رہا ہے اس کی نسبت معینہ مدت کے اندر تصفیہ کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ جب معینہ مدت ۴ جنوری ۱۸۵۱ء گزر گئی تو لارڈ ڈلہوزی نے سرکار نظام کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ قرضے کے عوض برار پائیں گھاٹ کے ضلع کمپنی کو سپرد کئے جائیں تاکہ ۶۴ لاکھ کی ادائی اور کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کا آئندہ انتظام ممکن ہو۔ نواب ناصر الدولہ کو اپنے ملک کا کوئی حصہ انگریزی حکومت کے حوالہ کرنا سخت شاق تھا۔ انھوں نے قرض کو قسطوں سے ادا کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کی بھی تکمیل نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنرل فریزر کے جانے کے بعد کرنل جان لو کو مارچ ۱۸۵۳ء میں گورنر جنرل نے معاہدہ کا مسودہ دے کر روانہ کیا جس پر سرکار نظام کے دستخط ثبت کرانے کی اس کو تاکید کی گئی تھی۔ نواب سراج الملک نے سرکار کی طرف سے کرنل لو کو ہرچند یقین دلایا کہ میں بہت جلد قرض کی ادائی کا بندوبست کر دوں گا لیکن نئے ریزیڈنٹ نے کہا کہ میں مجبور ہوں۔ اگر معاہدے پر دستخط نہ ہوئے تو مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ پونا سے گوروں کی دو پلٹنیں طلب کروں تاکہ معاہدے کی تکمیل فوجی کارروائی کے ذریعے ہو سکے۔

سراج الملک نے انگریزی ریزیڈنٹ کو بتایا کہ انگریزی حکومت عرصے سے سکندرآباد اور جالنہ کی آبکاری کے محاصل بہ حساب ایک لاکھ روپے سالانہ گزشتہ ۴۱ سال سے وصول کرتی رہی ہے۔ اس کو اگر کمپنی کے قرضے میں سے

مع سود کے منہا کر دیا جائے تو سرکار نظام پر قرضے کی رقم کا بار بہت کم ہو جائے گا
لیکن اس جائز مطالبے کی مطلق شنوائی نہیں ہوئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے پہلے ہی
نواب ناصر الدولہ کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ قرض کی ادائی اور کنٹنجنٹ کی
ماہوار تنخواہ پابندی سے ادا کرنے کی صرف ایک یہی صورت ہے کہ برار پائیں گھاٹ کے
ضلعے حکومت ہند کے سپرد کر دئے جائیں لیکن شروع میں نواب ناصر الدولہ گورنر جنرل کے
اس مطالبے کو ماننے سے انکار کرتے رہے آخر کار انھوں نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔
معاہدے کی رو سے برار پائیں گھاٹ کے ضلعے رائچور دوآب اور سرحدی ضلعے شولاپور و احمد نگر انگریزی
حکومت کے سپرد کر دئے گئے۔ دو قسم کی سپاہ ریاست حیدر آباد میں رہنے کیلئے مقرر کی گئی ایک تو
اعانتی (سب سی ڈیری) فوج جو ملک کی عام حفاظت کے لئے تھی۔ اس میں حسب سابق پیادوں
کی آٹھ پلٹنیں اور سواروں کی دو رجمنٹیں، توپ خانہ اور جنگی ساز و سامان شامل
تھا۔ اس فوج کی غرض و غایت یہ بتائی گئی کہ اس کو نواب کی شخصی حفاظت
اور اندرونی فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا اور تحصیل
مالگزاری کے سلسلے میں اگر کوئی زمیندار یا اجارہ دار سرکشی کرے تو اس فوج
کے ذریعہ سے اس کی سرکوبی کی جائے گی۔ دوسری سپاہ کنٹنجنٹ تھی جسے اس
معاہدے کی رو سے برقرار رکھا گیا۔ یہ پانچ ہزار پیادوں دو ہزار سواروں
اور چار فیلڈ بیٹری پر مشتمل تھی۔ اس کے سب افسر انگریز تھے اور تنخواہ کی ادائی
اور دوسرے انتظاموں کا تعلق براہ راست ریزیڈنٹ سے تھا۔ اگر انگریزی
علاقے میں فتنہ و فساد برپا ہو یا کسی ایسے علاقے میں جس کی سرحد ممالک محروسہ
سرکار عالی سے ملی ہوئی ہو بدامنی رونما ہو تو کنٹنجنٹ سے کام لیا جا سکے گا۔ اس کے
جملہ اخراجات سرکار نظام کے ذمے ہوں گے لیکن اس کے استعمال کرنے کا
انحصار تمام تر ریزیڈنٹ پر ہوگا۔[1]

اس معاہدے میں یہ بھی طے ہوا کہ اعانتی فوج اور کنٹنجنٹ کے علاوہ اور
کوئی فوج انگریزی حکومت سرکار عالی سے طلب کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ سنہ ۱۸۵۸ء

---

[1] Fraser, Our Faithful Ally, The Nizam, p 276

میں سرکار نظام اور انگریزی حکومت کے درمیان جب عہد معاونت طے ہوا تھا تو اس کی رو سے سرکار نظام پر لازم قرار پایا تھا کہ جب کبھی برطانوی حکومت اپنی فوجی اغراض کے لئے نو ہزار سوار اور چھ ہزار پیادے طلب کرے تو انھیں تیار رکھا جائے ۱۸۵۳ء کے معاہدے میں اس شرط کو اڑا کر انگریزی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ جب اسے ضرورت ہو تو اعانتی فوج اور کنٹنجنٹ کو طلب کر سکتی ہے۔

جو ضلعے اس معاہدے کے بموجب سرکار نظام نے حکومت برطانیہ کو سپرد کئے ان کی آمدنی تقریباً پچاس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ انگریزی حکومت نے یہ اقرار کیا کہ وہ سرکار نظام کو سالانہ اس رقم کی جمع وخرچ کا حساب دیا کرے گی کنٹنجنٹ کی سات ہزار سپاہ کا خرچ اور سپرد کئے ہوئے علاقوں کے انتظامی اخراجات کو نکال کر جو رقم بچے گی وہ سرکار نظام کو ادا کر دی جائے گی۔ اس معاہدے میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی کہ برار کے نظم ونسق کے اخراجات کتنے ہوں گے چنانچہ اس عدم وضاحت کے باعث انگریزی حکومت کو پورا اختیار حاصل رہا کہ انتظامی اخراجات کی مد کو اتنا بڑھا دے کہ سرکار نظام کو دینے کے لئے کوئی رقم بچے ہی نہیں۔ حالانکہ خود کنٹنجنٹ کے اخراجات میں برار کے ضلعے سپرد کئے جانے کے بعد جو تخفیف عمل میں آئی اس کی وجہ سے رقم زیادہ بچنی چاہئے تھی۔ جب کنٹنجنٹ کا انتظام سرکار نظام کے تحت لیکن ریزیڈنٹ کے ذریعہ سے ہوتا تھا تو اس کے اخراجات سالانہ چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہوا کرتے تھے۔ اور جب معاہدۂ برار کی رو سے اس کا انتظام انگریزی حکومت کے تحت آگیا تو یہ اخراجات ۲۲ لاکھ سالانہ رہ گئے۔ اگر چند سال قبل کنٹنجنٹ کے اخراجات میں تخفیف کی جاتی تو سرکار نظام کو خواہ مخواہ قرضے سے زیر بار نہ ہونا پڑتا۔ پھر قرضے کی رقم اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس کی بنا پر ممالک محروسہ کے نہایت زرخیز اور سیر حاصل علاقوں کو حوالے کرنا ضروری ہوتا۔ حکومت نظام جس کی سالانہ آمدنی اس زمانے میں دو کروڑ روپے سالانہ سے زیادہ تھی یقیناً ۴۶ لاکھ کے قرضہ کو چند سال کے اندر آسانی کے ساتھ ادا کر سکتی تھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند کو اتنی جلدی اور بے اعتباری کیوں تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

لارڈ ڈلہوزی پہلے ہی سے فیصلہ کر چکا تھا کہ زر نقد کے بجائے قرضے کے بہانے سے وہ برار کے ضلعوں کو انگریزی علمداری میں شامل کرے گا اور اس طرح اپنے توسیع سلطنت کے منصوبے کو ترقی دے گا۔

ڈلہوزی نے نہ صرف توسیع سلطنت کے لئے کوشش کی بلکہ اس کے ساتھ اس نے اندرونی نظم ونسق کی اصلاح کا بھی پورا خیال رکھا۔ اس کے عہد میں ملک میں نئے انتظامات ہوئے جن کی بدولت اہل ہند کی ترقی ہوئی۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ ہر تفصیل پر اس کی نظر رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انتظامی معاملوں میں بھی اپنی شخصیت کے نقوش بہت گہرے چھوڑے۔

ڈلہوزی کے اندرونی انتظامات

پنجاب، برما، ناگپور اور اودھ کے جو وسیع علاقے ڈلہوزی کے عہد حکومت میں انگریزی علمداری میں شامل کئے گئے ان کے علحدہ صوبے بنائے گئے۔ ان کے جدید انتظام میں فوجی اور سول عناصر برابر کے شریک تھے تاکہ معاملے جلد طے ہوا کریں اور رعایا کو عدل وانصاف بہم پہنچانے میں کارکردگی کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے۔ ہر علاقے میں مقامی رسوم اور روایتوں کا اس حد تک خیال رکھا گیا جس حد تک کہ وہ عدل وانسانیت کے عام اصول سے مطابقت رکھتے تھے۔ یہ صوبے نان ریگولیشن پراونس کہلاتے تھے اس واسطے کہ پریسی ڈنسیوں کے قوانین اور ضابطے ایک دم سے یہاں نافذ نہیں کئے گئے تاکہ رعایا کوئی بکایک تبدیلی نہ محسوس کرے۔ یہ صوبے راست گورنر جنرل کے تحت تھے۔ پنجاب میں بھی جہاں نظم ونسق کی مشین کو چلانے کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا تھا لارڈ ڈلہوزی نے حقیقی دروبست اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔ ان صوبوں میں افسر ضلع کے اختیارات بہت وسیع رکھے گئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے تحت عدالت، پولیس، انگریزی غرضکہ نظم ونسق کا ہر اہم شعبہ تھا۔ آہستہ آہستہ جب حالات میں تبدیلی ہوئی تو صوبوں کے چیف کمشنر لفٹنٹ گورنر بن گئے۔ پنجاب کا ایک صوبہ بن گیا۔ اودھ کو صوبہ شمال مغربی کے ساتھ ملا دیا گیا۔ برما میں بھی بعد میں لفٹنٹ گورنر کا عہدہ قایم ہوگیا۔ ناگپور کی ریاست سے جو علاقے ملے تھے وہ صوبہ متوسط کی شکل میں

ہمارے سامنے ہیں۔
ڈلہوزی کے عہد میں حکومت ہند کی آمدنی چھبیس سے تیس کروڑ سالانہ ہوگئی۔ تجارت میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ڈلہوزی چاہتا تھا کہ ملک میں ریلوں کا جال پھیل جائے تاکہ اندرونی علاقوں سے آسانی کے ساتھ مال بندرگاہوں تک پہنچ سکے۔ ۱۸۵۳ء میں پہلے پہل تھانہ سے بمبئی تک ریلوے لائن قایم ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد رانی گنج سے کلکتہ تک اور مدراس میں بھی ریلوے لائن قایم ہوئیں۔ بڑے بڑے شہروں اور فوجی چھاؤنیوں میں تار بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ ڈاک کی اصلاح عمل میں آئی۔ اب تک خط ہرکاروں کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے جاتے تھے اور کافی خرچ پڑتا تھا۔ ڈلہوزی نے آدھ آنہ کا محصول ملک کے ہر حصے میں خط بھیجنے کے لئے نکالا۔ تار برقی سے ملک پر حکومت کرنے میں آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ گورنر جنرل نے محکمۂ تعمیرات کی تنظیم کی اور ملک کے مختلف حصوں میں وسیع پیمانے پر سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ تعمیرات کے بجٹ میں کافی اضافہ کیا گیا۔ گنگا کی نہر کی تعمیر اگرچہ لارڈ ڈلہوزی کے آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا کام بہت سست رفتار سے ہو رہا تھا۔ چھ سال میں اس پر ڈیڑھ کروڑ کی رقم صرف کی گئی اور کام تکمیل کو پہنچا۔
اہل ہند کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ ملک میں دیہاتی مدرسے کھولے گئے تاکہ عوام میں تعلیم پھیلے۔ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ نے جو بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگرانی) کا صدر تھا اہل ہند کی تعلیم کی ایک ہمہ گیر یادداشت مرتب کی جس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ ہر صوبہ میں محکمہ تعلیمات اور ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ استادوں کی ٹریننگ کے لئے خاص مدرسے کھولے جائیں اور مڈل اسکولوں میں دیسی زبانوں میں تعلیم دینی چاہئے۔ ان مدرسوں کو اسی طرح سے سرکاری امداد دینی چاہئے جس طرح انگریزی مدرسوں کو امداد دینے کا طریقہ رائج تھا۔ اس وقت بنگال پریسیڈنسی میں انگریزی اعلیٰ تعلیم کی طرف بہ مقابلہ ابتدائی تعلیم کے زیادہ توجہ کی جا رہی تھی۔ چنانچہ

۱۸۵۲ء میں تیس انگریزی کالج موجود تھے جن میں طلبہ کی تعداد ۵ ہزار تھی۔ اسکے برخلاف بمبئی پریسی ڈنسی میں انگریزی کے کالجوں کی تعداد صرف ۱۴ تھی اور ابتدائی مدرسوں کی تعداد (۲۲۳) تھی جن میں گیارہ ہزار سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سر چارلس وڈ کی تحریک پر مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) نے ۱۸۵۴ء میں اہل ہند کی تعلیم کے متعلق حکومت ہند کو جو ہدایتیں بھیجیں ان میں ابتدائی تعلیم پر زیادہ زور دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں جب سے کہ میکالے کے اصول کے مطابق حکومت ہند نے اپنی تعلیمی حکمت عملی کی تشکیل کی تھی انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے متعلق دشواریوں کے احساس کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا گیا تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں انگریزی جیسی غیر زبان کو عام طور پر رواج دینا ممکن نہیں۔ اس خیال کی صحت میں بھی شبہہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزی کی توسیع سے نظم ونسق کے معاملوں میں حکومت ہند کو سہولت ہوگی۔ خاصکر ابتدائی تعلیم سوائے مادری زبان کے کسی غیر ملکی زبان کے ذریعے نہ صرف ممکن نہیں بلکہ اس ملک کے تمدن اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ ہے جس میں اس قسم کا تجربہ کیا جائے۔ چنانچہ ہوشمند انگریزوں نے میکالے کے اصول عمل کے نقائص محسوس کرلئے اور جدید تعلیمی حکمت عملی کی داغ بیل پڑ گئی۔

سر چارلس وڈ (بعد میں لارڈ ہیلی فیکس) کی یادداشت نے اس جھگڑے کو ختم کر دیا جو ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف سنسکرت یا عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق میکالے کے وقت میں شروع ہوا تھا۔ اس یادداشت میں ہندوستان کے عوام کے لئے نہ تو انگریزی کو اور نہ کسی کلاسیکل زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔ اس کے بجائے مقامی دیسی زبانوں کو ابتدائی تعلیم میں استعمال کرنے کی سفارش کی گئی۔ اس کے ساتھ اس یادداشت میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ ان مدرسوں کی امداد کرے جو پاٹھشالاؤں اور مسجدوں میں قایم ہیں اور اپنے انسپکٹروں کو معائنہ کے لئے بھیج کر ان کی حالت کو سدھارنے کی کوشش کرے تاکہ ابتدائی تعلیم کے اس دیسی نظام تعلیم سے بھی رعایا اور حکومت فائدہ اٹھا سکیں۔

شاہی منشور

۱۸۵۳ء میں آخری مرتبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہی منشور عطا ہوا۔ گزشتہ منشور کو منظور ہوئے اب بیس سال گزر چکے تھے۔ پارلیمنٹ نے ارل آف ڈربی کی تجویز کے مطابق ہندوستانی نظم ونسق کے معاملوں پر غور وتحقیق کرنے کے لئے ایک مجلس منتخبہ مقرر کی۔ رائے عامہ کا اس وقت رجحان یہ تھا کہ کمپنی کے بجائے تاج برطانیہ ہندوستانی مقبوضات کے نظم ونسق اور تمام ذمہ داریوں کو اپنی طرف منتقل کرلے۔ لیکن اس قسم کی بنیادی تبدیلی پارلیمنٹ کے لئے قابل قبول نہ تھی جو کمپنی کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ انگریزی سیاست کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ تدریج سے تبدیلیاں کی جاتی ہیں اور اس طرح ماضی کے سلسلے کو یک لخت نہیں توڑا جاتا۔ اگرچہ گزشتہ نصف صدی میں مجلس نظماء کے اختیارات بہت کچھ چھن چکے تھے لیکن اب بھی پارلیمنٹ اس مجلس کی ماہرانہ رایوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ تقررات کے معاملے میں مجلس نظماء کی رائے کی زیادہ وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں مجلس نظماء کے اصرار پر مجلس نگران نے لارڈ ایلن برا کو انگلستان واپس بلالیا۔

ہندوستان کے معاملوں پر مجلس منتخبہ نے جو سفارشیں کیں ان کے مطابق پارلیمنٹ نے ۱۸۵۳ء کا قانون منشور ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کیا۔ اس میں اس امر کی صراحت کردی گئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بدستور اس وقت تک تاج کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی رہے گی جب تک کہ پارلیمنٹ اس کے خلاف فیصلہ نہ کردے۔ اس منشوری قانون کی رو سے سول سروس کے ارکان بجائے نامزدگی کے عام مقابلہ کے ذریعہ مقرر ہوا کریں گے۔ لارڈ میکالے کی صدارت میں پارلیمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کردی تاکہ سیول سروس کے امتحان کے قاعدے اور ضابطے بنائے۔ امتحان انگلستان میں ہونا طے ہوا۔ گزشتہ منشوری قوانین میں کمپنی کے اختیارات کی بیس بیس سال کے لئے توسیع کی گئی تھی لیکن اس دفعہ کوئی میعاد نہیں مقرر کی گئی۔ اس قانون کی اہم دفعیں یہ ہیں۔

مجلس نظماء کے ارکان کی تعداد بجائے ۲۴ کے ۱۸ کردی جائے جن میں

سے ۶ کو تاج نامزد کرے گا۔ باقی بارہ میں سے چھ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں کمپنی کی خدمت میں کم سے کم دس سال ضرور صرف کر چکے ہوں اس دفعہ کے موجب یہ ممکن ہو سکا کہ کمپنی کے ان ملازموں کو مجلس نگران کی رکنیت دی جائے جو کمپنی کی ملازمت ختم کرکے وظیفہ پر علٰحدہ ہو چکے ہوں اور جنھیں پرانے طریق کار کے لحاظ سے منتخب ہونے کا امکان نہ تھا۔ انتظامی سہولت کے مدنظر بنگال اور بہار کا علٰحدہ لفٹننٹ گورنر مقرر کیا جائے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے قانونی رکن کی وہی حیثیت ہوگی جو دوسرے ارکان کی ہے۔ اس کو کونسل کے اجلاسوں میں شرکت کرنے اور رائے دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اب تک رکن قانون کو صرف وضع قوانین کے معاملوں سے تعلق تھا۔ دوسرے عاملانہ اور انتظامی مسائل میں اس کی رائے نہیں طلب کی جاتی تھی گورنر جنرل کی کونسل میں وضع قوانین کی سہولت کے مدنظر ۶ ارکان کا مزید اضافہ کیا گیا جن میں سے ایک بنگال کا چیف جسٹس اور ایک بنگال کی عدالت العالیہ کا جج ہوگا۔ باقی چار ارکان کو بنگال، مدراس، بمبئی اور صوبہ شمال مغربی کی حکومتیں نامزد کریں گی۔ ان ارکان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں کم سے کم دس سال رہ چکے ہوں۔ پہلے گورنر جنرل کی کونسل چھ ارکان پر مشتمل تھی یعنی گورنر جنرل، کمانڈر ان چیف اور چار ارکان کونسل۔ اب ۶ مزید ارکان کو ملا کر تعداد ۱۲ ہو گئی۔ اگرچہ گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ کونسل کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کو منظور نہ کرے لیکن وہ اس کا مجاز نہ ہوگا کہ ارکان کونسل کی اکثریت کی مرضی کے خلاف بذات خود کوئی قانون بنائے اور پھر خود ہی اس کے نافذ کرنے کا حکم دے دے۔ کونسل کے وضع کئے ہوئے قوانین اس وقت نافذ ہو سکیں گے جبکہ گورنر جنرل ان کی منظوری دے گا۔ گورنر جنرل اور گورنروں کی کونسلوں کے ارکان کے تقررات تاج کی جانب سے ہوا کریں گے۔ معاہداتی سیول سروس (اکاوی ننٹڈ سیول سروس) کے تقررات انگلستان میں مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہونگے۔ امتحانوں کے متعلق مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) اسکیم منظور کرے گا جس کی

پابندی ضروری ہوگی۔

۱۸۵۴ء میں پارلیمنٹ نے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو انتظامی سہولت بہم پہنچانے کے لئے یہ اختیار دیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں اپنی صوابدید پر نئے حکام مقرر کرے۔ چنانچہ آسام، صوبہ متوسط اور برما کے چیف کمشنروں کا تقرر گورنر جنرل کرے گا اور انھیں مقامی نظم و نسق کے اختیارات سپرد کرے گا۔[1]

ڈلہوزی کا کارنامہ

ڈلہوزی نے ملک کا اندرونی نظم و نسق درست کرنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں وہ مفید ثابت ہوئیں ڈلہوزی بلا کا محنتی اور جفاکش تھا۔ وہ اپنی فرصت کے اوقات میں بھی حکومت ہی کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ اس کی نظر معاملوں کی تفصیل پر رہتی تھی۔ آٹھ سال کی متواتر جانکاہی سے اس کی صحت پر برا اثر پڑا۔ ہندوستان سے واپسی پر وہ چار سال تک صاحب فراش رہا اور ۴۸ سال کی عمر میں جو کچھ زیادہ نہیں تھی اس نے وفات پائی۔ وہ اگرچہ بڑا قابل اور فرض شناس حکمراں تھا لیکن اس میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دوسروں کی رائے اور ان کے جذبات کی مطلق پروا نہیں کرتا تھا اور ضابطہ کی تکمیل پر بہت زیادہ زور دیا کرتا تھا۔ لیکن ضابطہ پر اس صورت میں زور دیتا تھا جب کہ اس کی رائے اور ضابطہ میں موافقت پائی جاتی ہو۔ وہ خودرائے تحکم پسند اور ضدی تھا اس لئے اپنے ساتھیوں سے سوائے ان کے جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے وہ نباہ نہ کرسکا۔ اس لئے سر چارلس نیپیر اور سر ہنری لارنس جیسے لوگوں کو جب کہ وہ اس کی رائے کے خلاف تھے بے اثر کرکے رکھ دیا۔ وہ اپنے ماتحتوں سے خوب دبا کر کام لیتا تھا اور چونکہ وہ خود بھی بہت جفاکش تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ دوسرے سب بھی اسی کی طرح حکومت کے کام کو فرض منصبی کی حیثیت سے انجام دیں۔

مختلف دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے اہل ہند کے سب سے

---

[1] Keith, A Constitutional History of India. p 139.

زیادہ بااثر طبقہ یعنی امراء میں انگریزی حکومت کی طرف سے سخت بد دلی پھیل گئی تھی جس کی ذمہ داری یقیناً ڈلہوزی پر عاید ہوتی ہے۔ نہ صرف والیان ملک اور طبقہ امراء اصول بازگشت کے عمل درآمد کے سبب سے انگریزی حکومت کے خلاف ہو گئے بلکہ عوام میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے مذہب یا دھرم کو وہ خراب کرنا چاہتی ہے۔ مسیحی مبلغوں کی کوشش سے ڈلہوزی نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ جو ہندوستانی اپنا مذہب بدل لیں ان کے حقوق وراثت متاثر نہ ہوں۔ حالانکہ یہ بات ہندوؤں کے دھرم شاستر اور مسلمانوں کی شریعت دونوں کے خلاف تھی۔ اس قانون کے منظور ہونے سے لازمی طور پر اہل ہند کے دل میں یہ شبہہ پیدا ہوا کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ملک میں مسیحی مذہب کی اشاعت اور تبلیغ سے اہل ہند بہت ناراض اور برافروختہ تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈلہوزی کے جانے کے بعد ملک میں بے چینی اور بد دلی کی لہر سی دوڑ گئی۔ بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز حکام رعایا سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے اور انھیں رعایا کے خیالات و جذبات کا علم تک نہ ہوتا تھا۔ کئی سال سے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے خلاف لوگوں کی ناراضی بڑھ رہی تھی جو بعد میں ایک دم سے زبردست شورش کی شکل میں نمودار ہوئی لیکن انگریزوں کو اس وقت تک ان حالات کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ رونما نہ ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں جو بغاوت ہوئی اور جس کا اثر خاص شمالی ہند میں زیادہ تھا اس سے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں ہل گئیں۔

پندرھواں باب

۱۸۵۷ء کا غدر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ

لارڈ کیننگ کا عہد حکومت

فروری ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ ڈلہوزی کا جانشیں مقرر ہوکر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانیہ میں نظم ونسق کا تجربہ حاصل کیا تھا اور پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر رہ چکا تھا جب مجلس نظماء نے اس کو انگلستان میں وداعی دعوت دی تو اس موقع پر اس نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا تھا۔

"میری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان میں میرے عہد حکومت میں امن وامان قایم رہے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستان کے آسمان کے صاف مطلع پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا ہے جو آدمی کی ہتھیلی کے برابر سہی لیکن وہی رفتہ رفتہ بڑھ کر یکایک طوفان کی طرح برس سکتا ہے اور سب کو سیلاب فنا میں بہالے جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] Ibid, p. 549

ان الفاظ سے کیننگ کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ جس طوفان کا اندیشہ اس نے ظاہر کیا تھا وہ اسی کے زمانے میں آیا اور ایسی شدومد کے ساتھ آیا کہ اس کی مثال ہندوستان کی برطانوی تاریخ میں نہیں ملتی۔

جب کیننگ کلکتہ پہنچا تو ڈلہوزی وہاں موجود تھا۔ اس سے اس نے ہندوستان کی عام حالت کے متعلق معلومات حاصل کیں اور مبادلہ خیالات کیا۔ ڈلہوزی نے اس کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کے امن وامان میں خلل ڈالنے والے کوئی اسباب نظر نہیں آتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈلہوزی نے آٹھ سال تک جس ملک پر بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کی اس کی حقیقی حالت سے وہ کس قدر بے خبر تھا۔ ڈلہوزی کا غالباً خیال تھا کہ برما کی لڑائی کے بعد کوئی فوجی قوت ملک میں ایسی موجود نہیں جس سے انگریزی حکومت کو کسی قسم کا خطرہ ہو سکے۔ لیکن اندر ہی اندر بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو بہت جلد بھڑک کر اپنی آگ کے شعلے سارے ملک میں پہنچا دینے والی تھیں اور خاص کر شمالی ہند میں۔ خود کلکتہ میں جہاں اودھ کے معزول حکمراں نواب واجد علی شاہ کا قیام تھا انگریزوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا کئے جا رہے تھے جن کی اہمیت کو انگریزی حکومت نے نظر انداز کیا۔ اودھ میں مسٹر جیکسن کو ڈلہوزی نے چیف کمشنر مقرر کیا تھا جس نے اہل اودھ کی تالیف قلب کرنے کے بجائے سختی کا برتاؤ کیا۔ ایک تو اہل اودھ کو اس کا صدمہ تھا کہ ان کا حکمراں جلاوطن کر دیا گیا اور دوسرے یہ کہ نئی حکومت کا طرز کار ایسا تھا کہ جس سے جائز طور پر شرفا اور امرا کے دلوں میں اور عام رعایا میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ موقع ملتے ہی ان جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ اصول بازگشت کے بموجب بعض نہایت وسیع ریاستوں کو ڈلہوزی نے برطانوی عملداری میں ملا لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے جو انعامی کمیشن مقرر کیا اس کی سفارشوں کے بموجب تقریباً ۲۰ ہزار زمینداروں کی زمینداریاں دکن میں ضبط کر لی گئی تھیں اور جن لوگوں نے جعلی سندیں بنا کر

جاگیروں پر قبضہ کر لیا تھا وہ اپنی زمینوں سے محروم کر دئے گئے تھے اور ان علاقوں کو رعیت داری نظام کے مطابق براہ راست انگریزی حکومت کے تحت کر لیا گیا تھا۔

ڈلہوزی نے دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کو دہلی سے الگ کرنے اور اس کے بعد اس کی اولاد کو شاہی خطاب سے محروم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن مجلس نظماء نے اس کی ان تجویزوں کو نامنظور کر دیا۔ مجلس نظماء نے اس موقع پر بڑی دور اندیشی اور عقلمندی کا ثبوت دیا۔ کیننگ کے ہندوستان آنے کے بعد مغل بادشاہ کے معاملے پر حکومت ہند نے پھر غور شروع کیا۔ چنانچہ کیننگ کے ایما پر حکومت ہند کی جانب سے بہادر شاہ کو ایک خط بھیجا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ لال قلعہ کی جس میں مغل بادشاہ کا قیام تھا انگریزی فوج کے لئے ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ بہادر شاہ کو جو خطاب والقاب حاصل ہیں وہ اس کے ذاتی ہیں۔ اس کے بعد اس کی اولاد کو انھیں استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ زینت محل نے جو بہادر شاہ کی چہیتی بیگم تھیں خاندانی عزت ووقار سے محروم ہونے کو بہت محسوس کیا۔ زینت محل کے اشارے پر انگریزوں کے خلاف شمالی ہند میں پروپگنڈا شروع ہو گیا۔ چونکہ حکومت ایران اس وقت انگریزی حکومت سے ہرات کے معاملہ پر برسرپیکار رہتی اس لئے بیگم کے ایلچی ایران تک پہنچے تاکہ حکومت ایران کو جنگ جاری رکھنے پر آمادہ کریں۔ بیگم کے ایلچی ہندوستان کے مختلف حصوں میں برابر اپنا کام کرتے رہے اور خاص کر مسلمانوں کو انھوں نے انگریزوں کے خلاف بھڑکانے میں کامیابی حاصل کی۔ پورے ملک میں اس قسم کی افواہیں پھیل گئیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کا راج بس ایک صدی رہے گا۔ جنگ پلاسی کے بعد سے اب چونکہ سو سال گزر چکے اس لئے اب پھر اسلامی حکومت کو استحکام نصیب ہوگا اس ضمن میں فارسی زبان کی متعدد نظمیں مشہور ہوئیں جن میں انگریزوں کے زوال کی پیشین گوئی کی گئی تھی اور جنھیں بعض بزرگوں سے منسوب کیا گیا تھا۔ یہ بھی عام طور پر مشہور تھا کہ لارڈ کیننگ کو خاص طور پر ملکہ وکٹوریہ نے اس لئے ہندوستان بھیجا ہے

کہ وہ اہل ہند کو عیسائی بنائے۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب باتوں کا مقصد اور منشا یہی تھا کہ انگریزی عملداری ختم ہونے والی ہے یا اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن انگریزی حکومت اس تمام عرصے میں ایسی بے خبر رہی کہ اس نے ان باتوں کا توڑ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

فوج کی بغاوت ۱۸۵۷ء

کمپنی کی بنگال والی فوج میں بہت بڑی تعداد اس سپاہ کی تھی جس کا تعلق سرزمین اودھ سے تھا۔ ان کے ساتھ یہ رعایت کی گئی تھی کہ اگر وہ اپنے افسر مجاز کا صداقت نامہ پیش کر دیتے تو ان کے وہ مقدمات جو گاؤں میں اراضی وغیرہ کے ضمن میں پیدا ہوتے تھے ایک خاص عدالت کے روبرو تصفیہ کے لئے پیش ہوا کرتے تھے۔ لیکن ڈلہوزی کے عہد میں الحاق اودھ کے بعد یہ رعایتیں اٹھالی گئیں جن سے سپاہ میں بے چینی پھیل گئی۔ ۱۸۵۶ء میں سرکار کمپنی نے یہ حکم نافذ کیا کہ آئندہ سے کسی ایسے شخص کو کمپنی کی فوج میں بھرتی نہیں کیا جائے گا جو اس بات پر حلف اٹھانے کو تیار نہ ہو کہ اگر ضرورت کے وقت اس کو سمندر پار بھیجنا منظور ہوا تو اس پر اس کو کسی قسم کا کوئی عذر نہ ہوگا۔ چونکہ شمالی ہند کے ہندوؤں میں صرف اعلیٰ ذات کے لوگ ہی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اس لئے ان ذاتوں میں کمپنی کی حکومت کے خلاف سخت بے چینی اور بددلی پھیل گئی۔ پھر اس کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے طبقے اور عوام میں مختلف وجوہ کی بنا پر انگریزی حکومت کے خلاف جو نفرت پھیلی ہوئی تھی اس کا اثر آہستہ آہستہ فوج پر بھی پڑنا شروع ہو گیا۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ کے قریب دمدم کی چھاؤنی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ولایت سے جو نئے کارتوس آئے ہیں ان کے کاغذ میں سور اور گائے کی چربی ملی ہوئی ہے۔ ان کارتوسوں کو بندوق میں رکھنے سے پہلے ان کا سرا دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ اگرچہ اس افواہ سے ڈر کر انگریز افسروں نے حکم دے دیا تھا کہ نئے کارتوس سپاہی نہ استعمال کریں لیکن یہ بہت بعد از وقت تھا۔ اس سے کوئی خاص فائدہ

نہیں ہوا۔ فوج کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ انگریز ان کا دھرم خراب کرنا اور ان کا ایمان بگاڑنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے بارک پور کی ۳۴ ویں دیسی پلٹن نے بغاوت کی اور پھر شمالی ہند کی دوسری چھاؤنیوں میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں سب سے بڑی چھاؤنی میرٹھ کی تھی۔ یہاں ۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء ہندوستانی سپاہ بگڑ گئی اور اپنے انگریز افسروں کو قتل کر ڈالا اور تمام ہتھیاروں اور سازوسامان پر قبضہ کرکے دہلی کی طرف دھاوا بول دیا۔ فوج کے ساتھ شہر اور گاؤں کے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ شہر دہلی میں جو فوج موجود تھی وہ بھی دھاوا بولنے والے باغیوں سے مل گئی اور لوٹ مار ہونے لگی۔ دہلی بنک لوٹ لیا گیا۔ دہلی کا اسلحہ خانہ جو صوبۂ شمال مغربی میں سب سے بڑا مخزن تھا لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ اس کو ایک انگریز افسر نے بارود سے اڑا دیا۔ چھاؤنی کی دو ہندوستانی رجمنٹیں انگریز افسروں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے بنگلوں کو جا کر آگ لگادی۔ دہلی کے لال قلعہ میں جو انگریز تھے انھیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد باغیوں نے بوڑھے بہادر شاہ کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ کو ایک چاندی کے تخت پر بٹھا کر اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ افسروں نے نذریں گزرانیں اور شاہی فرامین کا نفاذ ہونے لگا۔ اب بغاوت صوبۂ شمال مغربی کے ہر گوشہ میں پھیل چکی تھی اور دہلی اس کا مرکز تھا۔ بظاہر یہ بغاوت اگرچہ فوجیوں کی تھی لیکن عوام میں چونکہ پہلے سے بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس لئے باغیوں کو ہر طرف سے پوری امداد ملی اور ان سب لوگوں نے جو انگریزی حکومت سے ناخوش تھے بغاوت کو پھیلانے میں مدد دی۔

دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو جانے کی خبر لاہور پہنچی تو انگریز افسروں نے پنجاب کی مختلف چھاؤنیوں میں دیسی سپاہ سے ہتھیار رکھوا لئے اور اسلحہ خانے اور مخزنوں پر گورا فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ وادیٔ پشاور کی چار ہندوستانی رجمنٹوں نے بغاوت کی کوشش کی لیکن ان کو اچانک طور پر گھیر لیا گیا اور ہتھیار

رکھوائے گئے۔ ایک رجمنٹ نے پشاور کے قریب بغاوت کی جسکو کرنل نکلسن نے شکست دے کر منتشر کر دیا۔ جہلم اور سیالکوٹ کی دیسی سپاہ کا جبکہ وہ دہلی کی طرف کوچ کر رہی تھی کرنل نکلسن نے پیچھا کیا اور دہلی پہنچنے سے پہلے انھیں منتشر کر ڈالا۔ میرٹھ کی بغاوت کے ایک مہینے کے اندر شمالی ہند کی کوئی ایسی دیسی رجمنٹ نہیں تھی جس نے بغاوت نہ کی ہو۔ تمام باغی سپاہی دہلی کی طرف کھینچ کھینچ کر جمع ہونے لگے جو نئی حکومت کا صدر مقام قرار پا چکا تھا۔

لارڈ کیننگ کو معلوم تھا کہ دہلی نے ایک خاص مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے اس لئے جب تک کہ اس پر قبضہ نہ ہو اس وقت تک انگریزی فوج کو اپنے اوپر بھروسا نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۰ر جون ۱۸۵۷ء کو جنرل ولسن کی قیادت میں دہلی کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن یہ محاصرہ بے اثر رہا۔ بعض کا خیال ہے کہ خود انگریز فوج کی حیثیت ایسی چھاونی کی سی ہوگئی تھی جسکا باغیوں نے محاصرہ کر لیا ہو اس لئے کہ یہ شروع سے برابر مدافعت کر رہی تھی۔ توپوں اور سپاہ کی تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کوئی اقدامی کارروائی نہ کر سکی۔ انگریزی فوج کو پنجاب سے جو کمک بھیجی جا رہی تھی وہ بہت کم تھی اس کے مقابلے میں باغیوں کی تعداد میں ان نئی رجمنٹوں کی امداد سے برابر اضافہ ہو رہا تھا جو شمالی ہند کے مختلف حصوں سے دہلی چلی آ رہی تھیں۔ اسی دوران میں سر جان لارنس نے سکھوں میں یہ پروپگنڈا شروع کیا کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم لوگ اس وقت انگریزی حکومت کی مدد کرو گے تو تمھیں فوجی ملازمتوں میں خاص رعایتیں دی جائیں گی۔ سکھوں میں ایک یہ پرانی پیشین گوئی چلی آتی تھی کہ دہلی کا لال قلعہ ایک دن سکھوں کے قبضہ میں آ جائے گا۔ چنانچہ سکھ قوم کو یہ سمجھایا گیا کہ اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ سکھ بڑے مذہبی جوش کے ساتھ جوق جوق انگریزی فوج میں داخل ہونے لگے۔ ۱۴ر اگست کو بریگیڈیر نکلسن فوج کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ جب اس کو اطلاع ملی کہ باغیوں کی فوج مع توپ خانہ اس قلعہ شکن

توپ خانہ کو راستہ میں ختم کرنے کیلئے روانہ ہوئی ہے جو فیروز پور سے دہلی کی طرف آرہا تھا اور جس کا سلسلہ تیرہ میل کی لمبائی میں تھا تو وہ انکے مقابلے کیلئے روانہ ہوا اور راستہ ہی میں شکست دیکر منتشر کر دیا۔ قلعہ شکن توپ خانہ ۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچ گیا۔ ایک ہفتہ تک پچاس بڑی توپوں نے دہلی کی فصیلوں پر گولے برسائے اور انمیں رخنے ڈالدئے یہاں تک کہ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چار جگہ سے شہر پر دھاوا کر دیا گیا جس کی قیادت بریگیڈیر نکلسن کے ہاتھ میں تھی۔ دھاوے کے وقت اس کو ایک کاری زخم لگا جس سے وہ جان بر نہ ہو سکا۔ دشمن نے بڑی جانبازی سے مدافعت کی۔ چپہ چپہ زمین پر انھوں نے مقابلہ کیا۔ چھ دن تک اسی طرح شہر میں لڑائی کا بازار گرم رہا۔ آخر انگریزی فوجوں نے لال قلعہ پر بھی شہر پناہ کے پھاٹکوں کو سرنگ سے اڑا دینے کے بعد قبضہ کر لیا۔ بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی۔ کپتان ہڈسن نے بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے افراد کو مقبرہ میں جاکر گرفتار کیا اور لال قلعہ میں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن ہڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گرفتار کرکے گولی ماردی۔ کئی ماہ بعد بہادر شاہ پر مقدمہ چلایا گیا اور انکو اور انکی بیگم زینت النساء کو جلا وطن کرکے رنگون بھیجدیا گیا اور وہیں ۱۸۶۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا۔

دہلی کی فتح سے باغیوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ اب عام طور پر اہل ہند میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ انگریزوں کے اقبال کا ستارہ عروج پر ہے۔ انگریزوں کو سمندر کے راستے سے اس عرصے میں برابر کمک پہنچ رہی تھی برخلاف اس کے باغیوں کی فوج روز بروز کم اور منتشر ہوتی جارہی تھی۔ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں باغیوں کا قبضہ تھوڑے دنوں تک رہا لیکن بہت جلد ایک ایک کرکے ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اودھ بھی بغاوت کا بڑا زبردست مرکز تھا۔ لکھنؤ میں سر ہنری لارنس نے بڑی بہادری سے ریزیڈنسی میں انگریزوں کو پناہ دی تھی اور جو کچھ سامان جنگ مل سکا اس سے اپنی مدافعت کرتا رہا۔ باغیوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ

کرلیا اور سر ہنری لارنس ایک گولے کے پھٹنے سے مارا گیا۔ لیکن پھر بھی باغی ریزیڈنسی پر قبضہ نہ کرسکے۔ آؤٹ رم، ہیولاک اور سر کولن کیمپ بل کے پہنچنے پر باغیوں کو شکست ہوئی اور محصور انگریزوں کی جان بچی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اودھ میں امن و امان قایم ہوا۔ اودھ کے جن تعلقداروں نے کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لیا تھا ان کے خلاف فوج کشی کی گئی اور ان کی جاگیریں ضبط کرلی گئیں۔ سر کولن کیمپ بل کو اودھ میں امن و امان قایم کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ نیپال کے وزیر اعظم جنگ بہادر نے انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ گورکھا فوجوں کی مدد سے پورے اودھ پر انگریزوں نے پھر سے قبضہ کرلیا۔

کانپور میں باغیوں کی قیادت نانا صاحب نے کی جو آخری پیشوا باجی راؤ کا متبنیٰ تھا۔ ڈلہوزی نے باجی راؤ کی وفات پر پنشن بند کردی تھی۔ نانا صاحب کو باجی راؤ کا خزانہ اور ساز و سامان ورثہ میں ملا۔ وہ اپنی محرومی کی وجہ سے انگریزوں سے سخت ناراض تھا اور ان سے بدلہ لینے کی فکر میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ باغیوں کی مدد سے مرہٹہ راج کو پھر سے قایم کرے۔ اس نے انگریزوں کو محاصرہ میں لے لیا۔ سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد انگریزوں نے ہتیار ڈال دیئے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ انگریزوں نے جب اطاعت قبول کرلی تو انھیں دریائے گنگا کے راستے سے کشتیوں پر سوار کرکے الٰہ آباد بھیجنے کا وعدہ کیا گیا۔ جب وہ کشتیوں پر سوار ہوگئے تو کنارے پر سے نانا صاحب کے حکم سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ نانا صاحب نے یکم جولائی ۱۸۵۷ء اپنے پیشوا ہونے کا اعلان کیا اور اس تقریب کو بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ آخر کرنل ہیولاک نے کانپور پر قبضہ کرلیا۔ نانا صاحب نے بھاگ کر اودھ میں اور پھر نیپال میں پناہ لی۔ انگریزوں نے ہر چند اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا اور اس نے اپنی باقی زندگی جلاوطنی میں گزار دی۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے بڑی بہادری سے انگریزی فوجوں

کا مقابلہ کیا۔ سر ہیو روز نے اس کے اور نانا صاحب کے سپہ سالار تانتیا ٹوپی کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی۔ سندھیا کی سب فوج بغاوت میں رانی کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔ رانی نے گوالیار کے قلعہ میں انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ مردانہ لباس پہنے مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی۔ تانتیا ٹوپی کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ کالپی جھانسی اور بندیلکھنڈ کے دوسرے مقاموں پر جہاں بغاوت کے مرکز قایم ہو گئے تھے سر ہیو روز نے قبضہ کر لیا اور انگریزی عملداری کو از سر نو قایم کیا۔

شمالی ہند میں دوآبہ اور روہیلکھنڈ میں باغیوں کا بڑا زور تھا۔ فرخ آباد شاہ جہاں پور اور بریلی وغیرہ پر ایک ایک کر کے انگریزی قبضہ ہو گیا۔ باغیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جو باقی رہ گئیں وہ بھی بہت جلد منتشر کر دی گئیں۔ غدر کو فرو کرنے میں انگریزی فوجوں نے اکثر مقامات پر وحشیانہ مظالم ڈھائے اور غیظ و غضب کا اظہار کیا جنہیں انگریز مورخ یہ کہہ کر حق بجانب ٹھہراتے ہیں کہ ان حالات میں یہی طرز عمل مناسب تھا۔

شورش کو دبانے میں تقریباً دو سال لگے۔ بغاوت زیادہ تر شمالی ہند اور وسط ہند تک محدود رہی۔ دکن میں سر سالار جنگ نے غدر کے ہنگاموں میں انگریزی حکومت کے ساتھ معاہدوں کے بموجب دوستی قایم رکھی۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت بڑی پریشانی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ گورنر بمبئی نے ریزیڈنٹ حیدرآباد کو اس مضمون کا تار دیا تھا کہ "اگر حیدرآباد پھر گیا تو پھر ہمارا خاتمہ ہے" لیکن حکومت حیدرآباد نے اس پر آشوب زمانے میں نہ صرف انگریزی حکومت کی حمایت کی بلکہ اپنی عملداری میں کسی قسم کی باغیانہ تحریک کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ بلدہ حیدرآباد میں باغیوں نے فوج کو ملانے کی کوشش کی اور ریزیڈنسی پر حملہ بول دیا لیکن ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اسی طرح اورنگ آباد کے کنٹنجنٹ فوج میں بھی بعض سر پھرے سپاہیوں نے بغاوت کی کوشش کی لیکن ان کی شورش فوراً دبا دی گئی۔ سر سالار جنگ نے غدر کے موقع پر جو خدمات

انجام دیں اس کے لئے انگریز قوم ان کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی کم تھا[1] گوالیار کے وزیر اعظم سر ڈنکر راؤ نے مہاراجہ گوالیار کو جو کم عمر تھا انگریزوں کے ساتھ وفاداری پر استوار رکھا۔ سندھیا کے وفادار رہنے کا اثر یہ ہوا کہ دوسری مرہٹہ ریاستوں نے بھی غدر میں حصہ نہیں لیا ورنہ انگریزوں کی پریشانیاں اور بڑھ جاتیں[2] مہاراجہ ہلکر، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ کولھاپور اور دوسرے مرہٹہ حکمران اس موقع پر وفادار رہے۔ راجپوتانہ کی ریاستیں بھی شورش سے الگ رہیں سندھ اور افغانستان، بنگال اور نیپال اور جنوبی ہند کے حصوں میں غدر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چونکہ شورش زیادہ تر صوبہ شمال مغربی تک محدود تھی اس لئے انگریزوں کو اس امر پر قابو پانے میں سہولت ہوئی۔

سرکار انگریزی نے ان سب لوگوں کو انعام واکرام سے سرفراز کیا جنھوں نے شورش کے زمانے میں انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنے گھروں میں چھپاکر ان کی جانیں بچائی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے شورش میں حصہ لیا تھا یا کسی قسم کی امداد کی تھی بہت سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ فوجی عدالتوں کے حکم سے بعض وقت بالکل معمولی شبہہ کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ آدمیوں کو سنگین سزائیں دی گئیں۔ اگرچہ خود کیننگ اور سر جان لارنس گورنر پنجاب کی یہ رائے تھی کہ انگریزوں کو انتقام کے جوش میں بالکل اندھا نہ ہو جانا چاہئے اور جہاں تک ہو سکے ظلم اور زیادتی سے بچنا چاہئے لیکن فوجی سرداروں کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ چنانچہ نکلسن کا خیال تھا کہ اگر انتقام لینے کے لئے اور آئندہ کے لئے اہل ہند کو نصیحت کرنے کے واسطے ان لوگوں کو جنھوں نے شورش میں حصہ لیا ہے زندہ جلا دیں یا ان کے جسموں کی کھالیں کھنچوا لیں یا ان کے جسموں میں لوہے کی کیلیں ٹھونک کر موت کے گھاٹ اتار دیں تو بالکل حق بجانب ہوگا[3] کیننگ نے فوجی عدالتوں

---

[1] Holmes, History of the Indian Mutiny

[2] McLeod Innes. The Sepoy Revolt, p. 301.

[3] Kaye, History of the Indian Mutiny, Vol II. p. 301.

کی رہنمائی کے لئے قاعدے اور ضابطے نافذ کرائے تھے تاکہ بغیر کافی تحقیق کئے ہوئے اور ثبوت فراہم کئے ہوئے کسی کو سزا نہ دی جائے لیکن ان قاعدوں کی پروا نہیں کی گئی طنز اور تعریض کے طور پر فوجی افسر کیننگ کو "کلیمنسی کیننگ" (رحم کا پتلا کیننگ) کہا کرتے تھے۔ حالانکہ کیننگ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اہل ہند کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور تلخی نہ بڑھے تاکہ آئندہ ان پر حکمرانی میں سہولت ہو اور پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ باغیوں کے سامنے کوئی متحدہ سیاسی مقصد نہ تھا اور ان کے پاس قابل اور بلند پایہ قائدوں کی کمی تھی۔ فوج کی ایک جماعت دہلی کی مغل شہنشاہی کے احیا کا خواب دیکھ رہی تھی اور دوسری جماعت مرہٹہ حکومت قایم کرنا چاہتی تھی۔ خود ہندوستانی فوج کا زیادہ حصہ جس میں سکھوں کی فوجیں اور بمبئی اور مدراس کی فوجیں شامل ہیں بغاوت میں شریک نہیں ہوا بلکہ ان فوجوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا اور اپنے اہل ملک کو شکست دینے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ پھر انگریزوں کی پشت پناہی پر وہ سب فنی اور سائنٹفک قوتیں تھیں جو مغربی تمدن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دنیا کے سمندروں پر انگریزوں کا غلبہ مسلم تھا۔ چنانچہ جب ضرورت ہوئی تو انگلستان سے انگریزی فوج کمک کے لئے ہندوستان پہنچ گئی۔ باغیوں کو کہیں سے کوئی کمک نہیں پہنچی۔ ان کی قوت روز بروز کمزور ہوتی گئی والی افغانستان اور شاہ ایران نے اس موقع پر اہل ہند کی کوئی مدد نہ کی۔ اور وہ مدد کیوں کرتے۔ جب ان پر مصیبتیں آئیں تو اہل ہند نے ان کی کونسی مدد کی تھی؟ غرضکہ غدر میں نہ تو ہندوستان کے سب لوگوں نے دل سے شرکت کی اور نہ باہر سے انھیں کوئی مدد مل سکی۔ زراعت پیشہ، تجارت پیشہ اور حرفت پیشہ طبقے زیادہ تر الگ تھلگ رہے۔ اگرچہ ایران کی حکومت اس وقت انگریزوں سے برسر پیکار تھی اور ایرانی سفیر بات چیت کے لئے بہادر شاہ کے پاس دہلی پہنچے بھی تھے لیکن خود ایرانی حکومت کی حالت ایسی تھی کہ وہ کوئی موثر امداد نہیں بھیج سکتی تھی نیز پرسی ڈنسیول

کی فوجوں میں سے صرف بنگال پریسی ڈنسی کی فوج نے اطاعت سے انکار کیا تھا۔ باقی دیسی فوج کو انگریز افسروں نے خود ان کے ہم وطنوں کی سرکوبی کے لئے استعمال کیا۔

اگرچہ شورش کو فرو کرنے میں انگریزی حکومت کو کامیابی ہوئی لیکن اسکے نفسیاتی اثرات بہت گہرے تھے جن کو فوراً دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ اہل ہند کے حساس طبیعتوں کا ردعمل تھا اس مغربی نظام فکر و تمدن کے خلاف جو آہستہ آہستہ پورے ملک پر چھا رہا تھا اور جس کی وجہ سے قدیم تمدن کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اگرچہ عسکری کامیابی انگریزوں کو حاصل ہوگئی تھی لیکن اہل ہند کے دلوں میں جو نفرت اور تلخی پیدا ہوگئی تھی وہ اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک طرف اپنی بے بسی کا احساس اور دوسری طرف یہ احساس کہ چاہے کچھ ہو وہ مغربی تمدن کے غلبے کو تسلیم نہیں کرینگے اہل ہند کے لئے سوہان روح کا باعث بنا رہا۔ عوام کی حالت ہندوستان میں ہمیشہ سے تماشائیوں کی سی رہی ہے۔ وہ اپنی مصیبتوں میں ایسے مبتلا رہے کہ انھیں اس کی پروا نہیں تھی کہ ایک حکمران کی جگہ دوسرا حکمران آیا۔ اگر ملک میں سیاسی انقلاب ہوگیا تو ہوا کرے۔ وہ قوت لایموت کی فکر اور اپنی زندگی کی دوسری ضرورتیں حاصل کرنے میں ایسے مشغول تھے کہ سیاست ہمیشہ ان کے خیال سے علٰحدہ رہی۔ لیکن باوجود اس کے ۱۸۵۷ء کے غدر کا عام طور پر اہل ہند کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ بہت سوں کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ ان کا مذہب خطرہ میں ہے یا یہ کہ ان سبھوں کو عیسائی بنا لیا جائیگا۔ اس زمانہ میں مذہب تہذیب کا دوسرا نام تھا ہندوؤں میں آریہ سماج کی تحریک اور مسلمانوں میں وہابی تحریک مغربی تہذیب و تمدن سے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی زبردست کوششیں تھیں ان تحریکوں نے ماضی پرستی کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا۔ ان تحریکوں نے بعد میں مذہبی خیالات کا تعارف ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس طور پر کرایا جو ایک انقلابی حیثیت رکھتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد انگلستان میں یہ بات شدت سے محسوس کی جانے لگی

کہ ہندوستان میں اب تک برطانوی حکومت جس نہج پر چلائی گئی ہے اس میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اقتدار اپنے طرز حکومت کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کسی قسم کی بھی تبدیلی کے خلاف تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مسٹر جان اسکورٹ مل نے مجلس نظما، کی ہدایت کے بموجب ایک یادداشت پارلیمنٹ میں پیش کی جس میں اس الزام کی تردید کی گئی کہ غدر کو کمپنی کی بدانتظامی سے کوئی تعلق تھا۔ اس امر پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان کے برطانوی نظم و نسق میں بنیادی تبدیلی ایسے وقت کی جارہی ہے جب کہ حالات پوری طرح سے قابو میں نہیں آئے ہیں۔ یادداشت کے الفاظ یہ ہیں۔

"درخواست کنندگان (یعنی ارکان مجلس نظما) ان الزاموں کو جو ان پر لگائے گئے ہیں کسی دوسرے کے سر نہیں تھوپنا چاہتے۔ ہندوستان پر جس طرح سے حکومت کی گئی ہے اس کی پوری ذمہ داری وہ اپنے اوپر لینے کو تیار ہیں۔ وہ اس ذمہ داری کو باعث ذلت نہیں بلکہ موجب فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔ انھیں اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ ان کے مشورے اور ان کے اقداموں کی بدولت ہندوستان کے مسئلوں کو طے کرنے اور چلانے میں بڑی مدد ملی۔ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے متعلق جتنی تحقیق کی جائے گی اور جتنے زیادہ معاملے تاریکی سے روشنی میں آئیں گے اتنی ہی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ کمپنی نے لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کچھ کیا اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ خاص طور پر گزشتہ پیڑھی اور موجودہ پشت میں کمپنی کی حکومت ترقی کرتی رہی ہے۔ اتنی ترقی پذیر دنیا کی کوئی دوسری حکومت نہیں رہی۔ اب جبکہ پارلیمنٹ ہندوستان کے انتظاموں میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے تو اس وقت بھی مختلف

محکموں میں ترقی جاری ہے جیسی کہ پہلے کبھی نہ تھی! انھیں اس امر کا یقین ہے کہ ہندوستان میں جو کچھ بھی ترقیاں آئندہ وجود میں آئیں گی ان کے بیج کمپنی کے عہد حکومت میں بوئے جا چکے ہیں۔ آئندہ جو کچھ تعمیر ہوگی وہ ان بنیادوں ہی پر ہوگی جو کمپنی کے عہد میں اس کی ہدایتوں کے بموجب قایم کی گئی ہیں۔[1]

لیکن اس یادداشت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لارڈ پامرسٹن نے جب قدامت پسند حکومت کی طرف سے ہندوستان کا نظم و نسق تاج کو منتقل کرنے کی تجویز کی تو مسٹر ہیرنگ نے اس پر ترمیم پیش کی اور لارڈ ایلن برا نے مخالفت کی لیکن تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی اور اسی کے مطابق قانون بنایا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بقول مارشمین "ایسٹ انڈیا کمپنی کی تخلیق تاج نے ڈھائی سو سال پہلے اس غرض سے کی تھی کہ برطانوی تجارت کو مشرقی ممالک میں وسعت دے۔ لیکن اس کمپنی نے اپنی کارگزاری ختم کرتے وقت تاج کو ایسی سلطنت منتقل کی جو روما کی سلطنت سے بھی زیادہ شاندار تھی۔"[2]

اگست ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا گیا اس لئے کہ وہ اپنی غایت پوری کر چکی تھی۔ یہ بات عرصے سے بے شک محسوس کی جا رہی تھی کہ اتنی بڑی سلطنت کی باگ ڈور جیسی کہ ہندوستان میں انگریزوں نے قایم کر لی تھی ایک تجارتی کمپنی کے ہاتھ میں رہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کی بڑی شورش پیش نہ آتی تو بھی غالباً ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور حکمران کے ہندوستان میں زیادہ عرصہ تک نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

۱۸۵۸ء کے قانون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام ذمہ داریاں تاج برطانیہ کو منتقل کر دیں اور مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) اور اس کے صدر کی جگہ وزیر ہند اور اس کی کونسل پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کے نظم و نسق کے

[1] G D The History of the Indian Revolt (Appendix)

[2] Marshman, p. 521

ذمہ دار قرار پائے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں تاج برطانیہ کے تحت براہ راست اچھی حکومت قایم کرنے کے وسیلے اختیار کیے جائیں اسواسطے اس کو "بیٹر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ قرار دیا گیا۔ مجلس نظما، اور بورڈ آف کنٹرول کے جملہ اختیارات سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (وزیر ہند) کو منتقل کر دیے گئے۔ وزیر ہند کی کونسل پندرہ ارکان پر مشتمل ہوگی جن میں سے ۸ براہ راست تاج کی جانب سے نامزد ہوں گے اور ۷ کا انتخاب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناظر کریں گے۔[1] ان نامزد کردہ اور منتخب شدہ ارکان میں سے بیشتر وہ اشخاص ہونے چاہئیں جو کم سے کم دس سال ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں رہ چکے ہوں یا کم سے کم دس سال تک ہندوستان میں رہ چکے ہوں اور جنہیں ہندوستان سے واپس ہوئے دس سال سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔ وزیر ہند کی کونسل کے ارکان کی رکنیت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ ان کا رویہ قابل اطمینان رہے گا۔ لیکن اگر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ان میں سے کسی کے متعلق علٰحدگی کا فیصلہ ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ وزیر ہند کی کونسل کی رکنیت سے الگ کر دیے جائیں گے۔ وزیر ہند انڈیا کونسل کا صدر ہوگا اور کونسل کی اکثریت سے اختلاف کی صورت میں وہ اپنا فیصلہ ناطق کرنے کا مجاز ہوگا سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق اجرائی تمسکات، ملکیت کی فروخت یا رہن، رقموں کی نشان دہی، معاہدوں یا تنخواہوں میں تغیر یا رخصت کے قاعدوں میں تبدیلی سے ہو۔ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ بغیر کونسل میں پیش کئے ہوئے اہم سیاسی نوعیت کے احکام براہ راست ہندوستان بھیج سکے خاص کر ایسے احکام جن کا تعلق صلح و جنگ یا دیسی والیان ملک کے متعلق کوئی خاص پالیسی اختیار کرنے سے ہو۔ ہندوستان سے جو خفیہ مراسلے وصول ہوں گے وہ بغیر وزیر ہند کی اجازت کے انڈیا کونسل

[1] Keith, A. Constitutional History of India, p. 165

کے سامنے پیش نہیں ہو سکتے۔
حکومت ہند کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر تاج یا وزیر ہند کی جانب سے ہوا کرے گا۔ لفٹنٹ گورنروں کا تقرر گورنر جنرل کرے گا جس کی منظوری تاج سے حاصل کرنا ضروری ہوگی۔ ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کی رعایا میں سے ہر ایک کو یہ حق ہوگا کہ سول سروس کے امتحان کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکے جس کی بابت بہت جلد انتظامات وزیر ہند بہ اجلاس کونسل سول سروس کے کمشنروں کی مدد سے انجام دے گا۔ حکومت ہند کی آمدنی کو خرچ کرنے کی ذمہ داری وزیر ہند پر ہوگی۔ اس آمدنی میں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اصل حصہ داروں کو منافع دیا جائے گا اور کمپنی کے قرضے کی ادائی بھی اسی میں سے کی جائے گی۔ ان حسابات کی تنقیح ایک خاص ناظر حسابات کے ذمہ ہوگی۔ قانونی اغراض کے لئے وزیر ہند پر وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں عاید ہونگی جو ایسٹ انڈیا کمپنی پر عاید تھیں۔ کمپنی کی فوجیں اور بحریہ جو ہندوستان میں ہے تاج کی ملازمت میں منسلک کرلیا جائے گا۔ ان فوجی ملازموں کی تنخواہوں اور ان کے حقوق اور رعایتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔
گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے رکن قانونی اور گورنروں اور ایڈوکیٹ جنرل کا تقرر براہ راست تاج کرے گا۔ گورنروں کی کونسل کے باقی ارکان کا انتخاب وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کی جانب سے کیا جائے گا اور ایسا کرنے میں کونسل کی اکثریت کے فیصلے کے مطابق عمل ہوگا۔ وزیر ہند اگر ہندوستان میں کسی والئی ملک کے خلاف اعلان جنگ کا حکم بھیجے تو ضرور ہے کہ تین مہینے کے اندر اس کی اطلاع پارلیمنٹ کو کردی جائے۔ ہندوستانی مقبوضات کے باہر اگر ہندوستانی فوج بھیجی جائے گی تو اس کے اخراجات کا بار حکومت ہند کے خزانہ پر نہ ہوگا سوائے اس حالت کے کہ ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کے لئے فوج کو سرحد پار بھیجنا ضروری ہوگیا ہو یا اسی طرح کی اور کوئی غیر معمولی اور اچانک صورت پیش آجائے۔ وزیر ہند کا فرض ہوگا کہ ہر سال ہندوستان

کی مادی اور اخلاقی ترقی کی بابت پارلیمنٹ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔

۱۸۵۸ء کا قانون دستور جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک نشان منزل کا حکم رکھتا ہے جس کی رو سے اس وسیع ملک کے انتظام اور اسکی سرحدوں کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں چلی گئی آمد ورفت کے وسیلوں کی سہولت اور ریل اور تار کے رواج سے ہندوستان انگلستان سے اتنا دور نہیں رہا جتنا کہ سو سال پہلے تھا۔ اب کوئی وجہ نہ تھی کہ تاج برطانیہ اس ملک کے نظم ونسق کی باگ ڈور لیتے ہوئے ہچکچاتا ہندوستان انگریز قوم کے لئے بطور امانت تھا جس سے انگریز قوم کی آئندہ نسلیں فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اس لئے ضرور تھا کہ اس امانت کو اپنے قبضہ وتصرف سے باہر نہ جانے دیا جائے جیسا کہ غدر کے وقت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

سولھواں باب

تاج برطانیہ کی ابتدائی حکومت

ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلان شائع کیا جس کا ترجمہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں شائع کیا گیا اس اعلان میں بتایا گیا تھا کہ رعایا کے مذہبی معاملوں میں حکومت مداخلت نہیں کرے گی اور نہ مسیحی عقیدوں کو رعایا سے منوایا جائے گا۔ مذہبی شعائر یا اعتقاد کی بنا پر نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے گی اور نہ کسی کو ستایا جائے گا بلکہ قانون سب کا ایک سا محافظ ہوگا۔ ہر شخص جو اہلیت رکھتا ہوگا اس کو بلا تخصیص نسل و مذہب حکومت ہند کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ تک پہنچنے کا موقع حاصل رہے گا۔ تمام معاہدات اور تمام مناصب اور تمام حقوق و عملدرآمد جنھیں کمپنی کی حکومت تسلیم کرتی تھی وہ بدستور قائم و برقرار رہیں گے۔ اس اعلان کے ذریعے ان باغیوں کے قصور معاف کر دئے گئے جنھوں نے غدر میں دوسروں کے بہکانے سے حصہ لیا تھا اور جو گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں چھپے چھپے پھرتے تھے۔ والیان ملک

کو یقین دلایا گیا کہ آیندہ ان کی ریاستیں ضبط نہیں کی جائیں گی اور انھیں اپنے رسوم اور روایتوں کے مطابق متبنٰی کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ یہ بھی اطمینان دلایا گیا کہ تاج برطانیہ اپنے ملکی مقبوضات میں کسی اضافہ کا خواہاں نہیں ہے۔ جس طرح وہ اس بات کا روادار نہیں ہے کہ برطانوی ملک یا حقوق میں دست اندازی کی جائے اسی طرح وہ اس کو بھی جائز نہیں سمجھتا کہ کسی دوسرے کے ملک یا حقوق میں مداخلت کی جائے۔ حکومت برطانیہ اپنے حقوق کی طرح دیسی والیان ملک کے وقار اور مرتبہ کا احترام کرے گی۔[1]

یکم نومبر ۱۸۵۸ء لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ایک بڑا دربار کیا جس میں امن و امان قایم ہونے اور عام معافی کا اعلان کیا گیا تاکہ رعایا کے دلوں میں اطمینان پیدا ہو اور ہر شخص بلا کسی خوف اور خدشہ کے اپنے اپنے کام میں لگ جائے۔ کیننگ نے بڑی فراخ دلی سے اپنی حکمت عملی کو نافذ کیا جس کی وجہ سے امن و سکون کے قایم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان ہندوستانیوں کے حق کا منشور اعظم کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ہر خیال کے ہندوستانیوں نے اپنی آزادی اور حقوق کی بنیاد قرار دیا۔ اب شورش فرو ہو چکی تھی۔ برطانوی غلبہ اور تسلط ہندوستان کے ہر گوشے میں مانا جا چکا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ انگریز قوم ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرتے اور اس ملک کے نظم و نسق میں جدید حالات کے مطابق اصلاح کرنے کی جانب قدم اٹھاتی۔

۱۸۵۷ء کی بڑی شورش کے بعد ہندوستان میں ایسے سیاسی حالات پیدا ہوئے جن کا اقتضا یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہر قسم کی انتشاری قوتوں کو دبائے اور مرکزیت کو زیادہ موثر بنائے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کی رو سے حکومت ہند کی مرکزیت مکمل کر دی گئی اور لارڈ کیننگ کو جو پہلے وائسرائے نامزد کئے گئے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے۔ لیکن شورش عظیم نے انگریزی قوم کو یہ سبق دیا کہ اہل ہند پر حکومت کرنے کے لئے ان کی رائے عامہ سے

---

[1] M Mukherjee, Indian Constitutional Documents, Vol. I, p. 431.

حکومت کو واقف ہونا چاہئے۔ ایک اجنبی قوم کی حکومت کو ضرورت اسکی تھی کہ اس کا تعلق رعایا کے ساتھ زیادہ واضح، گہرا اور پائیدار ہو ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں پھر ۱۸۵۷ء کی سی شورش نہ ہو جائے۔ دیسی والیان ملک کو یہ آسانی تھی کہ ان کی حکومت کوئی غیر ملکی حکومت نہ تھی۔ اس لئے اس کا تعلق عوام کے ساتھ قایم تھا۔ غدر سے انگریزوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان جو بیگانگی ہے اس کے باعث ان کی نیت پر بہت جلد شبہ کیا جا سکتا تھا۔ خاص کر قوانین بنانے کا کام اس نوعیت کا ہے کہ جن لوگوں کے لئے حکومت قانون بنانا چاہتی ہے ان کے منشا، اور خواہشوں کی اسے اطلاع ہونی چاہئے۔ حکومت ہند یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل کر سکتی تھی جب کہ قوانین بنانے کے لئے غیر سرکاری عنصر کو اپنے ساتھ شریک کرے جو جمہور کی نمایندگی کر سکے۔ یہ بات اب مناسب نہیں سمجھی گئی کہ قانون بنانے کا سارا کام حسب سابق گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں سر چارلس وڈ نے ایک قانونی مسودہ پیش کیا تاکہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کے نفاذ کے بعد حکومت ہند میں جو خرابیاں رونما ہوئی تھیں انھیں دور کیا جائے اور قوانین بنانے میں رائے عامہ کے منشا کو معلوم کرنے کی تدبیر نکالی جائے۔ اس کو انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء (قانون مجالس ہند ۱۸۶۱ء) کہتے ہیں۔

قانون مجالس ہند ۱۸۶۱ء اس قانون کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل کے معمولی ارکان کی تعداد پانچ ہو گئی جن میں سے تین ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں تاج کی ملازمت میں کم از کم دس سال سے ہوں۔ ارکان کونسل میں مختلف محکمے (پورٹ فولیوز) تقسیم کرنے کے متعلق بھی قاعدے بنائے گئے۔ قانون بنانے کے لئے گورنر جنرل کی کونسل میں مزید بارہ ارکان کو گورنر جنرل نامزد کر سکے گا۔ ان میں سے نصف کا غیر سرکاری ہونا ضروری ہے۔ ان کی میعاد عہدہ دو سال ہوگی۔ اس مجلس وضع قانون میں سوائے قانون بنانے کے اور دوسرے انتظامی مسائل پیش نہیں کئے جا سکیں گے۔

یہ مجلس ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مروجہ قوانین میں تبدیلی، ترمیم یا تنسیخ کرنے کی مجاز ہوگی اور اس کو جدید قوانین بنانے کا بھی اختیار ہوگا بشرطیکہ یہ نئے قوانین برطانیہ عظمیٰ کے دستوریا غیر تحریری آئین کے کسی طرح خلاف نہ ہوں۔ اس میں کوئی ایسی تجویز جس کا تعلق قرضہ یا مالیات عامہ اور بحری اور بری افواج سے ہو اس وقت تک پیش نہ ہو سکے گی جب تک کہ گورنر جنرل اس کے پیش کرنے کی اجازت نہ دیدے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ مجلس کی منظور کی ہوئی تجویز کو منظور کرے یا رد کردے یا ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کا اس کی نسبت منشا معلوم کرنے کی غرض سے ملتوی کردے۔ گورنر جنرل کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ضرورت کے وقت چھ مہینے کے لئے خصوصی احکام (آرڈیننس) نافذ کردے[1]۔ یہ اختیار گورنر جنرل کو اس قانون میں خاص طور پر دیا گیا اس واسطے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے وقت اس کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ حکومت مدراس و بمبئی اپنی مقامی ضرورتوں کے مطابق قاعدے اور ضابطے بنا سکیں گی۔ اگر ان قاعدوں اور ضابطوں کا تعلق قرضۂ عامہ، زر مروجہ، ڈاک اور تار، تعزیرات کی تبدیلی، مذہبی امور، فوجی اور بحری مسائل یا امور خارجی سے ہوگا تو بغیر گورنر جنرل کی منظوری کے ان کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ بمبئی اور مدراس کے گورنروں کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنی کونسل میں چار سے لیکر آٹھ ارکان تک نامزد کریں جن میں سے نصف کا غیر سرکاری ہونا ضروری ہے۔ وضع قانون کی ان صوبجاتی مجالس میں مقامی حالات کے مدنظر جو قواعد وضوابط منظور کئے جائیں گے وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتے جب تک کہ گورنر جنرل کی منظوری ان کی بابت نہ حاصل کرلی جائے۔

اگرچہ وضع قانون کی مجلس میں جو ۱۸۶۱ء کے قانون دستور کی رو سے قائم ہوئی صرف وہی قوانین منظور ہو سکتے تھے جنھیں حکومت نافذ کرنا چاہتی تھی لیکن اس مجلس کے وجود میں آنے سے اتنا ضرور ہوا کہ غیر سرکاری ارکان کا نقطۂ نظر حکومت کے سامنے پیش ہونے لگا۔ مجلس کو ملکی نظم ونسق کے متعلق

[1] Keith, A Constitutional History of India, p 174.

تجویزیں پیش کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ جو قوانین وضع قانون کی مجلس منظور کرے ان کے نافذ کرنے کا حق عدالتوں کو دیا گیا۔ غیر سرکاری ارکان کو نامزد کرنے کا حق تمام تر گورنر جنرل کو حاصل تھا جو ایسے لوگوں کو چنتا تھا جن کی وفاداری مسلم رہی ہو۔ چنانچہ پہلی مجلس میں گوالیار کے سابق وزیر سر دنکر راؤ کو ہندوستانی نمایندے کے طور پر نامزد کیا گیا جس نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا اور نوعمر مہاراجہ کو باغیوں کے اثرات سے محفوظ رکھا تھا۔ لیکن غدر کے بعد مہاراجہ نے سر ڈنکر راؤ کو وزارت سے الگ کر دیا۔ اس پر کیننگ نے اس کی قدر افزائی کے لئے اس کو کونسل کی رکنیت پر نامزد کیا۔[1]

قانون بابت ہائیکورٹس سنہ ۱۸۶۱ء

اس قانون کے منظور ہونے سے پہلے قوانین کی تدوین کا کام تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۸۵۹ء میں اور تعزیرات ہند سنہ ۱۸۶۰ء میں نافذ کئے جا چکے تھے۔ ضرورت اس کی تھی کہ قوانین کے نافذ کرنے میں یکسانی اور کارکردگی بڑھائی جائے۔ چنانچہ انڈین ہائی کورٹس ایکٹ کے ذریعہ اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قانون کی وجہ سے کلکتہ مدراس اور بمبئی میں ہائیکورٹ قایم کئے گئے۔ قدیم عدالت ہائے عالیہ عدالت ہائے صدر دیوانی اور عدالت فوجداری کو انہیں ہائی کورٹوں میں ملا دیا گیا۔ جدید ہائیکورٹس ایک میر مجلس (چیف جسٹس) اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ ججوں پر مشتمل ہوں گے۔ ان پندرہ ججوں میں سے لازمی طور پر ⅓ تعداد بیرسٹروں پر مشتمل ہوگی اور ⅓ اسول سروس کے ارکان ہوں گے۔[2] ہائیکورٹ کے ہر جج کیلئے ضروری ہوگا کہ اس کو کم سے کم دس سال کا وکالت کا تجربہ حاصل ہو۔ جج ہونے سے پہلے ۵ سال تک کسی عدالتی عہدہ پر رہ چکا ہو۔ جج اپنے عہدہ پر اس وقت تک کارگزار رہیں گے جب تک کہ ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کی مرضی ہوگی۔ ہائیکورٹوں میں ماتحت عدالتوں سے

---

[1] Thurlow, The Company and the Crown, p. 242.

[2] Keith, A Constitutional History of India, p. 204,

مرافعے ہوا کریں گے۔ انھیں یہ حق ہوگا کہ ماتحت عدالتوں کی کارروائیاں ایک نہج پر رکھنے کے لئے قواعد وضوابط نافذ کریں نیز مقدموں کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں منتقل کر سکیں۔ ماتحت عدالتوں کی عام نگرانی اور ان کے تقررات وغیرہ کا انتظام بھی ہائیکورٹوں کے ذمہ ہوگا۔ ۱۸۶۶ء میں الہ آباد میں بھی ایک ہائیکورٹ قائم کردیا گیا جس کا حلقۂ سماعت صوبۂ شمال مغربی پر پھیلا ہوا تھا۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی صوابدید پر کسی علاقہ کو جو کسی خاص حلقۂ سماعت میں شامل ہو کسی دوسرے حلقۂ سماعت میں منتقل کر دے۔[۱]

حکومت ہند کی مالی حالت

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کی وجہ سے حکومت ہند کا قرضہ بڑھ کر پچاس کروڑ کے قریب ہو گیا تھا اور فوجی خرچ کے اضافہ کی وجہ سے سالانہ اخراجات پچاس کروڑ ہو گئے تھے۔ میزانیہ میں کئی سال سے خسارہ آرہا تھا۔ حکومت ہند کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ اس خسارہ کو کس طرح سے دور کیا جائے۔ چنانچہ سر چارلس وڈ نے جو اس وقت وزیر ہند تھے انگلستان سے ایک ماہر مالیات سر جیمس ولسن کو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے منتخب کیا۔ سر جیمس ولسن ہندوستان آنے سے قبل حکومت انگلستان کے محکمۂ مالیات کے سکرٹری رہ چکے تھے اور مالی معاملوں پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ سر جیمس ولسن نے فوج کے اخراجات میں تخفیف کی اور سالانہ آمدنی پر محصول (انکم ٹیکس) لگایا۔ ہر قسم کے لائسنس جو حکومت جاری کرتی ہے ان پر بھی محصول لگایا گیا۔ نو مہینے کے بعد سر جیمس ولسن کے انتقال پر مسٹر سیموئل لینگ اس کی جگہ رکن مالیات مقرر ہوئے۔ اس لئے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی کو جاری رکھا۔ رائج الوقت سکے میں ترمیم کی گئی۔ کاغذی نوٹ جاری کئے گئے۔ تمباکو اور نمک کے محصولوں سے آمدنی کی کمی پوری کی گئی دس فیصدی محصول درآمد بھی لگایا گیا۔ غرضکہ تین سال کے عرصہ میں حکومت ہند

۱۔ Ibid., p.

کا میزانیہ متوازن ہو گیا۔

سر جیمس ولسن نے جب محصول آمدنی کا اصول جاری کیا تو مدراس کے گورنر سر چارلس ٹریولین نے اس سے اختلاف کیا اور گورنر جنرل کو اپنی رائے سے مطلع کیا کہ محصول کے اس نئے طریقے سے اندیشہ ہے کہ اہل ہند میں بے اطمینانی پیدا ہو۔ اس کی رائے میں محصول آمدنی جاری کرنے کے بجائے فوجی اخراجات میں اور زیادہ تخفیف کرنی چاہئے لیکن گورنر جنرل نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ سر چارلس ٹریولین نے وہ تمام خط و کتابت جو اس ضمن میں گورنر جنرل سے ہوئی تھی انگریزی اخبارات میں شائع کر دی۔ اس بنا پر وزیر ہند نے سر چارلس ٹریولین کو جو ایک قابل اور رعایا سے دلی ہمدردی رکھنے والا عہدہ دار تھا واپس بلا لیا۔ شروع میں محصول آمدنی صرف پانچ سال کے لئے لگایا گیا تھا لیکن بعد میں بھی اس کو جاری رکھا گیا اور وہ حکومت ہند کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔

فوج کی جدید تنظیم

غدر کے بعد حکومت ہند نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا کہ آیا جو ہندوستانی فوج اس وقت موجود تھی اس کو یونہی رکھا جائے یا اس میں کمی کی جائے۔ لارڈ کیننگ کے مشورے سے جدید حالات اور اقتصاد کے مدنظر وزیر ہند نے اس اصول کی تائید کی کہ انگریزی فوج کی تعداد بڑھانا چاہئے اور دیسی فوج کی تعداد میں تخفیف کی جائے ۱۵ جولائی ۱۸۵۸ء کو فوج کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے ۷ مارچ ۱۸۵۹ء اپنی سفارشیں پیش کیں۔ اس کمیشن کی سفارشوں سے نہ صرف انگریزی فوج کی تعداد بڑھا دی گئی بلکہ اس کے ساتھ دیسی فوج کی تعداد میں بھی کافی کمی کر دی گئی۔ توپ خانہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکال کر پورے طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ بجز ملک کے ایسے علاقوں کے جہاں کی آب و ہوا کی خرابی ایسی ہو کہ انگریز اس میں نہ رہ سکیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں مستقل طور پر رہنے والی انگریزی فوج کی تعداد ۸۰ ہزار کر دی گئی۔ ڈلہوزی کے عہد میں انگریز فوج کی

تعداد ۵ ۴ ہزار تھی۔ کمیشن کی یہ بھی سفارش تھی کہ انگریزی فوج اور دیسی فوج میں ایک اور تین کی نسبت ہمیشہ رکھنی چاہئے اس واسطے کہ اگر اس نسبت میں خلل پڑا تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو خطرہ رہے گا۔ فوج کی تنظیم مختلف ذاتوں اور طبقوں کی تقسیم کو بظاہر کارکردگی بڑھانے کے لئے روا رکھا گیا لیکن اسکی اصلی وجہ یہ تھی کہ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ پھر کبھی ہندوستانی فوج برطانوی مفاد کے خلاف متحد ہو سکے۔ مختلف طبقوں کی تفریق کا اصول اب تک فوج میں قایم ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی فوج میں کسی قسم کا کوئی قومی جذبہ نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے گزشتہ تقریباً سو سال میں ہندوستانی فوج کو خود ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کو دبانے اور اپنے بیرونی شہنشاہی منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے موثر طور پر استعمال کیا۔ آج بھی ہندوستانی فوج برطانوی شہنشاہیت کی توسیع و استحکام کا ایک زبردست آلۂ کار ہے۔

انگریزوں کی آبادکاری

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بڑی تعداد میں انگریز ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہوں۔ چنانچہ مستقل طور پر ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے والے انگریزوں کو مختلف قسم کے اجازت نامے حاصل کرنے پڑتے تھے۔ اس ضمن میں اس قدر احتیاط برتی جاتی تھی کہ خود بخود انگریزوں کی آبادکاری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن غدر نے حکومت ہند کی آنکھیں بہت سے معاملوں کے متعلق کھول دیں۔ اب یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت رکھنے والے انگریزوں کی تعداد جتنی بھی زیادہ ہوگی اتنا ہی اچھا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں صرف بنگال میں نیل کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے انگریز آباد کئے گئے تھے جن کا سلوک مقامی کاشتکاروں کے ساتھ بہت برا تھا۔ دیسی مہاجنوں اور زمینداروں نے بھی کاشتکاروں پر کبھی اتنے مظالم نہیں ڈھائے تھے جتنے ان لوگوں نے ڈھائے یہ لوگ مقامی کاشتکاروں سے معاہدے کر لیتے تھے اور اس کے بعد غریب کاشتکار کی حالت عمر بھر کے لئے غلاموں سے بھی بدتر ہو جاتی تھی چنانچہ پلانٹرز

کے خلاف کاشتکاروں کے بلوے برابر ہوتے رہتے تھے۔ جب پلانٹرز اور دیسی کاشتکاروں کے جھگڑے بہت بڑھ گئے تو حکومت ہند نے ۱۸۶۰ء میں ان تمام معاملوں کی چھان بین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے اپنی رپورٹ میں تمام برائیوں کی طرف حکومت کو متوجہ کیا جو عرصے سے چلی آ رہی تھیں اور جو برطانوی نظم و نسق پر سیاہ دھبوں کے مثل تھیں۔ خود بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جے۔ پی گرانٹ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پلانٹرز کی زیادتیوں کا بہت جلد تدارک ہونا چاہئے اس لئے کہ نیل کی کاشت کا مسئلہ اب محض ایک تجارتی یا زرعی مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک خالص سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ چنانچہ حکومت بنگال نے پلانٹرز اور کاشتکاروں اور مزدوروں کے تعلقات کو بہتر اصول پر معین کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کیں لیکن ان کا اثر محض عارضی رہا۔

کیننگ کے عہد حکومت میں آسام اور نیلگری کے پہاڑی علاقوں میں چاء اور قہوہ کی کاشت کے لیے انگریز خاندانوں کو خاص رعایتیں دیکر آباد کیا گیا۔ افتادہ زمینوں کے قاعدوں کے تحت (ویسٹ لینڈ رولز) ایک شخص کو تین ہزار ایکڑ زمین بطور معافی مل سکتی تھی۔ جب زمین دی جاتی تھی تو برائے نام اس کے معاوضے میں رقم لی جاتی تھی۔ بعد میں اس زمین پر کوئی محصول نہیں لگایا جاتا تھا۔ یہ رعایت انگریزوں کے لئے خاص کر دی گئی تھی چاء اور قہوہ کی تجارت سے انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی کاشت اور تجارت بالکل انھیں کے ہاتھ میں رہی۔

لارڈ کیننگ اور دیسی ریاستیں

لارڈ کیننگ کو اسی بات کا پوری طرح سے احساس تھا کہ دیسی ریاستوں کا وجود خود برطانوی ہند کے تحفظ و بقا کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر کبھی ہندوستان پر باہر سے حملے کی نوبت آ گئے یا انگلستان کی خارجی حکمت عملی کی وجہ سے جو اس کے مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہو یہ صورت پیدا ہو کہ اس کی مشرقی سلطنت خطرہ میں پڑ جائے تو اس وقت

ان دیسی ریاستوں سے ہمیں بڑا سہارا ملے گا۔ لیکن اپنا معاون بنانے کیلئے ضرورت اس کی ہے کہ ہم ان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کریں اور انھیں یقین دلا دیں کہ انھیں ہماری طرف سے چاہے کتنے شبہات کیوں نہ ہوں لیکن ان کی آزادی برقرار رہے گی اور ہم ایسے موقعوں کے منتظر نہیں ہیں کہ ان کے علاقوں پر برطانوی علمداری قایم کریں۔[1]

غدر کے فرو ہو جانے کے بعد ۱۸۶۲ء میں ہندوستان کے ایک سو چالیس بڑے بڑے والیان ملک کو حکومت ہند نے سندیں عطا کیں جن میں ان کے قدیم حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ اور بڑی ریاستوں کی طرح حیدرآباد کے حکمران نواب افضل الدولہ بہادر کو بھی سند بھیجی گئی جس میں اس امر کی صراحت کر دی گئی تھی کہ ریزیڈنٹ حیدرآباد کو اختیار ہوگا کہ وہ ان جرموں کی نسبت تحقیقات کرے جو اہل یورپ اور ان ہندوستانیوں سے جو برطانوی رعایا ہوں حدود ریاست حیدرآباد میں سرزد ہوں۔ رزیڈنٹ مجاز ہوگا کہ اپنے اس اختیار کو کسی دوسرے کو منتقل کر دے۔ اگر برطانوی رعایا کے کسی فرد اور سرکار نظام کے کسی فرد میں جھگڑا ہو تو ریزیڈنٹ اسکے متعلق تحقیقات کرے گا اور ملزم کو سزا دے گا۔ اس قسم کے مقدموں میں ریاست کی عدالتوں کو حق سماعت حاصل نہ ہوگا۔

لارڈ کیننگ کی سفارش پر نواب افضل الدولہ کو ان کی دوستی کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ نے جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا جسے قبول کرنے میں انھیں پس وپیش تھا اس لئے کہ اب تک دکن کے کسی حکمران نے برطانوی حکومت کا کوئی خطاب قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن رزیڈنٹ نے نواب افضل الدولہ بہادر کو یقین دلایا کہ خطاب دینے کا مقصد سیاسی نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے خطاب قبول کر لیا۔[2]

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 70.

[2] Fraser, Our Faithful Ally, The Nizam, p. 315.

سنہ۱۸۶۲ء میں حکومت ہند نے جو سندیں مختلف والیان ریاست کو عطا کیں اور جن کی حیثیت اقرار ناموں کی تھی ان کا مقصد اس وقت یہ سمجھا گیا کہ انگریزی حکومت اپنے آئندہ کے منشا اور ارادوں کو واضح کرنا چاہتی ہے جن کی جانب ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں اشارے موجود تھے لیکن کچھ عرصے بعد حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ (پولٹیکل ڈپارٹمنٹ) نے ان کی یہ توجیہ پیش کی کہ چونکہ سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت بحیثیت بالادست قوت کے اس کی جانشین ہوگئی ہے اس لئے اب اس کا یہ منصب ہے کہ والیان ریاست کے اختیارات کی تصدیق کرے۔ اس ضمن میں مختلف ریاستوں کے مرتبوں کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ حالانکہ بعض ان میں ایسی تھیں جن کی حیثیت معاہدوں کے ذریعہ حلیف کی سی تھی اور بعض دوسری ایسی تھیں جو برطانوی حکومت کی بنائی ہوئی یا باجگزار تھیں۔ چنانچہ سنہ۱۸۵۷ء سے پہلے کمپنی کی حکومت نے مختلف ریاستوں میں باہم فرق و مراتب کا پورا لحاظ رکھا تھا اگرچہ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد حکومت سے یہ بات تو مانی جاچکی تھی کہ برطانوی حکومت نے ملک میں بالادست قوت کی حیثیت اختیار کرلی ہے لیکن باوجود اس کے کمپنی کی حکومت نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ تمام ریاستوں کے لئے یکساں لائحہ عمل تجویز کرے۔ ہر ریاست کے ساتھ سیاسی تعلقات کی نوعیت کو معین کرنے والی چیز معاہدہ کی شرطیں ہوتی تھیں جو برطانوی حکومت اور متعلقہ ریاست کے درمیان طے ہوئی ہوں۔ غدر کے بعد ریاستوں کو جاگیروں کے مثل تصور کیا گیا اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کی کوشش کی گئی جو معاہدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ کیننگ نے صاف طور پر ایک دفعہ اس کی صراحت کردی کہ برطانوی حکومت نے اگرچہ عدہ کیا ہے کہ وہ دیسی ریاستوں کو آئندہ ملحق نہیں کرے گی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں یہ حق حاصل نہیں رہا کہ معاہدوں کی علانیہ خلاف ورزی یا غیر وفاداری کی صورت میں ہم والئ ملک کو سزا نہ دیں یا اسکی ریاست کو ضبط نہ کریں۔[۱]

۱؎ Lee Warner, The Native States of India, P. 164, 165.

اس کے علاوہ کیننگ نے ریاستوں کے حقیقی مرتبہ اور مقام کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ وہ ہمارے جاگیرداروں (فیوڈیٹریز) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہم نے بہت عرصے تک اپنے اقتدار کو سلطنت مغلیہ کے نائب کی حیثیت سے استعمال کیا لیکن اب سلطنت مغلیہ کے آخری دھندلے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔ آج تاج برطانیہ کی حکمرانی اور بالادستی کسی شک وشبہہ کے بغیر مانی جا چکی ہے۔ اب تاج برطانیہ کو براہ راست اپنے جاگیرداروں (فیوڈیٹریز) سے معاملے طے کرنے ہیں۔ انگلستان کا اقتدار اس ملک میں اب ایسی حقیقت ہے جس کو والیاں ملک خوشی سے تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس اقتدار کی نوعیت آج ایسی ہے جیسی پہلے کبھی نہیں تھی۔"[1]

واقعہ یہ ہے کہ والیان ریاست کو جاگیردار قرار دینا اس ملک کی تاریخ اور روایتوں سے انکار کرنا ہے۔ لیکن اس دعوے سے برطانوی حکومت کے اس نقطۂ نظر کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے جو غدر کے بعد اس نے ریاستوں کے متعلق اختیار کیا۔ ریاستوں کی حیثیت اب شہنشاہی نظام میں محض معاون اجزاء کی رہ گئی اور ان کے متعلق تاج برطانیہ نے اپنی ذمہ داری اسی طرح واضح کر دی جس طرح ان علاقوں کی نسبت کی تھی جو براہ راست اس کی عملداری میں تھے۔ اب معاہدوں سے زیادہ اہمیت رواج کو دی جانے لگی جو آہستہ آہستہ حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ اور دیسی ریاستوں کے تعلقات کے تعین کے لئے وجود میں آرہا تھا اور جس کی ابتداء لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت سے ہوئی[2] یہ بات فرض کر لی گئی کہ تاج برطانیہ جس طرح سے کسی معمولی سی باجگزار ریاست سے جواب طلب کرنے کا مجاز ہے اسی طرح بڑی سے بڑی

---

[1] Lee Warner, The Natives States of India, p. 100.

[2] (See also Varadarajan. The Indian States and the Federation, p. 2)

ریاست سے جواب طلب کر سکتا ہے جس کی آزاد اور حلیفانہ حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت برابر تسلیم کرتی رہی تھی۔ ان حالات میں بعد میں آہستہ آہستہ مختلف ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کر کے معاشی اور مالی حقوق حکومت ہند نے حاصل کر لئے جو اس کو معاہدوں کی رو سے حاصل نہیں تھے۔

کیننگ کا جانشین

لیڈی کیننگ کے انتقال اور چھ سال کی سخت تشویش نے کیننگ کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ۱۸۶۲ء میں وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر انگلستان چلا گیا اور وہاں پہنچ کر صرف تین مہینے زندہ رہا۔ اس کو اپنے عہد حکومت میں جن نازک حالات اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ویسا کسی دوسرے گورنر جنرل کو نہیں ہونا پڑا تھا۔ کیننگ میں مستقل مزاجی کی صفت موجود تھی جس کے باعث وہ مصیبت کے وقت میں بھی اپنا دماغی توازن قایم رکھ سکا۔ اس نے بڑے صبر اور محنت سے ملکی نظم ونسق کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگرچہ بعض قدامت پسند انگریز اس کے اصلاحی اور روادارانہ مسلک کو برا بتاتے تھے لیکن اس نے جو کچھ کیا وہ انگریزی قوم اور ہندوستان دونوں کی بھلائی کے مدنظر کیا۔ لارڈ ایلجن کو اسکا جانشین مقرر کیا گیا لیکن اپنے عہدہ کا جایزہ لئے ہوئے اس کو ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ دھرم سالہ میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے اسکا انتقال ہو گیا۔ اس کے مختصر عہد حکومت میں بس یہی ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کے خلاف مہم امبیلا بھیجی گئی۔ پٹھانوں نے انگریزی فوج کو بہت کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن بعد میں انگریزی فوج نے صورت حالات پر قابو پا لیا۔

سر جان لارنس ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء

چونکہ سرحد کی شورش بڑھ رہی تھی اس لئے ہندوستان کی گورنر جنرلی ایک ایسے شخص کو سپرد کرنے کا تصفیہ کیا گیا جو ملک کے حالات سے باخبر ہو اور سرحدی معاملوں کا بھی تجربہ رکھتا ہو۔ اس وقت سر جان لارنس وزیر ہند کی کونسل کی رکنیت پر ممتاز

تھا۔ اگرچہ سر جارج بارلو کے وقت سے یہ طریقہ قایم ہو گیا تھا کہ کسی سویلین کو گورنر جنرل نہ بنایا جائے لیکن سر جان لارنس کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا تاکہ اس کے وسیع تجربہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ پنجاب میں چیف کمشنری کے عہدہ پر رہ چکا تھا اور غدر کے زمانے میں اس نے انگریزی قوم کی بڑی زبردست خدمتیں انجام دی تھیں۔ اس کی قابلیت اور معاملہ فہمی کی بدولت پنجاب کا پورا علاقہ غدر میں نہ صرف انگریزی حکومت کے ساتھ وفادار رہا بلکہ اس کے ساتھ وہاں کے باشندوں نے اور خاص طور پر سکھوں نے انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر غدر کو دبانے میں بڑی مدد کی۔ سر جان لارنس کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا تھا جنھوں نے غدر کے پر آشوب زمانے میں انگریزی قوم کے مفادوں کو ہندوستان میں تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔

سر جان لارنس کے عہد حکومت میں اصلاحات اور کفایت شعاری کے اصول پر عمل کیا گیا۔ اس کو کسانوں کی فلاح و بہبود کی فکر تھی۔ چنانچہ اس نے ان کی حالت سدھارنے کی طرف خاص توجہ کی۔ اس ضمن میں اس نے وہ ضابطہ جاری کیا جس کی وجہ سے پنجاب اور اودھ کے کاشتکاروں کو زمینداروں کی دراز دستیوں سے محفوظ کر دیا گیا اور انھیں موروثی کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس کے ساتھ اودھ کے تعلقداروں کی اس حیثیت اور منصب کا بھی اس ضابطہ میں خاص طور پر خیال رکھا گیا جو لارڈ کیننگ کی حکومت کے زمانے میں انھیں حاصل ہوا تھا۔

۱۸۶۵ء میں اڑیسہ میں سخت قحط پڑا جو ایک سال تک رہا۔ قحط کے ساتھ سیلاب کی مصیبت سے بھی رعایا کو دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے دس لاکھ سے زائد جانیں ضائع ہو گئیں اور فصلوں کی بربادی سے بہت نقصان ہوا۔ حکومت بنگال نے بڑی بے پروائی سے کام لیا۔ برخلاف اس کے حکومت مدراس نے شمالی سرکاروں کے متاثرہ علاقوں میں بہت اچھا انتظام کیا۔ حکومت بنگال نے بجائے اس کے کہ خود کوئی اقدام کرتی رعایا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت بنگال نے حکومت ہند کو باور کرایا کہ

حالات قابل اطمینان ہیں۔ اس قسم کے حالات میں حکومت کی جانب سے عدم مداخلت کی پالیسی اس وقت حق بجانب کہی جاسکتی ہے جب کہ ملک میں آمد و رفت کے ذریعے مکمل حالت میں موجود ہوں اور غلہ کے ذخیرے ملنے میں تاجروں کو دشواری نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو طلب اور رسد کے معاشی قانون پر بھروسہ کرنا بڑی نافہمی ہوگی۔ سرجان لارنس نے لوگوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے بڑی مستعدی اور قابلیت سے کام لیا لیکن حکومت بنگال کی بے پروائی اور بدانتظامی کی وجہ سے جتنی مدد لوگوں کو پہنچنی چاہیے تھی اتنی نہ پہنچ سکی۔ لارنس کی مداخلت پر غریب لوگوں کو غلہ مفت تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا لیکن اس میں بہت تاخیر ہو چکی تھی اور جتنا نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا تھا۔ گورنر جنرل کے ایما پر سرجارج کیمپ بل کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ قحط کی روک تھام کے مسئلہ پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی سفارشوں کے بموجب حکومت نے ایک سرمایۂ محفوظ قحط زدہ علاقوں کی امداد کے لئے خاص کردیا۔

تجارت وصنعت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خانہ جنگی کی وجہ سے جو روئی وہاں سے انگلستان بھیجی جایا کرتی تھی وہ بند ہوگئی۔ چنانچہ مانچسٹر کے کارخانوں کو چالو رکھنے کے لئے ہندوستان کی روئی کی مانگ بڑھ گئی۔ کچھ دنوں ہندوستان کی روئی کی خوب گرم بازاری رہی۔ اکاسی کی مقدار سو فی صدی تک ہو گئی۔ چونکہ نکاسی کی مقدار زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس قیمت کا مال معاوضہ میں انگلستان سے نہیں دیا جاسکتا تھا اس لئے روئی کی قیمت زر نقد کی صورت میں ادا ہونے لگی۔ ہندوستان کے ان علاقوں کے کاشتکاروں کو جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی خوب فائدہ ہوا۔ اسی دوران میں بمبئی میں نئے کارخانے قائم ہوگئے۔ جب مانچسٹر سے ہندوستانی روئی کی مانگ کم ہوگئی تو اس کی کھپت دیسی کارخانوں میں ہونے لگی اور ہندوستان کی ایک اہم صنعت کو ترقی کا موقع ملا۔ لیکن بمبئی کے تاجروں کی عام آسودگی کے باعث بمبئی بنک نے بے سوچے

ل Cambridge History of India, Vol. VI. p. 299.

سمجھے ناقابل عمل تجارتی منصوبوں میں روپیہ لگا دیا جس کی وجہ سے دیوالیہ ہو جانا پڑا۔ ہندوستانی تاجروں نے غالباً بین الاقوامی تجارتی حالات سے پہلی مرتبہ روئی کی تجارت میں زبردست نفع کمایا اور وہ صحیح توازن نہ قایم رکھ سکے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں قایم ہو گئیں لیکن کوئی باقاعدہ تجارتی قانون نہ ہونے سے تھوڑے تھوڑے دنوں بعد وہ ختم ہو گئیں۔ سٹہ بازی کی وجہ سے بھی بہت سے تاجروں کا سرمایہ ڈوب گیا۔

میسور کے معاملات

سرتھامس منرو گورنر مدراس کے مشورے کے بموجب لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں میسور کی ریاست کا انتظام انگریزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس انتظام کو اس لئے حق بجانب بتایا گیا کہ وہاں انتہا درجہ کی بدانتظامی تھی۔ لیکن خود بنٹنگ کو اس کا احساس تھا کہ راجا میسور کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے چنانچہ ۱۴ اپریل ۱۸۳۴ء کو اس نے جو مراسلہ مجلس نظار کی خفیہ کمیٹی کو لکھا اس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ صورت زیادہ مناسب ہوتی اگر ہم پہلے راجا کو آگاہ کرتے اور اگر اس کا اچھا نتیجہ نہ نکلتا تو میسور کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لینے کا انتہائی طریق کار اختیار کیا جاتا۔ لیکن بنٹنگ کو منرو نے جو مشورہ دیا اس پر وہ عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت تک راجا برابر حکومت ہند سے خط و کتابت کرتا رہا کہ اس کی ریاست اس کو واپس کر دی جائے لیکن کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹالا گیا۔ ڈلہوزی نے اپنی الحاق پالیسی کا وار میسور پر بھی کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۶ جنوری ۱۸۵۶ء کو اس نے اپنے ایک مراسلہ میں اس کی وضاحت کر دی کہ چونکہ موجودہ راجا میسور لاولد ہے اس لئے اس کی موت پر یہ ریاست سلطنت برطانیہ میں شامل کر لینی چاہئے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ اس معاہدے میں جو ولزلی کے عہد میں ہوا اس امر کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے کہ راجا کے بعد اس کی اولاد ریاست کی وارث قرار پائے گی اس لئے

لہ Major Evans Bell, The Mysore Reversion, p. 22.

قانونی حیثیت سے انگریزی حکومت کو اس کا وارث ہونا چاہئے۔[1] لیکن راجا چونکہ غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے ساتھ وفادار رہا اور والیان ریاست کے ساتھ بالادست قوت کی پالیسی میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی اس لئے راجا کو امید تھی کہ کیننگ کے عہد حکومت میں ریاست اس کو واپس کردی جائے گی۔ لیکن ریاست اس کو واپس کرنے کے بجائے وزیر ہند کی رائے کے بموجب میسور کے انتظام کی نگرانی حکومت مدراس کے سپرد کردی گئی جسے راجا نے اپنی ذلت سمجھا اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس پر وزیر ہند نے یہ طے کیا کہ میسور کا انتظام یونہی حکومت ہند کی نگرانی میں رہے۔ راجا نے جب لارڈ کیننگ سے اپنی ریاست کی واپسی کا مطالبہ کیا تو لارڈ موصوف نے اس کا صاف طور پر نفی میں جواب دے دیا۔

راجا نے سر جان لارنس کے عہد حکومت میں ۱۸۶۵ء میں ایک بچہ کو اپنا متبنیٰ کرلیا اور گورنر جنرل کو اس کے متعلق مطلع کردیا۔ اس پر حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ نے کمشنر مقیم میسور کو لکھا کہ "راجا کو اپنی ذاتی ملکیت کی حد تک پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا متبنیٰ مقرر کرے لیکن ہز ہائی نس کو صاف طور پر جتا دینا ضروری ہے کہ اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ میسور کی گدی کے لئے کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے اور یہ اختیار اس کو اب دیا بھی نہیں جا سکتا ہے۔"[2]

راجا نے اپنا اصرار جاری رکھا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اگر اس کے مرنے پر باوجود ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے ریاست میسور ملحق کرلی گئی تو نہ صرف یہ کہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ انگریزی حکومت قانوناً ایسا کرنے کی مجاز نہیں اس واسطے کہ سرکار نظام بھی اس قسم کا دعویٰ پیش کرسکتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کے ملک کی تسخیر میں انگریزی

[1] Ibid., p. 4.

[2] Ibid., p. 84.

فوجوں کے ساتھ سرکار نظام کی فوجیں بھی شریک تھیں اور معاہدہ کے بعد جو ملک کی تقسیم عمل میں آئی اس میں بھی انگریزی حکومت اور سرکار نظام معاہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن سر جان لارنس نے راجا کے ان دعووں کو ماننے سے انکار کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میسور کی تسخیر کے بعد وہاں کا اقتدار اعلیٰ برطانوی حکومت کو حاصل ہوگیا جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ جب میسور کا معاملہ وزیر ہند سر چارلس وڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے وائسرائے اور اس کی کونسل کی رائے سے اختلاف کیا اور راجا میسور کے متبنیٰ لڑکے کو اس کا جانشین اور آئندہ ریاست کا مالک تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس کے بلوغ کو پہنچنے کے بعد ۱۸۸۱ء میں لارڈ رپن کے عہد میں اس کو حکومت کے اختیارات سپرد کر دئے گئے اور ریاست اس کو واپس کر دی گئی۔

بھوٹان کی لڑائی

بھوٹان کے باشندے ہمالیہ کے جنوبی ڈھالوں پر جنگل سے پٹے ہوئے پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے کچھ عرصے سے انھوں نے یہ شروع کیا تھا کہ انگریزی علاقوں پر حملے کرتے اور لوٹ مار کر کے اپنے پہاڑوں میں واپس چلے جاتے تھے۔ لارڈ ایلجن نے مصالحت کے لئے ایشلے ایڈن کو ایلچی کے طور پر بھوٹان بھیجا تاکہ بات چیت کے ذریعے معاملہ طے ہو جائیں۔ بھوٹان کی حکومت نے زبردستی اس سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے جس کی شرطوں کی رو سے انگریزی حکومت بھوٹانیوں کے دعوے کو ان انگریزی علاقوں پر تسلیم کرنے کو تیار تھی جو بھوٹان کی سرحد سے ملے ہوئے تھے اور جہاں اکثر بھوٹان والے لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ جب سر جان لارنس نے گورنر جنرل کا جائزہ لیا تو حکومت بنگال بھوٹان کے جھگڑے میں الجھی ہوئی تھی۔ سر جان لارنس اگرچہ امن پسند تھا لیکن وہ مجبور ہوگیا کہ بھوٹانیوں کے خلاف جنگ کرے۔ یہاں کے پہاڑی علاقے کی آب و ہوا خراب تھی جس کی وجہ سے انگریزی فوج کے بہت سے آدمی مر گئے لیکن جنگ میں بھوٹانیوں کو شکست ہوئی اور انھوں نے جو معاہدہ کیا اس کی رو سے دوار کا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔ انگریزی حکومت نے ۲۵ ہزار روپے سالانہ

بطور زر امدادی دینا منظور کیا تاکہ بھوٹان کی حکومت کا خرچ چلنے میں آسانی ہو۔ بھوٹان کے لوگ نیپال والوں کی طرح مضبوط اور بہادر ہوتے ہیں اور انگریزی فوجوں میں ملازمت کرتے ہیں۔

خارجی پالیسی ۱۸۶۳ء میں افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ تخت وتاج کے لئے اس کے بیٹوں میں جھگڑا شروع ہو جانے سے سارے ملک کا انتظام درہم وبرہم ہوگیا۔ امیر دوست محمد خاں نے اپنے بیٹے شیر علی کو اپنا جانشین نامزد کردیا تھا اس کے تخت نشین ہونے کے بعد بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے بھائیوں میں افضل خاں، عظیم خاں اور امین خاں نے اپنی اپنی پارٹیاں قایم کرلیں اور ہر ایک نے بعض فوجی سرداروں کو اپنے ساتھ ملاکر تخت وتاج کے لئے کوشش شروع کردی۔ افضل خاں نے کچھ عرصے کے لئے شیر علی کو تخت سے بے دخل کردیا۔ لیکن شیر علی نے پھر کابل پر قبضہ کرلیا۔ کئی سال تک یوں ہی ہوتا رہا۔ آخر شیر علی نے زیادہ قوت حاصل کرلی اور اپنے حریفوں کو زیر کرلیا۔ ان میں سے ہر ایک نے سرجان لارنس سے امداد طلب کی تھی لیکن سرجان لارنس افغانستان کی اندرونی سیاست میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ بھیڑوں کے اس چھتے کو چھیڑنے میں نقصان اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے جانشینی کے جھگڑوں میں اپنی غیر جانبداری کو قایم رکھا۔ جب شیر علی کی حیثیت مسلم ہوگئی تو حکومت ہند نے اس کو بے تامل امیر افغانستان تسلیم کرلیا۔ بعض مورخوں نے سرجان لارنس کی افغانی حکمت عملی کو "عدم مداخلت کے شاہکار" سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کا تخت وتاج حاصل کرنے میں جو بھی کامیاب ہوگا اسی کو حکومت ہند وہاں کا حکمران مان لے گی۔ سرجان لارنس نے امیر شیر علی کے ساتھ اچھے تعلقات قایم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ روس کی طرف زیادہ مائل نہ ہو جس کی سرحد ترکستان میں بخارا اور خیوا تک پہنچ چکی تھی۔

اس زمانے میں بعض انگریز ماہرین سیاست کی یہ رائے تھی کہ ممکن ہے کہ روس افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملہ کر دے اس لئے برطانوی حکومت کو چاہئے کہ قبائلی علاقے پر قبضہ کر کے وہاں اپنے فوجی مرکز قائم کرے۔ اگر ضرورت ہو تو افغانستان کے بعض حصوں پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ ہندوستان کی قدرتی سرحد دریائے انڈس ہے۔ اگر حکومت ہند اس قدرتی سرحد سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کرے گی تو ٹھوکر کھائے گی اور بیٹھے بٹھائے پریشانیوں میں اپنے آپ کو مبتلا کرے گی۔ اقدامی حکمت عملی کا سب سے بڑا حامی سر ہنری رالنس تھا جو وزیر ہند کی کونسل کا رکن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت ہند فوراً کوئٹہ پر قبضہ کر لے تاکہ درۂ بولان پر اس کا قبضہ اور تصرف مان لیا جائے اور امیر افغانستان کو زر امداد دیا جائے تاکہ وہ روسیوں کے پھندے میں نہ پھنس جائے لیکن سر جان لارنس اپنی عدم مداخلت کی حکمت عملی پر ایسی سختی سے پابند تھا کہ اس نے کسی دوسرے کی رائے کی زیادہ پروا نہیں کی۔ اس نے اقدامی حکمت عملی کے حامیوں کو بتا دیا کہ اگر کبھی روس ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے تو ہماری حفاظت کا بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ ہم افغانستان میں نہ پھنسے ہوئے ہوں بلکہ ہماری فوجیں خود ہمارے علاقوں میں تیار رہیں۔ اور سب سے بڑھ کر حفاظت کا ذریعہ یہ ہوگا کہ اہل ہند ہماری حکومت سے مطمئن ہوں اور ہماری ایمان داری اور نیک نیتی کا انھیں پوری طرح یقین ہو۔[۱]

سر جان لارنس کی عدم مداخلت کی حکمت عملی کو بعد میں لارڈ لٹن نے بدلنے کی کوشش کی لیکن اس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں جن کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ وسط ایشیا کے واقعات اس تیزی سے وقوع پذیر ہو رہے تھے کہ حکومت ہند بالکل غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے عرصے تک خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی تدبیر یہ تھی کہ سیاست کاری کے اصول کے مطابق حکومت افغانستان سے دوستانہ تعلقات

۱۔ Lord Lawrence, by Sir Charles Aitchison, p. 194.

بڑھائے جائیں تاکہ وہ روسیوں کے اثر سے باہر رہے نہ یہ کہ افغانستان میں فوجی اقدام کی کوشش کی جاتی۔ اس ضمن میں لارڈ لٹن نے جو غلط رائے قایم کی اسکا خمیازہ حکومت ہند کو بھگتنا پڑا۔

سر جان لارنس کی حکومت کو ہم کامیاب حکومت نہیں کہہ سکتے ہیں کو اگرچہ ہندوستان کے نظم ونسق کا وسیع تجربہ تھا لیکن وہ بجائے اپنے ماتحتوں کی رہبری کرنے کے خود ان کی رائے پر چلتا تھا۔ اڑیسہ کے قحط کی ذمہ داری اگرچہ بڑی حد تک حکومت بنگال پر عاید ہوتی ہے لیکن خود گورنر جنرل بھی اس سے بری الذمہ نہیں کہا جا سکتا۔ سر جان لارنس روزمرہ کے نظم ونسق کے کاموں اور بندھے ٹکے فرائض کو اچھی طرح سے انجام دیتا تھا لیکن اس میں نئے حالات کے لئے نئے حل تلاش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس میں تخیل کی بڑی کمی تھی جو حکومت کے اعلی عہدہ دار میں ہونا ضروری ہے۔ انگلستان سے واپسی پر سر جان لارنس کو اس کی خدمتوں کے صلہ میں لارڈ کا خطاب اور ایوان بالا کی رکنیت سے سرفراز کیا گیا۔

لارڈ میو
۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۲ء

انگلستان کی قدامت پسند حکومت نے اپنی حکومت کے ایک رکن لارڈ میو کو جو آئرلینڈ کا چیف سکرٹری تین مرتبہ رہ چکا تھا سر جان لارنس کا جانشین مقرر کیا۔

لارڈ میو نے ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے امیر افغانستان سے تعلقات استوار کرنے کی جانب توجہ کی۔ سر جان لارنس نے افغانستان کے متعلق جو عدم مداخلت کی حکمت عملی اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر شیر علی نے روسی حکومت سے تعلقات بڑھانے کی کوشش شروع کردی۔ لارڈ میو نے محسوس کیا کہ اگر حکومت ہند نے افغانستان کے معاملات کی طرف اسی طرح بے توجہی کی جیسی کہ پچھلے چند سال میں کی تھی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ افغانستان پوری طرح روس کے حلقۂ اثر میں آجائے گا۔ چنانچہ لارڈ میو نے امیر شیر علی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مارچ ۱۸۶۹ء میں انبالہ کے مقام پر لارڈ میو نے امیر شیر علی کا بڑے شان وشوکت کے ساتھ

خیر مقدم کیا۔ وائسرائے اور امیر صاحب میں سیاسی معاملات پر گفت و شنید ہوئی اگرچہ ہوم گورنمنٹ نے لارڈ میئو کو مستقل معاہدہ کرنے کا مجاز نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی اس نے بڑی قابلیت سے امیر صاحب کو روس کے اثر سے نکالنے کی پوری کوشش کی۔ حکومت ہند نے امیر شیر علی کی فرمان روائی کو تسلیم کیا اور بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور زر امدادی کے دینا قبول کیا۔ اس کے علاوہ حربی آلات کی معقول تعداد مقرر کی گئی جو حکومت ہند حکومت افغانستان کو سالانہ بھیجا کرے گی تاکہ وہ اپنی مدافعت کا اچھا انتظام کر سکے۔ اس ملاقات سے برطانوی حکومت اور افغانستان کی حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔[1]

لارڈ میئو نے امیر شیر علی سے معاملوں کی یکسوئی کے بعد حکومت ہند کی جانب سے سر ڈگلس فورسٹھ کی صدارت میں ایک وفد سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا تاکہ افغانستان کے متعلق روسی حکومت کو حکومت ہند کے نقطہ نظر سے واقف کرائے۔ روسی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ دریائے جیحون (Oxus) افغانستان کی شمالی سرحد پر خط فاصل تصور کرے گی اور اس کا پورا احترام کرے گی۔ اُس سے اس قسم کا وعدہ لے لینا لارڈ میئو کی خارجی حکمت عملی کی زبردست کامیابی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ یورپین سیاست میں بعد میں دوسری پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے روس کے وعدوں کی زیادہ اہمیت نہیں رہی اور وسط ایشیا، کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہ نکل سکا۔

مالیاتی اصلاح

سر جان لارنس کے عہد سے حکومت ہند نے مفاد عامہ کے کاموں پر کافی رقم خرچ کرنا شروع کر دی تھی لیکن آمدنی اور خرچ کا توازن جیسا ہونا چاہئے ویسا نہ تھا۔ لارڈ میئو نے جب گورنر جنرلی کا جائزہ لیا تو حکومت ہند کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ اس نے سر رچرڈ ٹمپل اور رچرڈ اسٹریچی جیسے تجربہ کار ماہران مالیات کی تجویزوں کے بموجب محصول

---

[1] Hunter, Life of Lord Mayo p. 125 128

آمدنی اور محصول نمک میں اضافہ کر کے بجٹ کو متوازن کر دیا۔ تعمیرات کے محکمہ کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ اس لئے کہ حکومت کو بہت بڑی رقم اس محکمہ کے کاموں کی توسیع پر خرچ کرنی پڑتی تھی۔

لیکن لارڈ میئو کا سب سے اہم کارنامہ صوبجاتی مالیات کی تنظیم ہے قانون مجالس ہند سنہ ۱۸۶۱ء نے اگرچہ پریسی ڈنسیوں کی حکومت کو مقامی حالات کے مدنظر قوانین بنانے کا اختیار دے دیا تھا لیکن اب تک پورے ملک کی مالیات مرکزی حکومت ہی سے متعلق تھی۔ چنانچہ کل برطانوی ہند کی آمدنی ایک جگہ جمع ہوتی تھی جس کی منظوری ہندوستان کے مختلف حصول کی ضرورتوں کے لحاظ سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل دیتا تھا۔ یہ انتظام ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے موزوں نہ تھا جہاں ہر صوبے کے حالات اور ضروریات الگ الگ ہیں۔ صوبجاتی حکومتوں کو محصول لگانے یا قرض لینے کی اجازت نہ تھی۔ وہ صرف مقامی محصول کچھ وصول کر سکتی تھیں جو سڑکوں کی تعمیر اور ابتدائی مدرسوں کے اخراجات کے واسطے لئے جاتے تھے۔ معمولی معمولی اخراجات کے لئے انھیں مرکزی حکومت کی منظوری لینی ہوتی تھی۔ پھر ہر صوبے کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مرکزی حکومت سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے۔ اگر کوئی صوبہ اپنے اخراجات میں کمی اور کفایت کرتا تو اس کو اس سے فائدہ نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ بعض صوبوں کی کفایت سے مرکزی حکومت کے پاس جو رقم بچتی تھی وہ دوسرے اپنے کام میں لاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صوبہ فضول خرچی کی طرف مائل تھا۔ اور مرکزی حکومت کے سامنے اپنے مطالبے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔ اپنے مقامی آمدنی کے ذریعوں کو ترقی دینے کی طرف سے صوبے غفلت برت رہے تھے۔ لارڈ میو کی حکومت نے ۱۸۷۰ء میں ایک تجویز منظور کی جس کی بدولت صوبجاتی حکومتوں کو بعض مالیاتی حقوق حاصل ہو گئے۔ اور بعض محکموں کے انتظام کے لئے مرکزی حکومت سے مستقل امداد مقرر ہو گئی اگر کسی صوبے کی آمدنی اور خرچ متوازن نہ ہوں تو ایسی حالت میں صوبجاتی حکومت

یا تو مقامی محصولوں سے کمی پوری کرے گی یا اپنے اخراجات کم کرے گی۔ اگر سال کے ختم پر صوبجاتی حکومت کے پاس کچھ رقم بچ رہے گی تو وہ مرکزی حکومت کو واپس نہیں کی جائے گی بلکہ صوبجاتی حکومت کے تصرف میں رہے گی۔ صوبجاتی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار تک کی خدمتوں پر تقرر کرسکیں۔ لارڈ میئو کا خیال تھا کہ اس انتظام سے مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہوگی جس سے دونوں کے لئے سہولت ہوگی۔ لیکن مختلف صوبوں کی حقیقی ضروریات اور ان کے اخراجات کا باقاعدہ تعین نہیں کیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں جو مختلف صوبوں کے اخراجات تھے انھیں کو رقموں کے تعین کی بنیاد قرار دیا گیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ صوبے جو حال ہی میں برطانوی مقبوضات میں شریک کئے گئے تھے ان کی ضرورتیں ان صوبوں سے مختلف تھیں جو پہلے سے انگریزی حکومت کے تحت آچکے تھے۔ اس طرح بعض صوبوں کے ساتھ مرکزی حکومت فیاضی سے پیش آئی اور بعض دوسرے صوبوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی۔

لارڈ میئو کی صوبجاتی مالیات کی تجویز عہد حالیہ کی انتظامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس تجویز میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کی اسی وقت ترقی اور نشو ونما ممکن ہوگی جب کہ حکومت کی مالیات میں عدم مرکزیت پیدا کی جائے۔ بغیر ایسا کئے تعلیم، حفظان صحت، تعمیرات اور دوسری مقامی ضرورتوں کی پابجائی ممکن نہیں ہوسکتی۔ پہلی مرتبہ مقامی حکومت اختیاری کے اداروں کی ضرورت کا ذکر ہمیں لارڈ میئو کی اس تجویز میں ملتا ہے[۱]۔ بعد میں رپن نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ لارڈ میئو نے صوبوں کی حکومتوں کو محکمہ رجسٹری، جیل، پولیس، تعمیرات اور سررشتہ تعلیمات کا انتظام سپرد کردیا اور ان کے لئے رقم مقرر کردی گئی۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مرکزی حکومت کے کام کا بوجھ

۱۔ Cambridge History of India, Vol. VI, p 517.

ہلکا ہو جائے۔ صوبوں کی حکومتوں کو مقامی محصول لگانے کا اختیار دے دیا گیا تاکہ وہ اس طرح اپنی آمدنی بڑھا سکیں اور ان میں اپنی حیثیت اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ اب ہر صوبہ کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے رقم مقرر کر دی گئی جو وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا مجاز تھا۔ اگر اس رقم کے علاوہ کوئی صوبہ خرچ کی ضرورت محسوس کرتا تو وہ اپنے شہریوں پر محصول لگا کر رقم مہیا کر سکتا تھا۔ اس انتظام سے مرکزی حکومت کو بہت بچت ہونے لگی اور صوبوں کا مالی انتظام بھی بہتر ہو گیا۔

دیسی ریاستیں

لارڈ میئو کو دیسی ریاستوں کے معاملات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے مختلف ریاستوں میں اپنے دوروں میں والیان ملک پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ برطانوی حکومت ریاستوں میں اچھا نظم و نسق دیکھنا چاہتی ہے اور اگر کہیں بدنظمی پھیلے گی تو بالادست قوت کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ عوام کے مفاد کی نگہداشت کی خاطر مداخلت کرے۔ لارڈ میئو کے عہد میں حکومت ہند کے محکمہ سیاسیہ (پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ) نے اس امر پر خاص طور پر زور دیا کہ مختلف ریاستوں میں جب وزیر اعظم مقرر کیا جائے تو حکومت ہند سے دریافت کر لیا جائے۔ اگر حکومت ہند کسی شخص کے دیوان (وزیر اعظم) ہونے کو پسند نہ کرے تو والئ ملک مجاز نہ ہوگا کہ اپنی رائے پر اصرار کرے۔ اگرچہ یہ حق حکومت ہند کو کسی معاہدہ کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کو اس پر اصرار تھا اس واسطے والیان ملک خاموش ہو گئے۔

لارڈ میئو نے راجپوتانہ میں والیان ملک کا جو دربار کیا اس میں جن الفاظ میں انھیں نصیحت کی ان کا لب و لہجہ ملاحظہ ہو:۔

"آپ کو چاہئے کہ اپنی رعایا کے ساتھ رحم
اور انصاف سے پیش آئیں ہم (یعنی انگریزی حکومت)
یہ نہیں چاہتے کہ آپ ہم لوگوں کے سامنے جب آئیں تو
آپ کے ہاتھ تحفوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب آپ آئیں تو آپ کے ہاتھ (ظلم و زیادتی کی آلائش سے) پاک ہوں۔ آپ چاہے کیسے ہی قیمتی تحفے لائیں لیکن ان کے ذریعہ سے آپ برطانوی حکومت کی رضامندی کو نہیں خرید سکتے۔ آپ کی شان و شوکت سے ہماری نظر میں آپ کی وقعت نہیں بڑھے گی۔ آپکی خوشامد میری دوستی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ ہمارے دل میں آپ کی قدر و منزلت نہ تو ان تحفوں سے ہوگی جو آپ ہمیں پیش کرنے کی غرض سے لائیں گے اور نہ آپ کے اور آپ کے خدمتگاروں کی شان و شوکت سے بلکہ اس طرز عمل سے جو آپ اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے اختیار کریں گے ...... اگر ہم آپ کے حقوق و مراعات کا لحاظ رکھتے ہیں تو آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ آپ بھی ان لوگوں کے حقوق کا خیال رکھیں جن پر آپ کی حکومت قایم ہے۔ ہم آپ کے اختیارات کو قایم رکھنے میں آپ کے پشت و پناہ ہیں اور ہم اس کے صلہ میں توقع رکھتے ہیں کہ آپ اپنی ریاستوں میں اچھی حکومت قایم رکھیں گے۔ ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ راجپوتانہ کے طول و عرض میں ہر جگہ امن و امان اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ہر شخص کی ملکیت محفوظ رہے۔ مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا کھٹکے آجاسکیں کاشتکار اپنی محنت کا پھل پائے اور اور تاجر اپنے بیوپار سے نفع کمائے۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں سڑکیں بنائیں، آبپاشی کا انتظام کریں تاکہ رعایا کی حالت میں بہتری کی صورت پیدا ہو اور آپ کی ریاستوں کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ بیماروں کے لئے علاج کا انتظام کریں اور تعلیم کی اشاعت کریں" [1]

[1] The British Crown and the Indian States, p. 63-64.

لارڈ میؤ نے محکمۂ سیاسیہ کو براہ راست اپنے تحت لے لیا تھا۔ اس لئے والیان ریاست کی نابالغی کے زمانے کے لئے بعض عام اصول بنائے جن پر مختلف ریاستوں میں عمل کیا گیا۔ ایسی حالت میں بالواسطہ حکومت ہند کی نگرانی قایم کردی گئی۔ بالواسطہ راجپوتانہ کے والیان ریاست کو یہ بات جتادی گئی کہ حکومت ہند کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ معاہدوں کی لفظی پابندی کرے بلکہ بالادست قوت کی حیثیت سے وہ ان کے انتظام کو بہتر بنانے کیلئے جب ضروری خیال کرے مداخلت کرسکے گی۔ ان کی خود مختاری اور مطلق حکمرانی کے اصول اسی وقت تک ہیں جب تک کہ اندرونی نظم و نسق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی جس کا تعین کرنا حکومت ہند کا فرض ہے اس کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صورتوں میں بالادست قوت کے معاشی اور مالی مفاد کو ترقی دینے کی تدبیریں اختیار کرنے میں بڑی سہولت ہوگئی۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ ملک میں ریلوے کی وسعت عمل میں آرہی تھی۔ لارڈ میؤ کے ایماء پر یہ اصول تسلیم کرلیا گیا کہ جس ریاست میں سے ریلوے لائین گزرے وہاں اس کے لئے مفت زمین حاصل کرلی جائے اور اس پر حکومت ہند کا اقتدار اور اختیار سماعت تسلیم کیا جائے۔ چونکہ محکمۂ سیاسیہ کی طرح تعمیرات (پی۔ڈبلیو۔ڈی) کا محکمہ بھی براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھا اسلئے ریلوں کے لئے ریاستوں سے زمینیں حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ لارڈ میؤ یہ چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں کے نظم و نسق میں بہتری پیدا ہو لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ سب کچھ انگریزی حکومت کے اشارہ پر ہو۔ اگرچہ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے والیان ریاست سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اندرونی آزادی کا احترام کیا جائے گا لیکن عملی طور پر حکومت ہند کو اپنی صوابدید پر یہ اختیار حاصل رہا کہ اگر کسی ریاست کے انتظام میں خرابی پیدا ہو تو وہ مداخلت کرکے انتظام کو درست کرلے۔ لارڈ میؤ کے زمانے میں الور اور کاٹھیاوار کی بعض ریاستوں میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ لارڈ میؤ نے ان والیان ریاست کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ الور کے راجا کو گدی سے ہٹا کر اس کے

اختیارات عارضی طور پر ایک کونسل کے سپرد کردئے گئے جس کے ارکان کو حکومت ہند نے منتخب کیا تھا میئو نے والیان ریاست کی اولاد کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اجمیر میں ایک کالج قایم کیا جو راجکمار کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کالج کی تعلیم میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ راجکماروں کو ان کی آئندہ ذمہ داریوں کیلئے تیار کیا جائے۔ اور انھیں ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے لئے مفید ہو اور آئندہ انھیں اچھا حکمراں بننے میں مدد دے۔ ریاستوں کا انتظام درست کرنے کی یہ نہایت مناسب تجویز تھی جس سے خاطر خواہ نتائج حاصل ہوئے۔ بعد میں راجکوٹ اور لاہور میں بھی اسی قسم کے کالج قایم کئے گئے جن میں وہی اصول مدنظر رکھے گئے جن کے مطابق اجمیر کے راجکمار کالج کو قایم کیا گیا تھا۔

لارڈ میئو نے ۱۸۷۰ء میں ریاست الور کے معاملوں میں وہاں کی بدنظمی کے باعث مداخلت کی۔ راجا کو گدی سے ہٹا کر ریاست کا انتظام ایک مجلس کے سپرد کردیا جس کی صدارت انگریزی حکومت کے ایجنٹ کے ذمہ قرار پائی اور وہی اصل کرتا دھرتا بن گیا۔ حالانکہ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے والیٔ الور سے معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے ریاست کی فوجی حفاظت کے علاوہ یہ وعدہ کیا تھا کہ اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی[۱]۔ تاج سے براہ راست تعلق پیدا ہو جانے سے والیان ریاست کو اپنی بقا کے متعلق تو اطمینان پیدا ہو گیا تھا لیکن لارڈ کیننگ ہی کے وقت سے انکی دستوری حیثیت کو برطانوی مرکزی حکومت کے مفاد میں کمزور کرنے کی کوشش کی گئی اور لارڈ میئو نے خاص طور پر اس رجحان کو اور زیادہ قوی کردیا۔ اب برطانوی حکمت عملی کا منشا اپنے مقبوضات کو وسیع کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مفاد یہ تھا کہ مرکزی حکومت کے اثر اور نفوذ کو بڑھایا جائے اور ہندوستان کے سیاسی نظام میں ریاستوں کو ایک لازمی جزو کی حیثیت سے جگہ دی جائے۔

لارڈ میئو کے عہد حکومت میں نہروں ریلوں اور سڑکوں کی توسیع کی تجویزوں کو خود اس کی ذاتی نگرانی میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ حکومت ہند میں

---

[۱] Aitchison, Vol. III, p. 322

محکمہ زراعت اور محکمہ تجارت قایم ہوئے تاکہ ان دونوں شعبوں پر ان کی اہمیت کے لحاظ سے توجہ کی جا سکے اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہو۔ اعداد و شمار کا محکمہ قایم ہوا اور ملک میں پہلی مرتبہ مردم شماری لی گئی۔ لارڈ میئو جیل کے انتظام میں بھی اصلاح کرنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ فروری ۱۸۷۲ء میں جزیرۂ انڈمنس گیا تاکہ خود حالات کا معائنہ کرے۔ وہاں ایک قیدی نے اس کو قتل کر دیا۔ لارڈ میئو کی دردناک موت پر ہر طرف رنج والم کا اظہار کیا گیا اس واسطے کہ وہ ایک اصلاح پسند اور محنتی حکمراں تھا اور رعایا کی بھلائی کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اس کے قتل کے بعد گورنر مدراس لارڈ نیپیر نے گورنر جنرل کے فرائض ۱۸۷۲ء کی ابتدا تک سنبھالے جب کہ انگلستان سے لارڈ نارتھ بروک اس عہدہ پر نامزد ہو کر آ گئے۔

لارڈ نارتھ بروک ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء

لارڈ نارتھ بروک کا انتخاب ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے کے عہدہ کے لیئے مسٹر گلیڈسٹن نے کیا جو اس زمانے میں انگلستان کا وزیر اعظم تھا لارڈ نارتھ بروک لبرل وزارت میں نائب معتمد جنگ کی خدمت پر فائز رہ چکا تھا۔ وہ نظم و نسق کے عملی مسائل کا کافی تجربہ رکھتا تھا۔ وہ مزاج میں اپنے پیشرو لارڈ میئو اور اپنے جانشین لارڈ لٹن سے بالکل مختلف تھا۔ نہ اس میں میئو کی سی قوت عمل تھی اور نہ لٹن کی سی آب و تاب۔ اس کی ہر بات ہچکچاہٹ اور احتیاط کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کے نظم و نسق کی خصوصیت سر جان لارنس کی سی بے عملی ہے۔ وہ آگے قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا چنانچہ اس نے اپنی سرگزشت (میموارز) میں لکھا ہے کہ میری پالیسی کا اصول یہ تھا کہ معاملے جیسے چل رہے ہیں انھیں اسی طرح سے چلنے دیا جائے تاکہ کسی قسم کا ملک میں ہیجان نہ پیدا ہو[1]۔

لارڈ نارتھ بروک کو مالیات کے معاملوں کا کافی تجربہ تھا۔ اس نے

---

[1] Thomas George, Earl of North brook, "A Memoir" by B. Mallet, p. 69.

حکومت ہند کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں اگرچہ انگلستان کی حکومت کی مخالفت کرنی پڑی لیکن اس نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔ اس زمانے میں ہندوستان سے باہر جانے والے مال پر بحساب قیمت دس فی صدی اور دوسرے ملکوں سے آنے والے مال پر تین فی صدی محصول حکومت ہند وصول کیا کرتی تھی۔ لارڈ نارتھ بروک نے درآمد کے محصول کو گھٹا کر پانچ فی صدی کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اکثر برآمد ہونے والی اشیا کا محصول بالکل معاف کر دیا تاکہ ہندوستانی تجارت کو ترقی کا موقع ملے۔ چونکہ ہندوستان سے اکثر اشیائے خام باہر جاتی تھیں اس واسطے اس تجویز سے کاشتکاروں کو فائدہ ہوا۔ حکومت انگلستان چاہتی تھی کہ درآمد پر جو پانچ فی صد محصول رکھا گیا ہے اسے اٹھا دیا جائے تاکہ مانچسٹر کے کپڑے کی گرنیوں والوں کو نفع کمانے کا موقع ملے۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک نے اس کا صاف جواب دے دیا کہ یہ محصول کسی حالت میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت ہند ہندوستان کے مفاد کے مقابلہ میں انگلستان کے تاجروں کے مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔ اس نے محصول آمدنی کو ختم کر دیا جو کیننگ کے زمانے میں رائج کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کے متوسط طبقہ کا بار ہلکا ہو اور اس کی وفاداری سلطنت برطانیہ کے ساتھ استوار ہو۔[1] لارڈ نارتھ بروک کا خیال تھا کہ اگر محصول آمدنی کو ختم کر دیا گیا تو اس سے ملک میں بہتر سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکمت عملی کے طور پر محصول آمدنی کو ختم کرنے کے خاطر خواہ نتائج نکلے لیکن معاشی نقطۂ نظر سے لارڈ نارتھ بروک کی رائے کی صحت مشتبہ ہے۔ اگر محصول آمدنی کے بجائے محصول نمک کو ختم کیا جاتا تو عوام کو زیادہ فائدہ ہوتا۔ لیکن گورنر جنرل کو عوام کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقے اور تاجروں کی جو سیاسی شعور رکھتے تھے اور جن کی رضامندی کو حکومت عوام کے مفاد

[1] Ibid., p. 69-80.

کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ لارڈ نارتھ بروک نے اپنے عہد میں کوئی نیا محصول نہیں جاری کیا۔ اس نے بعد میں لکھا تھا کہ "اہل ہند انفعالی طور پر ہمارے وفادار رہیں گے اگر ہم ان پر محصولوں کا بار نہ ڈالیں۔ رہا عملی طور پر ہماری وفاداری میں ان کا سرگرم ہونا اس کی ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔"

بنگال اور بہار کا قحط ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۴ء میں بنگال کے بعض حصے اور بہار کا پورا علاقہ قحط سے متاثر تھا۔ لارڈ نارتھ بروک کے حکم سے حکومت ہند نے چاول کی بہت بڑی مقدار برما سے خرید کر قحط زدہ علاقوں میں تقسیم کی اور گزشتہ قحطوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اس دفعہ بہت اچھا انتظام کیا۔ متاثرہ علاقوں میں حکومت کی طرف سے امدادی کام جاری کر دیئے گئے تاکہ رعایا کی تکلیف میں کمی ہو اور گاؤں کے غریب لوگوں کو روزگار فراہم ہو جائے۔ دیہات میں نہریں کھدوانے اور سڑکیں بنوانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا گیا جس سے ملک کو بھی آئندہ فائدہ پہنچا اور وقتی امداد سے بہت سے لوگوں کی جانیں بچ گئیں۔ اس ضمن میں حکومت ہند کے رکن مالیات سر رچرڈ ٹمپل کی کوششیں قابل تعریف ہیں جس کی انتظامی قابلیت تمام رکاوٹوں پر غالب آگئی۔ اس نے اس وقت تک قحط کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جب تک کہ متاثرہ علاقوں میں لوگوں کو پھر سے اطمینان حاصل نہ ہو گیا۔ اگرچہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جارج کیمبل قحط زدہ علاقوں میں احتیاط سے روپیہ خرچ کرنا چاہتا تھا لیکن مرکزی حکومت نے بڑی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دیا۔ چونکہ قحط کو دور کرنے میں مرکزی حکومت نے تمام روپیہ صرف کیا تھا اس لئے سارا انتظام اور نگرانی بھی مرکزی حکومت کی رہی اور لفٹنٹ گورنر بنگال پر اس دفعہ بھروسہ نہیں کیا گیا جس کی اس کو شکایت تھی قحط کے ختم ہو جانے کے بعد بھی غلہ کے ذخیرے باقی رہ گئے جنھیں حکومت نے سستے داموں بیچ ڈالا۔ سر رچرڈ ٹمپل نے معترضوں کو یہ جواب دیا کہ اگر وقت پر بارش نہ ہو جاتی تو اندیشہ تھا کہ قحط کا سلسلہ آئندہ سال بھی چلے گا۔ چنانچہ

احتیاطاً غلہ کے ذخیرے جمع کر لئے گئے تھے تاکہ ضرورت کے وقت رعایا کو تکلیف نہ ہو اور فاقوں سے جانیں ضائع نہ ہوں۔ لیکن چونکہ بارش ہو جانے کی وجہ سے اس ذخیرہ کو استعمال کی نوبت نہیں آئی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ حکومت نے فضول خرچی سے کام لیا۔ اگر آئندہ کے لئے ذخیرہ نہ رکھا جاتا تو عین وقت پر حکومت رعایا کی مدد کرنے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی آنے والی مصیبت کے لئے پیش بندی کرنا حکومت کا فرض تھا[1]

ریاست بڑودہ میں مداخلت

مہاراجہ ملھار راؤ گائکواڑ والی بڑودہ اور حکومت ہند میں کچھ عرصے سے آن بن چلی آ رہی تھی۔ حکومت ہند نے بعض انتظامی معاملات کے متعلق مہاراجہ کو فہمائش بھی کی گئی لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اس زمانے میں بڑودہ میں کرنل فیر ریزیڈنٹ مہاراجہ کا مخالف تھا۔ اختلاف کی اصلی وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ کے جانشین کو ریزیڈنٹ اس کی اولاد نہیں تصور کرتا تھا اور اسکے خلاف حکومت ہند کو اپنی رائے سے مطلع کر چکا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں ریزیڈنٹ کو کسی نے شربت میں زہر دینے کی کوشش کی تو حکومت ہند نے اس واقعہ کی نسبت تحقیق کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جو چھ ارکان پر مشتمل تھا تین انگریز اور تین ہندوستانی (ایں) کے صدر کلکتہ ہائیکورٹ کا چیف جسٹس سر رچرڈ کوچ تھا۔ ہندوستانی ارکان مہاراجہ گوالیار مہاراجہ جے پور اور سر ڈنکر راؤ تھے۔ ان تینوں کی رائے تھی کہ مہاراجہ بڑودہ زہر خورانی کے معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں لیکن انگریز ارکان نے مہاراجہ پر جرم کو ثابت قرار دیا۔ مہاراجہ کی طرف سے مسٹر سرجنٹ بیلنٹائن نے بڑی قابلیت سے مقدمہ کی قانونی پیروی کی۔ غرضکہ آخری تجویز کے لئے معاملہ کو وائسرائے کی خدمت میں پیش کر دیا گیا جس کو بالادست قوت کے نمائندے کی حیثیت سے والیان ملک پر ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ جب یہ دیکھا گیا کہ مقدمہ ثابت نہیں ہوتا تو حکومت ہند نے وزیر ہند کے مشورے سے

[1] Temple, Men and events of my time in India, P. 403, 404

بدانتظامی کے الزام میں مہاراجہ کو گدی سے ہٹا کر مدارس بھیج دیا اور اس کے ایک نوعمر رشتہ دار کو گدی نشین کیا گیا۔ سرمادھوراؤ کو بحیثیت وزیر اعظم نظم و نسق کے وسیع اختیارات دیے گئے۔ جب تک راجہ نابالغ رہا حکومت کی نگرانی ریاست پر قایم رہی۔ مہاراجہ کے خلاف حکومت ہند نے جو فیصلہ کیا اس پر دیسی زبان کے اخباروں میں سخت تنقید کی گئی خود بڑودہ کی رعایا میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ حکومت ہند کے طرز عمل پر یہ تنقید بالکل صحیح ہے کہ جس الزام کی بنا پر مہاراجہ بڑودہ کے خلاف ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا اور مقدمہ چلایا گیا تھا اس کے تحت اس کو معزول نہیں کیا گیا بلکہ بدنظمی کے ایک عام اور مبہم الزام پر جس کا قانونی تعین ممکن نہ تھا لارڈ نارتھ بروک نے ریاست بڑودہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو ان الفاظ میں حق بجانب قرار دیا جن سے اس کی دیسی ریاستوں سے متعلق حکمت عملی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہئے کہ کسی دیسی ریاست کے باشندے بدانتظامی کے خلاف صرف بالادست قوت سے رجوع کر سکتے ہیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ والیان ریاست کو اب ان انقلابی بغاوتوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا جو قدیم زمانے میں ظلم و زیادتی کا واحد علاج تھا۔ لیکن اب ملکہ معظمہ کے راج میں ظلم و زیادتی کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی ایسی حکومت کے تحت بدنظمی پھیل جائے جس کی پشت پناہی پر بالادست قوت موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انگریزی حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ ایسی ریاست کے انتظام کو درست کرنے کی کوشش کرے جہاں ابتری پھیلی ہوئی ہو۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے کمیشن مقرر کرنے کا حق جیسا کہ مہاراجہ بڑودہ کے متعلق تحقیق اور تفتیش کے لئے مقرر کیا گیا حکومت ہند کو کس طرح حاصل ہوا۔ کیا معاہدوں میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ معاہدوں میں ایسی کارروائیوں کا حکومت ہند کو مجاز نہیں کیا گیا ہے لیکن عمل درآمد یہ رہا ہے کہ بالا دست قوت کی حیثیت سے حکومت ہند نے خود یہ حق حاصل کر لیا ہے۔ پھر قانون کا یہ عام اصول ہے کہ جب تک کسی شخص پر جرم ثابت نہ ہو جائے اس کو بے خطا سمجھنا چاہئے۔ لیکن بالا دست قوت اس قسم کے معاملات میں عدالتی فیصلہ کا انتظار کئے بغیر من ملنے طور پر جو کچھ چاہتی ہے خود کرتی ہے۔ چنانچہ مہاراجہ بڑودہ کو اس سے پہلے کہ کمیشن اپنی رپورٹ پیش کرے حکومت ہند نے تمام اختیارات سے قطعاً محروم کر دیا تھا۔ اس سے صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے ریاستوں کی جاگیردارانہ نوعیت پر کچھ عرصے سے زور دینا شروع کیا تھا تاکہ والیان ریاست کو اس کا احساس ہو کہ وہ تاج برطانیہ کے ماتحت ہیں اور اس کی رضامندی ان کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔

افغانستان سر جان لارنس کی تقلید میں لارڈ نارتھ بروک نے بھی افغانستان کے اندرونی معاملوں میں عدم مداخلت کی حکمت عملی اختیار کی۔ امیر شیر علیخاں چاہتا تھا کہ کوئی معاہدہ ہو جائے تاکہ حکومت ہند کے ساتھ ان کے تعلقات واضح ہو جائیں۔ اس زمانے میں روسی اثر ترکستان میں بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے امیر شیر علی کو تشویش ہوئی تھی۔ روسی فوجیں افغانستان کی شمالی سرحد تک پہنچ گئی تھیں۔ ۱۸۷۳ء میں روسیوں نے خیوا پر قبضہ کر لیا تھا اور خان خیوا روسی حکومت کا باجگزار بن گیا تھا۔ ان حالات میں امیر افغانستان نے حکومت ہند کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنا ایک سفیر بات چیت کی غرض سے وائسرائے کے پاس روانہ کیا۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک افغانستان کے معاملے میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں اس نے اپنے ایک خط میں جو سر لوی سیلث کے نام ہے لکھا تھا کہ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت ہند افغانستان کی بابت اپنی حکمت عملی میں کسی قسم کی تبدیلی کرے۔ نظری طور پر روس کا خطرہ چاہے کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو لیکن اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا کہ

وہ ہندوستان پر حملہ کرے گا۔[1]

جب انگلستان میں ڈزرائیلی کی سرکردگی میں قدامت پسند حکومت برسر اقتدار ہوئی تو لارڈ نارتھ بروک کو نئی حکومت کے دفتر خارجہ نے خطرہ کی اہمیت اور اس کے نتیجوں کی جانب متوجہ کیا۔ لارڈ سالبسری نے جو اس قدامت پسند حکومت میں وزیر ہند تھا، امیر افغانستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کی تائید کی اور ضرورت کے وقت اس کو مدد دینے اور اس کے ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ لیکن لارڈ نارتھ بروک کو وزیر ہند کی حکمت عمل سے اتفاق نہ تھا۔ اس لئے اس نے استعفا دے دیا اور اس کی جگہ لارڈ لٹن وائسرائے مقرر ہوا۔ لارڈ نارتھ بروک کا خیال تھا کہ اگرچہ وزیر ہند کا عہدہ وائسرائے کے عہدہ سے بلند ہے لیکن پارلیمنٹ نے وائسرائے اور اس کے ساتھیوں کو بعض ایسے حقوق بھی دے ہیں جن کی وجہ سے وہ وزیر ہند کا تابع فرمان نہیں کہا جا سکتا۔[2]

---

[1] Mallet, Earl of North brook, p. 59. The Cambridge History of India, Vol. IV, p. 215.

[2] Mallet, Ibid, p. 91.

ستر ھواں باب

لارڈ لٹن کی شہنشاہیت پسندی

لارڈ لٹن انگلستان کی قدامت پسند جماعت کا ایک با اثر رکن تھا کابینہ وقت اور وزیر ہند سالبری نے اس کو اس لئے ہندوستان بھیجا کہ وہ وہاں جاکر افغانستان کے بارہ میں نئے اصول کار کو نافذ کرے جو انگلستان کی خارجی حکمت عملی کے مطابق ہوں۔ چنانچہ لارڈ لٹن کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے پیشروؤں کی طرح عدم مداخلت کی منفیانہ حکمت عملی کو ترک کرکے امیر شیر علی کے ساتھ معاہدہ کرے تاکہ افغانستان میں برطانوی مفاد کا تحفظ ممکن ہو اور وہاں روسی حلقۂ اثر نہ قائم ہو سکے۔

لٹن نے سرحد پر فوجی استحکام کی خاطر خان قلات سے کوئٹہ اور اس کے مضافات کو خرید لیا جو ہندوستان کی سرحد پر فوجی نقل و حرکت کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت اہمیت رکھتے تھے۔ کوئٹہ سے درۂ بولان کے حملہ آور کی مدافعت موثر طور پر ممکن تھی۔ امیر شیر علی کو یہ انتظام پسند نہیں آیا۔ اس کے دل میں شبہہ پیدا ہوا

کہ کہیں حکومت ہند کوئٹہ سے آگے بڑھ کر قندھار پر قبضہ کا ارادہ تو نہیں رکھتی۔ مہاراجہ کشمیر سے گلگت حاصل کیا گیا تو اسے بھی افغانستان میں شبہہ کی نظر سے دیکھا گیا اس واسطے کہ یہ مقام بھی افغانستان کی شمالی سرحد پر واقع تھا۔ امیر شیر علی انگریزی حکومت کی نیت سے کھٹک گیا تو اس نے روسی حکومت سے اپنے تعلقات بڑھانے شروع کر دئے۔ چنانچہ ایک روسی وفد کابل آیا جس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس اثناء میں یورپ میں روس اور ترکی جنگ چھڑ گئی اور حکومت برطانیہ نے اپنی خارجی مصلحتوں کے مدنظر ترکوں کی طرفداری کا فیصلہ کیا۔ روس نے جو شرطیں ترکی سے منوالی تھیں انھیں انگریزوں کے اشارہ پر ۱۸۷۸ء کی برلن کانگریس میں رد کر دیا گیا۔ روس چونکہ اس موقع پر یورپ کے اکثر ملکوں سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا اس واسطے وہ خاموش ہو گیا۔ اور انگریزی حکومت کو سیاست کاری کی بڑی بھاری جیت رہی۔ ترکی میں جب روس کو اپنے سیاسی منصوبے پورا کرنے کا موقع نہ ملا تو اس نے افغانستان کی سرحد پر فوجیں بھیجنا شروع کیں تاکہ انگریزوں کو ذرا پریشانی ہو۔ امیر شیر علی کو اپنی شمالی سرحد پر روسی فوجوں کا جماؤ اگرچہ ناپسند تھا لیکن وہ اس بارہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس موقع پر لارڈ لٹن تدبیر اور معاملہ فہمی سے کام لیتا تو ممکن تھا امیر شیر علی حکومت ہند سے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لٹن نے اپنے طرز عمل سے معاملات کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا جن کی وجہ سے دوسری جنگ افغانستان کی نوبت آئی۔

لارڈ لٹن نے امیر افغانستان کو کہلا بھیجا کہ حکومت ہند یہ ارادہ کر رہی ہے کہ عنقریب ایک وفد کابل بھیجے تاکہ ملکہ وکٹوریہ کے ملکہ ہند (امپرس آف انڈیا) ہونے کا افغانستان کے دارالسلطنت میں باقاعدہ اعلان کیا جائے۔ امیر صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ ساری کارروائی بالکل غیر ضروری ہے۔ اس قسم کا کوئی انتظام اس واسطے قرین مصلحت نہ ہوگا کہ وفد کے ارکان کی جان کی حفاظت حکومت افغانستان اپنے ذمہ نہیں لے سکتی۔ لارڈ لٹن کو یہ جواب بہت ناگوار گزرا۔ اس نے اس کو اپنے لئے اور اپنی حکومت کے لئے

ایک طرح کی ذلت اور ہتک سمجھا۔ خود وائسرائے کی کونسل کے تین ارکان جن میں سر ولیم میور، سر ہنری نارمن اور سر آرتھر ہاب ہاوس شامل تھے لٹن کے اس اقدام کے خلاف تھے اور امیر افغانستان کو حق بجانب سمجھتے تھے کہ وہ حکومت ہند کے وفد کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت نہ دے۔

جنوری ۱۸۷۷ء میں افغانی نمایندے سید نور محمد اور سر لوئس پیلی کی پشاور میں ملاقات ہوئی تاکہ معاملات کی صفائی کرلی جائے۔ سید نور محمد نے حکومت ہند کی اس خواہش کو ماننے سے انکار کیا کہ انگریزی ریزیڈنٹ مستقل طور پر کابل میں رہے۔ اس نے یہ بات واضح کردی کہ اگر امیر شیر علی حکومت ہند کو اس کی اجازت دے دیں کہ ان کا ریزیڈنٹ کابل میں رہے تو افغانی لوگ یہ خیال کریں گے کہ افغانستان پر انگریزوں نے اپنا اثر قایم کرلیا ہے۔ ایسی حالت میں خود امیر شیر علی اپنے تخت و تاج کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اسلئے کہ افغانی آزادی کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں غرضکہ جس اصول پر لٹن نے افغانستان سے تعلقات قایم کرنے چاہے وہ حکومت افغانستان کے لئے ناقابل قبول تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی نوعیت دونوں ملکوں کے لئے ناقابل اطمینان تھی۔

آخر لٹن نے امیر صاحب کو پیغام بھیجا کہ اس کو حکومت ہند کی جانب سے جو زر امدادی ملتا ہے اس میں اضافہ کردیا جائے گا اور اس کے چھوٹے بیٹے عبداللہ خان کو اس کی مرضی کے مطابق اس کا جانشین تسلیم کرلیا جائے گا۔ اور اگر افغانستان کی سرحد پر کوئی غیر ملکی حکومت حملہ کرے گی تو حکومت ہند اس کی مدد کرے گی۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جبکہ امیر صاحب ہرات میں انگریزی ریزیڈنٹ کا مستقل طور پر قیام تسلیم کریں۔ لیکن امیر صاحب اس شرط کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ غرضکہ حکومت ہند اور حکومت افغانستان میں بات چیت کچھ عرصے تک بند رہی۔ اب تک لارڈ لٹن نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا تھا جس سے کشیدگی بڑھتی۔ اس نے یہ ضرور کیا کہ گلگت پر قبضہ ہوجانے کے بعد قبائلی علاقوں میں فوجی چوکیاں بنانے کی کوشش کی۔ اس سے امیر افغانستان کے شبہوں میں اضافہ ہوا اور وہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ انھیں کے خلاف ہے۔ کپتان کیوگناری تک نے جو لٹن کا معتمد الیہ اور

اس کی حکمت عملی کے مداحوں میں تھا اس کو متنبہ کیا کہ قبائلی علاقے میں حلقہ اثر بڑھانے کی ہر کوشش کو امیر صاحب اپنے خلاف ایک حربہ تصور کریں گے۔ اس لئے اس بات میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس دوران میں امیر شیر علی نے روس کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر لیا روسی وفد کا کابل میں سرکاری طور پر استقبال کیا گیا۔ لٹن کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے وزیر ہند سے اس کی اجازت حاصل کر لی کہ امیر شیر علی کو مجبور کیا جائے کہ روسی وفد کی طرح انگریزی وفد کو افغانستان جانے کا موقع دے۔ لٹن کا خیال تھا کہ اگر اب زیادہ عرصے تک افغانستان کے معاملات کی طرف سے حکومت ہند نے بے توجہی برتی تو برطانوی مفاد کو سخت نقصان پہنچ جائے گا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ امیر شیر علی کے اس اختیار کی حد بندی کی جائے کہ وہ بغیر انگریزی حکومت کی اجازت کے جس بیرونی طاقت سے چاہے بات چیت کر سکے۔ جب روسی حکومت کو معلوم ہوا کہ حکومت ہند اپنا وفد بھیجنے والی ہے تو روسی سفیر اسٹول ٹاف کو واپس بلا لیا گیا۔ سیاست کاری کے اصول کے مدنظر یہ ایسا موقع تھا کہ لٹن چاہتا تو بجائے انگریزی مشن بھیجنے پر اصرار کرنے کے امیر صاحب سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی دوسری تدبیریں کرتا۔ لیکن اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سر نیول چیمبرلین کی سرکردگی میں ایک سفارت افغانستان روانہ کر دی۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۷۸ء کو یہ سفارت علی مسجد پہنچی یہاں انھیں معلوم ہوا کہ اگر وہ اور آگے بڑھے تو ان کے خلاف افغانی حکومت قوت استعمال کرے گی۔ چنانچہ علی مسجد سے وہ پشاور چلے آئے۔ لٹن نے برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد ۲۱ نومبر ۱۸۷۸ء افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ سر سیمول براون کی سرکردگی میں درہ خیبر کی طرف سے میجر جنرل رابرٹس کی سرکردگی میں درۂ پیوار کی طرف سے اور جنرل اسٹورٹ کی سرکردگی میں درۂ بولان کی طرف سے انگریزی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ بغیر کسی مقابلے کے انھوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر شیر علی نے بھاگ کر ترکستان کے روسی علاقہ میں پناہ لی

اس لئے ترکستان کے روسی گورنر کوف مان کو ہر چند آمادہ کرنا چاہا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کچھ اس کی مدد کرے لیکن کوف مان اپنی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایسا کوئی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ امیر شیر علی نے جب یہ خواہش کی کہ اس کو روس کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرزبرگ جانے کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ وہاں جاکر زار کے روبرو اپنا معاملہ پیش کر سکے تو بھی اس کو کوئی ہمت افزا جواب نہیں دیا گیا بلکہ ٹالنے کی کوشش کی گئی۔ اس بے کسی اور پریشانی کے عالم میں ۲۱ر فروری ۱۸۷۹ء مزار شریف کے مقام پر اس نے وفات پائی۔

امیر شیر علی کے انتقال کے بعد حکومت ہند نے اسکے بیٹے یعقوب خاں کو امیر افغانستان مان لیا اور مئی ۱۸۷۹ء میں گندمک کے مقام پر اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے نئے امیر نے وعدہ کیا کہ وہ کابل میں انگریزی ریزیڈنٹ اور ہرات میں انگریزی ایجنٹ کو رکھے گا اور خارجی امور میں حکومت ہند کے مشورہ پر عمل کرے گا۔ حکومت ہند نے چھ لاکھ روپیہ سالانہ زر امدادی دینے کے علاوہ وعدہ کیا کہ اگر افغانستان پر کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہوگی تو اس کی فوجی امداد کی جائے گی۔ یعقوب خاں نے درہ بولان کے قریب کے ضلعے پشین اور سیبی انگریزوں کے حوالے کر دئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ افغانستان میں جہاں جہاں انگریزی فوجیں ہیں وہ سب فوراً ہندوستان واپس ہو جائیں گی سوائے قندھار کی فوج کے جو موسم سرما کے آخر تک وہاں رہے گی اور پھر وہ بھی واپس ہو جائے گی۔ صلح نامہ گندمک لارڈ لٹن کی حکمت عملی کی انتہائی کامیابی سمجھنا چاہئے اس لئے کہ اس میں جو شرطیں طے ہوئیں ان سے انگریزوں کو وہ سب کچھ مل گیا جو وہ عرصے سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بقول لارڈ بیکنس فیلڈ انگریزوں کو ہندوستان کی حفاظت کے لئے سائنٹفک سرحد مل گئی۔ لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ دوبارہ انگریزی حکومت کو یہ تجربہ ہوا کہ افغانستان میں کوئی ایسی حکومت مستحکم بنیادوں پر قایم نہیں سمجھنا چاہئے جس کی پشت پناہی پر غیر ملکی طاقت ہو۔

سرلوئی کیوگناری نے ۲۴- جولائی ۱۸۷۹ء کابل میں ریزیڈنٹ کی نئی خدمت کا جائزہ لیا۔ ۲- ستمبر کو افغانوں نے ریزیڈنسی میں گھس کر اُس کو قتل کر ڈالا اور ریزیڈنسی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ انگریزی افواج دوبارہ افغانستان پر حملہ آور ہوئیں اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب خاں نے پیشتر اس کے کہ انگریزی فوج کابل پہونچے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور سرلوئی کیوگناری کے قتل کے واقعہ سے اپنی بے تعلقی ثابت کی۔ وہ تخت و تاج سے دستبردار ہو گیا اور اپنے آپ کو پوری طرح سے انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ انگریز فوجی افسروں نے کابل پہنچ کر کیوگناری کے قتل کے واقعہ کی مکمل تحقیقات کی تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یعقوب خاں کا اس میں کوئی اشارہ شامل نہ تھا لیکن یہ کہ اس کی جانب سے بے پروائی برتی گئی۔ چنانچہ اس بنا پر اس کو قیدی کی حیثیت سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔

افغانستان میں ہر طرف نراج کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر طرف سے افغانوں کے لشکر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے اور پہاڑوں میں جا کر چھپ جاتے۔ رابرٹس کے لئے بڑا دشوار ہو گیا کہ وہ ہندوستان کے برطانوی علاقے کے ساتھ رسل و رسائل کا سلسلہ جاری رکھ سکے انگریزی فوجیں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھیں کہ جلال آباد، قندھار اور کابل پر قبضہ رکھیں۔ پورے ملک کو زیر تصرف لانا بس کی بات نہ تھی اس واسطے کہ افغانی قوم انتہائی اشتعال کی حالت میں تھی اور وہ انگریزوں کو کسی حالت میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ افغانستان میں اس وقت کسی باقاعدہ حکومت کا وجود بھی نہ تھا جس کے ساتھ انگریزی حکومت معاہدہ کر لیتی۔ بالآخر لارڈ لٹن اس نتیجہ پر پہنچا کہ افغانستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ مشرقی افغانستان کا صدر مقام قندھار قرار پایا اور وہاں کے ایک سردار شیر علی خاں کو حکومت ہند نے حکمران مان لیا۔ اسی طرح شمال مغربی افغانستان پر جس کا صدر مقام کابل ہو گا عبدالرحمٰن کو حکمران تسلیم کر لیا گیا جو امیر شیر علی سابق امیر افغانستان کا

بھتیجا تھا۔ وہ عرصے سے روسی علاقہ میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت کے خلفشار کو دیکھ کر اس نے شمالی افغانستان میں قسمت آزمائی کرنی چاہی۔ اپنے گرد حمایتوں کی ایک بڑی جماعت جمع کر لی۔ روس کے علاقے میں گیارہ سال رہنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ افغانستان کے لئے بمقابلہ روس کے انگریزوں کی دوستی زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ لیکن اس نے انگریزوں کے ساتھ اپنی دوستی کے اظہار میں بڑی احتیاط برتی تاکہ افغانی لوگ اسے مشتبہ نظروں سے نہ دیکھنے لگیں۔ چنانچہ اپنی خود نوشت سوانحعمری میں وہ لکھتا ہے۔

میں انگریزوں کے ساتھ اپنی دوستی اور موافقت کو کھلم کھلا نہیں ظاہر کر سکتا تھا اس واسطے کہ میری قوم جاہل اور متعصب ہے۔ اگر میں انگریزوں کی جانب اپنا رجحان کھلم کھلا ظاہر کرتا تو میری قوم مجھے کافر کہتی جس نے کافروں کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہے۔[1]

یہی وجہ تھی کہ امیر عبدالرحمٰن نے شروع سے انگریزوں کے ساتھ اپنا رویہ ایسا رکھا کہ جس سے اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو اور یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنی دانشمندی اور قوت کے بل پر سب کچھ حاصل کر رہا ہے نہ کہ انگریزوں کی مہربانی سے۔

اسی دوران میں (اپریل ۱۸۸۰ء) انگلستان میں جو عام انتخاب ہوا اس میں قدامت پسند جماعت نے لبرل جماعت کے ہاتھ سخت شکست کھائی۔ لارڈ بیکنس فیلڈ کی جگہ مسٹر گلیڈسٹن نے اپنی کابینہ بنائی جس میں لارڈ ہارٹنگٹن وزیر ہند کے عہدہ پر فائز تھے۔ لبرل جماعت نے پارلیمنٹ میں قدامت پسندوں کی خارجی حکمت عملی پر سخت تنقیدیں کی تھیں اور خاص کر دوسری جنگ افغانستان کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد لارڈ لٹن کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ رپن کو وائسرائے

---

[1] The life of Abdur Rahman, Vol II, p 117.

مقرر کیا گیا۔ نئے وائسرائے کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہندوستان جاکر افغانستان کے معاملے کو سلجھائے اور عبدالرحمن کو امیر تسلیم کرلے۔

لارڈ رپن کے ہندوستان آنے کے بعد ایوب خاں نے جو امیر شیر علی کا بیٹا تھا اور جس نے ہرات کے قرب وجوار میں زبردست لشکر جمع کرلیا تھا قندھار پر حملہ کردیا۔ اس نے میوند کے مقام پر جنرل بروز کی انگریزی فوج کو شکست دی لیکن جنرل رابرٹس نے ایوب خاں کو قندھار پر شکست دے کر بھگا دیا۔ لارڈ لٹن نے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ شمالی افغانستان پر عبدالرحمن نے اپنی حکومت کا نقشہ جمالیا تھا لیکن قندھار میں شیر علیخاں کی حکومت کمزور تھی۔ لارڈ رپن افغانستان کی تقسیم کے خلاف تھا۔ اس کے ایما پر شیر علیخاں ہندوستان چلا آیا اور اس کا وظیفہ کردیا گیا اور پورے ملک میں عبدالرحمن کی حکومت تسلیم کرلی گئی۔ انگریزی فوج افغانستان سے واپس بلالی گئی۔ پشین اور سبی کے ضلعوں پر عبدالرحمن نے انگریزوں کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ عبدالرحمن نے ایوب خاں کو شکست دیکر ایران بھگا دیا اور اب پورے ملک میں اس کا کوئی بھی مدمقابل باقی نہ رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ لارڈ بیکنس فیلڈ اور لارڈ سالبری نے ظاہر میں لارڈ لٹن کی مہم افغانستان کی تائید کی لیکن حقیقت میں وہ دونوں یہ نہیں چاہتے تھے کہ افغانستان سے جنگ کی نوبت آئے[1] ہاں ان کا منشاء یہ ضرور تھا کہ افغانستان کے معاملات میں حکومت ہند نے جو دخل نہ دینے کا اصول اختیار کیا ہے اسکو ترک کردیا جائے اور وہ ان تمام معاملوں سے عملی طور پر باخبر رہے جو وسط ایشیا کی سیاست میں روسی اثر کے تحت رونما ہورہے تھے اور جن سے مشرقی ممالک میں حکومتوں کا توازن متاثر ہونے کا امکان تھا۔ لارڈ سالسبری کا تو یہ خیال تھا کہ اگر لارڈ لٹن کے طرزعمل کی روک تھام نہ کی گئی تو وہ برطانوی سلطنت کیلئے خطرے پیدا کردیگا لیکن اس روک تھام

[1] Roberts, History of British India, p. 451

کی نوبت آنے سے پہلے ہی لٹن اپنی اقدامی حکمت عملی میں اتنا آگے بڑھ گیا
تھا کہ جہاں سے اس کو واپس لانا مشکل تھا۔ اگر حکومت انگلستان اس کے
اصول کار کو ناپسند کرتی تھی تو ضرور یہ تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم
اٹھاتا اس کی روک تھام کر لینی چاہئے تھی۔ ان حالات میں انگلستان کی
حکومت کو دوسری جنگ افغانستان کی ذمہ داری سے بری نہیں کیا
جاسکتا۔ وہ خود اپنی پالیسی کی حدیں معین نہ کرسکی جن سے آگے بڑھنے
کی وائسرائے کو اجازت نہ ہونی چاہئے تھی۔ دوسری جنگ افغانستان میں
حکومت ہند کو جان اور مال کا جو نقصان برداشت کرنا پڑا وہ ناقابل تلافی
تھا۔ آخر میں اس مہم کا کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے حکومت ہند کی سبکی کے افغانستان
کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا خیال ناقابل عمل تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا
ہے کہ لٹن میں تدبیر پیش بینی اور اصابت رائے کی کمی تھی۔

اندرونی نظم ونسق

لارڈ لٹن کے ابتدائی عہد حکومت میں دکن
اور جنوبی ہند میں سخت قحط پڑا جس کے اثرات دو
سال تک جاری رہے (۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء)۔ حکومت ہند نے قحط زدہ
علاقوں میں غریبوں کی جانیں بچانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی اور صوبجاتی حکومتوں
کا ہاتھ بٹایا۔ حکومت ہند نے اس موقع پر یہ اصول اختیار کیا کہ غریبوں سے
کام لے کر بطور معاوضہ ان کے قوت لایموت کا انتظام کیا جائے۔ لٹن
نے سر رچرڈ اسٹریچی کی صدارت میں قحط کے اسباب اور حالات پر تحقیق
کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش
کی کہ اگرچہ حکومت کا یہ فرض ہے کہ قحط کے موقع پر غریبوں کی امداد کرے
لیکن اس کے ساتھ حکومت کو چاہئے کہ لوگوں میں خود اپنے اوپر بھروسہ
کرنے کا احساس زائل نہ ہو۔ خیرات کی تقسیم سوچ سمجھ کر ہونی چاہئے ورنہ
اندیشہ ہے کہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔ رپورٹ میں عام اصول
پیش کردئے گئے جنھیں ہر صوبہ اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھال سکتا تھا
تاکہ مقامی حالات ہر صورت میں مدنظر رہیں۔ اس ضمن میں زراعت پیشہ

آبادی کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کی جانب حکومت کو متوجہ کیا گیا۔ حکومت کا فرض قرار دیا گیا کہ قحط کے زمانے میں خاص طور پر بھی تاجروں کو سہولتیں فراہم کرے تاکہ ان کے ذریعے سے غلہ ان علاقوں میں بھی پہنچ جائے جہاں رسل و رسائل کی دشواری ہے۔ غالباً کمیشن کی اس سفارش کو آج کل جبکہ مملکت کا اثر و نفوذ تجارتی معاملات میں بڑھ رہا ہے اچھی نظر سے دیکھا جائے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ زمانہ آزاد تجارت کے عروج کا زمانہ ہے۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ قحط زدہ علاقوں میں حکومت کے محاصل معاف کر دینے چاہئیں اور وسیع پیمانے پر تقاوی تقسیم کرنی چاہئیں جنھیں قسط وار کاشتکاروں سے وصول کیا جا سکتا ہے۔ انھیں سفارشوں کے مطابق بعد میں ۱۸۸۳ء میں "ضوابط تدارک قحط" (فیمن کوڈ) مرتب کی گئی جس میں اصول بتا دیے گئے جن کی روشنی میں صوبے اپنے مقامی ضابطے بنا سکتے تھے اور جن میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی جا سکتی تھی۔

لٹن آزاد تجارت کے اصول کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے متعدد اشیاء پر درآمدی محصول بند کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی بندرگاہوں میں دنیا بھر سے بے کسی روک ٹوک کے مال کی درآمد ہوتی رہے۔ لیکن اہل ہند میں وہ لوگ جو صاحب فکر تھے لٹن کے اصول کے خلاف تھے۔ خاص طور پر لنکاشائر کے کپڑے کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا اس کو اٹھا دینے سے حکومت ہند کی آمدنی متاثر ہوتی تھی۔ چنانچہ خود انگریز اعلیٰ حکام میں ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو لنکاشائر کے کپڑے پر سے محصول اٹھا دینے کو ہندوستان کے مفاد کے خلاف تصور کرتی تھی۔ دراصل لنکاشائر کے سرمایہ داروں کا قدامت پسند پارٹی میں بہت اثر تھا۔ اسی اثر کی وجہ سے جولائی ۱۸۷۷ء میں دارالعوام میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ہندوستان میں جو لنکاشائر سے کپڑا جاتا ہے اس پر محصول نہیں لگانا چاہئے اس لئے کہ اس قسم کا محصول اصول تجارت کے خلاف ہے۔ وائسرائے کی کونسل کی اکثریت کی بھی یہی رائے تھی کہ لنکاشائر کے کپڑے پر درآمدی محصول برقرار رکھنا چاہئے

لیکن لارڈ لٹن نے اپنی کونسل کی اکثریت سے اختلاف کیا اور اپنے اختیار تمیزی سے اکثریت کی رائے کے خلاف فیصلہ کیا جس کا اسے دستوری حق بہ حیثیت وائسرائے حاصل تھا۔

لارڈ میو کے عہد حکومت میں جو مالیاتی عدم مرکزیت کی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی اسے سر جان اسٹریچی نے بہ حیثیت رکن مالیات اور زیادہ فروغ دیا۔ محکمہ فوج کے متعلق بجٹ میں جو تخمینے پیش کئے گئے تھے ان میں بڑی غلطیاں نکلیں۔ چنانچہ فوجی محاسبی کے دفتر کی جدید تنظیم عمل میں آئی ایمپی سول سروس (اسٹیٹوٹری سول سروس) کا قیام لارڈ لٹن کے ایما پر ہوا اور ایسے ضابطے بنائے گئے جن کی رو سے ہندوستانیوں کے لئے اعلیٰ عہدوں کی ۱/۶ تعداد محفوظ کر دی گئی جنھیں حکومت ہند نامزد کرے گی۔

۱۸۷۸ء میں حکومت ہند نے ورناکلر پریس ایکٹ منظور کیا جس کے بموجب کلکٹر یا مجسٹریٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید پر کسی دیسی زبان کے اخبار کے اڈیٹر سے ضمانت طلب کر سکے اگر وہ سمجھے کہ کسی شائع شدہ مضمون سے برطانوی حکومت کے خلاف یا مختلف نسلوں یا مذہبوں کے لوگوں میں آپس میں نفرت پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ مقامی زبانوں کے ہر اخبار یا رسالے میں جو مضمون شائع ہونے والا ہوتا تھا اس کا پروف پہلے حکومت کا مقرر کیا ہوا افسر دیکھ کر جب اجازت دیتا تو اس وقت وہ شائع کیا جا سکتا تھا۔ لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ قانون نے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ایک خطرناک آلۂ کار دیدیا ہے جو اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ اس قانون کو ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے ناپسند کیا اس لئے کہ اس میں دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کی خصوصیت تھی اور انگریزی کے اخبار و رسالوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ اس سے صاف نسلی امتیاز ظاہر ہوتا تھا۔ خود وائسرائے کی کونسل کے تین ارکان اس قانون کے جاری کرنے کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چند اخباروں کی بے لگامی کی وجہ سے حکومت کو اس قسم کا قانون منظور کرنے کا حق نہیں ہو سکتا جو انگریزی زبان اور دیسی زبانوں کے

اخباروں میں بے جا فرق و امتیاز کرے۔

لٹن۔ سے پہلے کسی وائسرائے پر انگلستان میں ایسی سخت نکتہ چینی نہیں ہوئی جیسی کہ اس پر ہوئی ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۸ء تک جو قحط پڑا اس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوگئیں۔ افغانستان کی لڑائی میں بھی ہزاروں جانیں کام آئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ انگلستان کی لبرل جماعت نے خاص طور پر لٹن کو ملامت کا نشانہ بنایا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ رائے قایم کرنے میں اکثر بڑی جلد بازی سے کام لیتا تھا جو ایک مدبر کی شان کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و توازن سے زیادہ اس کا تخیل اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ چنانچہ بعض امور میں جو رائے اس نے قایم کی اور جس کے بموجب وہ اپنے زمانے میں کوئی عمل اقدام نہ کرسکا اس پر آئندہ حکومت ہند نے عمل کیا۔ مثلاً وہ ہندوستان کی مالیات کے لئے طلائی معیار قایم کرنا چاہتا تھا جس پر بعد میں عمل ہوا۔ وہ شمال مغربی صوبہ پنجاب سے علحدہ قایم کرنا چاہتا تھا۔ جو کرزن کے عہد حکومت میں قایم ہوا۔ وہ ہندوستانیوں کو لارڈ بنانے کے موافق تھا اور چاہتا تھا کہ والیان ریاست کی ایک انڈین پریوی کونسل بنائی جائے تاکہ وائسرائے کو مشورہ دے سکے۔ اب تک حکومت ہند کی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ دیسی ریاستیں سوائے حکومت ہند کے توسط کے کسی دوسرے ذریعہ سے نہ کسی بیرونی حکومت سے اور نہ آپس میں سیاسی بات چیت کریں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور الگ تھلگ رہیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے انگریزی حکومت اور والیان ریاست کے درمیان جو معاہدے ہوئے ان میں یہ شرط ضرور رکھی گئی کہ وہ کمپنی کے بغیر آپس میں بے تعلق رہیں۔ لارڈ لٹن پہلا حکمران ہے جس نے اس ضمن میں ایسی حکمت عملی کو رائج کرنا چاہا جس کا مقصد حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ والیان ریاست کو ملکی سیاست میں اس سے زیادہ اہمیت حاصل ہو جتنی کہ اب تک انھیں حاصل تھی۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دہلی میں لارڈ لٹن نے ایک بڑا زبردست دربار کیا جس میں ملکۂ وکٹوریہ کے قیصر ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ پارلیمنٹ نے قانون بابتہ خطابات شاہی (رائل ٹائٹلز ایکٹ) منظور کردیا تھا جس کا

مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اس امر کا اعلان کیا جائے کہ ملکہ وکٹوریہ ۱۸۵۸ء
کے بعد سے سارے ہندوستان کی مقتدر اعلیٰ ہوگئی ہیں جس میں ریاستیں بھی
شامل ہیں۔ یہ قانون انگلستان کی قدامت پسند جماعت کے شہنشاہی اصول کے
موافق تھا۔ لبرل پارٹی اس کی مخالف تھی۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں کثرت رائے
سے یہ قانون منظور ہوگیا جس کا ذکر ملکہ وکٹوریہ نے اپنی شاہی تقریر میں بھی کردیا
لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ اس قانون کے منظور ہونے کے بعد
تاج برطانیہ کے اس تعلق کی نوعیت بالکل بدل جائے گی جو والیان ریاست
اور اس کے درمیان موجود ہے۔ اب آئندہ سے گویا تاج برطانیہ ہندوستان
کے شریفوں اور امیروں کی تمناؤں، امیدوں ہمدردیوں اور مفاد سے
وابستہ سمجھا جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے طبقہ امراء اور والیان
ریاست کے جذبۂ وفاداری سے جو ملکہ کے ساتھ انھیں ہے سیاسی فائدہ
اٹھانا چاہئے۔ دہلی دربار کے موقع پر لٹن نے والیان ملک کی پریوی کونسل
کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن برطانوی حکومت نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور
صرف اس پر اکتفا کیا کہ بعض والیان ملک کو "مشیر ملکہ" کے لقب سے یاد
کیا جائے[1] قدامت پسندوں میں سے بعض کو اس تجویز کے منظور کرنے میں
اس لئے تامل تھا کہ کہیں یہ نہ ہو کہ والیان ریاست اپنے متفقہ فیصلوں سے
حکومت ہند کے لئے زحمت کا موجب بن جائیں۔ لیکن آئندہ کے تجربہ
سے ثابت ہوگیا کہ ان کا یہ خدشہ کوئی اصلیت نہیں رکھتا تھا۔

لٹن کو ظاہری شان و شوکت اور طمطراق کا بڑا شوق تھا۔ اس کا
خیال تھا کہ اس کے اظہار سے انگریزی وقار میں اضافہ ہوگا اور انگریزی
حکومت کا رعب داب ہندوستانی رعایا اور والیان ملک سب کو مرعوب
کردے گا۔ لیکن تعجب ہے کہ اس وقت جب کہ دہلی میں بڑے
پیمانے پر شاہی دربار کی تیاریاں ہو رہی تھیں جنوبی اور مغربی ہند میں قحط کی

۱۔ Lady Betty Balfour, Lytton's Indian Administration, p. 109.

پر چھائیاں پڑ رہی تھیں۔ لیکن اس پر بھی دربار ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا اور اس کے ذریعہ سے لٹن کے پیش نظر جو شہنشاہی منصوبے تھے انھیں اس نے پورا کیا۔ دہلی دربار کی کامیابی کے متعلق اس نے وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ کو جو خط لکھا اس میں وہ لکھتا ہے۔

"راجاؤں اور مہاراجاؤں سے تعلقات قایم کرنے کا مجھے جو موقع ملا ان کی وجہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ اپنے خاندانی شجروں اور دستاویزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ والیان ملک کا ایک ایسا طبقہ اس ملک میں موجود ہے جس سے مفر نہیں۔ ہم قطعی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اس طبقہ کو اپنا دوست بنائیں اور پھر اس کو حکم دے کر جو چاہیں کام لیں۔ لیکن ہم نے اب تک کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ہم تاج برطانیہ کو مرکز قرار دے کر والیان ملک کے طبقہ کو اس کے گرد جمع کریں۔ ہر راجا نے جس سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا مجھ پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کا خاندان بہت قدیم ہے۔ نیز یہ کہ بالادست قوت نے وقتاً فوقتاً کس طرح اس کے خاندان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ مجھے ان سے مل کر یہ احساس ہوا کہ یہ طبقہ ان اعزاز کو جو حکومت برطانیہ انھیں عطا کرتی ہے بڑی قدر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے سلامی میں ایک توپ کا اضافہ یا یہ حق کہ وائسرائے بازدید کے لیے آئے یا دربار میں باعزت جگہ ملنا وغیرہ) ٹھیک اسی طرح جس طرح اگلے زمانے میں اکبر اعظم یا بادشاہ اورنگ زیب کے اعزاز و نوازش کو یہ طبقہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا۔"

کچھ ہی دن کے بعد لارڈ لٹن نے لارڈ سالسبری کو جو خط لکھا اس میں بھی اس نے والیان ریاست کی اہمیت اور حیثیت کی نسبت ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔

"میری دانست میں ہمارے قابل اور تجربہ کار اُن انگریز حکام کی یہ بڑی زبردست غلطی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہندوستان میں اچھی حکومت قایم کرکے اس ملک پر پائیدار قبضہ رکھ سکتے ہیں۔ اچھی حکومت سے مراد

یہ ہے کہ رعایا کی حالت سدھاری جائے۔ عدل و انصاف بے رو رعایت برتا جائے۔ آبپاشی کے کاموں پر خوب روپیہ خرچ کیا جائے وغیرہ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا کاشتکار طبقہ شعور و احساس سے بالکل محروم ہے۔ اس میں جب کبھی تھوڑی بہت حرکت پیدا ہوتی ہے تو وہ اطاعت شعاری کے لئے۔ اپنے برطانوی محسنوں کے لئے نہیں بلکہ دیسی امیروں اور والیان ریاست کے لئے چاہے وہ ان پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کریں۔ دیسی رائے عامہ کی نمائندگی صرف بابو لوگ کرتے ہیں جنھیں ہم نے اتنی تعلیم دے دی ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے اخباروں میں باغیانہ مضمون لکھ سکیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بابوؤں کا طبقہ خود اپنے معاشری وجود کی نقیض پیش کرتا ہے۔ اسٹریا نے اپنے اطالوی صوبوں کے نظم و نسق میں جو غلطیاں کیں ان سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ دراصل اٹلی کے کسی حصے میں ایسی اچھی حکومت نہیں تھی جیسی کہ ان صوبوں میں تھی۔ اسٹریا کے ارباب حل وعقد نے اطالیہ کے کسانوں کے مفاد کی حفاظت کی اور اطالوی امیروں کے طبقے کے ساتھ بے اتفاقی کا برتاؤ کیا اس لئے کہ اس طبقے سے وہ ڈرتے رہتے تھے۔ جب اطالوی امیروں کے طبقے کو اسٹریا کی حکومت کے بقا سے اپنے فائدے کی کوئی امید نہیں رہی تو اس نے اس کے خلاف سازش کی۔ ہوا یہ کہ کاشتکاروں نے یا تو ان امیروں کا ساتھ دیا یا بالکل بے تعلق بن کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے امیروں کا ساتھ اس واسطے دیا کہ وہ قومی زندگی میں ان کے رتبے کو بلند خیال کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے غیر ملکی محسنوں کے خلاف حملہ کرنے میں ان کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کا طبقۂ امرا اور یہاں کے والیان ریاست نہایت باا ثر جماعت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے سامنے اس وقت سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح ہم والیان ریاست کو قابلیت کے ساتھ اور موثر طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل ہمیں فوراً بنا بنایا مل جائے

ایک طرف تو ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم والیان ریاست کی دلی وفاداری حاصل کریں جس کا انحصار اس پر ہے کہ ان کا مفاد برطانوی حکومت سے وابستہ و پیوستہ رہے اور دوسری جانب ہم یہ نہیں چاہتے کہ انھیں ایسے اختیارات اور اقتدار حاصل ہوجائے جو انھیں ہم سے بے نیاز کردے۔ اسے ہماری خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ یہ طبقہ جذبات اور ظاہری علامتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے جو حقائق سے بہت کم مطابقت رکھتی ہیں[1]۔"

لارڈ لٹن نے اپنے ذاتی اثر کو جو والیان ریاست پر اسے حاصل تھا بعض معاہدوں کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ متعدد ریاستوں کے ساتھ نمک بنانے کے متعلق حکومت نے معاہدے کئے۔ بعض دفعہ ناجائز اثرات ڈالے گئے۔ ان معاہدوں کی رو سے اکثر ریاستوں کو نمک بنانے کے حق سے محروم کردیا گیا اور اس کے عوض انھیں کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوا۔ بعض صورتوں میں یہ کہا گیا کہ نمک سازی پر حکومت ہند کی نگرانی قایم کردی گئی ہے۔ مثلاً ریاست منڈی اور دوسری چھوٹی ریاستوں میں یہی طریق کار اختیار کیا گیا۔

لارڈ لٹن کا خیال تھا کہ اگر والیان ریاست کا تاج برطانیہ کے ساتھ شخصی نوعیت کا تعلق قایم ہوگیا تو اس سے برطانوی شہنشاہی مقاصد کو ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ وہ اور دوسرے شہنشاہیت کے حامیوں کی طرح سمجھتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد تاج کو نئے حقوق و اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ مغل شہنشاہ کا سارا اقتدار اب تاج برطانیہ کو منتقل ہوگیا اور چونکہ ملکہ وکٹوریہ مغلیہ سلطنت کی جانشین تھیں اس واسطے انھیں خود بخود وہ سب اقتدارات حاصل ہوگئے جو مغل بادشاہوں کو حاصل تھے۔ لیکن والیان ریاست نے ان تصورات کو ہمیشہ اپنی اصلی حیثیت اور مفاد کے منافی سمجھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا۔

[1] Lady Betty Balfour, Lytton's Indian Administration, p. 109.

اٹھارواں باب

لارڈ رپن کی اصلاح پسندی

افغانستان کے معاملے کو بخیر و خوبی ختم کرنے کے بعد لارڈ رپن نے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی۔ اس کے خیالات بہت کچھ لارڈ ولیم بنٹنک سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ اسی کی طرح اس کے عہد حکومت میں بھی اہل ہند کی ترقی اور فلاح کی طرف انگریزی حکومت نے توجہ کی۔ وہ اپنے خیالات او تصورات میں لارڈ لٹن کی بالکل ضد تھا۔ اگر ہم انگلستان میں انیسویں صدی عیسوی کے آخر کے لبرل اصول کی نمایاں مثال دیکھنا چاہیں تو وہ ہمیں رپن کی زندگی میں ملے گی۔ اس ملک میں انگریزی حکومت کا مقصد اور منشا یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے نظم و نسق کی کارگزاری بڑھائی جائے لیکن جو کچھ ہو وہ دفتر شاہی حکومت کے ایما پر ہو۔ انگریزی حکومت سے ہندوستان کو اب تک جو مادی فائدے حاصل ہوئے وہ اعلیٰ درجہ کی کارگزاری رکھنے والی دفتر شاہی حکومت کے ذریعے سے ہوئے۔ دفتر شاہی حکومت نے اپنے پیش نظر یہ مقصد

کبھی نہیں رکھا کہ خود اہل ہند کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ملک کے انتظام کا بوجھ سنبھالیں۔ ظاہر ہے جس زمانے میں انگریزوں کو اس ملک میں اپنی حکومت کی بنیادوں کو وسیع اور مستحکم کرنے کی ضرورت تھی اس وقت یہ خیال ارباب اقتدار کے دماغ میں کیسے آسکتا تھا کہ اہل ہند کو نظم ونسق میں برابر کا شریک کیا جائے۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہد میں بھی بعض انسانیت کا احترام کرنے والے انگریز ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں برک نے ایک موقع پر کس قدر انصاف پسندی اور نکتہ سنجی سے کہا ہے کہ "ہندوستان میں انگریز قوم کی حیثیت ایک تربیت گاہ کی سی ہے جہاں یکے بعد دیگرے حکام کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ خود غرض عہدہ داروں کی ایک قوم ہے، یہ ایک جمہوریت یا دولت مشترکہ ہے جس میں عوام کا وجود شامل نہیں یہ ایک ایسی مملکت ہے جو صرف مجسٹریٹوں پر مشتمل ہے۔"

صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی زمانے ہی میں نہیں بلکہ بعد میں جبکہ اس ملک میں انگریزی راج کی بنیادیں خوب مضبوط ہو چکی تھیں، انگریزوں نے ہندوستانیوں کو کبھی منہ نہیں لگایا اور ان سے الگ تھلگ رہ کر اپنے کام سے کام رکھا۔ ہندوستانیوں کی مرضی یا منشاء معلوم کرنے کی بھی زیادہ پروا نہیں کی گئی بلکہ یہ خیال کیا گیا کہ انگریز جس چیز کو اہل ہند کیلئے اچھا سمجھتے ہیں وہی ان کے لئے اچھی ہے۔ لیکن یہ طرز عمل زیادہ عرصے تک جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ بنٹک نے سب سے پہلے اس کی ضرورت کو محسوس کیا کہ نظم ونسق کے اعلیٰ عہدوں کے دروازے اہل ہند کے لئے کھول دئے جائیں۔ اس کے بعد رپن نے اہل ہند کے اس احساس و ہمدردی کے ساتھ محسوس کیا کہ خود ان کے ملک کی حکومت میں ان کی آواز کا کوئی اثر اور کوئی وزن نہیں۔ اس لئے اہل ہند کے جذبات کا تجزیہ اپنے اس مراسلہ میں کیا ہے جو ۱۸۸۲ء کے آخر میں وزیر ہند کو بھیجا تھا اور جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کی نظر کس قدر وسیع تھی۔ یہ مراسلہ ہندوستان کی دور جدید

کی تاریخ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں اس کا ترجمہ دینا ضروری ہے
وہ کہتا ہے۔
"اگر کوئی شخص ذرا سی توجہ کے ساتھ ان حالات کا مشاہدہ کرے
جو اس ملک میں رونما ہو رہے ہیں تو اس کو کبھی اس بات کو تسلیم کرنے میں
شبہہ نہ رہے گا کہ ہم ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ تعلیم کی اشاعت،
آزاد پریس کا بڑھتا ہوا اثر، مطلق العنانی کی جگہ قانونی حکومت کا رواج، ریلوں اور تار وغیرہ
کی سہولتیں، یورپ سے آمد و رفت کی آسانیاں، مغربی تصورات کی اشاعت،
یہ سب اسباب ایسے ہیں جن کا اثر لوگوں کے طبیعتوں پر پڑنا لازمی تھا۔ نئے
نئے خیالات اور نئی نئی امنگیں جنم لے رہی ہیں۔ رائے عامہ کی قوت روز بروز
بڑھ رہی ہے اور اس وقت ایک قسم کی تحریک وجود میں آ رہی ہے جو آنے
والے سالوں میں اور زیادہ ترقی کرے گی۔ اس صورت حالات میں چاہے
کوئی حکومت ہو اس کا کام دشوار ہو جایا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک ایسی حکومت
کا کام جو تقریباً مطلق العنان نوعیت رکھتی ہو۔ رفتار کو تیز کرنے میں یقیناً خطرہ
ہے لیکن اس میں اس سے بھی زیادہ خطرہ ہے کہ زمانے کا ساتھ نہ دیا جائے
اب ہمارے روبرو مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کی جو نئی روح اس ملک میں پیدا ہوئی ہے
اس کو کس طرح صحیح راستے پر ڈالا جائے۔ اگرچہ یہ روح ابھی پختگی سے عاری ہے
اور اس کے مظاہر میں سطحی پن پایا جاتا ہے لیکن اس کی پوری ترقی اور نشو و نما
سے ملک کو جو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں انھیں حاصل کرنا چاہئے اور ساتھ ہی
اس کی طرف بے اعتنائی برت کر یا اسے دبانے کی کوشش کر کے اس کو
اپنے لئے ایک مستقل سیاسی خطرہ نہیں بنا لینا چاہئے۔ ان امور کے پیش نظر
ان تمام کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جو بادی النظر میں حقیر
نظر آتی ہیں لیکن ان کے ذریعے سے ان حوصلوں اور امنگوں کے اظہار
کے لئے راہ کھل جاتی ہے جو خود ہم نے اس ملک کے باشندوں کے
دلوں میں پیدا کی ہیں اور جو نتیجہ ہیں ہماری تعلیم کا اور اس تمدن اور مادی
خوش حالی کا جو ہماری کوشش سے وجود میں آئی۔ اس طرح کی تدبیروں

سے لوگوں کے شعور کی سیاسی تربیت ہوگی جو بجائے خود ایک اعلیٰ نصب العین ہے اور اس کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ آئندہ کی ترقی کے لئے راستہ صاف ہوجائیگا۔ ہر سمجھدار آدمی اس بات کا متوقع ہوگا کہ پچاس سال کے آزاد پریس اور تیس سال کی تعلیم کی ترویج سے اسی قسم کے نتائج برآمد ہوں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف سے مغربی خیالات اس ملک میں پھیل رہے ہیں۔ ملکی رسمیں، عادتیں اور تعصبات کی دیواریں ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں۔ ریلوے اور اسی قسم کے دوسرے اثرات کی بدولت ذات پات کی بندشیں ڈھیلی پڑ رہی ہیں۔ غرضکہ ملک کے سمجھ والے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مقصدوں اور طبیعتوں میں ایسی تبدیلیاں ہورہی ہیں جنھیں کوئی ہوشمند حکومت نظرانداز نہیں کرسکتی۔ اگر یہ حکومت چاہتی ہے کہ اس کے انتظام کا ڈھانچہ ان قوتوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوجائے جنھیں خود اسی نے تخلیق کیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنے دروبست کو ان مقصدوں کے موافق بنالے۔ لیکن اب تک اس حکومت نے ان قوتوں کو نہ تو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوئی کوشش کی اور نہ ان کو قابو میں رکھنے کی۔ لیکن اگر بفرض محال ایسی کوئی ضرورت درپیش نہ ہوتی جو ملکی حالات نے پیدا کردی ہے اور جن کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ ترقی اور تغیر کے زمانے کا ساتھ دیا جائے تو بھی یقیناً حالات کا اقتضا اور انگریزی حکومت کے شایان شان یہی ہے کہ ان لوگوں کی سیاسی تربیت کرے جن پر وہ حکمرانی کرتی ہے تاکہ جوں جوں زمانہ گزرے وہ اس لایق ہوجائیں کہ اپنے ملک کے انتظام میں حصہ لے سکیں۔ ہندوستان میں جو اس وقت سیاسی مقاصد پیش نظر ہیں ان میں اس سے زیادہ بلند مقصد مجھے کوئی اور نظر نہیں آتا۔ دراصل اس مقصد کو سب سے پہلے حکومت ہند کے سامنے ایک قدامت پسند (لارڈ میو) نے پیش کیا جسے لبرل جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اب لبرل اصول کے ماننے والوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ لارڈ میو کی پالیسی کو اپنے ہاتھوں غیر موثر نہ بنادیں اور اس مقصد سے اختلاف کرنے والوں

کی بے اعتنائی کے زیر اثر اس کو ختم نہ کر ڈالیں جو اس کی حکیمانہ دوراندیشی اور اس کے معنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حکومت ہند کے سامنے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایک ان کی حکمت عملی ہے جنھوں نے اس ملک میں آزاد پریس قایم کیا، تعلیم کی اشاعت کی، اہل ہند کو پبلک سروس میں زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کی کوشش کی اور حکومت خود اختیاری کی ہمت افزائی کی۔ دوسری حکمت عملی ان کی ہے جو پریس کی آزادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جنھیں تعلیم کی ترقی میں اپنے لئے خطرات نظر آتے ہیں اور، جو ہر اس اقدام کو جس کا منشاء ہندوستانیوں کو اپنے امور کے انتظام میں زیادہ اختیارات دینا ہو خوف اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہیں ہمیں ان دونوں اصول کار میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ ایک ترقی کی طرف لے جانے والا ہے اور دوسرا جبر اور مطلق العنانی کی طرف۔ لارڈ لٹن نے ثانی الذکر کو پسند کیا اور میں اول الذکر کو ترجیح دیتا ہوں۔ دونوں کے نتیجوں سے ان اصول کار کی اچھائی، برائی کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔[1]

لارڈ رپن ہندوستان کی انگریزی حکومت میں لبرل رجحانوں کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں جبکہ لارڈ میو کی رائج کی ہوئی پنج سالہ مالیاتی سبیل بندی کا وقت آیا تو رپن نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور صوبجاتی حکومتوں سے مقامی حکومت خود اختیاری کی تجویزوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے یہ واضح کیا کہ یہ کافی نہیں کہ مرکزی حکومت سے صوبوں کو مالیاتی اختیار تحویل کئے جائیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ صوبے مقامی جماعتوں کو اختیارات تحویل کریں۔ اکثر صوبجاتی حکومتوں نے رپن کے خیالات کی تائید کی۔ چنانچہ ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء حکومت ہند نے مقامی حکومت خود اختیاری کے متعلق اپنی تجویز منظور کی جس کا منشاء یہ تھا کہ چند عام اصول کا تعین کر دیا جائے اور باقی عملی تفصیلوں کو صوبجاتی حکومتیں اپنے

---

[1] Wolf, Life of Lord Ripon, Vol. II, p. 92-94.

اپنے حالات کے مدنظر پڑ کریں۔ مقامی بورڈوں اور بلدیات کے ارکان کے انتخاب یا نامزدگی کے متعلق بھی صوبجاتی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے مخصوص حالات میں جو اصول بھی مناسب خیال کریں اس پر عمل کریں رپن چاہتا تھا کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے ادارے قایم کرنے سے لوگوں کے سیاسی شعور کی تربیت ہو اور ہندوستانیوں میں جو قابل اور ہوشمند افراد ہیں انھیں ملکی نظم و نسق کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ممکن ہے شروع شروع میں ضلع کے افسر اعلیٰ کو مقامی بورڈوں اور بلدیات کی نگرانی کرنی پڑے لیکن کچھ عرصے بعد اس کی نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہنی چاہئے۔ اگر اہل ہند کے قابل لوگوں کو آزادی عمل حاصل نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ وہ مقامی اداروں میں اتنی دلچسپی نہیں لیں گے جتنی کہ انھیں لینی چاہئے۔ رپن کے پیش نظر یہ نہیں تھا کہ وہ مغربی طرز کے جمہوری ادارے ہندوستان میں قایم کرے بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس ملک میں قدیم سے پنچایت کا جو طریقہ رائج تھا اسے زندہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کے متعلق ایک خط میں ذکر بھی کیا ہے۔[1] یہ بات اس نے اس واسطے صاف کر دی کہ انگلستان میں اور ہندوستان میں اس کے مخالف اس کی اسکیم کی نسبت اس قسم کے خدشے ظاہر کر رہے تھے۔ بعض قدامت پسند انگریزوں کا خیال تھا کہ رپن اصلاح کے میدان میں بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کا ساتھ ہندوستانیوں کی زندگی کی سست رفتاری نہیں دے سکے گی۔ لبرل اصول کا اطلاق خود انگلستان کی زندگی میں کافی تجربے کے بعد ممکن ہوا ہے۔ ان اصولوں کو ہندوستان کی زمین میں سرسبز ہونے کے لئے ضرور ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی زندگی سیاسی تجربوں کے وسیع میدان سے گزرے۔ بعض کو یہ اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کے نمایندوں کو نظم و نسق میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کی کارگزاری کا معیار گر جائے گا جس کی رپن نے پیش بینی نہیں کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ

[1] Wolf, Ibid., p. 100. ـ

اس نے اس کی اچھی طرح پیش بینی کی تھی۔ حکومت ہند نے مقامی حکومت خود اختیاری کی جو تجویز منظور کی تھی اس میں اس کی نسبت اشارہ موجود تھا۔ اس تجویز کے متن میں تھا کہ "نظم و نسق کی کارگزاری بڑھانا اس تجویز کا مقصد نہیں ہے بلکہ عوام کی سیاسی تربیت۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اس امر کا یقین ہے کہ جوں جوں مقامی حالات کے علم میں اضافہ ہوگا اور مقامی مفاد کو پیش نظر رکھا جائے گا اس کا نتیجہ مقامی نظم و نسق کی شکل میں ظاہر ہونا لازمی ہے۔ لارڈ رپن کا یہ خیال تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں لبرل اصلاحیں نافذ کی جائیں لیکن ہندوستان کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بہتر ہوگا کہ پہلے مقامی اداروں میں ہندوستانیوں کو سیاسی تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاسی تجربے کی بدولت جو غلطیاں ہوں گی وہ مقامی نوعیت کی ہوں گی جن سے پورے ملک کے نظم و نسق کو زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔

حکومت ہند کی تجویز کے بموجب تمام ہندوستان میں مجالس ضلع اور بلدیات کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ مجوزہ قاعدوں کی رو سے ان مجلسوں کی تشکیل میں نمائندہ عنصر کو داخل کیا گیا اور غیر سرکاری ارکان کی اکثریت رکھی گئی۔ سرکاری طور پر نامزد شدہ ارکان کی تعداد کسی حالت میں بھی ⅓ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مجالس ضلع اور بلدیات کی صدارت غیر سرکاری ارکان کر سکیں گے۔ بلدیات اور مجالس ضلع کو مقامی نوعیت کے محصول لگانے اور انھیں وصول کرنے کا اختیار ہوگا۔ جہاں غیر سرکاری ارکان میں مجلس ضلع کی صدارت کے لئے کوئی موزوں شخص موجود نہ ہو تو حاکم ضلع (مجسٹریٹ و کلکٹر) صدارت کے فرائض انجام دے گا۔ حاکم ضلع کو اس کا اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ اس امر کا تعین کرے کہ موزوں شخص موجود ہے یا نہیں اور اس ضمن میں اس کی رائے قطعی ہوگی۔ حاکم ضلع کی نگرانی میں مقامی مجالس ضلع بعض مخصوص مدوں کے تحت محصول لگانے کی مجاز ہوں گی اور قرض بھی لے سکیں گی۔ حاکم ضلع سے توقع کی جائے گی کہ وہ تا امکان مجلس ضلع کے فیصلوں میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرے سوائے ایسے حالات کے

جیسے بلدیاتی ملکیت کی فروخت، قرضے لینا یا ایسے محصول لگانا جن کی مجلس کو اجازت نہیں ہے۔ حکومت ہند کی تجویز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی نظم ونسق میں لبرل اصول کی کارفرمائی مدنظر ہے۔ رپن چاہتا تھا کہ مجالس ضلع اور بلدیات کے غیر سرکاری ارکان یہ محسوس کریں کہ ان کے ہاتھ میں انتظامی قوت دیگئی ہے اور انھیں اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہے۔ جہاں حالات اجازت دیں وہاں مجالس ضلع کے صدر غیر سرکاری ارکان بھی ہو سکتے ہیں جنھیں مجلس نے کثرت رائے سے منتخب کیا ہو۔ اگر حاکم ضلع مجلس ضلع کا صدر ہوگا تو اُس کو اس کی کارروائیوں میں رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔ نظم ونسق کی عام کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لئے اس کی صراحت کر دیگئی کہ اگر کسی بلدیہ میں بدانتظامی پھیلے گی اور ارکان اپنے فرائض کا احساس نہیں کریں گے تو حکومت اس بلدیہ کو منسوخ کر سکتی ہے۔

عام طور پر حکومت ہند کی مقامی خود اختیاری کی تجویز کا ہندوستان میں خیر مقدم کیا گیا۔ سوائے حکومت بمبئی کے دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے رپن کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی۔ حکومت بمبئی شروع سے اس قسم کی اصلاحوں کے خلاف تھی اور انھیں قبل از وقت سمجھتی تھی۔[1] اکثر صوبوں کی مقامی مجالس مقننہ نے حکومت ہند کی تجویز کے بموجب مقامی حکومت خود اختیاری کو وسعت دینے کی بابت قوانین بنائے۔

رپن کے عہد حکومت کا دوسرا کارنامہ ورناکلر پریس ایکٹ کا منسوخ کرنا ہے جسے لارڈ لٹن کے زمانے میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس قانون کے بنانے میں جو نسلی فرق اور امتیاز برتا گیا تھا وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے جذبات کو مجروح کرنے والا تھا۔ اگر کوئی ایسا عام قانون اس ضمن میں وضع کیا جاتا جس کا اطلاق انگریزی زبان اور دیسی زبانوں کے سب اخباروں پر ہوتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن صرف دیسی زبانوں کے اخباروں کی قانون میں تخصیص کرنا ہندوستانیو

[1] Wolf, Ibid., p. 105.

کو سخت ناگوار رہا۔ خود پارلیمنٹ میں اس قانون کی لبرل جماعت کی طرف سے سخت مخالفت کی گئی تھی اس لئے کہ اس کی رو سے کسی عدالت کے خلاف مرافعہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو لبرل اصول کے خلاف تھا۔ رپن کے وائسرائے ہونے کے بعد وزیر ہند ہارٹنگٹن نے ۲۸ جنوری سنہ ۱۸۸۱ء کو ایک سرکاری مراسلہ روانہ کیا جس میں ورناکلر پریس ایکٹ کو منسوخ کرنے اور معمولی قانون کے ذریعے باغیانہ مضامین شائع کرنے والے اخباروں اور رسالوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کی ہدایت کی گئی خاص طور پر انگلستان کا وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن اس قانون کو جلد منسوخ کرنے کا حامی تھا۔ چنانچہ اس قانون کو حکومت ہند نے منسوخ قرار دیا اور دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کے خلاف جو امتیاز برتا جاتا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔

رپن کی تعلیمی حکمت عملی کا محرک اس اصول میں ملتا ہے جس کی بنا پر اس نے مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کو ہندوستان میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ رپن کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ جب تک عام لوگوں میں ابتدائی تعلیم کی اشاعت نہ ہوگی اس وقت تک مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں سے اہل ملک کو اتنا فائدہ نہیں پہنچے گا جتنا کہ پہنچنا چاہیے۔ اس وقت جو تعلیمی نظام ہندوستان میں رائج تھا وہ بڑی حد تک سر چارلس وڈ کے اس مراسلہ پر مبنی تھا جو سنہ ۱۸۵۴ء میں بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس میں تھوڑی بہت ترمیمیں ہوئیں۔ اس نظام تعلیم میں اعلیٰ اور وسطانی تعلیم پر زیادہ توجہ کی گئی تھی۔ ابتدائی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ رپن نے اس ضمن میں وزیر ہند کو جو مراسلہ لکھا اس میں یہ امر واضح کیا کہ صرف وسطانی اور اعلیٰ تعلیم پر توجہ کرنے سے یہ سیاسی خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ایسے عوام کو خطاب کرے گا جو تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوں گے۔[1] رپن کی تجویز یہ تھی کہ انگریزی حکومت

[1] Letter to Hartington, June 3. 1881 (Wolf, II, p. 114).

کو چاہئے کہ عوام کی ابتدائی تعلیم کو سرکاری اثر سے متاثر نہ ہونے دے۔ بجائے اس کے کہ حکومت کی جانب سے ابتدائی تعلیم کے لئے براہ راست مدرسے قایم کئے جائیں حکومت کو چاہئے کہ اس قسم کے مدرسوں کو جو مقامی اداروں کے قایم کئے ہوں یا نجی ہوں امداد دے تاکہ وہ اچھی طرح سے چل سکیں۔ حکومت کے وسیلوں کے سوا ذاتی انفرادی امداد کے حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ ان تجویزوں پر غور کرنے کیلئے اکتوبر ۱۸۸۲ء میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا گیا۔ ایک سال کے بعد اس کمیشن کی سفارشوں کو حکومت ہند نے قبول کر لیا اور صوبوں کو بھی جامہ پہنانے کی سفارش کی۔ رپن کا عہد حکومت اس کے تھوڑے عرصے کے بعد ختم ہو گیا۔ صوبوں نے جیساکہ چاہئے حکومت ہند کی سفارشوں پر توجہ نہیں کی اور عوام کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ لیکن رپن نے اس ضمن میں جو کوششیں کیں ان سے کم از کم یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس کے عملی محرکات کیا تھے

معاشرتی اصلاح کے ضمن میں رپن نے کارخانوں کے مزدوروں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی ۱۸۸۱ء میں حکومت ہند نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ان بچوں کیلئے محنت کے اوقات زیادہ سے زیادہ ۹ گھنٹے مقرر کئے گئے جنکی عمر سات اور ۱۲ سال کے درمیان ہو۔ کارخانوں کے معائنہ کے لئے انسپکٹروں کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس بات کا اطمینان کر لیں کہ قانون پر عمل ہو رہا ہے۔ جن کارخانوں میں ایسی مشینیں استعمال کی جاتی ہے جس سے جان کا خطرہ ہو سکتا ہے اسکے گرد احاطہ بندی لازمی قرار دی گئی تاکہ ناواقف مزدور اور بچے نقصان نہ اٹھائیں۔

میسور کی حوالگی رپن نے اپنی لبرل حکمت عملی کو صرف برطانوی ہند تک محدود نہیں رکھا بلکہ والیان ریاست کے ساتھ حکومت ہند کے تعلقات میں بھی اس اصول کو برتنے کی کوشش کی۔

لارڈ ولیم بنٹنک نے میسور کے راج کی بد انتظامیوں کی وجہ سے ۱۸۳۱ء میں اس ریاست کو حکومت ہند کے تحت لے لیا تھا اور یہاں کا پورا دروبست انگریز افسروں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اگرچہ بعد میں بنٹنک کو اس بات کا یقین ہو گیا

کہ میسور کے نظم ونسق کے متعلق اسکو جو رپورٹیں دی گئی تھیں وہ درست نہ تھیں اور یہ کہ ریاست کو برطانوی حکومت کے تحت لینے کا اہم اقدام حق بجانب نہ تھا۔ چنانچہ جننگ چاہتا تھا کہ ریاست راجا کو واپس دیدی جائے لیکن برطانوی حکومت اس پر آمادہ نہ ہوئی۔ برطرف شدہ راجا کا ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوگیا۔ اب برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اسکا متبنیٰ لڑکا جب بالغ ہوجائے تو اسکو راج گدی دیدی جائے۔ ۱۸۸۱ء میں یہ لڑکا سن شعور کو پہنچا تو رپن نے برطانوی حکومت کے وعدے کے مطابق اسکو میسور کا حکمران تسلیم کرلیا۔ لیکن ان شرطوں کے ساتھ کہ اس وقت تک جو قوانین میسور کے دروبست میں نافذ ہو چکے تھے وہ علیٰ حالہ برقرار رکھے جائیں گے نظام حکومت میں کوئی اہم تبدیلی بغیر گورنر جنرل کی مرضی کے نہیں کی جائے گی اور اراضی کا جو بندوبست کردیا گیا ہے وہ جوں کا توں قایم رہے گا۔ جو انگریزی فوجی چھاؤنیاں میسور میں ہیں وہ موجود رہیں گی اور اگر ان کے علاوہ ریاست کے دوسرے مقامات میں چھاؤنیاں قایم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو حکومت ہند کو اختیار ہوگا کہ انھیں اپنے منشاء کے موافق قایم کرے جن کے لئے حکومت میسور علاقے فراہم کرے گی۔ میسور میں برطانوی سکہ رائج رہے گا۔ ریل اور تار برقی کے قیام کے لئے جو زمین درکار ہوگی وہ دربار میسور حکومت ہند کو بے معاوضہ دے گا۔ دربار میسور حکومت ہند کو سالانہ ۳۵ لاکھ روپیے پیش کش کے طور پر پیش کریگا جس کے عوض حکومت ہند ریاست کی دفاع کی ذمہ دار ہوگی۔ مہاراجا میسور کے لئے یہ بھی لازمی گردانا گیا کہ ریاست کے مالی اور عدالتی انتظام کے متعلق حکومت ہند جو ضروری مشورے وقتاً فوقتاً دے انھیں عملی جامہ پہنائے تاکہ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہو۔ اگرچہ اس موقع پر رپن نے یہ بہت اچھا کیا کہ ریاست میسور کو اس کے جائز وارث کے سپرد کردیا لیکن جو شرطیں لگائیں وہ حق بجانب نہیں کہی جاسکتیں۔ ان سے ایک ایسی نظیر قایم ہوگئی جس سے دوسری ریاستوں کے حقوق پر حکومت کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی زد پڑنے لگی[1]

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 77-84

البرٹ بل

۱۸۸۳ء میں حکومت ہند کے خلاف یورپین آبادی نے سخت احتجاج شروع کیا جس نے ایک زبردست شورش کی شکل اختیار کرلی۔ ہوا یہ کہ مرکزی مجلس مقننہ میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس نسلی امتیاز کو دور کیا جائے جو ہندوستانی ججوں اور مجسٹریٹوں کے خلاف اب تک روا رکھا گیا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں تعزیرات ہند میں یہ دفعہ شامل کی گئی کہ ضلعوں میں کوئی ہندوستانی مجسٹریٹ یا سشن جج کسی یورپین کے مقدمہ کی سماعت کا مجاز نہ ہوگا حالانکہ پریسی ڈنسی ٹاونز (کلکتہ، مدراس اور بمبئی) کی حدوں میں ہندوستانی مجسٹریٹوں اور سشن ججوں کو یورپینوں کے مقدموں کے حق سماعت سے محروم نہیں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی آئی۔سی۔ایس کے ارکان اپنے سفید فام ہم عصروں کے مقابلے میں اس فرق و امتیاز کو اپنے لئے ایک طرح کی ذلت سمجھتے تھے۔ رپن کے عہد کے شروع ہی میں مہاراجہ سر جو تیندرا ناتھ موہن ٹگور نے جو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن تھے اس مسئلہ کو کونسل میں اٹھانا چاہا۔ لیکن رپن کے کہنے پر اسوقت انھوں نے اس مسئلہ پر بحث ملتوی کردی۔ رپن نے اس بات میں صوبجاتی حکومتوں سے دریافت کیا جنھوں نے سوائے کورگ کے استثناء کے اس خیال کی تائید کی کہ انگریز اور ہندوستانی حکام کے اختیارات میں جو نازیبا امتیاز برتا جاتا ہے اس کا خاتمہ کردیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد سر کورٹنی البرٹ نے کونسل میں اپنا مسودہ پیش کیا تاکہ تعزیرات ہند میں ترمیم کردی جائے اور انگریز اور ہندوستانی عہدہ داروں میں قانونی امتیاز مٹ جائے اور ایک ہی سروس کے ارکان کی حیثیت سے ان کے رتبوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اس ترمیم کو پیش کرتے وقت یورپین باشندوں کو اطمینان دلانے کے لئے اس کی صراحت کردی گئی کہ ہندوستانی کوونیننٹڈ سروس کے افراد کے انتخاب میں انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے اور پھر انھیں ٹریننگ میں اتنے عرصے تک رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں عملی تجربے کے ساتھ رائے کی پختگی پیدا ہو جائے۔ ان سب امور سے

یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ یہ ہندوستانی عہدہ دار اپنے اختیارات کو مناسب طریقے پر استعمال کریں گے اور یورپین باشندوں کو ان کے خلاف شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ صرف آسام کے لفٹیننٹ گورنر سر سی۔ الیٹ نے حکومت ہند کی تجویز پر شبہہ ظاہر کیا اور بتلایا کہ ہندوستانی جج ممکن ہے نسلی تعصب برتیں لیکن اس نے کوئی ایسا اندیشہ نہیں ظاہر کیا کہ اگر اس ترمیم کو منظور کیا گیا تو ملک کے طول و عرض میں احتجاج کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ خود رپن کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ اس مسودہ قانون کے خلاف یورپین باشندے اس قدر چراغ پا ہوں گے۔ جب مسودہ قانون کے متعلق وزیر ہند کو مطلع کیا گیا تو اس نے بھی اس کی منظوری صادر کر دی۔

اب انگلو انڈین اخباروں نے رپن اور اس کی تجویزوں کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ کلکتہ میں انگلو انڈینز اور یورپینوں کی ایک انجمن قایم کی گئی تاکہ مسودہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے جلسے کئے جائیں اور انگلستان میں رائے عامہ کو اس کے چھپے ہوئے اثرات سے واقف کرایا جائے۔ اس انجمن کے جواب میں ہندوستانیوں نے مسودہ قانون کی موافقت میں دیسی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع کرانے شروع کئے اور جلسے منعقد کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اینگلو انڈینوں اور ہندوستانیوں کے درمیان سخت نسلی نفرت پھیلنے لگی جس کے اثرات بہت بعد تک رہے۔ انگریز پلانٹر نے خاص طور پر البرٹ بل کی مخالفت [illegible] اس کی مخالفت میں جو تحریک پیدا ہوئی اس کی مالی حمایت اس طبقے نے کی۔ ان کا ایک وفد انگلستان پہنچا تاکہ وہاں اخباروں کو روپیہ دیکر مضامین لکھوائے۔ انگلستان کے اخباروں میں اس موضوع پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا خود وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن ذرا گھبرا گئے اور انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں قدامت پسند جماعت اس مسئلہ سے پورا فائدہ اٹھاکر ان کی پارٹی کو نقصان نہ پہنچا دے۔ چنانچہ اس نے لیبارڈ رپن کو لکھا گیا کہ وہ مسودۂ قانون میں ایسی تبدیلیاں کر دے

گئیں جن کی رو سے یورپین ملزمین کو یہ حق دے دیا گیا کہ اگر ان کا مقدمہ کسی ہندوستانی جج کے روبرو پیش ہو تو وہ ایسی جیوری کا مطالبہ کرسکتے ہیں جس کے نصف ارکان ان کی قومیت کے افراد پر مشتمل ہوں۔ غرضکہ یورپین لوگوں کو عدالت کے روبرو جو امتیازی حقوق حاصل تھے وہ برقرار رہے۔

البرٹ بل میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ بات روشن ہوگئی کہ اگر کوئی اقلیت منظم ہو کر کوشش کرے تو وہ حکومت کو اپنے مطالبوں کے آگے جھکنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ ہندوستان کے سیاست دانوں پر تنظیم کی اہمیت واضح ہوئی اور انھوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ان کی بھی کوئی منظم جماعت ہونی چاہیئے جو حکومت کے روبرو ان کی ضرورتوں اور شکایتوں کو پیش کرسکے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے البرٹ ہال میں ایک سیاسی کانفرنس کی گئی جس میں سریندرناتھ بینرجی اور اے۔ ایم بوس نے شرکت کی اور یہی دونوں اس کی روح رواں تھے۔ کانفرنس تین دن تک جاری رہی۔ ہندوستانی سیاست دانوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور ایک بین الہندی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا جو برطانوی حکومت کے سامنے ہندوستان کے مطالبے پیش کرسکے۔ اسی کانفرنس کے زیر اثر جنوری ۱۸۸۵ء میں بمبئی پریسی ڈنسی ایسوسی ایشن قائم ہوا جس کے روح رواں فیروز شاہ مہتا، تلک اور طیب جی تھے۔ اسی طرح مدراس میں مہاجن سبھا وجود میں آئی۔ غرضکہ ملک کے ان حصوں میں جہاں سیاسی شعور تھوڑا بہت پیدا ہوچکا تھا سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ بنگال کے اینگلو انڈینز کی سیاسی تنظیم سے تعلیم یافتہ ہندوستانی کافی متاثر ہوئے اور خاص طور پر ان کی احتجاجی ڈور دھوپ نے انھیں متاثر کیا جس کے نتیجہ کے طور پر لارڈ رپن کو البرٹ بل میں تبدیلیاں کرنی پڑیں جو اس طبقہ کے لئے قابل اطمینان تھیں۔

اگرچہ اینگلو انڈینوں اور یورپین طبقے میں لارڈ رپن کو مقبولیت حاصل

نہ تھی لیکن ہندوستانی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۸۴ء میں جب وہ مستعفی ہو کر انگلستان جا رہا تھا ہندوستانیوں نے اپنی نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے بڑے مظاہرے کئے۔ رپن سے پہلے اب تک کسی گورنر جنرل نے ہندوستانیوں کے دل میں گھر نہیں کیا تھا۔ رپن کو ہندوستانی اپنا ہمدرد اور سچا دوست سمجھتے تھے اور وہ یقیناً ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے۔

انیسواں باب
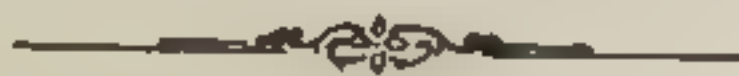
ڈفرن، لینسڈون اور الجن کے عہد حکومت میں قومی شعور کی ابتدا

لارڈ رپن کے استعفے کے بعد لارڈ ڈفرن اس کا جانشیں ہوا۔ ہندوستان آنے سے پہلے اس کو عملی سیاست کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ نائب وزیر ہند اور کناڈا کی گورنر جنرلی کے عہدہ پر رہ چکا تھا اور سینٹ پٹرزبرگ اور قسطنطنیہ میں انگریزی حکومت کی سفارت کے فرائض بڑی خوبی سے ادا کر چکا تھا۔ روس میں رہنے سے اُس کو ملک کی خارجی پالیسی اور ارادوں سے واقفیت حاصل ہوئی جن کی زد یک طرح سے ہندوستان پر بھی پڑتی تھی۔ لارڈ ڈفرن اعلیٰ درجے کا خطیب اور ماہر سیاست تھا۔ البرٹ بل سے ہندوستان میں جو ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے ڈفرن سے بہتر شخص انگلستان میں نہیں مل سکتا تھا۔ ایک طرف ہندوستان کے انگریز باشندوں کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گئی تھی اور دوسری طرف تعلیم یافتہ ہندوستانی یہ محسوس

کر رہے تھے کہ انھیں خود اپنے ملک کے درو بست میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔
ڈفرن نے کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے ہر جماعت کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے

روس کا خطرہ

ڈفرن کے عہد میں وسط ایشیا اور افغانستان کی سیاست نے پھر ایک مرتبہ حکومت ہند کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ روس افغانستان کی شمالی مغربی سرحد کی طرف انھیں مقصدوں سے آگے بڑھ رہا تھا جن کے زیر اثر حکومت ہند نے درۂ بولان اور درۂ خیبر پر اپنا قبضہ ضروری سمجھا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں روس نے شہر مرو پر قبضہ کر لیا جو افغانستان کی سرحد سے ۱۵۰ میل پر واقع تھا۔ انگلستان میں اس شہر کی فوجی اور جغرافی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا تھا اور اس پر روس کے قبضہ کو تشویش نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ روس اور انگلستان کے دفاتر خارجہ میں کشیدگی بڑھنے کے خوف سے دونوں حکومتوں نے یہ تجویز منظور کر لی کہ افغانستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کے تعین کے لئے ایک مشترک کمیشن مقرر کر دیا جائے تاکہ آئندہ سرحدی جھگڑے نہ پیدا ہوں۔ لارڈ ڈفرن نے امیر عبدالرحمٰن خاں سے راولپنڈی میں ملاقات کی اور اس پر آمادہ کر لیا کہ کمیشن جو فیصلہ کرے اسے وہ مان لیں۔ امیر صاحب کی ملاقات سے ڈفرن بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے ان کی قابلیت، فراست اور تدبر کی بڑی تعریف کی۔ حکومت ہند نے وعدہ کیا کہ اگر افغانستان پر روس کا حملہ ہوا تو ہتھیاروں اور فوج سے مدد کی جائے گی۔ اس کمیشن میں روس، انگلستان اور افغانستان کی حکومتوں کے نامزد شدہ ارکان شریک تھے۔ اس کے برطانوی رکن سر پیٹر لمڈن نے محسوس کیا کہ روس اور افغانستان کے سیاسی تعلقات میں کافی تلخی پیدا ہو چکی ہے اور دونوں حکومتوں کا خیال ہے کہ ان مقاموں پر جن پر جھگڑا ہے پہلے ہی سے اپنا قبضہ جمانا چاہیئے تاکہ کمیشن کی تحقیق سے پہلے واقعات تکمیل شدہ امور کی صورت میں سامنے آئیں۔ گویا کسی مقام پر قبضہ کرنا اپنے حق کو منوانے کا بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ ایک تندخو روسی فوجی افسر نے جس کا نام جنرل کوماروف تھا افغانی فوج کو پنجدہ کے مقام سے بے دخل کر کے

خود قبضہ کر لیا۔ اب تک پنجدہ پر افغانستان کا قبضہ چلا آتا تھا۔ پنجدہ سے ہرات ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر تھا جو فوجی نقل و حرکت کے لحاظ سے نہایت اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ روس کی اس جارحانہ پیشقدمی کا یہ اثر ہوا کہ حکومت ہند کو تشویش ہوئی کہ کہیں اسی طرح آہستہ آہستہ روس پورے افغانستان کو نہ ہڑپ کر جائے یہ صورت حالات ایسی تھی جس سے وسط ایشیا کی سیاست کے توازن میں خلل پیدا ہونا لازمی تھا۔ حکومت ہند نے شمال مغربی سرحد پر فوجیں جمع کرنے کا حکم دے دیا۔ انگلستان میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ روس سے لڑائی ہوئے بغیر نہیں بچ سکتی۔ قدامت پسند جماعت نے پارلیمنٹ میں لبرل حکومت کی بے عملی پر سخت نکتہ چینی کی۔ گلیڈسٹن کی لبرل وزارت اپنی خارجی حکمت عملی کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ادھر سوڈان میں گورڈن کے مارے جانے اور مہدی کی تحریک نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ آئرستان کے مسئلہ میں بھی لبرل وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹن نے ہاؤس آف کامنز میں صاف طور پر تسلیم کیا کہ صورت حالات سخت تشویش ناک ہے چنانچہ اس کی تجویز پر ہاؤس آف کامنز نے ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ کی منظوری دی تاکہ اگر کوئی اچانک صورت پیش آ جائے تو عہدہ برآ ہونا ممکن ہو اور فوراً فوجوں کو نقل و حرکت میں لایا جا سکے۔ غرضکہ روس اور انگلستان دونوں روز بروز ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمن خاں نے اس موقع پر بڑی دانشمندی اور تحمل سے کام لیا۔ امیر صاحب جانتے تھے کہ اگر روس اور انگلستان میں لڑائی چھڑی تو تباہی ان کے ملک کی ہوگی۔ امیر صاحب اس پر آمادہ ہو گئے کہ پنجدہ کی بجائے سرحدی مقام ذوالفقار حکومت افغانستان کو دے دیا جائے۔ اس سمجھوتے سے ایک بڑی مصیبت سر سے ٹل گئی۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں امیر افغانستان نے اپنے ملک کی حالت اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کی ہے۔

"میرا ملک ایک بکرے کے مثل ہے جس پر ایک طرف شیر کی اور دوسری طرف ریچھ کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ خداوندی مدد کے بغیر بہت عرصے تک

شکار (یعنی ملک افغانستان) کا بچنا مشکل ہے۔"[1]

غرضکہ امیر عبدالرحمن خاں کی دانائی اور سمجھوتے کی وجہ سے روس اور انگلستان میں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ سرحدی کمیشن نے جو پہلے سے اپنے اجلاس کر رہا تھا یہ فیصلہ کردیا کہ پنجدہ روس کو دے دیا جائے اور اس کے بدلے میں افغانستان کا ذوالفقار کے شہر پر قبضہ ہو جائے۔ حکومت انگلستان نے سر پیٹر لمسڈن کے بجائے سر وسٹ رج وے کو سرحدی کمیشن کی تحقیقات کے لئے رکن نامزد کیا۔ روس، انگلستان اور افغانستان کے نامزد شدہ ارکان نے بڑی محنت اور جانفشانی سے افغانستان کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کا تعین کردیا جسے متعلقہ ملکوں نے تسلیم کرلیا اور جولائی ۱۸۸۷ء میں سینٹ پیٹرزبرگ میں اس ضمن میں ایک معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ یہ سرحد اس طور پر مقرر کی گئی کہ امیر افغانستان کا کوئی مالی نقصان نہ ہوا اور نہ ان کے ملک کا کوئی علاقہ ان سے چھینا گیا۔ اس سرحد کے تعین سے یہ فائدہ ہوا کہ روس اور انگلستان نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر ایک دوسرے سے بجائے جنگ کے سیاست کاری کے مدبرانہ طریقہ سے منوالئے اور افغانستان پر جو دونوں طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی کم ہو گیا۔

امپیریل سروس ٹروپس روس سے جنگ کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت ہند نے اپنی فوج کی تعداد مستقل طور پر بڑھادی جس کی وجہ سے تقریباً تین کروڑ روپے سالانہ کا خزانہ پر بار پڑا۔ اس کے علاوہ ڈفرن کی دعوت پر والیان ریاست نے بھی حکومت ہند کی رقمی امداد کی تاکہ انگریزی حکومت کو سرحدی استحکامات پر جو روپیہ خرچ کرنا پڑے اس میں وہ بھی شریک ہوں۔ اعلیٰحضرت مرحوم میر محبوب علیخاں آصف سادس نے انگریزی حکومت کا ہاتھ بٹانے کیلئے ساٹھ لاکھ روپے عنایت فرمائے تاکہ اس رقم کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے کام میں صرف کیا جائے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی پٹیالہ والی تقریر میں اعلیٰحضرت مرحوم کا اس ضمن میں شکریہ ادا کیا اور دوسرے والیان ریاست کو اسکی پیروی کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ سب بھی حکومت برطانیہ کی حفاظت ملک کی ذمہ داری

۱؎ 1. Roberts, History of British India, p. 475.

ہیں برابر کے شریک ہوں۔ بعد میں لارڈ ڈفرن نے اعلیحضرت مرحوم سے درخواست کی کہ مشترک مدافعت کی اغراض کے لئے وہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے اندر سواروں کا ایک دستہ مرتب کریں جس کا کل خرچ سرکار عالی کے ذمے ہو اور وہ امپیریل سروس ٹروپس کے نام سے مشہور ہو۔ اس فوج کو جدید ترین طریقے پر فن جنگ کی تعلیم دی جائے اور جب کبھی برٹش گورنمنٹ کو ضرورت ہو تو اس کو استعمال کیا جا سکے۔ اس ساٹھ لاکھ روپیے سے جو اعلیحضرت مرحوم نے حکومت ہند کو تحفے کے طور پر دئے تھے امپیریل سروس ٹروپس کی ابتدائی تنظیم کی گئی۔ مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک نے حکومت ہند کی اس تجویز سے اختلاف کیا۔ ان کا یہ کہنا یہ تھا کہ سب سی ڈیری اور کنٹنجنٹ کی دو الگ الگ فوجوں کے موجود ہوتے ہوئے ایک اور تیسری نئی فوج کی کوئی ضرورت نہیں جس کے اخراجات کا بار حکومت سرکار عالی کے خزانہ پر ڈالا جائے۔ سب سی ڈیری فوج کے ضمن میں ریاست حیدرآباد نے کڑپہ کرنول اور بلاری وغیرہ کے ضلعے جن کی مجموعی سالانہ آمدنی ایک کروڑ روپیے کے قریب تھی، حکومت ہند کے حوالے کئے۔ کنٹنجنٹ کے سلسلے میں برار کے زرخیز ضلعوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اب تیسری فوج کے خرچ کے ضمن میں نہ معلوم کوئی اور حصہ ملک انگریزی حکومت کے سپرد کرنا پڑے۔ ان اعتراضوں سے حکومت ہند بہت ناراض ہوئی لیکن ان کا کوئی معقول جواب بن نہ پڑا۔ ڈفرن ارادہ کر چکا تھا کہ امپیریل سروس ٹروپس کی بنا حیدرآباد میں پڑے تاکہ دوسرے والیان ریاست کو اس قسم کی فوج تیار کرنے کی ترغیب ہو اور اس طرح حکومت ہند کو کسی خرچ کے بغیر ایک ایسی فوج مل جائے جسے امپیریل مقصدوں کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حیدرآباد کی طرح دوسری ریاستوں نے بھی امپیریل سروس ٹروپس اپنے اپنے یہاں قایم کیں اور حکومت ہند نے بڑی ہوشیاری سے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

تیسری جنگ برما ۱۸۸۵ء

شمالی برما کے حکمران تھی بانے کچھ

عرصے سے اپنی آزادی کو عملی طور پر برتنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزی حکومت سے بے پوچھے اپنے علاقہ میں فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کو خاص رعایتیں دیں۔ یہ بات انگریزوں کو سخت ناگوار گزری۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۹ء میں شمالی برما میں جو انگریز ایجنٹ رہا کرتا تھا اس کو واپس بلا لیا گیا۔ اور جنوبی برما میں جو انگریز تاجر آباد ہو گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ شمالی برما کو بھی انگریزی حکومت اپنے تحت کرے تاکہ انکے منافع میں اضافہ ہو۔ بہانہ یہ تراشا گیا کہ شمالی برما کی حکومت کا ایک انگریز کمپنی پر جرمانہ کرنا حق بجانب نہیں ہے جنوبی برما کے انگریز تاجر برابر حکومت ہند کو اکسا رہے تھے کہ شمالی برما کے حکمران کو سزا دینی چاہیئے اسلیئے کہ وہ انگریزوں کا سخت مخالف اور بدخواہ ہے۔ اسی دوران میں شمالی برما کے حکمران نے ایک مشن پیرس بھیجا اور بات چیت کے بعد یہ طے کیا کہ مانڈلے میں ایک فرانسیسی بنک قائم کیا جائے۔ ان سب باتوں سے جنوبی برما کے انگریز تاجر اور بھی چراغ پا ہو گئے اور انھوں نے متحدہ طور پر حکومت ہند کو لکھا کہ شمالی برما کے حکمران سے جواب طلب کیا جائے۔ چنانچہ حکومت ہند نے شمالی برما کے حکمران سے جواب طلب کیا کہ انگریز کمپنی پر کیوں جرمانہ کیا گیا۔ لارڈ ڈفرن چاہتا تھا کہ اس ضمن میں حکومت ہند کو تحقیقات کرنے کا مجاز کیا جائے لیکن تھی با نے اس کو اپنے اقتدار کے منافی سمجھتے ہوئے انکار کر دیا۔ اس پر ڈفرن نے لکھا کہ مانڈلے میں ایک انگریز سفیر کو رکھا جائے تاکہ وہ اس قسم کے واقعات کی چھان بین کر سکے۔ اور جب تک کہ یہ سفیر وہاں پہنچ نہ جائے انگریزی کمپنی پر جرمانہ کی جو کارروائی کی گئی ہے اسے ملتوی رکھا جائے۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ انگریز تاجروں کو اس کی اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ شمالی برما میں سے ہو کر چین کو اپنا سامان لے جا سکیں۔ حکومت برما نے ان تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جنرل پرنڈرگاسٹ کی ماتحتی میں شمالی برما پر حملہ کر دیا گیا۔ رنگون میں پہلے سے فوج اکٹھی کر لی گئی تھی اور سامان جنگ تیار تھا۔ برما والے انگریزوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انھیں ہر موقع پر شکست اٹھانی پڑی۔ دس روز کے اندر انگریزی فوجیں شمالی برما کے صدر مقام آوا تک پہنچ گئیں۔ تھی با نے

بے شرط کے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا۔ یکم جنوری سنہ ۱۸۸۶ء پورا شمالی برما کا علاقہ انگریزی راج میں اعلان کر کے شامل کر لیا گیا۔ یہ علاقہ فرانس کے رقبے سے بڑا تھا اور اس کی آبادی اس وقت ۵۰ لاکھ تھی۔ تھی با کو گرفتار کر کے پہلے کچھ عرصے تک رنگون میں رکھا اس کے بعد اس کو وظیفہ دیکر رتناگری (صوبہ بمبئی) کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اس نے ۱۶؍ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو وفات پائی۔

شمالی برما کے بعض فوجی سرداروں نے اپنی چھوٹی ٹولیاں بنالیں اور انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔ وہ گھنے جنگلوں کے دشوار گزار رستوں سے واقف تھے جہاں وہ حملہ کرنے کے بعد جا کر چھپ جاتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اس قسم کا مقابلہ کسی منظم مملکت کے وسیلوں کے سامنے زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتا۔ سر چارلس برنارڈ کی چیف کمشنری کے زمانے میں پورے شمالی برما میں انگریزی راج مستحکم ہو گیا اور نیا نظم ونسق قائم ہوا۔

شمالی برما کے الحاق کے لئے حکومت ہند نے جو بہانہ تراشا وہ معقول نہیں معلوم ہوتا۔ محض اس بنا پر کہ ایک انگریزی تجارتی کمپنی پر تھی با کی حکومت نے جرمانہ کیا تھا اس لئے اس کے پورے ملک پر قبضہ کر لیا جائے ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۲۶ء میں جب پہلی برما کی لڑائی ہوئی تو انگریزوں نے اراکان اور تناسیرم کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کیا۔ پھر سنہ ۱۸۵۲ء میں جب دوسری برما کی لڑائی ہوئی تو پیگو کا زرخیز علاقہ حکومت ہند کے ہاتھ آیا اور سمندر پر کسی طرف سے بھی شمالی برما کی حکومت کی رسائی باقی نہ رہی۔

اب واقعات کی رفتار نے یہ صورت اختیار کی کہ شمالی برما کا بھی انگریزی عمل داری میں شامل ہونا ضروری ہو گیا خاص طور پر اس لئے یہ خواہش اور زیادہ شدید ہو گئی کہ فرانسیسیوں کی طرف سے حکومت ہند کو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ شمالی برما میں اپنی حکومت کا ڈول نہ ڈالیں۔ چنانچہ جنگ سے قبل ہی لارڈ ڈفرن نے اپنے ایک خط میں جو مغربی برما کے چیف کمشنر کے نام تھا اس قسم کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا کہ "اگر فرانسیسیوں کی

کارروائیاں ایسی ہیں جن سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہو کہ وہ ہم سے پہلے شمالی برما میں اپنی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں مجھے مطلق تامل نہ ہوگا کہ اس پورے علاقہ کو برطانوی عملداری سے ملحق کر دیا جائے۔ موجودہ حالات میں مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ طریق کار اس سے بہتر ہوگا کہ وہاں ہم اپنے زیراثر کسی دوسرے حکمران کو گدی پر بٹھائیں[1]

شمالی برما پر قبضہ ہونے کے باعث حکومت ہند کو شہنشاہ چین سے اپنے سیاسی تعلقات کی صفائی کرنی پڑی۔ اب تک برما چین کی بالادستی کو مانتا تھا۔ اگرچہ محض رسمی طور پر۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اس ضمن میں آئندہ پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں حکومت ہند نے معاملے صاف کرنے چاہے تبت پر بھی چین کا اقتدار چلا آتا تھا۔ حکومت ہند نے حکومت چین کو اس امر پر رضامند کرلیا تھا کہ اگر وہ تبت کو اپنا تجارتی مشن بھیجے تو وہ کوئی اعتراض نہ کرے گی اس شرط سے کہ تبت کی حکومت اس پر آمادہ ہو۔ اگرچہ حکومت چین نے اس کی اجازت دے دی تھی لیکن خود حکومت تبت نے اس پر اعتراض کیا اور مشن کا استقبال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ غرضکہ یہ معاملہ اُلجھ کر رہ گیا۔ شمالی برما پر قبضہ ہو جانے کے بعد حکومت ہند نے حکومت چین سے یہ طے کیا کہ وہ اس وقت تبت کو اپنا مشن نہیں بھیجتی بشرطیکہ چین کی حکومت پورے برما پر انگریزی تسلط کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ چین نے برما پر انگریزی اقتدار مان لیا۔ اس ملک پر چین کا اقتدار محض رسمی تھا۔ وہاں برطانوی تسلط تسلیم کرنے سے چین کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا۔ لیکن چین یہ بھول گیا کہ مغربی استعمار اپنی قوت کو بڑھا کر ایک دن خود اس کی شہ رگ کو اپنے قابو میں کرلے گا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء

رپن نے اپنی یادداشت میں جو لارڈ ہارٹنگٹن وزیر ہند کو بھیجی تھی صاف طور پر بتلادیا تھا کہ

[1] Sir Alfred Lyall, Life of Marquis of Dufferin and Av, p. 398.

تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ملک کی حکمرانی میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جو انھیں دینا چاہیئے۔ اگر انھیں ملک کے نظم ونسق میں شریک نہ کیا گیا تو ان کی توانائیاں کجروی اختیار کر کے انگریزی راج کی بنیادوں کو متزلزل کرنے والی ہونگی۔ اس کی پیشین گوئی ٹھیک نکلی۔ مقامی حکومت خود اختیاری کے جو ادارے رپن کے عہد میں قایم ہوئے انھیں بعد میں اس طریقہ پر چلایا گیا کہ وہ غیرموثر ہو گئے اور ان کے ذریعہ ہندوستانیوں کی جن تمناؤں کو پورا کرنا مقصود تھا وہ بھی پوری نہ ہوئیں۔ غرضکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی انگریزی حکومت سے بدگمانی برابر بڑھتی گئی۔ ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی تاریخ اور انگریزی لبرل ازم کے اصول سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی فطری خواہش یہ تھی کہ اپنے ملک میں بھی جمہوری طرز کی حکومت قایم کرے جسے سیاسی ارتقا کی آخری منزل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی جانتے تھے کہ ان کے ملک میں بھی انگلستان کی طرح نمایندہ ادارے قایم ہوں تاکہ ان کے ذریعے سے ان کے بہترین لوگوں کو عاملہ اور مقننہ میں داخل ہو کر ملک کی خدمت کا موقع ملے۔ ملک کے ہر گوشے کے انگریزی پڑھے ہوئے ہندوستانیوں میں یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اپنی آواز موثر بنانے کے لئے اپنی سیاسی تنظیم کریں۔ چنانچہ بنگال میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور بمبئی میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن نے ہندوستانیوں کے پبلک مسائل کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا تھا۔ لیکن انکی نوعیت مقامی تھی۔ اب ضرورت اس کی محسوس کی جا رہی تھی کہ کل ملک کے لئے ایسی جماعت قایم کی جائے جو ہندوستانیوں کے جائز حقوق کی دیکھ بھال کر سکے۔ ۱۸۷۷ء میں سریندر ناتھ بنرجی نے بمبئی اور مدراس کے صوبوں کا دورہ کیا تاکہ ایک محضر تیار کیا جائے اور لارڈ سالسبری وزیر ہند کے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا جائے جس کی رو سے انڈین سول سروس کے امتحان میں شرکت کرنے والے امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے کم کر کے ۱۹ سال کر دی گئی تھی۔ اس طرح عمر کم کرنے سے جو تھوڑے بہت ہندوستانی سول سروس میں آ جاتے تھے آئندہ وہ بھی نہیں آ سکینگے۔ یہ محضر ہاؤس آف کامنز میں

پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔ اسی زمانے میں لارڈ لٹن کی شہنشاہی پالیسی سے ہندوستانیوں کے جذبات برطانوی حکومت کے خلاف ہو گئے۔ رپن نے اگرچہ تالیف قلب کی کوشش کی لیکن اس کی حکمت عمل کو بعد میں غیر موثر بنا دیا گیا۔ اب ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی محرومی اور بے اثری کا اور بھی زیادہ احساس ہو گیا۔ البرٹ بل کے ضمن میں اینگلو انڈین طبقہ نے جو دوڑ دھوپ کی اس سے اہل ہند کو سبق ملا اور انھوں نے سوچا کہ اگر وہ بھی منظم ہو کر کچھ کریں تو اس کا اثر ہونا لازمی ہے ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے البرٹ ہال میں جو پولیٹیکل کانفرنس ہوئی اس میں بھی سر سندر ناتھ بنرجی نے ایک ایسی سیاسی جماعت کی ضرورت پر زور دیا جو ملکیوں کے حقوق اور مفاد کی نگہداشت کر سکے۔ ہندوستانیوں کے مقصدوں سے ہمدردی رکھنے والے بعض انگریز بھی تھے جو چاہتے تھے کہ ان کے جائز حقوق سے انھیں محروم نہ کیا جائے۔ ان میں مسٹر الن ہیوم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ انگلستان اور ہندوستان میں ایسا ربط قایم ہو جائے جو دونوں ملکوں کی فلاح و ترقی کا ضامن ہو۔ مسٹر ہیوم نے ایک بین الہندی جماعت کو تشکیل دینے کا خیال باضابطہ طور پر سب سے پہلے پیش کیا اور انھیں کے ایما پر انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ وہ احساس جو ملک کے مختلف حصوں کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے دلوں میں کچھ عرصے سے موجود تھا اب اس کی خارجی تشکیل کا وقت آ گیا اور وہ بھی ایک انگریز ہمدرد کے ہاتھوں۔ مسٹر ہیوم کے پیش نظر یہ تھا کہ جس صوبے میں کانگریس کا اجلاس ہو وہیں کا گورنر یا لفٹننٹ گورنر اس کی صدارت کرے چنانچہ اس نے وائسرائے لارڈ ڈفرن سے اس ضمن میں گفتگو بھی کی۔ لیکن ڈفرن نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر نہ کر سکیں گے۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ کانگریس کے کاروبار میں سرکاری عنصر کو شریک نہ کیا جائے۔ شروع شروع میں ڈفرن نے کانگریس کے مقصدوں سے کچھ ہمدردی کا اظہار کیا بلکہ اسی نے مسٹر ہیوم کو یہ

بھی مشورہ دیا کہ معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی معاملوں پر بھی اس کے اجلاسوں میں بحث و مباحثہ ہو سکتا ہے[۱]۔

شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند کے مقصدوں میں وحدت پیدا کرے، ملکی انتظام میں ان کی شرکت کا مطالبہ کرے اور انھیں وقتاً فوقتاً جو شکایتیں پیدا ہوں انھیں تجویزوں کی شکل میں حکومت کے روبرو پیش کرے۔ چنانچہ پہلی کانگریس کے صدر مسٹر ڈبلو سی بونرجی نے اپنے خطبہ صدارت میں صاف طور پر کہا کہ "ہمارا مقصد ملک کی وحدت کے ان جذبات کو مستحکم کرنا ہے جن کی ابتدا ہمارے محبوب لارڈ رپن کے عہد میں ہوئی ہے"[۲]۔ انگریزوں میں مسٹر ہیوم کے علاوہ سر ڈیوڈ ڈیول، سر ولیم ویڈربرن اور سر ہنری کاٹن بھی انڈین نیشنل کانگریس کے مقصدوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مسٹر ہیوم نے انگلستان جا کر جان برائٹ اور چارلس براڈلا کو آمادہ کر لیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اہل ہند کے جائز مطالبوں کی تائید کریں گے۔ لبرل جماعت کے بعض دوسرے افراد نے بھی اس ضمن میں اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ شروع میں اگرچہ کانگریسیوں کے لب و لہجہ میں احتیاط پائی جاتی تھی لیکن دو سال کے اندر اندر حکومت ہند ان کے مقصدوں سے بدظن ہو گئی اور اپنے ملازموں کے لئے کانگریس کی شرکت ممنوع قرار دی۔ لارڈ ڈفرن جس نے شروع میں کانگریس کے مقصدوں سے ہمدردی ظاہر کی تھی اس کی نسبت طنز اور تحقیر سے ذکر کرنے لگا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا کانگریس حکومت کی مخالف جماعت تصور کی جانے لگی۔ ڈفرن چاہتا تھا ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں کے نمائندوں کو مقننہ میں شریک کرنا چاہئے میزانیہ پر انھیں بحث کرنے کا حق دینا چاہئے۔ انھیں عاملہ کے ارکان سے سوالات کرنے کا بھی حق دینا چاہئے۔ اس نے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے

---

۱. The History of the Congress, by P. Sitaramayya, p. 107.

۲. Thompson and Garatt. Rise and fulfilment of British Rule in India, p. 543.

۳. Ibid., p. 544.

بعد اپنے ایک مراسلہ میں جو اس نے وزیر ہند کو بھیجا تھا اہل ہند کے ارادوں اور خواہشوں کی صحیح ترجمانی کی اور رپن کی طرح اس نے بھی وزیر ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ انگریزی حکومت کو چاہیئے کہ بہت جلد سیاسی اصلاحیں نافذ کرے تاکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں شرکت کا موقع حاصل ہو سکے لارڈ ڈفرن نے اپنی مجلس عاملہ کی ایک کمیٹی اصلاحات کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے مقرر کی۔ اس کمیٹی نے جو سفارشیں پیش کیں ان میں سب سے اہم یہ تجویز تھی کہ گورنر جنرل اور گورنروں کی مجالس مقننہ میں نیابتی طریقہ کو رائج کیا جائے۔ اب تک ان مجالس کی تشکیل میں انتخابی عنصر بالکل نہیں رکھا گیا تھا بلکہ تمام ارکان نامزد شدہ ہوتے تھے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنے مراسلہ میں جو وزیر ہند کے نام تھا اس کی وضاحت کر دی تھی کہ اس کی اسکیم دراصل مجالس مقننہ کی توسیع کرنا چاہتی ہے۔ ان کی حیثیت کو بلند کرنا اُن کے وظیفوں کو بڑھانا اور طریق انتخاب کو رواج دینا بھی مقصود ہے تاکہ سیاسی اداروں کی حیثیت سے ان کے عام خد و خال لبرل نظر آئیں۔ لارڈ موصوف نے ساتھ ساتھ اس کی بھی وضاحت کر دی کہ ہم ہندوستان میں پارلیمانی طریق حکومت رائج کرنے کا خواب و خیال بھی نہیں رکھتے۔ یہ اس واسطے کیا گیا تاکہ انگلستان کی قدامت پسند جماعت ان کی اسکیم کی طرف سے بدظن ہو کر چیخ پکار نہ کرے جس طرح رپن کے عہد میں کیا گیا۔ باوجود اس محتاط نقطہ نظر کے جو لارڈ ڈفرن اور حکومت ہند کی جانب سے اختیار کیا گیا وزیر ہند نے صاف جواب دے دیا کہ اس وقت تک حکومت ہند کی تشکیل میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی کرنے کے متعلق غور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کی تائید میں قطعی شہادتیں نہ فراہم کر لی جائیں۔

لارڈ ڈفرن کے ایما پر حکومت ہند نے ۱۸۸۶ء میں سر چارلس ایچی سن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ اس مسئلہ پر غور کرے کہ ہندوستانیوں کی تعداد اعلیٰ خدمتوں پر بڑھانے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس

کمیشن کے ۱۵ ارکان میں سے ۵ ہندوستانی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس
کی اس تجویز پر غور کیا گیا کہ انڈین سول سروس کے مقابلہ کا امتحان انگلستان
میں بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ تجویز منظور نہیں کی گئی اس لئے کہ اندیشہ تھا
کہ ہندوستانیوں کے وہ طبقے جو معاشری لحاظ سے بلند رتبہ رکھتے ہیں لیکن
انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ابھی پیچھے ہیں اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکینگے
کمیشن نے اس ضمن میں تمام تفتیشوں پر سوچ بچار کیا اور پبلک سروس کو
چار حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ امپیریل سنٹرل، پراونشل اور سبارڈینیٹ
پہلے کے تقررات وزیر ہند کی جانب سے ہوں گے۔ دوسرے کا تعلق تمام تر
مرکزی حکومت سے رہے گا۔ اس کے تحت مالیات ریلوے اور ٹپہ وغیرہ
کی اعلیٰ خدمتیں ہوں گی۔ پراونشل اور سبارڈینیٹ سروس کے ارکان کا تقرر صوبجاتی
حکومت کرے گی۔ ان سروسوں کے ارکان ترقی کرکے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
ڈسٹرکٹ جج اور سشن جج کی خدمتوں پر فائز ہو سکیں گے۔ یہ دونوں سروسیں
تمام تر ہندوستانیوں پر مشتمل ہوں گی۔ کمیشن نے اس کی بھی سفارش کی
کہ قابل نوجوان ہندوستانیوں کو امپیریل سروس میں داخل ہونے کے لئے
آسانیاں بہم پہنچائی جائیں اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ چونکہ
انگریزی عنصر کو کم کرنے سے برطانوی نقطہ نظر سے نظم و نسق میں خرابیاں
پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے احتیاط لازم ہوگی۔

اب ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کا آہستہ آہستہ اثر بڑھ رہا تھا۔ انگلستان
کے بعض لبرل خیال کے مدبرین کو بھی اہل ہند کے سیاسی مطالبوں سے
ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں ہاؤس آف کامنز میں چارلس بریڈلا
نے ایک مسودہ قانون پیش کیا جس میں گورنر جنرل اور گورنر کی مجالس مقننہ
کے ارکان کی تعداد بڑھانے، ان میں انتخابی عنصر شامل کرنے اور ان
کے اختیارات وسیع کرنے کے متعلق تجویزیں تھیں۔ لیکن موصوف کے
انتقال کے باعث اور آئرستان کے مسئلے کے انہماک کی وجہ سے پارلیمنٹ
ہندوستانیوں میں سیاسی اصلاحیں نافذ کرنے کے مسئلہ پر غور نہ کر سکی اور چند سال کے لئے

معاملہ ٹل گیا۔

لارڈ ڈفرن کے جانشین لارڈ لینسڈون کے عہد حکومت میں کانگریسی انتہا پسندوں کا زور بڑھنے لگا۔ لارڈ موصوف کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مسئلے پر کافی مباحثہ ہوا اور وہ تمام مسائل بحث میں آئے جن کی نسبت ڈفرن نے اپنے مراسلے میں اشارہ کیا تھا۔ آخر ۱۸۹۲ء میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا جس کا منشا ۱۸۶۱ء کے قانون مجالس ہند کی ترمیم تھا۔ مسٹر (بعد میں لارڈ) کرزن نے جو اس وقت نائب وزیر ہند کے عہدہ پر تھے اس مسودہ قانون کو ہاؤس آف کامنز میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا مقصد حکومت ہند کی بنیاد کو وسیع کرنا اور اس کے فرائض میں وسعت پیدا کرنا ہے تاکہ ہندوستانیوں کے غیر سرکاری عنصر کو حکومت کے کام میں زیادہ شرکت کے موقعے مل سکیں۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔[1] یہ گویا سرکاری طور پر اس نمایاں ترقی کا اعتراف تھا جو اہل ہند کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے گزشتہ تیس سال میں کی تھی۔ قانون مجالس ہند (انڈین کونسلز ایکٹ) ۱۸۹۲ء کی رو سے ذیل کے سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔

گورنر جنرل کی کونسل (امپیریل کونسل) کے زاید ارکان کی تعداد بجائے ۱۲ کے ۱۶ کر دی گئی۔ صوبجاتی مجالس وضع قانون کی تعداد بمبئی، مدراس اور بنگال کی پریسی ڈنسیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ۲۰ اور صوبہ شمال مغرب کے لئے ۱۵ قرار دی گئی۔ پنجاب اور برما میں پہلی مرتبہ مجالس وضع قانون قایم کی گئیں۔ گورنر جنرل اور گورنروں کو اختیار دیا گیا کہ مجالس کے ارکان کی نامزدگی کے متعلق اس قانون کے تحت اپنی صوابدید کے موافق تفصیلی قاعدے مقرر کریں تاکہ مختلف مفادوں کی نمائندگی

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 545.

ہو سکے۔ بلدیات، مجالس ضلع، جامعات اور اور تجارتی ایوان ان مجالس کے لئے انتخابی حلقے مقرر ہوئے۔ حکومت ہند کا سالانہ میزانیہ بحث کے لئے ارکان کے سامنے پیش کیا جائیگا اور ہر رکن کو چند روز پہلے میزانیہ کی ایک نقل بھیج دی جائے گی۔ ارکان کو اختیار ہوگا کہ میزانیہ کی مدوں کے متعلق تنقید اور بحث کر سکیں۔ محکمہ متعلقہ کا اعلیٰ افسر یا صدر ان اعتراضوں کا جواب دے گا۔ میزانیہ کے متعلق ارکان کوئی نئی تجویز پیش کرنے کے مجاز نہ ہونگے۔ ارکان مجلس کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق ہوگا تاکہ کسی مسئلہ کے متعلق حکومت سے معلومات فراہم کی جائیں جن کی اطلاع پہلے سے کرنا ہوگی۔ صدر مجلس کو اختیار ہوگا کہ اگر کسی سوال کو نامناسب خیال کرے تو اس کے پیش کرنے کی اجازت نہ دے۔ صوبجاتی مجلسوں کو اختیار ہوگا کہ گورنر جنرل کی اجازت حاصل کرنے کے بعد امپریل کونسل کے کسی ایسے منظور کردہ قانون کی ترمیم یا تنسیخ کے متعلق بحث کر سکیں جو اس صوبہ سے تعلق رکھتا ہو۔

سنہ ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند سے امپریل کونسل اور صوبجاتی مجلسوں کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔ اب ان کا کام محض وضع قانون نہیں رہا بلکہ انتظامی معاملوں کے متعلق ارکان مجلس حکومت سے سوالات کر سکتے تھے جو ایک نہایت اہم پارلیمانی حق ہے۔ اس کے علاوہ ان مجالس کے قیام میں بالواسطہ طریق انتخاب پہلی مرتبہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ یہ دونوں باتیں سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس نے سنہ ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند کو غیر تشفی بخش اور اپنی امیدوں سے بہت کم قرار دیا اور مزید سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا۔ خاص طور پر یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ امپریل کونسل اور صوبہ جاتی کونسلوں کے ارکان کا انتخاب براہ راست ہونا چاہئے۔

لے۔ Cambridge History of India, Vol. VI, p 546-47.

شمالی مغربی سرحد لارڈ لینسڈون کے عہد حکومت میں درۂ بولان تک ریل پہنچادی گئی اور کوئٹہ سے لیکر کشمیر تک سرحد پر انگریزی حلقۂ اثر بڑھانے کی کوشش کی گئی حلقۂ اثر قایم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت براہ راست ان علاقوں پر اپنی حکومت نہیں قایم کرے گی لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ کوئی دوسری طاقت وہاں اپنا عمل دخل بڑھائے۔ لارڈ ڈفرن کے عہد حکومت میں امیر عبدالرحمن خاں سے دوستانہ تعلقات کی تجدید ہوئی تھی لیکن لینسڈون کے عہد میں حکومت افغانستان اور حکومت ہند کے تعلقات میں ایک طرح کی سرد مہری پیدا ہوگئی لارڈ لینسڈون کے خطوں کا انداز امیر عبدالرحمن کی نظر میں دوستی اور اخلاص کے منافی تھا۔ اسے یہ بات بھی ناگوار تھی کہ لارڈ لینسڈون اس کو اندرونی انتظامات کے متعلق بیٹھے بیٹھے مشورہ دیا کرتا ہے جس کی دراصل کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

برطانوی سرحد اور افغانستان کی سرحد کے درمیان ۲۵ ہزار مربع میل کا کوہستانی علاقہ ہے جہاں قدیم سے مختلف قبیلے آباد ہیں۔ حریت و آزادی انکی گھٹی میں شامل ہے۔ برائے نام یہ قبیلے امیر افغانستان کے ماتحت تھے۔ امیر افغانستان کو ان پر بس اتنا اثر حاصل تھا کہ جب کبھی وہ چاہتا ان قبیلوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرسکتا تھا ان قبیلوں کا اس میں فائدہ تھا کہ وہ برطانوی علاقوں پر دھاوے کرکے لوٹ مار کریں اور تجارتی راستوں پر چھاپے مارکر مال و اسباب لوٹ لیے جائیں۔ حکومت ہند ایسی صورت میں قبائلی علاقوں پر فوج کشی کرتی جس سے اکثر روک تھام کے بجائے اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اول تو یہ کہ وسیع قبائلی علاقے میں فوج کشی سے حکومت ہند کے خزانہ پر بہت بار پڑتا اور دوسرے یہ کہ افغانستان کی حکومت سے کشیدگی پیدا ہونا لازمی تھا۔ لارڈ رابرٹس جب تک کمانڈر ان چیف رہا اس وقت تک سرحد پر اقدامی حکمت عملی پر عمل ہوتا رہا جس کی وجہ سے امیر عبدالرحمن حکومت ہند سے بدظن ہوگیا۔ ۱۸۸۸ء میں حکومت ہند نے لارڈ رابرٹس کے زیر سرکردگی ایک مشن افغانستان روانہ کرنے کا ارادہ کیا تاکہ امیر صاحب کے دل میں حکومت ہند کے مقصد ول

کی نسبت جو شبہے پیدا ہو گئے ہوں انھیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن چونکہ شمالی افغانستان کی سرحد پر اسحٰق خاں نے اسی زمانے میں بغاوت کر دی تھی اور امیر عبدالرحمٰن اس کو فرو کرنے میں مصروف تھے اس لئے عارضی طور پر مشن کو ملتوی کرنا پڑا۔ دراصل امیر افغانستان لارڈ رابرٹس کو اس کے خیالات کی وجہ سے سخت ناپسند کرتا تھا اس لئے وہ اس کے مشن کا استقبال کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس اثناء میں حکومت ہند نے روسی خوف سے گلگت کی طرف جو فوجی چھاونیاں بنائیں تاکہ چترال کے علاقے تک پہنچ ہو سکے، اس سے امیر افغانستان کی بدظنی اور بڑھ گئی ۱۸۹۲ء میں مہتر چترال کے انتقال پر جو جانشینی کا قضیہ پیدا ہوا اس سے حکومت ہند نے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر رابرٹ سن کو اپنا سفیر بنا کر وہاں متعین کر دیا۔

حکومت ہند نے لارڈ رابرٹس کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد سر مارٹمر ڈیورنڈ کی سرکردگی میں افغانستان ایک مشن روانہ کیا۔ ڈیورنڈ نے بڑی ہوشمندی اور قابلیت سے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو حکومت ہند اور حکومت افغانستان کے درمیان پچھلے دنوں پیدا ہو گئی تھیں۔ جب تک ڈیورنڈ افغانستان میں رہا اس کی حفاظت افغانی فوج کے ذمے رہی۔ برنس اور کیوگناری کے قتل کی یاد ابھی تازہ تھی جن کی حفاظت کے لئے انگریزی فوجی دستے ہندوستان سے گئے تھے۔ امیر صاحب اور ڈیورنڈ میں ایک معاہدہ ہوا جس کی بموجب امیر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ قبائلی علاقوں کے معاملوں میں کسی قسم کا دخل نہ دیں گے۔ انگریزی اور افغانی کمشنروں نے قبائلی علاقوں اور افغانستان کی سرحد کا تعین کر دیا۔ سرحد کے بعض علاقے افغانستان کی حکومت کے حوالے کئے گئے جس کے عوض امیر عبدالرحمٰن خاں نے سوات، باجوڑ، دیر اور چترال کے معاملوں سے بے تعلقی کا وعدہ کیا۔ چمن کے مقام پر جہاں حکومت ہند نے ریلوے اسٹیشن قائم کیا تھا حکومت افغانستان اپنی ملکیت کے دعوے دار تھی لیکن اس معاہدہ کے بموجب وہ اس دعوے سے دستبردار ہو گئی۔ امیر افغانستان کو حکومت ہند نے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور زر امداد ی

دیا کرتی تھی۔ اس رقم کو اٹھارہ لاکھ کر دیا گیا۔ حکومت ہند کی طرف سے یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ امیر صاحب ہندوستان کے بندرگاہوں کے ذریعے باہر سے جو جنگی سامان منگائیں گے اس پر کسی طرح کی پابندیاں نہیں عائد کی جائیں گی۔ امیر عبدالرحمن خاں کو حکومت ہند کی طرف سے سر مارٹمر ڈیورنڈ نے انگلستان آنے کی دعوت دی۔ امیر صاحب نے دعوت کو قبول کر لیا لیکن وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ ان کی بجائے ان کے دوسرے بیٹے نصراللہ خاں ۱۸۹۵ء میں انگلستان گئے جہاں ان کی آؤ بھگت کی گئی۔ اس موقع پر حکومت افغانستان چاہتی تھی کہ برطانوی حکومت سے یہ طے ہو جائے کہ افغانستان کا سفیر لندن میں رہا کرے لیکن انگریزی حکومت اس پر آمادہ نہ ہوئی۔

لارڈ لینسڈون کے عہد حکومت میں شمال مغربی سرحد کی طرح ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر بھی فوجی نقل و حرکت رہی۔ فرانس کے انڈوچین پر قبضہ کرنے اور میکانگ تک پہنچ جانے اور ادھر انگریزوں کے شمالی برما پر تسلط قایم کرنے سے لازمی طور پر دونوں شہنشاہی ممالک میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی تھا۔ شمالی برما کی طرف سے انگریز اور انڈوچین کی طرف سے فرانسیسی اپنا اپنا حلقۂ اثر اسی طرح سے وسیع کرنے کی فکر میں تھے جس طرح افغانستان اور وسط ایشیا میں روس اور انگریز اپنی اپنی مملکتوں کی حفاظت کے لئے حلقہ ہائے اثر قایم کر رہے تھے۔ اس قسم کا عمل ہمیشہ وہاں نظر آتا ہے جہاں دو بڑی سلطنتیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر لوشائی، چن اور شان کی ریاستوں پر انگریزی حکومت نے اپنا حلقۂ اثر قایم کر لیا جو مشرقی برما میں واقع تھیں۔

اس عہد میں بعض دیسی ریاستوں کے معاملے بھی مرکز توجہ بنے۔ منی پور کی ریاست کے معاملات میں جو آسام کی سرحد پر واقع ہے لارڈ لینسڈون کی حکومت نے موثر مداخلت کی جانشینی کے قضیے کے ضمن میں وہاں جو بدامنی

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 428

پھیلی اسے دور کرنے کو آسام کے چیف کمشنر کوئنٹن کو مامور کیا گیا۔ منی پور میں بلوہ ہوگیا لیکن آسام کے چیف کمشنر نے تھوڑی سی فوج کی مدد سے صورت حالات پر قابو پا لیا۔ راجا کے خاندان کے ایک نابالغ لڑکے کو راج گدی پر بٹھایا گیا اور اس کی نابالغی کے زمانے میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ سے ریاست کا انتظام انجام پایا۔ اسی طرح قلات میں خان قلات کے خلاف حکومت ہند نے کارروائی کی۔ اس کی بد انتظامی کی وجہ سے لوگوں کے جان و مال کی حفاظت ممکن نہ تھی۔ چنانچہ قلات کے سرداروں کے مشورہ کے بموجب خان کو برطرف کر کے اس کے بیٹے کو حکمران بنایا گیا۔ کشمیر کے حکمران مہاراجا پرتاپ سنگھ کو حکومت ہند نے اس بنا پر گدی سے ہٹا دیا کہ اس کو کچھ ایسے ثبوت ملے جن سے پتہ چلتا تھا کہ مہاراجا روسیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کو برطرف کر کے ریاست کا نظم و نسق اسٹیٹ کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس کی صدارت برٹش ریزیڈنٹ کرے گا۔ کشمیر کی شمالی سرحد کی طرف جو علاقے روس کی سرحد سے ملتے تھے وہاں انگریزی چھاؤنیاں قائم کر دی گئیں جنھیں براہ راست حکومت ہند کے ماتحت کر دیا گیا۔ کشمیر کے معاملے میں حکومت ہند نے جو من مانی کارروائی کی اس کے خلاف پارلیمنٹ میں چارلس بریڈلا نے سخت احتجاج کیا۔ بعد میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ معزول مہاراجا پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ مشتبہ تھے[1]۔

لارڈ لینسڈاؤن کے جانشین لارڈ الجن کے عہد میں ملک طاعون اور قحط کی مصیبتوں کا شکار رہا۔ ۱۸۹۶ء میں ہانگ کانگ سے غلہ سے لدے ہوئے جو جہاز بمبئی پہنچے ان میں ایسے چوہے بھی آگئے جو طاعون سے متاثر ہو چکے تھے۔ طاعون کی بیماری بمبئی کی گھنی آبادی میں ایسی جلد پھیل گئی جیسے گھنے خشک جنگل میں آگ

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 496, The British Crown and the Indian States, p. 85.

پھیل جاتی ہے۔ بمبئی کے علاوہ مغربی ہند اور وسط ہند کے دوسرے شہروں میں بھی طاعون کی وبا پھیل گئی۔ اس ضمن میں حکومت نے جو قرنطینہ کے قاعدے نافذ کئے اس سے اہل ملک میں سخت بددلی پیدا ہوگئی بلکہ حکومت کی بدانتظامیوں کے متعلق دیسی زبانوں کے اخباروں میں سخت نکتہ چینی کی جانے لگی۔ مسٹر تلک نے اپنے اخبار "کیسری" میں سخت تنقیدیں شائع کیں۔ طاعون کو دور کرنے کے لئے جو اعلیٰ افسر مقرر کئے گئے تھے ان میں سے دو کو جن کے نام مسٹر رینڈ اور لفٹنٹ ارست تھے پونا میں قتل کر دیا گیا۔ قاتلوں کو پھانسی دی گئی اور مسٹر تلک کو مشتعل کرنے کے الزام میں ڈیڑھ سال کی سزا دی گئی۔ بعد میں حکومت ہند نے اس امر کو تسلیم کیا کہ طاعون کی روک تھام کے لئے جو قرنطینہ کے قاعدے نافذ کئے گئے تھے ان میں ملک والوں کے رسم و رواج اور ذات پات کے فرق و امتیاز کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ قاعدے موثر نہ ہو سکے اور ان سے ملک میں بددلی پیدا ہوئی۔ انتہا پسندوں نے ان تمام دردناک واقعات کو انگریزی حکومت کی بدانتظامی اور رعایا کے حالات سے ناواقفیت پر محمول کیا۔

حکومت ہند کو شمال مغربی سرحد پر اس زمانے میں سخت شورش کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۸۹۳ء میں حکومت افغانستان اور حکومت ہند میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے چترال کا علاقہ انگریزی حلقۂ اثر میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے گلگت میں جو پولیٹیکل ریذیڈنٹ مقرر کیا وہ کبھی کبھی چترال کے صدر مقام مستوج کا دورہ کرتا رہتا تھا۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں چترال کے حکمران کے قتل ہونے پر جانشینی کا قضیہ پیدا ہوگیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر حکومت ہند کے حکم سے انگریزی افواج نے چترال پر قبضہ کر لیا۔ لارڈ ایلجن چاہتا تھا کہ اس سرحدی علاقے پر جو روس کی سرحد سے ملا ہوا ہے مستقل طور پر قبضہ جما یا جائے لیکن لارڈ روزبری کی لبرل وزارت نے اس کی مخالفت کی اور حکم دیا کہ انگریزی فوجوں کو چترال کا تخلیہ کر دینا چاہئے۔ پیشتر اس کے کہ حکم کی تعمیل ہو لارڈ روزبری کی وزارت کی جگہ لارڈ سالسبری کی قدامت پسند

وزارت پر سر اقتدار ہوگئی اور پچھلے تصفیہ کو رد کرکے حکومت ہند کو حکم دیا کہ چترال کے صدر مقام سے برطانوی سرحد تک فوجی نقل و حرکت کے لئے ایک سڑک بنائی چاہئے جس کی حفاظت کے لئے تھوڑے فاصلے پر قلعہ بندیاں ہوں جہاں انگریزی فوج مستقل طور پر رہے گی۔ قدامت پسند حکومت نے اپنی پیشرو حکومت کے تصفیہ کو جس طرح کالعدم قرار دیا اس کے باعث انگلستان میں سخت نکتہ چینی کی گئی اور کچھ عرصے بعد سرحد پر جو شورش پیدا ہوئی اس کا محرک اسی تصفیہ کو قرار دیا۔ مسٹر مارلے اور مسٹر اسکوتھ نے لارڈ سالسبری کی پالیسی پر پارلیمنٹ میں سخت تنقید کی۔ قدامت پسندوں اور لبرلوں کے اخباروں میں بہت دن بعد تک چترال کے مسئلے کے متعلق بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔

اس میں شبہہ نہیں ۱۸۹۷ء میں شمال مغربی سرحد پر جو عام بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب چترال کا مسئلہ بھی تھا۔ قبائلی باشندے ہمیشہ سے اپنی آزادی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ پچھلے چند سالوں میں ان کے علاقوں میں سڑکیں بنائی جارہی ہیں۔ ریلیں نکالی جارہی اور چھاؤنیاں قایم ہو رہی ہیں۔ یہ سب باتیں ان کے نزدیک ان کی آزادی میں رکاوٹ ڈالنے والی تھیں۔ قبائلی علاقے اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کے ذریعے جو سرحد کا تعین کیا گیا تھا اس کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا گیا کہ ڈیورنڈ لائن تک انگریزی قبضہ ہو جائے گا اور یہی ہندوستان کی شمال مغربی سرحد قرار پائے گی۔ ملاؤں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین شروع کردی جو اسلامی حکومتوں کو ایک ایک کرکے اپنی عملداری میں شامل کر رہے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن خاں نے حال ہی میں ایک رسالہ شایع کیا تھا جس میں جہاد کی حقیقت اور اس کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ غرضکہ سرحد پر ایک عام شورش کے لئے مسالا تیار تھا۔ جون ۱۸۹۷ء میں وادیٔ توچی اور چکدرا اور مالاکنڈ کی چھاؤنیوں پر قبیلے والوں نے ہلہ بول دیا۔

تھوڑے دنوں بعد آفریدیوں، وزیریوں اور مہمندوں نے اپنے اپنے علاقوں میں انگریزی سرحد پر حملے شروع کر دئے۔ حکومت ہند کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ شورش اتنی بڑھ جائے گی۔ ان حالات کے مدنظر سر بنڈن بلڈ اور سر ولیم لاکھرٹ کی سرکردگی میں دو زبردست مہمیں روانہ کی گئیں قبیلے والوں نے بڑی بہادری اور استقلال سے مقابلہ کیا لیکن چونکہ ان کے مادی وسیلے محدود تھے اس لئے انھیں ہار ماننی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ غدر کے بعد سے اب تک انگریزی فوجوں کو اتنا سخت مقابلہ کبھی نہیں کرنا پڑا جتنا کہ اس وقت قبائلی لوگوں کے خلاف کرنا پڑا۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ افغانستان میں بھی اتنے سخت مقابلے کی نوبت نہیں آئی تھی۔[1]

[1] ۔ Roberts, History of British India, p. 513
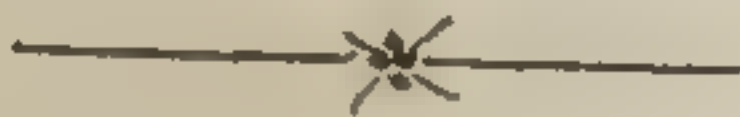
بیسواں باب

لارڈ کرزن کی خارجی اور داخلی حکمت عملی

۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن لارڈ الجن کا جانشین مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف چالیس سال تھی۔ وہ ایشیا کے اکثر ملکوں کا سفر کر چکا تھا۔ ترکی، مصر، ایران، افغانستان، جاپان، چین اور کوریا میں اس نے اپنے سفر کے دوران میں شخصی تعلقات قایم کر لئے تھے اور ان ملکوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس نے ایشیا کے مختلف ممالک کے متعلق تین تصنیفیں شائع کیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ کرزن سے پہلے کوئی گورنر جنرل مشرقی ممالک کے متعلق اس قدر وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے عہدہ پر فائز نہیں ہوا۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ حکومت ہند کے نظم و نسق کے ہر شعبے پر اپنا اثر چھوڑ جائے۔ اس کو تنقید کی پروا نہیں تھی۔ اسی لئے اس نے اپنے بہت سے مخالف پیدا کر لئے۔

سرحدی حکمت عملی

اگرچہ لارڈ کرزن ہندوستان کے شمال و مغرب پر اقدامی حکمت عملی اختیار کرنے کا موید تھا لیکن

اس ملک میں آکر اور یہاں کے صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنے اس خیال میں تبدیلی کرلی۔ چنانچہ اس کے حکم سے درۂ خیبر، وادی خرم، وزیرستان اور دوسرے قبائلی علاقوں میں جو انگریزی فوجیں تھیں انھیں واپس بلا لیا گیا۔ اس نے قبیلوں کی فوجیں بھرتی کیں تاکہ انھیں ان علاقوں میں استعمال کیا جائے اور ان کی مدد کے واسطے قبائلی علاقوں سے ذرا ہٹ کر برطانوی فوجیں متعین کردی گئیں تاکہ اچانک ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جاسکے۔ الجن کے عہد میں قبیلے والوں کو سزا دینے کی غرض سے برطانوی فوجیں قبائلی علاقوں میں گشتی چلی گئی تھیں اور اس کا کوئی خیال نہیں کیا گیا تھا کہ عقب میں رسل و رسائل کے ذرائع کو مضبوط کیا جائے۔ چنانچہ اس کا قوی اندیشہ تھا کہ یہ فوجیں رسل و رسائل کی کمی کی وجہ سے دشمن کی لشکر کشی کے وقت کہیں سخت پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں[1]۔ کرزن نے ان تمام تجویزوں کو جن کا مقصد قبائلی علاقے میں قلعہ بندی کرنا تھا رد کردیا۔ اس اقدامی حکمت عملی کی بجائے حکومت ہند نے ریلیں اور سڑکیں بنانے پر زیادہ توجہ کی تاکہ انگریزی چھاؤنیوں سے سرحدی ملیشیا کو آسانی سے مدد پہنچائی جاسکے۔ اس کے علاوہ کرزن نے قبائلی سرداروں کو ملانے کے لئے خوب روپیہ صرف کیا۔ اس نے سرحد کا دورہ کرکے کوئٹہ میں قبائلی سرداروں کا ایک دربار کیا اور انھیں یقین دلایا کہ انگریزی حکومت قبائلی علاقے پر قبضہ کی کوئی نیت نہیں رکھتی لیکن اس کے ساتھ وہ ان علاقوں میں بغاوت اور بدامنی کو بھی گوارا نہیں کرسکتی۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آئندہ دس سال تک سرحد پر امن و امان قائم رہا اور حکومت ہند کو ان پریشانیوں میں مبتلا نہ ہونا پڑا جن میں وہ بہت دنوں سے مبتلا تھی۔

قبائلی مسئلہ کو فوجی نقطۂ نظر سے حل کرنے کے بعد کرزن نے سرحد کے انتظامی مسائل کی طرف توجہ کی۔ اب تک شمال مغربی سرحد کا سارا علاقہ

[1] Cambridge History of India, Vol p. 460

صوبہ پنجاب کے تحت تھا۔ یہ انتظام ان انگریزی فتوحات کا نتیجہ تھا جو شمال مغربی ہند میں برطانیہ کو انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں حاصل ہوئی تھیں۔ اگرچہ سرحدی معاملوں کی ذمہ داری حکومت ہند پر تھی لیکن عملی حیثیت سے مرکزی حکومت اپنی تمام کارروائیاں حکومت پنجاب کے توسط سے انجام دیا کرتی تھی۔

کرزن نے جب مرکزی حکومت کی معتمدی (سکریٹریٹ) کی اصلاح کی تو اس کے سامنے بعض ایسی اہم کارروائیاں پیش ہوئیں جن کا تعلق سرحدی امور سے تھا اور جن کے متعلق حکومت ہند کو جلد تصفیہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن دوعملی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ کرزن نے محسوس کیا کہ جب تک سرحد کا علٰحدہ صوبہ نہ قایم کیا جائے اس وقت تک وہاں کے نظم ونسق کی اصلاح ممکن نہیں جو زیادہ تر فوجی اور سیاسی معاملوں سے تعلق رکھتا ہے[1]۔ کرزن نے اسی ضمن میں وزیر ہند کو یادداشت بھیجی اس کو منظور کرلیا گیا اور ۱۹۰۱ء میں شہنشاہ ایڈورڈ کی سالگرہ کے موقع پر سرحدی صوبے کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا انتظام ایک چیف کمشنر کے تحت رکھا گیا جو براہ راست حکومت کی ہدایتوں پر عمل کرتا تھا۔ صوبہ کا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا اس وقت تک اودھ اور موجودہ یوپی کے صوبہ کا نام صوبہ شمال مغربی تھا۔ یہ نام اس زمانے کی یادگار تھا جب کہ انگریزی راج شمال ہند میں بنگال و بہار تک محدود تھا اور چونکہ یہ علاقہ بہار کے شمال و جنوب میں تھا اس لئے یہ نام پڑ گیا اور کرزن کے عہد تک باقی رہا حالانکہ برطانوی حکومت کی شمال مغربی سرحد بدل کر کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی۔ چونکہ ناموں میں التباس کا اندیشہ تھا اس واسطے شمال مغربی صوبہ کا نام یونائیٹڈ پروانس آف آگرہ اینڈ اودھ (یو۔پی) رکھا گیا۔

انگریزی حکومت کی شمال مغربی سرحد جانی علاقوں تک پہنچنے کا لازمی

---

[1] Ronaldshay, The life of curzon. Vol. II, p. 182.

نتیجہ یہ تھا کہ افغانستان سے سیاسی تعلقات پیدا کئے جائیں۔ ایسا کرنے کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ وسط ایشیا میں روس کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا۔ کرزن کے خیالات ہمیشہ سے شہنشاہیت پسندانہ تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانوی ہند کے اطراف جو ممالک واقع ہیں وہ انگریزوں کے زیر اثر رہیں نہ کہ کسی دوسری یوروپین طاقت کے۔[1] گورنر جنرل اور وائسرائے ہونے سے قبل جب کرزن ۱۸۹۴ء میں سیاحت کی غرض سے افغانستان گیا تھا تو اس نے امیر عبدالرحمٰن خاں کو یقین دلایا تھا کہ انھیں حکومت ہند سے جو شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کرانے کی کوشش کرے گا۔ ستمبر ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں نے وفات پائی اور ان کی جگہ ان کے بڑے فرزند امیر حبیب اللہ خاں تخت و تاج کے مالک بنے۔ کرزن چاہتا تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں حکومت ہند سے جدید معاہدہ کریں جس کے بموجب دونوں حکومتوں کے تعلقات متعین ممکن ہو۔ لیکن امیر حبیب اللہ خاں نے اس کو غیر ضروری قرار دیا اور کرزن کو مطلع کر دیا کہ اس کے والد امیر عبدالرحمٰن خاں اور حکومت ہند کے درمیان جو تعلقات پچھلے بیس سال سے چلے آ رہے ہیں وہ آئندہ بھی جاری رہیں گے۔ اس پر حکومت ہند نے یہ دعا کیا کہ امیر عبدالرحمٰن خاں سے جو معاملے انگریزی حکومت نے طے کئے تھے ان کی نوعیت شخصی تھی۔ کرزن کی نیت یہ تھی کہ نئے امیر صاحب سے نئے معاہدہ کرے جس کی رو سے والی افغانستان کی حیثیت ماتحت حکمران کی ہو کر رہ جائے۔ ویسے بھی عام طور سے ماتحت حکمران کے انتقال پر اس کے جانشین سے جدید معاہدہ کیا جاتا ہے تاکہ ان ذمہ داریوں کی توثیق حاصل کر لی جائے جو اس کے پیشرو نے قبول کی تھیں۔ جب کرزن جدید معاہدہ پر اڑا تو امیر حبیب اللہ خاں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ حکومت ہند کے ماتحت نہیں ہیں کہ ایسا کریں۔ چنانچہ حکومت ہند جو ۱۸ لاکھ روپیہ سالانہ بطور زر امدادی حکومت افغانستان

[1] Ronaldshay, Ibid., p. 275

کو دیا کرتی تھی وہ بھی حکومت افغانستان نے وصول نہیں کئے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اپنے نام کے ساتھ ہزمجسٹی کا لقب استعمال کرنا شروع کر دیا جس سے اپنے ملک کی کل آزادی جتانا مقصود تھا۔ کرزن نے افغانستان کے متعلق جو کارروائی کی تھی اس کو حکومت برطانیہ پسند نہیں کرتی تھی اس واسطے کہ اس کو روس کا ڈر لگا ہوا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں جب کرزن انگلستان گیا ہوا تھا تو ہوم گورنمنٹ کے ایما پر منعرم وائسرے لارڈ ایمتھل نے سر لوئی ڈین کو امیر صاحب سے صلح و صفائی کے لئے بھیجا۔ چنانچہ سر لوئی ڈین کی سفارت کامیاب رہی۔ امیر صاحب اور حکومت ہند کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔ امدادی زر کی بقایا رقم حکومت افغانستان نے وصول کر لی اور حکومت برطانیہ اور حکومت ہند نے امیر حبیب اللہ خاں کے لئے ہزمجسٹی کا لقب تسلیم کر لیا۔

خلیج فارس انیسویں صدی کے آخر میں عدن سے لے کر بلوچستان کے ساحل تک بحری راستے پر انگریزی حکومت نے اپنا اثر قایم کر لیا تھا۔ اس ساحل علاقہ کے تمام حکمرانوں سے حکومت برطانیہ نے معاہدے کر لئے تھے جن کے بموجب یہ حکمران برطانیہ کے علاوہ کسی دوسری یورپین طاقت کو کسی قسم کی رعایتیں دینے کے مجاز نہ تھے۔ خلیج فارس میں بھی برطانوی اثر مانا جاچکا تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے روس، فرانس اور جرمنی خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سلطان عمان نے حکومت فرانس کو بندرجہ میں بحری اجازت دے دی تھی جہاں کوئلہ کا ذخیرہ فرانسیسی جہازوں کے لئے رکھا جا سکتا تھا۔ اسی زمانے میں سلطان نے برطانوی تاجروں کے مال پر بعض محاصل لگائے جو حکومت برطانیہ کو سخت ناگوار گزرے برطانوی حکومت نے جب اس ضمن میں حکومت فرانس سے دریافت کیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ ممکن ہے فرانسیسی قونصل نے اپنی ذمہ داری پر کوئی معاہدہ کر لیا ہو جس سے فرانسیسی دفتر خارجہ ناواقف ہے۔ حکومت ہند کو اس کی باوثوق ذریعوں سے اطلاع مل چکی تھی کہ بندرجہ پر فرانسیسی قبضہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ کرزن نے کرنل میڈ کو یہ اختیار دے کر روانہ کر دیا کہ اگر سلطان عمان بندرجہ

سے فرانسیسیوں کو فوراً بے دخل کرنے کا وعدہ نہ کرے تو اس کے محل پر حملہ
کر دیا جائے۔ سلطان نے کرنل میڈ کی شرطیں مان لیں اور اس طرح وہ معاملہ
جو حکومت برطانیہ اور حکومت فرانس کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ
مدتوں میں طے ہوتا چند گھنٹے میں انگریزوں کے موافق طے ہو گیا ہوم گورنمنٹ
براہ راست فرانس سے اس موقع پر بگاڑ نہیں چاہتی تھی۔ انگلستان کے
وزیر خارجہ لارڈ سالسبری کو اندیشہ تھا کہ خلیج فارس میں اثر و رسوخ کے لئے
فرانس سے جو مسابقت ہو رہی ہے اس کا اثر دوسرے خارجی امور پر نہ پڑے
چنانچہ جس طرح حکومت فرانس نے اس معاملہ کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش
کی تھی کہ سلطان عمان سے ممکن ہے فرانسیسی قونصل نے اپنی ذمہ داری
پر کوئی معاہدہ کر لیا ہو اسی طرح ہوم گورنمنٹ نے بھی خلیج فارس کی سیاست
میں راست اقدام کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ گورنر جنرل ہند کی
ذمہ داری پر اقدام کرایا جائے جس سے سرکاری طور پر انگلستان کے دفتر خارجہ
کا کوئی تعلق نہ تھا۔ غرضکہ دونوں طرف سے سیاست کے داؤں پیچ چلے
گئے۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ کرزن کی اولوالعزمی کے باعث فرانسیسیوں کو عمان
کی سیاست میں نیچا دیکھنا پڑا۔ بعد میں فرانسیسی جہاز رانوں نے یہ دعویٰ پیش
کیا کہ ان جہازوں کی جن پر حکومت فرانس کا جھنڈا ہو انگریزی ایجنٹ
عمان کے ساحل پر تلاشی لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ اس معاملہ نے بہت
طول کھینچا۔ آخر ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں یہ جھگڑا پیش ہوا اور فیصلہ
ہوا کہ فرانسیسی جہاز رانوں کو ساحل عمان پر حکومت فرانس کا جھنڈا استعمال
کرنے کا حق نہیں ہے۔ نیز یہ کہ سلطان عمان کو ان پر حق عدالت حاصل ہوگا۔
غرضکہ اس طرح فرانسیسیوں کی یہ کوشش کہ خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کریں
ناکام رہی۔

جرمنی بھی خلیج فارس میں بحری مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھا وہ بغداد ریلوے کا آخری اسٹیشن
خلیج فارس کے ساحل پر بنانا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں ساحلی علاقے کے بعض
شیوخ سے پٹہ پر زمین حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انگریزی سیاست کاری

نے جرمنی کے ان منصوبوں کو سرسبز نہ ہونے دیا۔ اسی طرح روس بندر عباس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ایران کے بیچ میں سے جو ریل بنانے کی روسی اسکیم تھی اس کے بموجب یہ مقام آخری اسٹیشن ہو۔ ۱۹۰۱ء میں روسی مشن نے خلیج فارس کے علاقوں کا دورہ کیا اور بندر عباس میں ایک روسی قونصل خانہ بھی قایم کیا گیا۔ کرزن روس کے خلاف فوجی قوت استعمال کرنے کی حمایت میں تھا لیکن ہوم گورنمنٹ اس حد تک اس کے ساتھ جانے کو آمادہ نہیں تھی۔ ہاں اس کو اس کی اجازت دی گئی کہ معقول حدوں کے اندر رہ کر روس کا کاٹ کیا جائے۔ چنانچہ خلیج فارس کے مختلف جزیروں میں انگریزی قونصل خانے قایم کئے گئے۔ ساحلی علاقے کے شیوخ اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو امدادی رقم دے کر پٹہ اور تار کی رعایتیں حاصل کی گئیں۔ حکومت ایران کے ساتھ تجارتی استحکام پیدا کرنے کے لئے دو سفارتیں بھیجی گئیں ایک انگلستان کے بورڈ آف ٹریڈ کی طرف سے اور دوسری حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۰۳ء میں لارڈ لینسڈ ڈن وزیر خارجہ نے پارلیمنٹ میں صاف طور پر اعلان کر دیا کہ خلیج فارس برطانوی حلقۂ اثر رہا ہے اور اب بھی ہے اور یہ کہ وہاں کسی دوسری مملکت کو بحری مرکز قایم کرنے یا قلعہ بندی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اس لئے کہ ایسا کرنے سے برطانوی مفاد خطرے میں پڑ جائے گا۔

کرزن نے ۱۹۰۳ء میں خلیج فارس کا ایک مختصر جنگی بیڑے کے ساتھ دورہ کیا۔ ساحلی علاقوں کے شیوخ سے سیاسی تعلقات استوار کئے گئے۔ اس نے ان شیوخ کو ایک دربار میں بذریعہ اعلان یقین دلایا کہ برطانیہ ان کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں اگر برطانوی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کسی جانب سے کوشش کی جائے تو اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔

کرزن نے جنوبی ایران کو روسی اثر سے بچانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ چنانچہ اس کے اصرار پر ہوم گورنمنٹ نے برطانوی سفیر مقیم طہران کو ہدایت کی کہ روس کو اچھی طرح جتا دیا جائے کہ اگر جنوبی ایران میں حلقۂ اثر قایم کرنے کی

کوشش کی تو برطانوی مفاد سے ٹکرانا لازمی ہوگا جسے کسی حالت میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر حکومت ایران نے اس ضمن میں روس کی ہمت افزائی کی تو برطانیہ کو اس ملک کے متعلق بھی اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی پڑے گی غرضکہ جب روس پر برطانوی حکمت عملی واضح ہوگئی تو ایران میں ریل بنانے اور جنوبی ایران میں بندرگاہ حاصل کرنے کی کوشش ترک کردی گئی۔ سیستان کو روسی اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے بلوچستان اور سیستان کے درمیان راستہ بنایا گیا جس سے تجارت میں سہولت ہوئی۔ بعد میں ۱۹۰۷ء میں اینگلو رشین کنونشن کے ذریعہ ایران میں روس اور برطانیہ کے حلقہ ہائے اثر کا تعین کردیا گیا تاکہ ان دونوں ملکوں میں ٹکرانے کی نوبت نہ آئے۔ شمالی ایران جہاں روسی اثر پہلے سے موجود تھا پورے طور پر روس کے حلقۂ اثر میں دے دیا گیا۔ خیوا اور بخارا کے فتح ہوجانے کے بعد تقریباً ایک ہزار میل تک روس اور ایران کی سرحد متصل ہوگئی تھی۔ طہران روسی سرحد سے سو میل پر واقع تھا۔ لیکن جنوب میں برطانوی حلقۂ اثر قائم ہوجانے اور دونوں قوتوں کے توازن سے ملک ایران روسی تسلط سے بچ گیا۔

تبت کی مہم تبت پر چینی اقتدار کا بندھن ڈھیلا پڑنے سے روس کو یہاں اپنا اثر بڑھانے کا اچھا موقع ملا۔ چین کے جو دو سفیر (ریزیڈنٹ) تبت کے صدر مقام لہاسا میں رہتے تھے ان کے اقتدار سے اہل تبت اپنے آپ کو آزاد کرانے کی فکر میں تھے۔ یہاں کا حکمران دلائی لاما پر ایک روسی شخص کا بڑا گہرا اثر تھا جس کا نام دورجیف تھا۔ وہ بدھ مت کا پیرو اور حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ ۱۸۹۸ء میں حکومت تبت نے اس کو روس روانہ کیا تاکہ وہاں جاکر بدھ مت کے جو ماننے والے ہیں ان سے مذہبی اغراض کی تکمیل کے لئے چندہ جمع کرکے لائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دورجیف مذہبی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام بھی چپکے چپکے انجام دے رہا تھا۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء میں وہ پھر روس گیا اور زار کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی۔ روس کے تمام بڑے بڑے اخباروں میں دورجیف

کے کارناموں پر مضامین شائع ہوئے جن میں یہ بات واضح کردی گئی کہ کس طرح وہ روسی اثر کو تبت میں بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب برطانوی سفیر مقیم سینٹ پیٹرزبرگ نے روسی وزیر خارجہ کو دورجیف کی کارروائیوں کے متعلق متوجہ کیا تو اس کو یہ جواب دیا گیا کہ اس کے روس آنے میں کوئی سیاسی محرک کارفرما نہیں ہے بلکہ وہ بدھ مت کے پیرول سے جو سلطنت روس میں آباد ہیں مذہبی تعلقات قایم کرنا چاہتا ہے۔ ادھر حکومت ہند کو بھی دورجیف کی نقل و حرکت اور تبت میں اس کے بڑھتے ہوئے اثر کے متعلق خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کرزن کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ دورجیف روس کا سیاسی ایجنٹ ہے جو تبت میں روسی حلقہ اثر قایم کرنے کی فکر میں ہے۔ خود دلائی لاما روس [illegible] متاثر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورجیف نے اس کو یقین دلایا تھا کہ برطانیہ کے مقابلے میں روس کی حکمت عملی تبت کے لئے زیادہ ہمدردانہ ہوگی اس لئے کہ روس میں بھی بدھ مت ماننے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ خود تبت کا مفاد اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی خاطر روس سے سیاسی روابط استوار کرے نہ کہ برطانیہ سے جو عرصے سے تبت میں تجارتی مرکز قایم کرنے کی فکر میں تھا۔ یہ خبر بھی اسی زمانے میں مشہور ہوئی کہ چین کو تبت پر جو حقوق اقتدار حاصل تھے وہ اسنے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعہ روس کے سپرد کردئے ہیں۔ یہ خبریں حکومت ہند کے لئے کافی تشویش پیدا کرنے والی تھیں اور خاص طور پر اسلئے اور بھی کہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کی نسبت کسی ذریعہ سے بھی توثیق نہیں کی جاسکتی تھی۔ اہل تبت عرصے سے حکومت ہند سے کسی قسم کے سیاسی یا تجارتی تعلقات قایم کرنے سے بچ رہے تھے اور اس ضمن میں اس کی ہر تجویز کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے سنہ ۱۹۰۲ء میں کرزن نے ہوم گورنمنٹ کو لکھا کہ حکومت ہند ایک فوجی مشن تبت روانہ کرنا چاہتی ہے تاکہ دلائی لاما سے اس کے طرز عمل

ا؎۔ Cambridge History of India, Vol. VI, p 427.

کے متعلق باز پرس کی جا سکے۔ ہوم گورنمنٹ اس کے اصرار پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ کرنل ینگ ہسبنڈ کی سرکردگی میں فوج روانہ کر دی گئی۔ اہل تبت کو مطلع کیا گیا کہ کھمبا جنگ کے مقام پر وہ اپنے نمائندے بھیج دیں تاکہ وہاں ان کے اور چین کے نمائندوں سے بات چیت کر لی جائے۔ چین کے نمائندے تو وہاں آ گئے لیکن حکومت تبت نے اپنے نمائندے اس وقت تک بھیجنے سے انکار کیا جب تک کہ برطانوی افواج ان کے سرحدی علاقے کا تخلیہ نہ کر دیں۔ برطانوی فوج کشی کے خلاف روس نے انگلستان کے دفتر خارجہ سے احتجاج کیا جس کا لارڈ لینز ڈاؤن نے یہ جواب دیا کہ حکومت تبت کے رویہ نے حکومت ہند کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ نیز یہ یقین دلایا کہ برطانیہ تبت کے کسی علاقے پر قبضہ و تصرف کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ غرضکہ کرنل ینگ ہسبنڈ نے مارچ ۱۹۰۴ء میں گیانٹسی پر فوج کشی کر دی۔ اہل تبت جو مقابلے پر آئے انھیں شکست کھانی پڑی۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انگریزی فوج نے لہاسا پر قبضہ کر لیا اور دلائی لاما فرار ہو گیا اور اپنے اختیارات ایجنٹ کے سپرد کر دیئے جس نے ذیل کی شرطوں پر کرنل ینگ ہسبنڈ سے صلح کر لی۔

(۱) یاٹنگ، گیانٹسی اور گارٹوک کے شہروں میں تجارتی مرکز قائم کئے جائیں گے اور آیندہ اس ضمن میں کسی روک ٹوک کو روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۲) ایک برطانوی تجارتی ایجنٹ گیانٹسی میں رہا کرے گا جسے وقتاً فوقتاً لہاسا جانے کی اجازت ہوگی۔

(۳) حکومت تبت ۷۵ لاکھ روپئے تاوان جنگ سالانہ ایک لاکھ روپیہ کے حساب سے ادا کرے گی۔

(۴) جب تک کہ تاوان کی پوری رقم ادا نہ ہو جائے انگریزی فوجیں وادیٔ چمبی پر قبضہ رکھیں گی جو بھوٹان اور سکم کے درمیان واقع ہے۔

(۵) حکومت تبت کو حق نہ ہوگا کہ اپنے کسی علاقے کو کسی بیرونی طاقت کے حوالے کرے اور نہ کسی بیرونی طاقت کا نمایندہ یا سفیر تبت میں رہے گا۔

(۲) کسی بیرونی طاقت کو تبت میں ریلوے، سڑکیں، تار اور کان کنی کے ضمن میں حقوق نہیں دئیے جائیں گے۔ اگر اس قسم کے حقوق دئیے گئے تو برطانوی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ بھی اس قسم کی رعایتیں حاصل کرے۔

وزیر ہند براڈرک کے اصرار پر تاوان کی رقم بجائے ۷۵ لاکھ کے ۲۵ لاکھ کردی گئی صلح کی شرطوں میں اتنی اور ترمیم کی گئی کہ انگریزی فوجیں وادئ چمبی سے تین سال کے بعد ہٹالی جائیں گی۔

تبت کے سیاسی معاملوں پر پارلیمنٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ روزبری نے کرزن کی خارجی حکمت عمل پر سخت تنقید کی اور بتایا کہ ۱۹۰۳ء کی تبت کی مہم اور ۱۸۷۸ء کی افغانستان کی مہم میں جو لارڈ لٹن نے بھیجی تھی ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں موقعوں پر ہندوستان کی سرحد کی مملکتیں روس سے اتحاد قایم کرنے کی طرف مائل نظر آتی تھیں اور دونوں موقعوں پر قانونی یا اخلاقی حیثیت سے انگریزوں کو اس کا حق حاصل نہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ دخل دیں۔ دونوں موقعوں پر حکومت ہند کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر ان سرحدی ممالک میں روسی سفیر رکھ لئے گئے اور انگریزی نمایندوں کو رکھنے سے انکار کیا گیا تو برطانوی وقار بری طرح متاثر ہوگا۔ دونوں موقعوں پر حکومت ہند نے ہوم گورنمنٹ کو باصرار آمادہ کیا کہ اقدامی حکمت عمل اختیار کی جائے۔ جس طرح لارڈ لٹن چاہتا تھا کہ کابل میں انگریزی ایجنٹ مستقل طور پر رہے اسی طرح لارڈ کرزن کی خواہش تھی کہ حکومت ہند کا نمایندہ گیانتسی یا لہاسا میں رہے۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۸۷۸ء کی دونوں مہموں کے موقع پر روس سے جس قدر خطرہ محسوس کیا گیا وہ حق بجانب نہیں کہا جاسکتا۔ جس طرح افغانستان میں کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ ہوا اسی طرح تبت میں کسی تجارتی یا سیاسی مفاد کی ترقی نہ ہوسکی[1]۔ برطانوی سیاست خارجہ کا رجحان اس زمانے میں یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے روس سے سمجھوتے کی صورت اختیار کی جائے۔ یہ

[1] Roberts, History of British India, p. 537 38.

یہ حکمت عملی ان سیاسی حالات کا نتیجہ تھی جو اس وقت براعظم یورپ میں پیدا ہو رہے تھے اور جن کی وجہ سے انگریزی حکومت روس کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ روس کے اس دعوے کا انگریزوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ اگر لہاسا میں انگریزی ایجنٹ رکھا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وسط ایشیا کی سیاست کا توازن درہم برہم ہو جائے گا۔ ۲ جون ۱۹۰۴ء کو وزیر خارجہ لارڈ لینسڈاؤن نے روسی سفیر کو یقین دلایا کہ اگر یورپ کی کوئی دوسری طاقت تبت کے معاملوں میں دخل نہیں دے گی تو انگریزی حکومت بھی وہاں نہ حلقۂ اثر قایم کرے گی اور نہ اندرونی معاملوں میں کسی قسم کی مداخلت کرے گی۔ بعد میں یہی سمجھوتے کے رجحانات ۱۳ اگست ۱۹۰۷ء کے اینگلو رشین کنونشن کی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اس معاہدہ کی رو سے انگلستان اور روس دونوں نے یہ طے کیا کہ تبت کے متعلق آئندہ انھیں جو بھی کارروائی کرنی ہوگی تو وہ حکومت چین کے توسط سے کی جائے گی۔ دونوں حکومتیں تبت میں نہ تو کسی قسم کی رعایتوں کی خواہاں ہوں گی اور نہ وہاں اپنے ایجنٹ رکھیں گی۔[1]

اندرونی نظم و نسق لارڈ کرزن نے ملک میں انتظامی اصلاحات نافذ کرنے کی طرف خاص توجہ کی۔ بار بار قحط پڑنے کی وجہ سے ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کی مالگزاری وصول کرنے کے اصول پر تنقید کر رہا تھا۔ کاشتکاروں کی حالت واقعی روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ بعض مدبرین کی رائے ہوئی کہ سارے ہندوستان میں دوامی بندوبست نافذ کر دینا چاہیے جس کی تائید مسٹر گوکھلے نے بھی کی تھی۔[2] حکومت کے روبرو یہ تجویزیں بھی پیش کی گئی تھیں کہ کسان سے جو لگان وصول کیا جاتا ہے اس کی نظر ثانی کرنے کا جب وقت آئے تو اس میں اس وقت تک اضافہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ حکومت

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 430.

[2] Speeches of Gokhale, p. 21.

کو اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ زمین کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ نیز یہ کہ ہر صوبے میں ایک معینہ اوسط سے زیادہ مالگزاری وصول نہ کی جائیگی۔ کرزن نے کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے ترقی پسند پالیسی اختیار کی۔ ۱۹۰۲ء میں جو تجویز بابتہ مالگزاری (لینڈ ریونیو ریزولیوشن) منظور کی گئی اس کے بموجب ان مقاموں پر مالگزاری میں تخفیف کی گئی جہاں بارش کی کمی کی وجہ سے فصلیں خراب ہوگئی تھیں اور کاشتکار مقررہ لگان نہیں ادا کرسکتے تھے۔ تشخیص شدہ مالگزاری اور لگان پر نظر ثانی کرنے میں جو قاعدہ کی پابندیاں عاید ہوتی تھیں انھیں اٹھالیا گیا تاکہ انتظام میں لوچ پیدا ہو جائے تقاوی کے طریقے کو ترقی دی گئی تاکہ کسانوں کی مشکل آسان ہو۔ قانون بابتہ انتقال اراضی صوبۂ پنجاب کی رو سے موروثی کسان کو اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر کسی قرض خواہ کا روپیہ کسان پر ہو تب بھی وہ زمین کی قرقی نہیں کرا سکتا تھا کہ وہ قانونی طور پر انتقال کے ناقابل قرار دی گئی۔ اس طرح مقروض کسانوں کی جو زمینیں قرض خواہوں کی چنگل میں پھنس جایا کرتی تھیں اس سے نجات ملی۔ قرض دینے والے آئندہ احتیاط کرنے لگے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ نئے قانون کے بموجب وہ موروثی کسان کی زمین پر اپنی ڈگری جاری نہیں کراسکیں گے اور اس طرح ان کی رقم خطرہ میں پڑ جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کسان کو جب روپیہ کی ضرورت ہو تو وہ کہاں سے قرض لے۔ ساہوکار موروثی کسانوں کو بے دخل نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ انھیں قرض دینے سے بچنے لگے۔ ہندوستان میں زرعی قرضہ داری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ سیدھے سادے طریقے سے حل ہو جائے فصل خراب ہونے کی صورت میں کسان مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ساہوکار سے قرضہ لے تاکہ بیج اور آلات کاشت کے لئے سرمایہ فراہم کرسکے۔ چنانچہ اس وقت تک جب تک کہ ساہوکار کے بجائے کوئی دوسرا انتظام نہ ہو ہندوستان کی زرعی زندگی میں ساہوکار کی خاص اہمیت ہے۔ لیکن اس کا

یہ مطلب نہیں کہ ساہوکار غریب کسانوں کا خون چوسے اور حکومت ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہے۔ کرزن نے ان تمام مسائل کو ماہروں کے مشورے سے حل کرنے کی کوشش کی۔ مقامی حکومتوں کے مشورے سے امداد باہمی کی اسکیم تیار ہوئی اور مارچ ۱۹۰۴ء میں مجالس امداد باہمی کا قانون حکومت ہند نے منظور کیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں مجالس امداد باہمی قایم کی گئیں تاکہ کسانوں کو ضرورت کے وقت برائے نام شرح سود پر قرضہ مل سکے۔ خاص طور پر بیج اور کھاد وغیرہ کے خریدنے کے لئے قرضے دئے جانے لگے۔ شروع میں امداد باہمی مرکزی حکومت سے متعلق تھی لیکن بعد میں اس کا تعلق صوبجاتی حکومتوں سے کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء تک ہندوستان میں تقریباً ساڑھے تین ہزار مجالس قایم ہوگئیں جن کا سرمایہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیے تھا۔ زراعت کو ترقی دینے کی مختلف تدبیریں کی گئیں پوسا (صوبہ بہار) میں ایک زراعتی کالج قایم کیا گیا جہاں ہندوستان کی زرعی پیداوار کو سائنٹفک طریقوں سے بڑھانے کی تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں اور طلبہ کو زراعت کے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک انسپکٹر جنرل آف اگریکلچر کا عہدہ قایم کیا گیا۔ امپیریل اگریکلچر ڈپارٹمنٹ کے ذمہ یہ کام قرار پایا کہ وہ دیہات میں تجربہ کرنے کے لئے (فارم) مزارع قایم کرے اور ان فارموں کے ذریعہ سے آس پاس کے علاقوں کی فصلوں کو بہتر بنانے اور بیج اور کھاد مہیا کرنے کا کام لیا جائے۔

زراعت کی ترقی کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کئی سال سے ہو رہی تھی اور یہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ملک میں قحط پڑنے کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ کاشتکار لگان ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا لیکن پھر بھی اس سے زیادہ لگان وصول کیا جاتا ہے۔ کئی سالوں کے متواتر قحطوں سے ہندوستان کی معیشت زرعی کا انتظام درہم وبرہم ہو گیا تھا اور کسانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ کرزن نے

سنہ ۱۹۰۱ء میں سر انتونی میکڈانلڈ کی صدارت میں قحط کے متعلق غور کرنے کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے رپورٹ میں اس بات پر زور دیا کہ پچھلے دنوں قحط کے زمانے میں حکومت کی جانب سے جو امدادی روپیہ رعایا کو تقسیم کیا گیا اس سے مفید مطلب نتیجے حاصل نہیں ہوئے کیونکہ اس سے لوگوں میں اپنی مدد آپ کرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جذبہ نہیں پیدا ہوا بلکہ وہ حکومت کی خیرات کے متوقع رہنے لگے۔ کمیشن نے سفارش کی کہ آئندہ جو امدادی روپیہ دیا جائے وہ بڑی احتیاط سے دیا جائے۔ خاص طور پر بیج اور مویشی خریدنے کے لئے رقم دینی چاہئے۔ آبپاشی کو ملک کے ہر حصے میں بڑھانا چاہئے اور لگان معاف کئے جائیں۔ کرزن نے قحط زدہ لوگوں کے لئے سرمائے کا افتتاح کیا جس میں نہ صرف ہندوستان سے بلکہ بیرون ہند سے امیر لوگوں نے چندے دئے۔ کرزن نے آبپاشی کے محکمے کا میزانیہ پہلے کے مقابلہ میں دوگنا کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں سر کالن اسکاٹ مانکریف کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ آبپاشی کو وسعت دینے کے امکانوں پر غور کرے۔ کمیشن نے آبپاشی کو وسیع کرنے کی پر زور سفارش کی۔ کرزن نے حکومت ہند کی مالی حالت کے لحاظ سے اپنے عہد حکومت میں آبپاشی کی ترقی کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں وہ قابل تعریف ہیں۔

پولیس کا محکمہ

پولیس کا انتظام برطانوی نظم و نسق کے لئے بھی باعث فخر نہ ہو سکا۔ پولیس بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو رعایا کا خادم تصور کرتی وہ اپنے تئیں غیر ملکی حکمرانوں کا آلہ کار سمجھتی تھی۔ عام طور پر اس محکمہ میں رشوت ستانی رائج تھی جس کی روک تھام کی کوئی قابل لحاظ کوشش نہیں کی گئی۔ کرزن نے سنہ ۱۹۰۲ء میں وزیر ہند سے مشورہ کرنے کے بعد سر اینڈرو فریزر کی صدارت میں تمام صوبوں میں پولیس کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ پورے ملک میں اصلاح کا ایک ہی قسم کا منصوبہ اور خاکہ تیار کیا جا سکے۔[1] کمیشن نے تمام ملک

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p. 372.

کا دورہ کرکے ہر جگہ کے مقامی حالات کی مفصل چھان بین کی اور ۱۹۰۳ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ کمیشن نے بتلایا کہ پولیس کا انتظام موجودہ حالت میں حکومت کے لئے بدنامی کا موجب ہے۔ بددیانتی اور رشوت ستانی عام ہے۔ پولیس کے عہدہ داروں کی ٹریننگ کا جیسا انتظام ہونا چاہئے ویسا نہیں کیا جاتا۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ پولیس کی تنخواہیں اور جوانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے۔ اس کا اچھا اثر مترتب ہوگا۔ ہر صوبہ میں علیحدہ پولیس سروس ہونی چاہئے اور ٹریننگ اسکول کھولنے چاہئیں۔ کرزن نے اپنے عہد حکومت میں پولیس کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی اور بجٹ میں ۵۰ لاکھ روپئے سالانہ پولیس کے محکمے کی توسیع کے لئے خاص کردئیے گئے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں سیاسی حالات کروٹ بدل رہے تھے کرزن نے خاص طور پر خفیہ پولیس کی تنظیم پر کافی روپیہ خرچ کیا۔ کرزن نے اپنے قیام ہندوستان کی آخری بجٹ کی تقریر میں اس کا ذکر کیا کہ کمیشن نے جن اصلاح کی صورتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان کو عملی جامہ پہنانے کی جلد کوشش کی جائے گی۔ پولیس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی آمدنی بڑھانے کے دوسرے ناجائز ذریعوں سے بے نیاز ہوجائے۔ حکومت کی پوری کوشش رہے گی کہ ہندوستان اور انگلستان کی آبادی کے بہترین عناصر ہندوستان کی پولیس سروس میں شریک ہوا کریں تاکہ رعایا کی بھلائی اور حفاظت کی تدبیریں عمل میں لائی جاسکیں۔

محکمہ آثار قدیمہ کرزن کو ہمیشہ سے علم تاریخ کا ذوق تھا۔ وائسرائے ہونے سے پہلے جب وہ بہ حیثیت ایک سیاح کے ہندوستان آیا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ آثار قدیمہ کی حفاظت کی طرف حکومت کو جتنی توجہ کرنی چاہئے وہ نہیں کررہی ہے۔ آثار قدیمہ کی دیکھ بھال کا کام ضلع کے حکام اعلیٰ کے ذمہ تھا جن کے پاس پہلے سے انتظامی کام اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ وہ اس جانب ظاہر ہے زیادہ توجہ نہیں کرسکتے تھے۔ پھر چونکہ آثار قدیمہ کے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا اس لئے اگر وہ توجہ کرنے کی کوشش بھی کرتے تو کوئی مفید نتیجے نہ حاصل ہوتے۔ شاہی آثار قدیمہ

کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ حکام ضلع نے اپنی دوسری معروفیتوں کی وجہ سے انھیں اپنا تختۂ مشق نہیں بنایا۔ کرزن نے آثار قدیمہ کا ایک مستقل محکمہ سر جان مارشل کی نظامت میں قایم کیا اور ایک قانون کے ذریعے تحفظ آثار قدیمہ کا انتظام کیا گیا۔ بعض قدیم عمارتوں پر لوگوں نے کس مپرسی کے زمانے میں قبضہ وتصرف جمالیا تھا۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی۔ بعض پرانی عمارتوں کی درستی کرائی گئی تاکہ انھیں جہاں تک ممکن ہو اصلی حالت میں قایم رکھا جائے۔ سر جان مارشل کی سرکردگی میں ملک کے مختلف حصوں میں کھدائیوں کا کام سرانجام پایا جس کی بدولت ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

محکمہ صنعت وحرفت اور ریلوے

اگرچہ انگریزی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ صنعت وتجارت کے معاملوں سے بے تعلق رہے لیکن اب حالات ایسے پیدا ہو رہے تھے کہ حکومت زیادہ عرصے تک ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی کو اپنے حلقۂ عمل سے باہر نہیں تصور کر سکتی تھی۔ کرزن نے صنعت وحرفت وتجارت کے لئے ایک محکمہ قایم کیا جس کا صدر وائسرائے کی کونسل کا رکن ہوتا تھا۔ حکومت ہند کی جانب سے ایک ہفتہ واری رسالہ بھی جاری کیا گیا تاکہ تجارتی معلومات کی اشاعت عمل میں آئے۔ کرزن کے عہد حکومت میں ریلوں کی توسیع عمل میں آئی۔ اس کے ایما پر انگلستان سے سر تھامس رابرٹسن کو جو ریلوے کے معاملوں کا مشہور ماہر تھا' ہندوستان روانہ کیا گیا "تاکہ وہ اس ملک کی ریلوں کے لائحۂ عمل تجویز کرے۔ ایک ریلوے بورڈ قائم کیا گیا" تاکہ ریلوے کے مخصوص مسائل اس کے ذمہ رہیں اور حکومت اس کی ماہرانہ رائے پر عمل کرے۔ اب تک ریلوے کا محکمہ بھی مرکزی پی۔ ڈبلیو۔ڈی کی شاخ تھی۔ لیکن اب ریلوے کے تمام معاملے ریلوے بورڈ کے سپرد کر دئے گئے جس کو وسیع انتظامی اختیارات حاصل تھے۔ بورڈ کو ان لائنوں پر جو کمپنیوں کی تھیں اور ان پر بھی جو حکومت کی تھیں نظم ونسق کے اختیارات

تفویض کرنے سے پورے ملک میں ریلوے کے انتظام میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔

کلکتہ میونسپل کارپوریشن کی جدید تنظیم

کرزن کے عہد حکومت سے پہلے لارڈ ایلجن کے زمانے میں کلکتہ کے میونسپل کارپوریشن پر غیر کارکردگی کا الزام لگایا جا چکا تھا۔ کرزن کے آنے کے بعد ہی بنگال کے لفٹننٹ گورنر الگزنڈر میکنزی نے لیجسلیٹو کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ عاملانہ اختیارات منتخب شدہ ارکان کے ہاتھ سے نکال کر ایک کمیٹی کے سپرد کر دیئے جائیں جسے حکومت نے نامزد کیا ہو۔ کارپوریشن کے صدر کو بھی اس کمیٹی کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس پر بنگال کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اس لئے کہ کارپوریشن میں منتخب شدہ ارکان کو رپن کے زمانے سے جو حقوق حاصل تھے ان سے وہ کسی صورت میں بھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھے۔ جب زیادہ گڑبڑ ہوئی تو تھوڑے دنوں کے لئے مسودہ کو قانون نہیں بنایا گیا اور وزیر ہند سے مشورہ طلب کیا گیا۔ لیکن اس دوران میں کرزن کے ایماء پر مسودہ میں جو تبدیلیاں کی گئیں وہ اور بھی زیادہ حقوق کو زائل کرنے والی تھیں۔ مثلاً اب تک کارپوریشن کے کل ارکان کی تعداد ۷۵ تھی جن میں سے ۵۰ منتخب شدہ ہوتے تھے۔ باقی ۲۵ نامزد شدہ ارکان تھے جو عام طور سے یورپین ہوتے تھے۔ کرزن کے ایماء پر منتخب شدہ رکنوں کی تعداد ۲۵ کر دی گئی اور نامزد شدہ کی ۵۰ یہ مسودۂ قانون منظور ہو گیا۔ بنگال میں اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ کارپوریشن کے ۲۸ ارکان نے استعفیٰ دے دیا۔ بنگال میں احتجاج کے جلسوں میں اس قانون کو مقامی حکومت خود اختیاری کے اصول کے منافی اور رجعت پسندانہ بتلایا گیا۔ اس قانون کے منظور ہونے سے ہندوستان کے قومیت پسند طبقے اور کرزن میں اختلاف شروع ہو گیا جو روز بروز بڑھتا گیا۔

تعلیمی پالیسی

کرزن کی تعلیمی حکمت عملی کو ہندوستان کا قومیت پسند طبقہ شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں شملہ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس میں ہر صوبے سے سرکاری ماہرین تعلیم کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس میں رائج الوقت نظام تعلیم پر کرزن

نے سخت تنقید کی اور بتایا کہ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم سے اگرچہ اہل ہند کو یقیناً بہت فائدہ ہوا لیکن اس پورے تعلیمی نظام میں سیرت سازی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور زیادہ تر امتحانوں کا بھوت سر پر سوار رہا۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ ضرورت اس کی ہے کہ وسطانی اور ابتدائی تعلیم کو ملک میں عام کیا جائے تاکہ اہل ملک کو حقیقی فائدہ حاصل ہو۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کرزن نے اس بات پر زور دیا کہ یونیورسٹیوں کی انتظامی جماعتوں یعنی سنڈیکیٹس اور سینیٹس کی اس طور پر تشکیل ہونی چاہیے کہ سیاست کا اثر ان میں راہ نہ پائے۔ اس کانفرنس میں جتنی تجویزیں پیش ہوئیں ان سب کا مسودہ خود کرزن نے تیار کیا تھا۔[1] ان تجویزوں میں ملک کے تعلیمی انتظام میں بنیادی تبدیلی کی سفارشیں کی گئی تھیں۔ ان سفارشوں کے بموجب ۱۹۰۲ء میں ایک ڈائرکٹر جنرل آف پبلک ایجوکیشن کا تقرر کیا گیا تاکہ وہ پورے ملک کے تعلیمی نظام پر نگرانی رکھ سکے۔ اسی سال یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ اعلیٰ تعلیم کے مسئلہ کے متعلق چھان بین کر کے حکومت کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیشن میں صرف دو ہندوستانی شریک کئے گئے ایک سید حسین بلگرامی اور دوسرے جسٹس گرو داس بنرجی۔ کمیشن کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد امپیریل مجلس قانون ساز میں مسودہ بابت تنظیم جامعات (یونیورسٹیز بل) پیش ہوا جس کی مسٹر گوکھلے اور دوسرے ہندوستانیوں نے سخت مخالفت کی۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں یہ مسودہ قانون بنا دیا گیا۔ اس کی رو سے جامعات کو اندرونی نظم و نسق کے پورے اختیارات دئے گئے۔ رفقاء کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہوگی اور ان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔ نامزد شدہ ارکان کو منتخب شدہ ارکان کے مقابلے میں اکثریت حاصل

---

[1] Cambridge History of India, Vol. VI, p 350.

[2] Ronaldshay, The life of Lord Curzon, Vol II, p. 191.

ہوگی۔ اسکولوں کو تسلیم کرنے اور ان کے الحاق کے متعلق حکومت کو فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں گے۔ صرف وہ طلبہ جو ملحقہ کالجوں میں تعلیم ختم کر چکے ہیں جامعہ میں شرکت کے مجاز ہوں گے۔ تمام ملحقہ کالجوں کا سرکاری طور پر معائنہ ہوا کرے گا۔ خانگی کالجوں کے قایم کرنے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری قرار دی گئی۔ مجلس رفقاء (سینٹ) معمولاً اسکی مجاز ہوگی کہ یونیورسٹی کے انتظام کے ضمن میں قاعدے اور ضابطے بنائے لیکن حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان قاعدوں میں تبدیلی یا ترمیم کر سکے۔

قانون جامعات (یونیورسٹیز ایکٹ) کے منظور ہونے پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ سریندرا ناتھ بنرجی نے بنگال میں اس قانون کی مخالفت میں خاص حصہ لیا۔ اور انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اس ضمن میں سخت تشویش کا اظہار کیا۔ خاص طور پر اس وجہ سے بے چینی پیدا ہوئی کہ یہ قانون ان تعلیمی اداروں کی ترقی کو روکنے والا تھا جو نجی طور پر ملک کے مختلف حصوں میں قایم ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ اس کا مقصد یونیورسٹیوں کی انتظامی جماعتوں کو سرکاری اثر میں لانا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی حد بندی سے گورنمنٹ یہ چاہتی تھی کہ غیر قانع طلبہ کی تعداد میں کمی ہو جو عام طور سے سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ قانون کی تعلیم پر بھی بعض قید عاید کی گئیں جن کا یہ مطلب لیا گیا کہ چونکہ وکیلوں کا طبقہ آزاد منش ہوتا ہے اس لئے اس طبقہ کی تعداد میں اضافہ انگریزی حکومت کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ اس طبقہ کے لوگ یونیورسٹی کی عالمانہ جماعتوں میں منتخب ہو کر حکومت پر تنقید کرتے تھے جو کرزن کو ناپسند تھا۔ اور چونکہ خاص طور پر کلکتہ یونیورسٹی پر آزاد منش طبقہ کا اثر بڑھتا جاتا تھا اس واسطے کرزن نے اس یونیورسٹی پر اور ضمنی طور پر دوسری یونیورسٹیوں پر حکومت کے قابو اور اختیارات کو مضبوط کرنے کی تدبیریں اختیار کیں۔ لیکن ان تدبیروں سے اہل ہند کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔

تقسیم بنگال قانون جامعات کی وجہ سے جو عام بے چینی پیدا

ہوگئی تھی اس کی لہریں ابھی دبی بھی نہ تھیں کہ حکومت نے تقسیم بنگال کے انتظام سے رہا سہا بھروسا بھی کھو دیا۔ سرکاری حلقوں میں عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ بنگال کے وسیع صوبے کو ایک لفٹنٹ گورنر کے تحت رکھنے سے انتظامی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ چنانچہ سر اینڈ روز فریزر لفٹنٹ گورنر بنگال کی تجویز تھی کہ ڈھاکہ، میمن سنگھ اور چٹا گانگ کو آسام کے ساتھ ملا دیا جائے تو لفٹنٹ گورنر بنگال کا کام بڑی حد تک ہلکا ہو جائے گا۔ یہ محض ایک انتظامی تجویز تھی۔ کرزن نے اس تجویز کو جو رنگ دیا وہ سیاسی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور جو تعلیم اور ثروت میں بنگالی ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں ایک نیا صوبہ بنا دینا چاہئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ انتظامی مقصد بھی حاصل ہو جائیگا اور مسلمانوں کو علٰحدہ صوبہ بن جانے کی صورت میں ترقی کے زیادہ موقعے حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ بنگال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں انقلابی خیالات نشو و نما پا رہے تھے اس لئے شہنشاہی مقصدوں کے لئے ان کے اثر کے خلاف مسلمانوں کو استعمال کرنا ممکن ہوگا۔ کافی غور و فکر کے بعد ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگال کا علٰحدہ صوبہ قایم کر دیا گیا جس کا صدر مقام ڈھاکہ قرار پایا۔ یہ صوبہ ڈھاکہ، راج شاہی اور چٹا گانگ کی قسمتوں (ڈویژنز) اور آسام پر مشتمل تھا۔ آسام کے چیف کمشنر کے عہدہ کو تخفیف کر کے مشرقی بنگال کیلئے ایک لفٹنٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ نئے صوبہ میں ایک علٰحدہ مقننہ اور ایک بورڈ آف ریونیو بھی قایم کیا گیا۔[1] اس پوری اسکیم کی تائید وزیر ہند سے حاصل کر کے اس کو فوراً نافذ کر دیا گیا۔

بنگال کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے تقسیم بنگالہ کی سخت مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس اسکیم کو نافذ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنگالی بولنے والی قوم کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے تاکہ اس کی یک جہتی اور اتحاد ہمیشہ

---

[1] Ronaldshay, Ibid., p. 329.

کے لئے کمزور ہو جائے۔ اگرچہ ظاہر میں تقسیم بنگال کی اسکیم کو انتظامی رنگ میں پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک سیاسی چال ہے اہل بنگال کے فکر و عمل کو منتشر کرنے کی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی تقسیم بنگال کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ بنگال کے لیڈروں نے انگریزی حکومت سے انتقام لینے کے لئے برطانوی تجارتی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریک کو فروغ دینے کی جو کوشش شروع کیں انھیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی قبول عام حاصل ہوا۔ تقسیم بنگال کو قومی رنگ دینے کے لئے مسلمانوں کی تائید بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بنگال کے مسلمانوں نے سر سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ کی صدارت میں جو کانفرنس منعقد کی اس میں تقسیم بنگال کی تائید کی اور اس کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے ضروری بتلایا کہ بغیر اس انتظام کے ان کی پستی اور ادبار کو دور کرنا ممکن نہیں۔ بنگال کے مسلمانوں کی تائید حاصل کرنا کرزن کی سیاست کاری کی زبردست کامیابی تھی۔

لیکن تقسیم بنگال کے ضمن میں جو شورش پیدا ہوئی اس کے اثرات سارے ملک کی سیاست پر پڑنے لگے۔ بنگال میں دہشت انگیزی کی تحریک نے جنم لیا جس کا مقصد انگریز عہدہ داروں کو قتل کرنا تھا۔ پورے بنگال میں خفیہ انقلابی انجمنوں کا جال بچھ گیا۔ بہت سے نوجوانوں نے انگریزوں سے ملک آزاد کرانے کو مذہبی مقصد قرار دیا۔ اپنی مالی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے وہ دولتمند لوگوں کو لوٹنا اور قتل و غارت کرنا جائز سمجھتے تھے۔ اس خفیہ انقلابی تحریک کے اثرات مہاراشٹر اور پنجاب تک پہنچے جہاں اس قسم کی خفیہ انجمنیں وجود میں آئیں جو دہشت انگیزی کے ذریعہ ملک کو نجات دلانے کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ ان جماعتوں میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ شرکت کرتے تھے اور انھیں میں سب سے زیادہ جوش اور جذبہ پایا جاتا لیکن ملک کی باقی آبادی ان تحریکوں سے بے تعلق رہی۔

دیسی ریاستیں

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ریاستوں کی حیثیت برطانوی شہنشاہی نظام میں ایک لازمی جزو کی ہو گئی تھی الحاق کے بجائے ان پر نگرانی کا اصول مسلم ہو چکا تھا اور حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے اندرونی نظم و نسق میں کبھی کبھی اپنی صوابدید کے موافق دخل دیتا رہتا تھا۔ رسل و رسائل کی ترقی تجارت کا فروغ اور برطانوی ہند میں شعور عامہ کی بیداری یہ سب اسباب ایسے تھے کہ جن سے ریاستیں عرصے تک غیر متاثر نہیں رہ سکتی تھیں۔ ریلوں اور تار برقی کی توسیع سے بالادست قوت سیاسی امور کے علاوہ ریاستوں کے معاشی معاملوں میں بھی دخیل ہو گئی۔ چونکہ والیان ریاست کو غدر کے بعد اس کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ ان کے علاقے برطانوی ہند میں ملحق کر لئے جائیں گے اس لئے انھوں نے بالادست قوت کے معاشی نفوذ کو خوشی سے گوارا کر لیا۔

کرزن کی عام حکمت عملی کا اقتضا یہ تھا کہ وہ دیسی ریاستوں کے معاملوں میں بالادست قوت کی نگرانی کے اصول کو اور زیادہ کڑا کر دے اس کا خیال تھا کہ ریاستوں کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ حکومت ہند پرانے معاہدوں کا لحاظ کئے بغیر تمام ریاستوں کے ساتھ چاہے وہ معاہداتی ہوں یا غیر معاہداتی اپنی حکمت عملی کی یکسانی قایم کرے تاکہ ایک ریاست کے معاملوں میں جو عملدرآمد کیا گیا وہ دوسری ریاست کے لئے نظیر بن سکے[1]۔ کرزن کے نزدیک والیان ریاست کی حیثیت حکومت ہند کے ایجنٹوں کی تھی جن کے جملہ حقوق و اختیارات کا ماخذ تاج تھا[2]۔ اسکے عہد حکومت میں ریاستوں پر برطانوی تفوق اور اقتدار کا نفوذ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ اسکے پیش نظر جو شہنشاہی مقاصد تھے انکی تکمیل کے لیے وہ ضروری سمجھتا تھا کہ ریاستوں پر حکومت ہند کی نگرانی میں اضافہ ہو۔ وہ اصول اور ضابطے جن کا اطلاق حکومت ہند

۱۔ Cambridge History of India, Vol. VI, p. 505.

۲۔ The British Crown and the Indian States, p. 91.

کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ بلالحاظ اس امر کے کہ کونسی ریاست معاہداتی مرتبہ رکھتی ہے اور کونسی غیر معاہداتی عرصے سے کر رہا تھا۔ ان ضوابط کو کرزن نے ایک مخصوص حکمت عملی کی حیثیت سے متعین کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں اس نے گوالیار میں جو تقریر کی اس میں اس حکمت عملی کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے۔

"ہماری حکمت عملی کی وجہ سے دیسی رئیس کو ہندوستان کے شہنشاہی نظام میں ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ملک کے نظم ونسق کے ساتھ اس کا تعلق اس سے کم نہیں جو وائسرائے یا لفٹنٹ گورنر کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کو اپنا ساتھی اور شریک کار سمجھتا ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ شہنشاہی نظام میں اس کی حیثیت ملکۂ معظمہ کے ایک وفادار فرد کی ہو اور وہ خود اپنے لوگوں کے روبرو ایک چھچھورا اور غیر ذمہ دار جابر بن جائے۔ اس کو جو اختیارات دئے گئے ہیں انھیں اس کو معقول طریقے سے استعمال کرنا ہوگا اور یہ حق بجانب ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ان کا مستحق ہے۔ ضرور ہے کہ وہ اپنی رعایا کا آقا بھی ہو اور خادم بھی۔[۱]"

جس طرح ڈلہوزی کے عہد میں دیسی ریاستوں کا برطانوی ہند میں الحاق اس بنا پر درست تصور کیا گیا تھا کہ ایسا کرنے سے وہاں کے لوگوں کو تعلیم اور ترقی کے بہتر مواقع حاصل ہو سکیں گے۔ اسی طرح کرزن نے ریاستوں کے نظم ونسق میں حکومت ہند کے تفوق اور اقتدار کو موثر بنانے کی کوشش کی تاکہ انتظامی کارکردگی میں اضافہ ہو اور وہ اس کی ماتحتی کے حلقہ سے جدا ہونے کی کبھی جرات نہ کر سکیں۔ وہ والیان ملک کو ملک کے نظم ونسق میں برابر کا رتبہ نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ وائسرائے کی ہدایتوں اور احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرتے

۱۔ Raleigh, Curzon in India, p. 217.

رہیں۔ چنانچہ رئیسوں سے خطاب کرتے وقت وہ ہمیشہ ان کے حقوق سے زیادہ ان کے فرائض پر زور دیا کرتا تھا۔ اگرچہ غدر کے بعد سے حکومت ہند دیسی ریاستوں کے معاملوں میں اپنے اختیارات کو برابر وسیع کرتی رہی اور ریاستوں کے معاہداتی حقوق اور والیان ریاست کے مرتبہ میں برابر کمی ہوتی رہی لیکن اس مداخلت کو حق بجانب ثابت کرنے اور مداخلت کو کھلم کھلا کرزن سے پہلے کسی وائسرائے نے سراہا نہ تھا۔ نواب بہاول پور کی گدی نشینی کے موقع پر اس نے جو تقریر کی اس سے اسکے شہنشاہی منصوبوں کی صراحت ہوتی ہے۔ اس نے کہا:۔

"ہندوستان کا سیاسی نظام نہ جاگیری ہے اور نہ وفاقی یہ کسی دستور کی شکل بھی نہیں رکھتا۔ اس کا انحصار ہر حالت میں معاہدہ پر نہیں اور نہ کسی لیگ سے اس کو مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظام تاج اور ہندوستانی رئیسوں کے تعلقات کے ایسے سلسلہ کو ظاہر کرتا ہے جو مختلف اور جداگانہ تاریخی حالات میں نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ لیکن بتدریج امتداد زمانہ سے ان تعلقات میں یکسانی پیدا ہو گئی ہے۔ تاج کا اقتدار اعلیٰ بلا شرکت غیرے مسلم ہے۔ اس نے اپنے اختیارات پر خود بعض حد بندیاں عائد کر لی ہیں .... تعلقات کی یہ کڑیاں جنھوں نے حکومت برطانیہ اور ہندوستانی ریاستوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے لوہے کی بیڑیاں نہیں ہیں جو طاقتور نے کمزور کو پہنائی ہیں اور نہ یہ ایسی مصنوعی بندشیں ہیں جو کسی غیر معمولی بار سے ٹوٹ جائیں بلکہ یہ وہ ریشمی تار ہیں جن سے باہمی فخر، احساس فرائض ذاتی قربانی اور احترام کی مضبوط ڈوری بنائی گئی ہے۔"[1]

کرزن کی اس حکمت عملی کو جس میں سرپرستانہ انداز پایا جاتا تھا والیان ملک پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر کو اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی حکومت نے اگر الحاق کی پالیسی ترک کر کے

---

[1] Raleigh Curzon in India, p 227.

بالادستی کو منوانے کی پالیسی اختیار کی ہے تو یہی غنیمت ہے۔ ان کا وجود تو اسی طرح برقرار رہ سکے گا۔ لیکن کرزن نے برطانوی تفوق اور بالادستی کو منوانے کا سوال محض نظری حیثیت سے نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے پیش نظر بعض عملی مسائل تھے۔ اس لئے صرف فوجی امور اور خارجی حکمت عملی کی نگرانی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ریاستوں کے اندرونی معاملوں میں بھی برطانوی مداخلت کو حق بجانب ٹھہرایا۔ جو والیان ریاست سیر و سیاحت کے لئے یورپ جایا کرتے تھے ان کی نقل و حرکت پر کرزن نے قیدیں لگادیں۔ آئندہ سے وہ بغیر حکومت ہند کی اجازت کے ریاست کے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ اس پر بعض والیان ریاست بہت چراغ پا ہوئے لیکن کچھ نہ کرسکے۔ اس لئے اس ضمن میں جو گشتی جاری کرائی اس میں صراحت کردی گئی کہ والیان ریاست کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی رعایا کی خدمت کریں۔ اسی کے صلہ میں بالادست قوت نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ سیر و تفریح میں اپنا وقت صرف نہ کریں بلکہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے۔ سیر و تفریح کا چسکا لگنے کے بعد والیٔ ملک اپنی رعایا سے دور ہوجاتا ہے اور ریاست سے باہر رہ کر یہ ممکن نہیں کہ فرائض کی انجام دہی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا جاسکے۔ باہر جانے کے لئے اجازت حاصل کرنے کے ضمن میں حکومت ہند نے یہ واضح کردیا کہ کسی رئیس کا بار بار اپنی ریاست سے باہر جانا فرائض عامہ کے منافی سمجھا جائے گا۔ اس وقت تک باہر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ حکومت ہند کو اطمینان نہ ہوجائے کہ ایسا کرنے سے والیٔ ملک اور رعایا دونوں کو کسی نہ کسی قسم کا فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک مرتبہ اجازت مل جانے کے بعد دوسری مرتبہ اس وقت تک اجازت نہیں ملے گی جب تک کہ کافی وقفہ نہ گزر گیا ہو۔[1]

---

[1] Ronaldshay, Ibid., p. 91.

اس میں شبہ نہیں کہ کرزن نے والیان ریاست کی نقل وحرکت کے متعلق جو پابندیاں عاید کیں وہ غیر ضروری تھیں۔ ان سے لازمی طور پر والیان ریاست کے حلقے میں سخت بے چینی پیدا ہوئی اور ان قیدوں کو انھوں نے اپنے خلاف شان سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرزن میں باوجود علمی قابلیت کے تخیل کی بڑی کمی تھی۔ جس طرح اس نے اپنے طرز عمل سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اپنا مخالف بنا لیا اسی طرح والیان ریاست کے جذبات سے بے پروائی برت کر اس نے ان کی ہمدردی حاصل نہیں کی۔ کرزن کی دخل دہی کو وہ اپنے اعزاز ووقار کے منافی خیال کرتے تھے۔

کرزن کے پیش نظر یہ تھا کہ ریاستیں اپنے آپ کو برطانوی ہند سے الگ تھلگ نہ سمجھیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ حکومت ہند کی حکمت عملی کی یکسانی ان سبھوں کے معاملوں کی نگراں رہے۔ اس ضمن میں وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ والیان ریاست کی ایک کونسل قایم کی جائے۔ کم وبیش اسی قسم کی تجویز لارڈ لٹن کے پیش نظر رہی تھی۔ کرزن محسوس کر رہا تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جو خیالات و جذبات پیدا ہو رہے ہیں وہ آخر انگریزی عملداری کے لئے مہلک ثابت ہونگے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ والیان ریاست کو کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر کے خلاف اجتماعی صورت میں استعمال کر سکے[1]۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ریاستیں دفاعی معاملوں میں حکومت ہند کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ اس نے تجویز کی کہ ہر ریاست اپنی آبادی کے تناسب سے فوجی امداد دیا کرے۔ امپیریل سروس ٹروپس کی جدید تنظیم کے بموجب یہ فوجیں حکومت ہند کے تحت کر دی گئیں اور ان کے اخراجات کا بار ریاستوں کے خزانہ پر رہا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں دہلی میں کرزن نے نہایت شاندار دربار کیا جس میں ہندوستان کے تمام والیان ریاست نے شرکت کی۔ اس سے اسکا مقصد

---

[1] Lord Morley, Recollections; Vol. II, p 176.

یہ تھا کہ برطانوی صوبوں اور ریاستوں میں ایک مشترکہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ شہنشاہیت کے اجزاء ہیں۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کا اعلان کیا جائے لیکن اصل میں وہ والیان ریاست کو اس موقع پر جتا دینا چاہتا تھا کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کے ماتحت ہیں اور ان کی حیثیت کل پرزوں سے زیادہ نہیں۔ بعض والیاں ریاست کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس سے ان میں کرزن کے خلاف مخالفت کا جذبہ بڑھ گیا۔[1]

کرزن کے عہد حکومت میں ریاست اندور کے مہاراجہ کو بدانتظامی کی علت میں ہٹا کے اس کے کمسن لڑکے کو اس کی جگہ گدی نشین کیا گیا۔ لڑکے کی نابالغی کے زمانے تک ریاست کا انتظام ایک مجلس تولیت (کونسل آف ریجنسی) کے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مہاراجہ کشمیر کے اختیارات جو ۱۸۸۱ء میں چھین لئے گئے تھے واپس کئے گئے۔

ریاستوں سے متعلق ایک خاص اصلاح کرزن کے عہد حکومت میں عمل میں لائی گئی جس کا بہت اچھا اثر مترتب ہوا۔ کرزن کے زمانے تک یہ طریقہ رائج تھا کہ ریاستوں میں جو ریزیڈنٹ مقرر کئے جاتے تھے ان کی تنخواہ تو انگریزی حکومت ادا کرتی تھی لیکن ان کے اسٹاف کے دورے کے اخراجات متعلقہ ریاست کے ذمہ ہوتے تھے۔ لیکن اکثر اوقات ریزیڈنٹ اور اس کے اسٹاف کے سارے ذاتی اخراجات ریاست ہی کے خزانے سے ادا ہوا کرتے تھے۔ کرزن نے اس طریقے کو قطعی طور پر بند کر دیا۔ اور حکومت ہند کے جو حکام ریاستوں میں مقرر ہوتے تھے انھیں سختی سے منع کر دیا گیا کہ وہ کسی قسم کا خرچ بھی ریاست سے نہ لیں۔

برار کا دوامی پٹہ

۱۹۰۱ء میں نواب وقار الامراء کے انتقال پر مہاراجہ سرکشن پرشاد ریاست حیدرآباد کے مدار المہام ہوئے۔ ابھی انھوں نے مدار المہامی کا جائزہ لیا ہی تھا کہ برار کا مسئلہ درپیش ہوا۔

---

[1] The British Crown and the Indian States, p. 92.

نواب سر سالار جنگ کی مدار المہامی کے زمانے میں برار کی واپسی کا سوال اٹھایا گیا تھا لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۷۶ء میں جب کہ وہ انگلستان تشریف لے گئے تھے تو انھیں اتنا یقین دلایا گیا تھا کہ جب ہز ہائینس نواب میر محبوب علیخاں ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لینگے تو سرکار نظام کے ان معاملوں پر جو از روئے معاہدہ طے ہوئے ہیں نظر ثانی کی جائے گی۔ لیکن سنہ ۱۸۸۳ء میں نواب سر سالار جنگ کے انتقال کی وجہ سے برار کی واپسی کا مسئلہ کچھ عرصے تک پس پشت پڑا رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں امساک باران اور قحط کے باعث ریاست حیدرآباد کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اور دو کروڑ کے قریب قرض ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں سرکار نظام نے برار کی آمدنی کے متعلق حکومت ہند کو لکھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدے کے بعد سے سرکار نظام کو برار کے سپرد کئے ہوئے علاقوں میں سے جو آمدنی از روئے معاہدہ ملنی چاہئے تھی وہ نہیں ملی۔ سرکار نظام کے لکھنے پر کرزن کو اس کا موقع مل گیا کہ من مانے طور پر برار کے متعلق تصفیہ کرے۔ برار کے مسئلہ کا حل اس کے نزدیک یہ تھا کہ سرکار نظام کو برار کے علاقے سے ایک معین آمدنی حاصل ہو سکے۔

سنہ ۱۹۰۲ء کے شروع میں کرزن خود حیدرآباد آیا تاکہ برار کے مسئلہ کے متعلق اعلیحضرت مرحوم نواب میر محبوب علیخاں سے بذریعہ معاہدہ یکسوئی کر لے۔ اعلیحضرت مرحوم اور امراء و اعیان سلطنت برار کے ضلعوں کو دوامی طور پر انگریزی حکومت کے سپرد کرنے کے خلاف تھے اس لئے کہ سنہ ۱۸۵۳ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کی رو سے برار کے ضلعے عارضی طور پر (بطور امانت ٹرسٹ) حکومت کے سپرد کئے گئے تھے تاکہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی ہو سکے۔ لیکن لارڈ کرزن کا اصرار تھا کہ برار پر انگریزی حکومت کو دوامی پٹے کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے اعلیحضرت مرحوم نے پوری کوشش فرمائی کہ دوامی پٹے کی شرط نہ منظور کرائی جائے اور اضلاع برار سرکار نظام

کو واپس دے دئیے جائیں لیکن لارڈ کرزن نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں یور ہائی نس کو کسی غلط امید میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں بالکل صفائی سے کہتا ہوں کہ محض میری ہی نہیں بلکہ تمام وائسراؤں کی جو میرے بعد آئیں گے یہی حکمت عمل ہوگی اور انگلستان میں بھی حکومت کی یہی پالیسی رہے گی کہ برار کو کبھی واپس نہ کیا جائے۔" اعلیحضرت مرحوم نے خیال فرمایا کہ جب برار کی واپسی ممکن نہیں تو یہی بہتر ہے کہ موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کے بجائے اسے پٹے پر اٹھا دیا جائے اور اس کے عوض کچھ مستقل سالانہ رقم حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ اضلاع برار پر سرکار نظام کے شاہی حقوق برقرار رکھتے ہوئے انھیں حکومت ہند کو انتظامی ضرورت کے مدنظر پٹے پر دے دیا جائے جس کے عوض حکومت ہند سرکار نظام کو ۲۵ لاکھ روپیے سالانہ مستقل طور پر دیا کرے گی۔ حکومت ہند اضلاع مفوضہ میں اپنی صوابدید پر انتظامات عمل میں لائے گی۔ وہ اس کی بھی مجاز ہوگی کہ جو فوجیں حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے قایم ہیں ان کی تنظیم جس طور پر چاہے کرے البتہ ۱۸۵۳ء کے معاہدے کی دفعہ (۲) میں ہز ہائینس کے مقبوضات کی حفاظت کا جو وعدہ حکومت برطانیہ نے کیا ہے اسے بخوبی پورا کیا جائے گا۔ اس معاہدہ کے بعد حکومت ہند نے حیدرآباد کنٹنجنٹ کو امپریل آرمی میں ضم کر دیا اور یہ بھی ضروری نہیں قرار پایا کہ وہ ریاست حیدرآباد کی حدود ارضی میں رہے[1]۔

کچنر سے اختلاف کرزن کے عہد تک کمانڈر ان چیف صرف فوج کی ٹریننگ اور تنظیم کا ذمہ دار تھا۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ کا ملٹری ممبر تمام فوجی نوعیت کے معاملوں میں وائسرائے کا مشیر ہوتا تھا۔ اس کو یہ حق حاصل تھا کہ کمانڈر ان چیف جو تجویزیں بھیجے ان پر تنقید کرے اور ان میں کاٹ چھانٹ کرے۔ کچنر کو جو لاک ہارٹ کی

[1] Aitchison, Treaties and engagements and Sanads. IX, p 17.

[2] Fraser, India under Curzon and after, p. 226.

جگہ حال ہی میں کمانڈران چیف ہوا تھا یہ انتظام سخت ناپسند تھا۔ اس کی طبیعت آمرانہ واقع ہوتی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ وائسرائے کی کونسل کے ملٹری ممبر کو فوج سے متعلق کسی معاملے میں بھی اس پر فوقیت حاصل ہو۔ اس شخصی وجہ کے علاوہ اصولی طور پر بھی وہ حکومت ہند کے فوجی انتظام کی دوعملی کا مخالف تھا اور عملی طور پر اسے مضرت رساں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے فوجی انتظام سے متعلق کارروائیوں میں خواہ مخواہ دیر ہوتی ہے۔ یہ بات کہ وائسرائے کو کمانڈران چیف کے علاوہ فوجی معاملات سے متعلق رائے کی ضرورت ہے اصولاً صحیح نہیں۔ کچنر نے اپنی یادداشت میں جو وائسرائے کے نام تھی یہ تمام خرابیاں واضح کیں۔ کرزن نے اس یادداشت کو سر ایڈمنڈ ایلس کے پاس بھیج دیا جو وائسرائے کی کونسل کا ملٹری ممبر تھا۔ اس نے کچنر کے اعتراضوں کا جواب دیا اور بتایا کہ ملٹری ممبر کے اختیارات کمانڈران چیف سے زیادہ نہیں ہیں بلکہ وہ صرف حکومت ہند کی نیابت کرتا ہے تاکہ فوجی اخراجات پر ایک طرح کی روک تھام رہے۔ کرزن بھی ملٹری ممبر کا ہم خیال تھا۔ کرزن کو اندیشہ تھا کہ اگر کچنر کی رائے پر عمل کیا گیا اور ملٹری ممبر کا عہدہ برخاست کر دیا گیا تو کمانڈران چیف کی آمریت قایم ہو جائے گی اور فوجی اخراجات پر جو حکومت ہند کے اخراجات کی سب سے بڑی مد ہے کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہے گی۔ اس انتظام کے بموجب مالی کفایت شعاری ممکن نہ ہوگی۔ غرضکہ پورا معاملہ وزیر ہند کے سامنے پیش ہوا جس نے اس پر سوچ بچار کے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کر دی۔ ذیلی کمیٹی نے سمجھوتے کی راہ اختیار کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ملٹری ممبر کو کمانڈران چیف کی کسی تجویز پر تنسیخی حق باقی نہ رہے اور وہ صرف گورنر جنرل کو عام پالیسی کے متعلق مشورہ دے اور خالص فوجی معاملوں میں صرف کمانڈران چیف سے مشورہ کیا جائے گا۔ ملٹری ممبر کے اختیارات صرف سپلائی تک محدود رہیں گے۔ لیکن کرزن نے اس کو کچنر کی فتح خیال کیا اور مستعفی ہو گیا۔

کچنر جنوبی افریقہ کی جنگ میں شہرت حاصل کرچکا تھا اور انگلستان کی پبلک میں اس کو خاص ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ پھر اس کے علاوہ ہوم گورنمنٹ چاہتی تھی کہ وسط ایشیا میں روس کی اقدامی پالیسی کی وجہ سے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہندوستان کی فوجی تنظیم جدید اصول پر ایک ایسے شخص کی رہبری میں انجام کو پہنچے جو جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ اس کام کے لیے کچنر سے بہتر شخص ملنا ممکن نہ تھا۔ اب تک ہندوستان کی فوج کی تنظیم امن کے نقطۂ نظر سے کی گئی تھی نہ کہ جنگ کی ضرورتوں کے مدنظر۔ غرضکہ ان تمام امور کے مدنظر ہوم گورنمنٹ کچنر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی چاہے اس وجہ سے کرزن کو مستعفی ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ نئی تنظیم میں کمانڈران چیف کے اختیارات بہت وسیع ہوگئے۔ برخلاف اس کے ملٹری ممبر کے اختیارات اتنے محدود ہوگئے کہ آخر ۱۹۰۹ء میں اس عہدہ کو ختم کردیا گیا اور کمانڈران چیف تمام فوجی امور کا ذمہ دار اور گورنر جنرل کا فوجی معاملوں میں مشیر قرار پایا۔

کرزن نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور قوت عمل سے حکومت ہند کے ہر شعبہ میں اپنی شخصیت کا اثر چھوڑا۔ وہ بلا کا محنتی تھا۔ حکومت کے کاروبار سے اس کو اسی طرح کا شوق تھا جیسے کسی کو لذت اور تفریح کے حصول میں ہوتا ہے۔ وہ ہر محکمہ کی کارکردگی کو اعلیٰ معیار پر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی سیرت کا بڑا عیب یہ تھا کہ جن لوگوں کی حکمرانی اس کے سپرد کی گئی تھی ان سے اس کو دلی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے ہندوستانیوں کو سیاسی رعایتیں دینے کے بجائے اس کی کوشش کی کہ جو نظام حکومت رائج ہے اس کو بہتر اصول پر منظم کرے۔ جس طرح لارڈ ڈلہوزی کی غیر معمولی قوت عمل کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نظر آتی ہے اسی طرح کرزن کے عمل و اصلاح کی جلو میں سیاسی شورش کا طوفان دکھائی دیتا ہے جس نے کچھ عرصے کیلئے تاریخ ہند کے مطلع کو گرد آلود کر دیا اور جس کی وجہ سے ایسے مسائل نے جنم لیا جن سے اب تک انگریزی حکومت عہدہ برا نہیں ہوسکی ہے۔

کرزن کے زمانۂ حکومت کے خاتمہ پر جدید ہند کی تاریخ کا ایک عہد ختم ہوتا ہے۔ کرزن کا عہد حکومت برطانوی دفتر شاہی کے انتہائی عروج و اقتدار کا زمانہ ہے۔ لیکن اب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ کرزن کے پیش نظر کلکتہ کے کارپوریشن کی جدید تنظیم، یونیورسٹی ایکٹ اور تقسیم بنگالہ سے چاہے دفتر شاہی کی کارکردگی میں اضافہ کرنا منظور ہو لیکن اس نے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے جذبات کو اپنی خودرائی سے سخت مجروح کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کی تحریک کو جو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی نشوونما پانے کے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہی کرزن جس نے بہ حیثیت نائب وزیر ہند قانون مجلس ہند بابتہ ۱۸۹۲ء کی دارالعوام میں پرزور تائید کی تھی جب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا اور سات سال تک اس ملک پر حکومت کی تو اس قانون کی اصلی روح کو اس نے اوروں سے زیادہ مٹانے کی کوشش کی۔ اس کی پالیسی کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو نظم و نسق میں شریک کرنا خود ان کے مفاد کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ ملکی انتظام کی کارگزاری کو بڑھانا۔ اس کو اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کو سیاسی اختیارات ملنے سے نظم و نسق کا وہ اعلیٰ معیار نہیں قائم رہ سکے گا جو ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور جس پر انگریزوں کو بجا طور پر ناز ہے۔ لیکن اس سے تخیل کی کمی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے یہ بات محسوس نہ کی کہ حکومت کی کارکردگی چاہے کتنی اچھی ہو لیکن جب تک لوگوں کو اس کا موقع نہ ملے کہ وہ خود اپنے ملک کے انتظام کو سرانجام دیں اسوقت تک انھیں اطمینان اور چین نہیں مل سکتا۔ کرزن کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں دہشت انگیزی کی تحریک کو زور پکڑنے کا موقع ملا جس کا خمیازہ اس کے جانشینوں کو بھگتنا پڑا۔

اکیسواں باب

منٹو مارلے اصلاحات اور سیاسی بے چینی

سنہ ۱۹۰۵ء میں انگلستان میں سر ہنری بینرمن کی لبرل وزارت کو اقتدار ملا اور لارڈ مارلے وزیر ہند مقرر ہوئے۔ وہ ہاؤس آف کامنز میں لارڈ کرزن کی پالیسی پر خوب نکتہ چینیاں کر چکے تھے۔ وہ لبرل جماعت کے سرگرم رکن اور مشہور صاحب فکر تھے۔ اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے ہندوستان کی سیاسی حالت کی تحقیقات شروع کرادی اور کرزن کے مستعفی ہو لینے کے بعد قدامت پسند وزارت نے لارڈ منٹو کو ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے اس واسطے مقرر کیا کہ وہ سوجھ بوجھ کا شخص تھا اور اس سے پہلے کناڈا میں دستوری گورنر جنرل کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے چکا تھا۔ کرزن کے بعد ہندوستان میں ایسے شخص کو گورنر جنرل بنا کر بھیجنے کی ضرورت تھی جو انتظامی معاملوں میں ذرا آہستہ اور احتیاط سے قدم اٹھائے۔

لارڈ منٹو نے مارلے کے ایما پر تبت کے معاملے میں اعتدال کے

اصول پر عمل کیا اور وادی چمبی سے برطانوی فوجوں کے ہٹانے کا حکم دیدیا اور اس طرح اس نے حکومت ہند کو آئندہ کی بہت سی سیاسی الجھنوں سے بچا لیا۔ چین کے ساتھ جو جدید معاہدہ ہوا اس کی رو سے یہ بات طے پاگئی کہ تبت میں کوئی خارجی طاقت دخل نہ دے۔ اسی طرح ۱۹۰۷ء میں جو اینگلو رشن کنونشن ہوا اس کی رو سے حکومت ہند کو اطمینان حاصل ہوگیا کہ روس افغانستان کی طرف اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ روس اور برطانیہ نے ایران کے متعلق بھی اپنے تعلقات کا تصفیہ کر لیا۔ چنانچہ شمالی ایران میں روس کا اور جنوبی ایران میں انگریزوں کے حلقۂ اثر کا تعین ہوگیا جس کی وجہ سے بعد میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور ایران کی صیانت اور بقا کو دونوں طاقتوں نے تسلیم کرلیا۔ خلیج فارس میں روس نے برطانوی مفاد کو مان لیا اور اپنے حقوق سے دستبردار ہوگیا جو سر ایڈورڈ گرے برطانوی وزیر خارجہ کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

لارڈ منٹو کے اپنے عہدہ کا جائزہ حاصل کرنے کے بعد ملک کی اندرونی حالت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ اس خرابی اور ابتری کے اسباب کچھ تو سطحی اور ظاہری تھے اور کچھ بنیادی۔ انقلاب کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں جن میں یہ خواہش ملی جلی تھی کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کا انتظام خود چلانا چاہیے۔ آزادی کے خیالات مشرق میں صرف ہندوستان تک محدود نہ تھے۔ ایران اور چین میں دستوری حکومت قایم کرنے کی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ جاپان نے ۱۹۰۵ء میں روس کی زبردست فوجوں کو جو شکست دی اس سے اہل مشرق کے حوصلے ذرا بڑھے۔ مغربی لبرل فلسفے کا اثر اہل ہند کے تعلیم یافتہ طبقے کے دماغوں پر نمایاں تھا۔ ہندوستان کے سیاست کار دنیا میں ایک جماعت انتہاپسندوں کی تھی جو برطانوی حکومت کے ہر پہلو کی کھلم کھلا مذمت کرتی تھی اور دوسری اعتدال پسندوں کی جو اپنے اہل وطن کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر

آمادہ تھے بشرطیکہ اہل ہند کو مزید سیاسی رعایتیں دی جائیں۔ اول الذکر میں تلک، بپن چندر پال، سریندر ناتھ بنرجی اور لالہ لاجپت رائے اور ثانی الذکر میں آر سی۔ دت، گوکھلے، سر فیروز شاہ مہتا، سر ستیندر راسنہا کے نام قابل ذکر ہیں۔ حکومت کے خلاف شمال مغربی ہند میں بلوے شروع ہو گئے۔ حکومت نے بھی سختی کی پالیسی اختیار کی۔ متعدد لوگوں کو ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن کے تحت جلا وطن کر دیا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں کی شہروں میں ممانعت کر دی گئی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت کانگریس میں انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں سخت اختلافات رونما ہو گئے جن کے باعث ثانی الذکر نے اعلان شائع کر دیا کہ ان کے پیش نظر قانونی اور دستوری ذریعے سے ہندوستان کے لئے وہی مرتبہ حاصل کرنا ہے جو کناڈا اور دوسری قلمروؤں کو سلطنت برطانیہ میں حاصل ہے۔ ۱۹۰۸ء میں دہشت انگیزی کو سارے ملک میں ترقی ہوئی اور انگریز عہدہ داروں کو قتل کیا جانے لگا جس کی وجہ سے حکومت نے عدالتوں کو غیر معمولی اختیارات دیدیئے تاکہ صورت حالات پر قابو رکھنا ممکن ہو۔ لارڈ مارلے کے کہنے کے مطابق لارڈ منٹو نے اعتدال پسند ہندوستانی مدبرین کو اپنے ساتھ کر لیا اور ایک طرف تو دہشت پسندی کے مقابلے کے لئے ان کی اخلاقی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے انھیں یقین دلایا کہ وہ خود اور وزیر ہند سیاسی اصلاحیں عنقریب نافذ کریں گے جن سے ہندوستانیوں کے سیاسی مرتبہ میں اضافہ ہوگا۔

لارڈ منٹو نے ہندوستان کے صاحب رائے اشخاص سے نجی طور پر دستوری مسئلہ کے متعلق گفت و شنید شروع کر دی۔ اس لئے اپنی کونسل کے چند ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس ضمن میں صوبجاتی حکومتوں سے بھی رائے طلب کی گئی۔ مارچ ۱۹۰۹ء میں باقاعدہ سرکاری طور پر امپیریل کونسل میں اس کا اعلان کیا گیا کہ جلد ہندوستان میں سیاسی اصلاحات رائج کی جائیں گی تاکہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی حکومت میں شریک ہونے کا

موقع مل سکے۔ ایک اہم مسئلہ اس وقت لارڈ منٹو کے سامنے یہ تھا کہ اگر کونسلوں کی تشکیل میں انتخابی عنصر کو رواج دیا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے کے بعض نہایت اہم طبقے جو نسبتاً تعلیم میں پیچھے ہیں کہیں نیابت سے محروم نہ رہ جائیں جس کی وجہ سے سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی ہوگا۔ ادھر مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ نیابتی اداروں کی ترویج میں انھیں وہی موقعے ملنے چاہئیں جن کے وہ مستحق ہیں۔

مسلم لیگ کی بناء

کچھ عرصے سے مسلمانوں میں اس بات کا احساس بڑھتا جاتا تھا کہ ملک میں نیابتی اداروں کے قائم ہونے سے ان کی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی۔ سر سید احمد خاں نے نیابتی اداروں کے رواج دینے کی مخالفت کی۔ ۱۸۹۸ء میں ان کے انتقال کے بعد بھی مسلمانوں کا نقطۂ نظر وہی رہا جس کا تعین سر سید احمد خاں نے کیا تھا۔ وہ اس سیاست سے الگ رہے جس کا مقصد حکومت کی تنقید تھا۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں انھوں نے اپنی سیاسی تنظیم کو نہایت ضروری خیال کیا۔ تقسیم بنگال سے بھی وہ سیاسی طور پر متاثر ہوئے۔ لارڈ منٹو کے آنے پر مزید سیاسی اصلاحوں کی امید نے ان کو اپنی سیاسی تنظیم کی طرف متوجہ کیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء ہندوستانی مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد نے سر آغا خاں کی سربراہی میں لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق نیابت کا مطالبہ پیش کیا۔ اسی سال مسلم لیگ کی بناء پڑی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے اور ان کے قومی بقا کے لئے تدبیریں کی جائیں۔ مسلم لیگ نے بھی جداگانہ نیابت کے اصول کو اپنی حکمت عملی کا سنگ بنیاد قرار دیا اور بتلایا کہ مروجہ قاعدوں کی رو سے کسی مسلمان کا منتخب ہونا ممکن نہیں جب تک کہ اکثریت کی تائید نہ حاصل ہو۔ یہ بھی شکایت کی گئی کہ مسلمانوں کی تعداد سرکاری ملازمتوں اور انتخابی جماعتوں میں نسبتاً بہت کم ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے یہ بھی مطالبہ پیش کیا گیا کہ تمام صوبوں میں سرکاری ملازمتوں میں

مسلمانوں کے لئے حکومت کا ایک خاص تناسب مقرر کر دینا چاہئے۔ مخلوط انتخاب میں چونکہ یہ اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے حقیقی نمایندے منتخب نہیں ہو سکیں گے اس لئے تمام نیابتی اداروں میں حکومت کو مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کرنا چاہئے۔

اس وقت تک ہندوستان کے مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہے تھے لیکن اب انھوں نے محسوس کیا کہ سیاست کو نظرانداز کرنے میں خود نظر انداز ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لارڈ منٹو کی خدمت میں مسلمانوں کے وفد نے جو ایڈریس پیش کیا اس میں انگریزی حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اس ملک میں جو سیاسی حیثیت اب تک رہی ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے سیاسی حقوق کا تعین ہونا چاہئے چونکہ سنہ ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند کے نافذ ہونے کے بعد مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں میں ان کے فرقے کی نمایندگی ناکافی رہی ہے اس لئے انھیں حق ملنا چاہئے کہ وہ جداگانہ انتخاب کے ذریعے اپنے نمایندے کونسلوں میں بھیج سکیں۔ لارڈ منٹو نے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ لیکن وزیر ہند لارڈ مارلے شروع میں اس اصول کے خلاف تھا۔ بعد میں مسٹر امیر علی اور دوسرے صاحب فکر مسلمانوں نے لارڈ مارلے کی غلط فہمیاں دور کردیں تو وہ اس اصول کا حامی ہوگیا۔ بہت کچھ چھان بین کے بعد سنہ ۱۹۰۹ء میں قانون مجالس ہند سنہ ۱۹۰۹ء جسے منٹو مارلے اسکیم بھی کہتے ہیں پارلیمنٹ میں منظور ہوا۔

اس قانون کی رو سے گورنر جنرل کی امپیریل کونسل کے زائد ارکان کی تعداد بجائے ۱۶ کے ۶۰ کردی گئی اور گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان کو شامل کرکے تعداد ۶۹ ہوگئی۔ ان میں سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل رہے گی۔ صوبوں کی کونسلوں میں بمبئی، مدراس، بنگال اور صوبہ شمال مغربی میں کونسلوں کے ارکان کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس ہوگی اور پنجاب اور برما میں زیادہ سے زیادہ تیس۔ صوبجاتی کونسلوں میں غیر سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل ہوگی۔ مجالس بلدیہ، مجالس ضلع، طبقہ زمینداران، ایوان ہائے تجارت

اور جامعات کو ارکان منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ مسلمانوں کی نیابت جداگانہ طریق انتخاب سے مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں میں ہوگی۔

مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں کے ارکان کو تجویزیں پیش کرنے کا حق ہوگا۔ میزانیہ ہر سال کونسلوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس پر بحث کرنے اور رائے دینے کی اجازت ہوگی۔ صدر کی اجازت سے ارکان کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق ہوگا۔ مرکزی مجلس کے ارکان کا انتخاب تین سال کے لئے ہوگا۔ لیکن سرکاری اراکین کی نامزدگی اس سے کم مدت کے لئے بھی ہوسکے گی۔ فوجی سیاسی اور صوبجاتی امور پر مرکزی مجلس وضع قانون میں بحث نہیں ہوگی۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اگر کسی مسئلہ پر بحث کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھے تو وہ پیش نہ ہوسکے گا۔ صدر مجلس کو اختیار ہوگا کہ کسی تجویز کو پیش ہونے سے اس بنا پر روک دے کہ ایسا کرنے سے مفاد عامہ کو نقصان پہنچے گا۔

۱۹۰۹ء کے قانون مجالس ہند (منٹو مارلے اسکیم) کے نافذ ہونے کے بعد منظورہ قواعد کے تحت مرکزی مقننہ کی ترتیب حسب ذیل تھی۔

گورنر جنرل۔

مجلس عاملہ کے سات ارکان

۲۹۔ سرکاری حکام جن میں سے ۲۸ نامزد شدہ ہوں گے جو صوبوں کی مقامی حکومتوں کی طرف سے بھیجے جائیں گے۔ نیز صوبہ دہلی کا چیف کمشنر یا پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بہ اعتبار عہدہ شرکت کا مجاز ہوگا۔

۳۲ غیر سرکاری ارکان جن میں سے پانچ نامزد شدہ ہوں گے اور ۲۷ منتخب شدہ۔ اس طرح کل تعداد ۶۹ ہوگی جن میں سے ۶۱ زائد ارکان ہوں گے۔

مرکزی مقننہ کے لئے حق رائے دہندگی مفصلہ ذیل کو حاصل تھا۔

(الف) صوبوں کی مجالس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان ۱۳ ارکان منتخب کریں گے۔

(ب) چھ صوبوں (یعنی بمبئی، مدراس، بنگال، یوپی، سی پی، اور بہار واڑیسہ) کے مسلمہ حیثیت کے زمینداروں کو اپنے صوبے سے سات زمیندار منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

(ج) مذکورہ چھ صوبوں کے مسلمہ حیثیت کے مسلمان پانچ ارکان منتخب کریں گے۔

(د) یورپین ایوان ہائے تجارت (بنگال وبمبئی) کی جانب سے دو رکن منتخب ہوں گے۔

(س) مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کے حقوق انتخاب میں فرق تھا۔ مرکزی مقننہ کے لئے دس ہزار سالانہ مال گزاری ادا کرنے والے حق انتخاب رکھتے تھے یا اعلیٰ خطاب یافتہ اشخاص۔ بنگال کے مسلمانوں کو بطور رعایت یہ حق تھا کہ ان کے آنریری مجسٹریٹ، آمدنی پر محصول ادا کرنے والے اور حکومت کے سب وظیفہ پانے والوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اس لئے کہ آمدنی کے معیار سے دیکھا جاتا تو بہت کم مسلمان رائے دینے کے حق کے مستحق ہوتے۔

منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعہ جو انتخابی طریقہ رائج ہوا اس کے بموجب اصل رائے دہندوں اور نمایندوں میں بہت دور کا تعلق تھا۔ اس کو براہ راست نیابتی طریق انتخاب کے بجائے بالواسطہ انتخاب کہنا درست ہوگا۔ اگرچہ صوبوں میں برائے نام غیر سرکاری ارکان کو اکثریت حاصل تھی لیکن چونکہ ان غیر سرکاری ارکان میں نامزد شدہ ارکان بھی شامل ہوتے تھے اس واسطے سرکاری ارکان من ملانے طور پر اکثر اوقات صوبجاتی مقننہ میں غلبہ حاصل کر لیتے تھے۔ اعتدال پسند ہندوؤں اور مسلمانوں کی مدد سے حکومت صوبجاتی مقننہ میں آسانی کے ساتھ توازن قایم رکھ سکتی تھی اور اپنے منشاء کے موافق معاملات طے کرا سکتی تھی۔ باوجود

انتخابی عنصر کی موجودگی کے مخصوص مفاد کی نمائندگی کرنے والے موجود تھے جو حکومت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے تھے اور جن کا فائدہ اسی میں تھا کہ ہمیشہ حکومت کی مرضی کے مطابق اپنی رائے دیں۔ غرضکہ بالواسطہ انتخاب کی وجہ سے نیابتی اصول محض جزوی طور پر رائج ہوا۔

واضح رہے کہ قانون مجالس ہند ۱۹۰۹ء کی رو سے پارلیمنٹ نے پہلی مرتبہ نیابتی اصول کو مجالس مقننہ کے لئے تسلیم کیا، چاہے وہ نیابت بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور صوبوں کی حکومتوں کی اہمیت اور حیثیت بہ نسبت پیشتر کے بلند ہوگئی۔ اب نظم ونسق کے اہم امور مجالس مقننہ میں بحث میں لائے جاسکتے تھے اور صوبوں کی حکومتیں اپنا میزانیہ علیحدہ تیار کرسکتی تھیں ۱۹۰۹ء سے قبل صوبجاتی مسودہ ہائے میزانیہ مرکزی حکومت کی منظوری کے لئے پیش ہوا کرتے تھے اور اکثر اوقات ان میں ایسے تغیرات کئے جاتے تھے کہ وہ بالکل بدل جاتے تھے۔ لیکن اب ایسا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ اگر کوئی صوبہ کی حکومت ایسی اسکیم پیش کرے جس میں پانچ ہزار روپے سے زیادہ خرچ ہوتا ہو تو وہ اسکیم مرکزی مقننہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کی جائے گی تاکہ وہ اس کے متعلق ضروری تنقیح اور جانچ پڑتال کرکے اپنی سفارش پیش کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان میں آدھے منتخب شدہ ارکان کی شرکت لازمی قرار دی گئی۔

مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں جو تجویزیں کثرت رائے سے منظور ہوتی تھیں ان کی حیثیت حکومت کے لئے محض سفارشوں کی ہوگی۔ حکومت ان کے مطابق عمل کرنے کی پابند نہ ہوگی۔ صدر کو اختیار ہوگا کہ بے وجہ بتلائے ہوئے جس تجویز کو چاہے مقننہ میں پیش ہونے سے روک دے۔ میزانیہ کی عام مدوں کے متعلق قطعی فیصلے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کرے گا۔ ارکان کی رائے کے مطابق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل میزانیہ میں تبدیلی کرسکتا ہے لیکن ارکان کو ازخود یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ میزانیہ کے متعلق کوئی تجویزیں پیش کریں۔ میزانیہ کی منظوری کے لئے مقننہ میں رائے نہیں لی جائے گی۔

آمدنی کی بعض مدیں مثلاً اسٹامپ، کروڑگیری اور دیسی والیان ملک کا خراج وغیرہ کے متعلق بحث نہیں کی جا سکے گی۔ اسی طرح بعض خرچ کی مدیں مثلاً فوج بحریہ، قرضہ عامہ، دفاع، سرکاری ریلیں اور امور مذہبی کے متعلق بھی کسی قسم کی بحث کی اجازت نہ ہوگی۔ ان امور کے علاوہ مفاد عامہ یا نظم و نسق کے دوسرے مسائل معرض بحث میں لائے جا سکیں گے۔ سوالات کرنے کے لئے قاعدے مقرر ہوں گے جن کی پابندی لازمی ہوگی۔

اعتدال پسندوں نے منٹو مارلے اسکیم کو باوجود اس کی خامیوں کے قابل قبول خیال کیا اور مسٹر گوکھلے نے اپنی مدراس والی تقریر میں نافذ شدہ اصلاحات کے فائدوں کی طرف اہل ہند کو متوجہ کیا۔ حکومت نے سر ستیندر ناتھ سنہا کو (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) وائسرائے کی کونسل کی رکنیت پر فائز کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی کو اتنا بڑا اعزاز دیا گیا۔ لندن کی انڈیا کونسل میں مسٹر کرشن گووند گپتا اور سید حسین بلگرامی کو رکنیت پر فائز کیا گیا۔

حکومت صوبجاتی کونسلوں کے اختیارات میں کسی خاص قسم کا اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی تاکہ بعد میں وہ خود مختار ہو سکیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے کمیشن بابتہ عدم مرکزیت (ڈی سنٹرل آئی زیشن کمیشن) کی سفارشوں سے بھی صوبجاتی کونسلوں کے حلقہ اختیار میں کوئی وسعت پیدا نہ ہوئی۔ ان کونسلوں کی ہیئت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محض تجربی اور تعلیمی ہے تاکہ ہندوستانیوں کو پارلیمانی طریق حکومت کے متعلق ابتدائی سبق حاصل ہو جائیں۔ اعتدال پسند مدبرین نے کونسلوں کو چلانے اور اس ضمن میں حکومت سے تعاون کرنے کی حمایت کی تھی لیکن کچھ عرصے بعد انھوں نے بھی محسوس کر لیا کہ وہ ان کے توسط سے ملکی نظم و نسق پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ مسٹر گوکھلے نے مرکزی مقننہ میں مختلف ملکی مسائل پر جو تقریریں کیں وہ خالص علمی اور خطیبانہ شان رکھتی تھیں اور پارلیمانی نقطۂ نظر سے ان کا معیار کافی بلند تھا لیکن ان کی آواز عملی حیثیت سے مساوی موثر نہ ہوئی۔ حکومت کو جو کرنا تھا وہ برابر کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسند مدبرین بھی ان اصلاحوں کی طرف

سے مایوس ہو گئے۔ انتہا پسندوں نے تو پہلے ہی سے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ان اصلاحوں سے حکومت ہند کو اس واسطے مایوسی ہوئی کہ تنقید کرنے والے بلا کسی تعمیری اصول کو پیش نظر رکھے ہوئے حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ اور چونکہ وہ خود حکومت کے کام میں عاملہ کے ساتھ شریک نہ تھے اس لئے ان کی رائے میں غیر ذمہ داری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اگرچہ گورنر جنرل کی کونسل میں ایک ہندوستانی کو رکن قانون بنایا گیا، وزیر ہند کی کونسل میں بھی دو ہندوستانیوں کو رکنیت پر لیا گیا اور گورنروں کی کونسلوں میں بھی ہندوستانی ارکان نے جگہ پائی لیکن حکومت کی عام حکمت عملی پر ان کی وجہ سے کوئی گہرا اثر نہیں پڑا خود لارڈ مارلے نے پارلیمنٹ میں مسودہ قانون پیش کرتے وقت صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اس قانون سے ہندوستان میں پارلیمانی طریق حکومت رائج کرنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ان کا منشاء اس سے یہی ہے کہ نزاع کی قوتوں کو دبا کر ہندوستانیوں کے اعتدال پسند طبقے کو حکومت کے کاروبار میں مشاورتی حیثیت سے شریک کیا جائے۔ ایسی صورت میں ہندوستانیوں کو اس قانون سے اتنی زیادہ امیدیں ہی نہ قایم کرنی چاہئے تھیں جتنی کہ انھوں نے کیں تاکہ مایوسی نہ ہوتی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ ہارڈنگ نے جو لارڈ منٹو کی جگہ گورنر جنرل مقرر ہوا ہندوستانیوں کی دل جوئی کی تاکہ انتہا پسندوں کا اثر عوام میں زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کے ہندوستان تشریف لانے پر دہلی میں بڑی شان و شوکت سے دربار ہوا جس میں ملک کے والیان ریاست، بڑے بڑے امیروں اور سرکاری عہدہ داروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا گیا اور کلکتہ کی بجائے دہلی کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دیا گیا۔ بہار اور اڑیسہ کا نیا صوبہ بنایا گیا، آسام میں چیف کمشنری قایم کی گئی۔ ایک شاہی ماموریہ (کمیشن) لارڈ ایلنگٹن کی صدارت میں مقرر کیا گیا تاکہ اس امر پر غور کرے

کہ سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد اس قدر کم کیوں ہے اور اس کو بڑھانے کے لئے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں۔ اس کمیشن کے ارکان میں تین ہندوستانی سر عبدالرحیم، گوپال کرشن گوکھلے اور مہادیو بھسکر چوبال شریک تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ پہلی جنگ عظیم کی مصروفیت کے باعث ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ جنگ کے بعد جب ہندوستان کے عام سیاسی مسئلہ کی طرف پارلیمنٹ نے توجہ کی تو سیول سروس اور اعلیٰ ملازمتوں کے مسئلہ پر بھی سوچ بچار ہوا اور ان میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانے کی تجویزیں منظور ہوئیں۔

بائیسواں باب

نیابتی اور ذمہ دار حکومت کا آغاز

اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہندوستانیوں نے برطانوی حکومت کی کامیابی کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ جنگ کے چار سالوں میں بارہ لاکھ ہندوستانیوں نے حصہ لیا اور کروڑوں روپے کا سامان جنگی ضرورتوں کے لئے اس ملک سے فراہم کیا گیا۔ فرانس اور مشرق قریب کے محاذوں پر لاکھوں ہندوستانیوں نے برطانیہ عظمیٰ کی حمایت میں اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ ان کی سرفروشانہ خدمتوں کا خود برطانوی مدبروں نے اعتراف کیا۔ قدرتی طور پر ہندوستانیوں کے تعلیم یافتہ اور اصلاح پسند طبقے کی یہ خواہش تھی کہ برطانوی حکومت ان کے ہم وطنوں کی خدمتوں کا صلہ سیاسی اصلاحوں کی شکل میں دے تاکہ ہندوستانیوں کی سیاسی حیثیت برطانوی قلمروؤں (ڈومینینس) کے مثل ہو جائے۔ دوران جنگ میں ہندوستانیوں کی خدمتوں کا اعتراف کرنے کی غرض سے ۱۹۱۷ء میں جو شہنشاہی جنگی کونسل ہوئی

اس میں مہاراجہ بیکانیر، سر ستیندر ناتھ سنہا اور سر جیمس مسٹن حکومت ہند کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک ہوئے۔
سنہ ۱۹۱۶ء میں جب لارڈ چیمسفورڈ لارڈ ہارڈنگ کی جگہ گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر ہو کر آیا تو اس نے ہندوستانیوں میں بے اطمینانی کی کیفیت محسوس کی اتحادیوں نے اور خاص طور پر انگریزوں نے دوران جنگ میں بار بار اعلان کیا تھا کہ وہ دنیا بھر کی قوموں کو جمہوریت کے لئے آزاد کرانے کی غرض سے جرمنی اور اس کے ساتھیوں سے لڑ رہے ہیں ان اعلانوں کا یہ قدرتی اثر ہوا کہ ہندوستانیوں کے دل میں بھی سیاسی حقوق ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی دوران جنگ میں مسز اینی بسنٹ اور مسٹر تلک نے ہوم رول کی تحریک شروع کر دی اور ہندوستانیوں کے سیاسی مطالبوں کو صاف صاف پیش کیا تاکہ برطانوی حکام کو شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں میں ایک میثاق ہوا جسے میثاق لکھنؤ کہتے ہیں اور اس ضمن میں ایک متفقہ اسکیم منظور ہوئی جسے تمام ہندوستانیوں کے مطالبہ کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ کانگریس لیگ اسکیم کہلاتی ہے۔ اس اسکیم میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں ۴/۵ تعداد ارکان وسیع رائے دہی کے اصول پر منتخب شدہ ہونی چاہئے۔ اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر صوبے کی مقننہ میں نشستیں محفوظ رکھی جائیں گی پنجاب میں ۵۰ فی صدی، یوپی میں ۳۰ فی صدی، بنگال میں ۴۰ فی صدی وغیرہ۔ اگر کسی اقلیت کے ۳/۴ منتخب شدہ ارکان کسی تجویز کی اپنے مفاد کے لحاظ سے مخالفت کریں تو اس تجویز کو پیش نہیں کیا جا سکے گا صوبہ کی کونسلوں کے صدر منتخب شدہ ہوں گے۔ صوبہ کی کونسلیں اپنی ذمہ داری پر قرض لینے اور محصولوں میں تغیر و تبدل کرنے کی مجاز ہوں گی۔ میزانیہ کونسل کی رائے سے منظور ہوا کرے گا اور کونسل کی تمام تجویزوں کی تعمیل عاملہ کے لئے ضروری اور لازمی ہو گی۔ صوبہ کی عاملہ کے نصف ارکان ہندوستانی

ہونے چاہئیں۔ مرکزی کونسل کے ارکان کا انتخاب صوبہ کی کونسلیں کریں گی اور اس میں وہ مسائل پیش ہوا کریں گے جن کا تعلق تمام ہندوستان سے ہوگا۔ گورنر جنرل کی عاملہ میں بھی نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہئیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے مندرجہ بالا تجویزیں ہندوستانیوں کے متفقہ مطالبے کے طور پر شائع کیں۔ اس اسکیم کا انگلستان میں بہت اچھا اثر ہوا اور برطانوی ارباب اقتدار ہندوستان کے مسئلے کی طرف زیادہ توجہ ظاہر کرنے لگے۔ اب تک سیاسی معاملوں میں صرف کانگریس ہی آواز بلند کرتی تھی لیکن اب مسلم لیگ بھی اس کے ساتھ ہوگئی۔

ایک اور قابل ذکر اسکیم "انیس کی یادداشت" کے نام سے مشہور ہے جسے مرکزی مقننہ کے ۱۹ غیر سرکاری ارکان نے اکتوبر ۱۹۱۶ء میں وائسرائے کے پاس پیش کیا تھا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ میں اکثریت منتخب شدہ ارکان کی ہو اور رائے دہی کے حق کو اتنا وسیع کیا جائے کہ عوام براہ راست شرکت کرسکیں۔ اقلیتوں کے حقوق محفوظ کئے جائیں۔ مجالس مقننہ کو ہر قسم کے قوانین اور میزانیہ منظور کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ وزیر ہند کی کونسل ختم کردی جائے۔ اور خود وزیر ہند کی حیثیت وزیر نوآبادیات کی طرح ہونی چاہئے۔ صوبہ کی حکومتوں کو خود اختیاری کے تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

اس ضمن میں انگلستان کے ارباب فکر میں انجمن راؤنڈ ٹیبل کی جماعت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس انجمن کے بانی مسٹر کرٹس تھے جو ٹرانسوال میں سرکاری عہدہ پر رہ چکے تھے۔ انھیں شہنشاہی مسائل اور ان کے علمی مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس جماعت کے ایک رکن مسٹر ڈیوک نے مسئلہ ہند کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں بتدریج ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ دوعمل (ڈیارکی) کے اصول کو تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح حکومت کا ایک حصہ برطانوی انتخاب کرنیوالوں کے سامنے ذمہ دار ہوگا اور دوسرا حصہ ہندوستانی انتخاب کرنیوالوں کے سامنے۔ ڈیوک نے ایک یادداشت مرتب کی جس میں مجالس مقننہ میں رائے دہی کے حق کی توسیع کے متعلق مفصل بحث کی گئی تھی۔ یہ یادداشت مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے پاس

غور کیلئے بھیجی گئی۔ مسٹر کرٹس خود ہندوستان آئے۔ یہاں کے سیاسی لیڈروں سے ملے اور اپنی تصنیف ''دوعلی'' میں ہندوستان کے دستوری مسئلے کا حل پیش کیا۔ اس کتاب میں ہندوستان کی دستوری ترقی کا مقصد قلمرو کی مرتبہ (ڈومینین اسٹیٹس) قرار دیا گیا۔ دوعلی میں یہ اصول مدنظر تھا کہ بعض محکمے ایسے ہیں جنکے انتظام کو اہل ہند کے سپرد نہیں کیا جاسکتا اسلئے کہ ایسا کرنے سے انتظامی ابتری پیدا ہونیکا اندیشہ تھا بعض دوسرے محکموں کا انتظام پوری طرح سے ہندوستانیوں کے سپرد کردیا جائے گا۔

کانگریس لیگ اسکیم نے جو لکھنؤ میں منظور ہوئی انگلستان کے مدبروں کو اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحیں نافذ کرنے کے متعلق جلد کوئی قدم اٹھائیں۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ۲۰؍ اگست ۱۹۱۷ء پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ

''ہر مجسٹی ملک معظم کی حکومت کی حکمت عمل جس سے حکومت ہند پورے طور پر متفق ہے یہ ہے کہ نظم ونسق کے شعبے میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھائی جائے اور خود مختاری کے اداروں کی بتدریج سے ترقی ہو تاکہ ہندوستان میں آہستہ آہستہ ذمہ دار حکومت قایم ہوجائے جبکی برطانوی شہنشاہی کے لازمی جزو کی سی حیثیت ہوگی۔۔۔ برطانوی حکومت اور حکومت ہند جن پر ہندوستانی قوموں کی خوشحالی اور ترقی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے ترقی کے معیار کا تعین کریں گی۔ ان دونوں حکومتوں کی اس بات میں رہنمائی اس عمل تعاون سے ہوگی جو انکی جانب سے ہوگا جنکو خدمت کے نئے موقعے دئے جائیں گے اور جس حدتک انکے احساس ذمہ داری پر بھروسا کیا جاسکے گا۔''

اس اعلان کے بعد مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے تاکہ مقامی حالات کا خود مشاہدہ کریں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے ملکر اس ملک کی سیاسی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائیں۔ مسٹر مانٹیگو نے جولائی ۱۹۱۸ء میں اپنی رپورٹ بابتہ اصلاحات جسے مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ بھی کہتے ہیں شائع کی۔ اس رپورٹ میں یہ بات اصولاً تسلیم کی گئی کہ مرکزی حکومت ہند میں زیادہ تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ صرف یہ ممکن ہے کہ جمہور کے نمایندوں کو اس کی کارگزاری پر تنقید کرنیکا حق دیا جائے جو پہلے حاصل نہیں تھا۔ رپورٹ میں اس امر کی تصریح کی گئی کہ چونکہ ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری حکومت ہند پر ہے

اسلئے اسکو ناتجربہ کار اور غیر ماہر ہاتھوں میں دینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ جب تک اندرونی و بیرونی حفاظت کیلئے ہندوستان برطانیہ عظمیٰ کی بری اور بحری فوجوں کا منت پذیر ہے اسوقت تک اس ملک کو جو خود مختاری کے حقوق حاصل ہوں گے وہ لازمی طور پر محدود ہونگے۔ مسٹر مانٹیگو لکھتے ہیں کہ اس بات کا قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا کہ پارلیمنٹ کبھی اسکے لئے آمادہ ہوگی کہ برطانوی فوجیں ایسی حکمت عملی کی تائید کے لئے استعمال کیجائیں جسکے تعین پر خود اسکو کوئی حق نگرانی حاصل نہیں یا جسے وہ ناپسند کرتی ہے ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ دراصل ایک شہنشاہی مسئلہ ہے اور اسواسطے حکومت ہند کیلئے لازم ہے کہ اس کے پاس ہمیشہ اتنی قوت اور ایسے وسیلے رہیں جنکی بدولت وہ اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکے۔

مسٹر مانٹیگو نے صوبے کی حکومتوں میں اہل ہند کو عاملانہ اختیارات میں شریک کرنے کی سفارش کی لیکن ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے مکمل صوبجاتی آزادی کے اصول کو نہیں تسلیم کیا اور صوبجاتی مقننہ کو مالیاتی اور وضع قانون کے پورے اختیارات دینا قبل از وقت بتلایا۔ گورنر کی مجلس عاملہ میں انگریز ارکان کے ساتھ ہندوستانی ارکان بھی ہونگے جو مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہونگے اور ان کے تحت چند انتظامی امور ہونگے۔ گورنر کی کوشش ہونی چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے عاملہ کے تمام فیصلے متفقہ ہوا کریں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ ایک صیغے کی کارروائی دوسرے صیغے پر اثر ڈالتی ہو۔ مسلمانوں کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوے ان کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کی سفارش کی گئی۔ یہ امر صاف طور پر تسلیم کیا گیا کہ "صوبجاتی حکومتوں میں ذمہ دار حکومت کی جانب پہلا قدم اٹھانا چاہیے صوبجاتی حکومتوں کو کچھ نہ کچھ ذمہ داری فوراً دینی چاہیے اور ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جب حالات اس کی اجازت دیں تو اس وقت انھیں پوری آزادی دی جاسکتی ہے اسلئے لازم ہے کہ صوبجاتی حکومتوں کو نظم ونسق کے قوانین بنانے اور اپنے مالیاتی معاملوں میں حکومت ہند سے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو جس حد تک کہ حکومت ہند کی ذمہ داریوں کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہ ہوتی ہو۔

مسٹر مانٹیگو نے جو ۱۹۱۹ء میں قانون حکومت ہند کا مسودہ دارالعوام

کے سامنے پیش کیا۔ اس کی دوسری خواندگی کے بعد مسودہ پارلیمنٹ کی ایک مجلس منتخبہ کے سامنے غور کے لئے بھیجا گیا جس میں سات دار العوام کے اور سات دار الامرا کے ارکان شریک تھے اور لارڈ سلبورن اس کے صدر تھے۔ مجلس منتخبہ نے سرکاری اور غیر سرکاری شہادتیں قلمبند کیں۔ ہندوستانیوں میں جنھوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کے خیالات مجلس منتخبہ کے سامنے پیش کئے ان میں سری نواس شاستری، وی۔ جے پٹیل، بال گنگادھر تلک، سر آغا خاں، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر ایم۔ اے جناح اور مسز اینی بسنٹ بھی شامل تھیں۔ کمیٹی نے ان سب شہادتوں کے مطابق مسودۂ قانون حکومت ہند کی تنقیح کی اور بالآخر اپنی رپورٹ نومبر ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی۔ مجلس منتخبہ نے حکومت کی مجوزہ اصلاحوں کی عام طور پر تائید کی اور یہ اصول تسلیم کیا کہ ہندوستانیو کے لئے ذمہ دار حکومت قائم کرنے میں اب کچھ دیر نہ ہونی چاہیئے۔ قانون حکومت ہند بحث و مباحثہ کے بعد پارلیمنٹ میں ۲۳ دسمبر ۱۹۱۹ء منظور ہوا اور شاہی جریدہ اعلامیہ میں اس کی منظوری کا اعلان کیا گیا۔

اس قانون کی رو سے مرکزی مقننہ دو ایوان پر مشتمل قرار دی گئی۔ کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی۔ کونسل آف اسٹیٹ میں ساٹھ ارکان ہوں گے جن میں سے ایک ثلث سرکاری ہوں گے باقی براہ راست منتخب ہوں گے۔ صدر کا تقرر گورنر جنرل کرے گا۔ ارکان پانچ سال کے لئے منتخب ہوں گے۔ لیجسلیٹو اسمبلی کم از کم ۱۴۴ ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس کے ارکان تین سال کے لئے چنے جائیں گے۔ صدر کا انتخاب ارکان میں سے ہوگا۔ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے ارکان دونوں ایوانوں کے سرکاری نامزد شدہ ارکان ہوں گے۔ کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی دونوں میں رکنیت کے لئے کم از کم پچیس سال کی شرط لازمی ہوگی اور ہر وہ شخص جو رائے دینے کا حق رکھتا ہے اس کو حق رکنیت بھی حاصل ہوگا۔ انتخاب کے حلقوں میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم رکھی گئی نشستوں کا تعین ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کے مطابق عمل میں آیا۔

مرکزی مقننہ کو وضع قوانین کے وسیع اختیارات حاصل ہوں گے۔ وہ

ہندوستان میں تاج برطانیہ کی رعایا اور ملازمین اور ہندوستانیوں کیلئے جہاں کہیں وہ ہوں بشرطیکہ انھوں نے اپنی قومیت نہ بدلی ہو وضع قوانین کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اس حق پر بعض قیدیں عاید کی گئی ہیں۔ مثلاً اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے کسی منظورہ قانون کو جس کا اطلاق برطانوی ہند پر ہوتا ہو منسوخ کرسکے یا اس میں کوئی ترمیم کرسکے یا کوئی ایسا قانون منظور کرے جس سے پارلیمنٹ کے اقتدار کو کسی طرح صدمہ پہنچتا ہو یا برطانیہ کے غیر تحریری دستور اور آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ ذیل امور کے متعلق مرکزی مقننہ کو اس وقت تک قانون بنانے کی اجازت نہ ہوگی جب تک کہ گورنر جنرل سے ان کے متعلق اجازت نہ لے لی گئی ہو۔

(الف) قرضۂ عامہ۔ ہندوستان کی مالیات سے متعلق کوئی مسئلہ۔

(ب) ہندوستان میں برطانوی رعایا کے مذہب یا مذہبی رسمیں اور عبادتیں وغیرہ۔

(ج) ہز مجسٹی ملک معظم کی بری بحری یا فضائی فوجوں میں نظم و ضبط قایم رکھنے کے متعلق کوئی مسئلہ۔

(د) حکومت ہند کے تعلقات خارجی دولتوں یا والیان ریاست کے ساتھ یا ان صوبجاتی امور سے متعلق وضع قانون کرنا جو کھلم کھلا مرکزی مقننہ کی حدود سے خارج ہیں یا کسی صوبجاتی مقننہ کے منظور کردہ قانون کی تنسیخ یا ترمیم کرنا یا گورنر جنرل کے نافذ کردہ خصوصی احکام (آرڈیننس) کی تنسیخ یا ترمیم۔ گورنر جنرل اس کا مجاز ہوگا کہ کسی ایسے مسودہ قانون کو جو مرکزی مقننہ میں پیش کیا جانے والا ہو پیش ہونے سے روک دے اس لئے کہ ایسا کرنے سے برطانوی ہند کے امن و امان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل رکن مالیات کے توسط سے مقننہ میں میزانیہ پیش کرائے گا مخصوص امور کے علاوہ جیسے دفاع، قرضہ عامہ کا سود، کلیسائی اخراجات وغیرہ مقننہ کا فیصلہ میزانیہ کی مدوں کے متعلق قطعی ہوگا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی رو سے مرکزی مقننہ کے دونوں ایوانوں میں منتخب شدہ عنصر کو

ا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کیتھ کی کتاب (A Constitutional History of India. از صفحہ ۲۴۷ تا ۲۷۳)

اکثریت حاصل ہوئی اور اس کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے تحت مرکزی حکومت کے تمام محکموں کے مفاد کی دیکھ بھال رکھی گئی۔ اگر دو صوبوں میں کسی مسئلہ پر جھگڑا ہو اور وہ اسے آپس میں طے نہ کر سکیں تو اس کا تصفیہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کرے گا حکومت کے ملکی اور فوجی انتظاموں کی عام دیکھ بھال اور نگرانی کے اختیارات بھی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو حاصل ہوں گے۔ کسی فوری ضرورت کے وقت وہ وقتی احکام نافذ کر سکے گا۔ اس قسم کے وقتی احکام کو چھ ماہ تک وہی قانونی حیثیت حاصل ہوگی جو مرکزی مقننہ کے کسی منظورہ قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ گورنر جنرل کو حق نامنظوری (ویٹو) اور حق تصدیق (سرٹی فی کیشن) حاصل ہوگا۔ حق نامنظوری سے یہ مراد ہے کہ ضرورت کے وقت کسی مسودہ قانون کو جب کہ وہ مقننہ میں منظور ہو چکا ہو رد کر دیا جائے اس لئے کہ گورنر جنرل کے خیال میں اس قانون کے نافذ کرنے سے برطانوی ہند کے مفاد کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حق تصدیق سے یہ مراد ہے کہ گورنر جنرل کسی فوری اور ضروری معاملے کے متعلق مقننہ کی منظوری کے بغیر اپنی ذمہ داری پر کسی مسودہ قانون کو نافذ کر دے اس لئے کہ ایسا کرنا اس کی رائے میں برطانوی ہند کے مفاد کی حفاظت کیلئے ضروری ہے اور اس کے فرائض کی انجام دہی بے اس کے ممکن نہ ہوگی۔

گورنر جنرل کی مجلس عاملہ چھ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ اگرچہ قانون دستور میں اس کا کوئی تعین نہیں کیا گیا کہ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے ارکان میں ہندوستانیوں کی تعداد کیا ہوگی لیکن پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ کی سفارش یہ تھی کہ چھ میں سے تین ہندوستانی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ آئندہ اس سفارش پر عمل کیا گیا۔ قانون دستور میں صرف اتنی صراحت کی گئی تھی کہ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ میں کم سے کم تین رکن ضرور ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں تاج کی خدمت میں دس سال گزار چکے ہوں اور ہندوستان کے انتظامی معاملوں کا تجربہ رکھتے ہوں۔ ان چھ ارکان پر نو انتظامی محکمے تقسیم کر دئے گئے۔ عام طور سے ارکان مجلس عاملہ کے معتمد اپنے محکموں کے متعلق گورنر جنرل کو باخبر رکھیں گے۔ معتمدوں کی حیثیت

صرف یہ نہ ہوگی کہ وہ متعلقہ رکن کو مشورہ دیں بلکہ ان کی رائیں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے سامنے پیش ہوں گی۔ حالانکہ برطانوی کابینہ میں معتمد کی حیثیت مشیر سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن حکومت ہند کے معتمدوں کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ رکھی گئی۔ خود گورنر جنرل ان کا تقرر کیا کرے گا۔

مرکزی حکومت کی دستوری نوعیت کو اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ اگرچہ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی رو سے لیجسلیٹو اسمبلی میں منتخب شدہ ارکان کی اکثریت سے جمہوری عنصر کو قوت دی گئی لیکن اس کے حقیقی اختیارات محدود رکھے گئے۔ مرکزی حکومت کی تشکیل میں ذمہ داری کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی اصلی ذمہ داری پارلیمنٹ کے روبرو تھی نہ کہ لیجسلیٹو اسمبلی اور ہندوستانی عوام کے روبرو۔ لیجسلیٹو اسمبلی میں منتخب شدہ عنصر کو جو اکثریت دی گئی تھی اس کا منشا صرف یہ تھا کہ دستور ہند کی جدید عمارت کے دونوں حصے یعنی مرکزی اور صوبجاتی حکومتیں بالکل غیر متناسب نہ ہو جائیں۔ صوبجاتی حکومتوں میں جو تجربہ کیا گیا اگر اسی قسم کا تجربہ مرکزی حکومت میں بھی کیا جاتا تو ان امور کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا جن پر شہنشاہی مفاد مبنی ہے۔ اس واسطے عمومی مقننہ اور غیر ذمہ دار عاملہ کی ان مل بے جوڑ تجویزیں مرکزی حکومت کی تشکیل میں روا رکھی گئیں۔ ایوان بالا قایم کرکے اس بات کی کوشش کی گئی کہ اگر ایوان زیریں کا عمومی عنصر زیادہ زور کرے تو اس کے خلاف ایوان بالا کو استعمال کیا جاسکے۔ چنانچہ اگر لیجسلیٹو اسمبلی حکومت کی کسی تجویز کو رد کرے تو توقع تھی کہ کونسل آف اسٹیٹ اس کو منظور کرلے گی۔ اس قانون دستور کی رو سے مرکزی مقننہ کی ظاہری ہیئت میں تو کچھ تبدیل ضرور کی گئی لیکن اس کے ساتھ مرکزی عاملہ کا بنیادی اصول جوں کا توں رکھا گیا چونکہ قانونی طور پر مرکزی عاملہ مرکزی مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں اسلئے ظاہر ہے کہ مقننہ نہ اسے برخاست کرسکتی تھی اور نہ اپنی بات منوانے پر اس کو مجبور کرسکتی تھی۔

صوبجاتی حکومت

قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کے بموجب صوبجاتی

حکومتوں کی عاملہ اور مقننہ دونوں میں نہایت دوررس تبدیلیاں کی گئیں۔ اس قانون کے بنانے میں یہ رجحان نمایاں طور پر پایا جاتا ہے کہ مرکز سے لے کر بعض اختیارات صوبوں کو منتقل کئے جائیں اور منتخب شدہ عنصر کو حقیقی اختیار میں ایک حد تک شریک کیا جائے۔ اس سے قبل ۱۹۰۸ء کے مامور یہ شاہی بابت لامرکزیت (ڈی سنٹریلائزیشن کمیشن) نے بھی یہی سفارش کی تھی۔ پھر لارڈ ہارڈنگ نے بہ حیثیت وائسرائے ہند اگست ۱۹۱۱ء کے مراسلہ میں جو "مراسلہ دربار تاجپوشی" کے نام سے موسوم ہے صوبوں کے اختیارات میں تدریجی اضافہ کی سفارش کی تھی اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کچھ عرصے تک ضروری ہے کہ مرکز سے صوبوں کو اختیارات کی تحویل کا رجحان کار فرما رہے تاکہ آئندہ ہندوستان خود مختار صوبوں کا مجموعہ بن جائے اور حکومت ہند کی ان پر صرف نگرانی رہے اور جہاں تک ہوسکے صوبجاتی امور میں کم سے کم دخل دہی روا رکھے۔ مرکز سے صوبوں کو اختیارات کی تحویل کے ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ ذمہ دار حکومت کا تجربہ بجائے مرکز کے صوبوں میں کیا جائے اور چنے ہوئے ارکان کو صوبجاتی نظم و نسق کے ایک حصے میں اس کا پورا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی آواز موثر بنا سکیں لیکن ایک دم سے وسیع انتظامی اختیارات دینا مناسب نہ ہوگا اس لئے دوعملی (ڈیارکی) کے طرز حکومت کو صوبوں میں رائج کیا گیا تاکہ انتظامی خرابی بھی پیدا نہ ہو اور ملک کے دردبست میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شرکت کا موقع ملے اور خود مختاری کے اداروں کو فروغ ہو۔

دوعملی کے اصول کے تحت صوبوں کے نظم و نسق کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک کو مفوضہ امور (ٹرانسفرڈ سبجکٹس) اور دوسرے کو محفوظ امور (ریزروڈ سبجکٹس) کہتے ہیں۔ مفوضہ امور وہ ہیں جو ہندوستانی وزیروں کے تحت ہوں گے جو پارلیمانی اصول کے مطابق صوبہ کی مجلس مقننہ کے سامنے ان کی بابت جواب دہ ہوں گے۔ جیسے مقامی حکومت اختیاری، تعلیمات، حفظان صحت، تعمیرات، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ۔ محفوظ امور سے نظم و نسق کے وہ شعبے مراد ہیں جن کے متعلق گورنر وزیر ہند کے سامنے جوابدہ

ہوگا جیسے انتظام مالگزاری، آبپاشی، عدالت، پولیس وغیرہ۔

محفوظہ امور کا انتظام گورنر بہ اجلاس کونسل کرے گا اور مفوضہ امور گورنر کو وزراء کے ساتھ سپرد ہوں گے۔ حکومت کے ان دو مختلف حصوں میں گورنر کی شخصیت ایک اتصالی کڑی کی طرح رہے گی۔ اس دوعملی کے انتظام کی بدولت صوبے کے نظم ونسق کا ایک حصہ گورنر کے توسط سے برطانوی انتخاب کنندوں کے سامنے جواب دہ قرار پایا اور دوسرا حصہ صوبجاتی انتخاب کنندوں کے سامنے۔ گورنر کو اس کا پابند نہیں کیا گیا کہ وہ وزیروں اور عاملہ کے دوسرے ارکان کا مشترک اجلاس کرے۔ کابینی طریق عمل ہندوستان میں رائج کرنے کی اس قانون میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وزیروں کی ذمہ داری مقننہ کے سامنے انفرادی حیثیت سے ہوگی۔ گورنر کے شاہی ہدایت نامہ میں یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ عاملہ کے ارکان اور وزیر آپس میں مشورے کی عادت بڑھانے کی کوشش کریں گے تاکہ سرکاری مشیروں کے مشورے سے وزیر مستفید ہوسکیں اور عاملہ کے ارکان کو وزیروں کے توسط سے رائے عامہ کی نسبت واقفیت حاصل ہو۔ لیکن اس کا مقصد مشترک کابینی ذمہ داری کو پیدا کرنا نہیں ہے اس واسطے کہ دوعملی کے مطابق حکومت کے دونوں حصوں کا انتظام ایک دوسرے سے علحدہ رکھا گیا ہے۔ پارلیمانی مجلس منتخبہ نے گورنر کی عاملہ کے ارکان اور وزیروں سے امید کی ہے کہ وہ تقریر یا اظہار رائے کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں گے۔ ارکان مجلس عاملہ کے لئے یہ بات لازمی نہ ہوگی کہ وہ وزیروں کی ان تجویزوں کی تائید کریں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے اور اسی طرح وزیروں کے لئے بھی یہ ضروری نہ ہوگا کہ ارکان عاملہ کی ان تجویزوں کی تائید کریں جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر ارکان عاملہ اور وزیر ایک دوسرے کی تجویزوں سے متفق ہوں تو ایسی صورت میں انھیں اختیار ہوگا کہ وہ اس کے متعلق تقریر یا اظہار رائے کرسکیں۔

صوبہ کا میزانیہ مرتب کرنے کی پوری ذمہ داری گورنر کی مجلس عاملہ پر ہوگی۔ مجلس عاملہ کا ایک رکن محکمہ مالیات کا صدر رہوگا۔ میزانیہ مرتب کرتے وقت سب اسے

پہلے ان رقموں کی نشان دہی ضروری ہوگی جو حکومت ہند کو واجب الادا ہوں گی اس کے بعد محفوظہ امور کے رقمی مطالبے پورے کئے جائیں گے اور سب سے آخر میں مفوضہ امور کے اخراجات کی پابجائی ہوگی۔ اگر مفوضہ امور کے لئے کافی رقم نہ بچے تو وزیروں کو اختیار ہوگا کہ اس کے لئے مقننہ میں مزید محصول لگانے کی تحریک کریں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یہ تحریک پیش کی جائے محکمہ مالیات اس کے متعلق ضروری تنقیح کرے گا اور مفوضہ امور کے متعلق آمدنی اور خرچ کی جانچ کرنے کے بعد اس کی سفارش کرے گا کہ آیا نئے محصول کی تحریک پیش کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ دراصل مفوضہ امور اور محفوظہ امور کے درمیان صوبجاتی آمدنی کی تقسیم ایسا دشوار مسئلہ تھا جس کا اطمینان بخش حل قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء میں تلاش کرنا عبث ہے۔ گورنر کو اختیار ہوگا کہ وہ صوبے کی آمدنی کو محفوظہ امور اور مفوضہ امور کی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنی صوابدید پر تقسیم کردے اور یہ تقسیم کا اصول اس وقت تک نافذ رہے گا جب تک کہ مقننہ کا جدید انتخاب عمل میں نہ آجائے۔ عملی طور پر چونکہ محفوظہ امور کے مطالبوں کو ترجیح حاصل ہوگی اس لئے وزیروں کے لئے ناممکن ہوگا کہ وہ قومیت کی تعمیر کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

قانون حکومت ۱۹۱۹ء کے تحت صوبجاتی مقننہ کو منٹو مارلے اصلاحوں کے مقابلے میں کافی وسعت دی گئی اور نسبتاً ان کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔ انتخاب براہ راست ہونے لگا اور حق رائے دہی کی توسیع عمل میں آئی۔ مسلمانوں، سکھوں، دیسی عیسائیوں اور اینگلو انڈینس کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا گیا۔ مدراس میں غیر برہمنوں اور بمبئی میں مرہٹوں کے لئے بھی نشستیں محفوظ کی گئیں۔ زمینداروں، تاجروں، کارخانوں کے مالکوں اور ریلان ٹرز کے لئے الگ نشستیں رکھی گئیں تاکہ مختلف مفادوں کی نمایندگی ہوسکے۔ اسی اختلاف مفاد کے اصول کے تحت شہری اور دیہی انتخابات کے حلقوں کا اضافہ ہوا۔ جن لوگوں کو حق رائے دہی حاصل ہوا وہ کل ملک کے بیس سال سے اوپر مردوں کی آبادی کے ۹ فی صد تھے۔

صوبجاتی حکومتوں میں دو عملی کا جو طریق حکومت نافذ کیا گیا اس پر یہ نکتہ چینی ہوتی ہے کہ نظم ونسق ایک وحدت بالکل ہوتا ہے جسے اس طرح ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ صوبہ کے نظم ونسق کا ایک حصہ تو صوبے کے رائے دینے والوں کے سامنے جوابدہ ہو اور دوسرے حصے کا تعلق برطانوی پارلیمنٹ سے قائم رہے جس کی نمایندگی وزیر ہند کے ذمہ ہوگی۔ مفوضہ امور کے متعلق تمام تجویزیں گورنر کے رحم وکرم پر منحصر ہوں گی۔ وہ اپنی صوابدید پر صوبہ کی آمدنی یا بجٹ کو مختلف محکموں کیلئے خاص کر سکے گا۔ ایسی صورت میں وزیر اپنے محکموں کے لئے اسی وقت ضروری رقمیں حاصل کر سکیں گے جبکہ ان کے تعلقات گورنر اور مجلس عاملہ کے ارکان سے نہایت خوشگوار ہوں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تجویزیں آگے نہ بڑھ سکیں گی۔

وزیر ہند بہ اجلاس کونسل

لارڈ کریو کی صدارت میں وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کے اختیارات کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے جون ۱۹۱۹ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ وزیر ہند کی کونسل کو ختم کر دینا چاہئے۔ لیکن پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ نے اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کیا اور اس کے اثرات کو مضرت رساں بتلایا۔ چنانچہ قانون دستور میں کونسل کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی تشکیل میں بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کونسل کے ارکان کی زیادہ سے زیادہ تعداد بجائے ۱۴ کے ۱۲ کر دی گئی اور کم سے کم ۸۔ ان میں سے نصف ارکان کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہندوستان میں ملازمت کے سلسلہ میں کم سے کم دس سال رہ چکے ہوں۔ رکنیت کی مدت بجائے سات سال کے پانچ سال کر دی گئی۔ بارہ سو پونڈ سالانہ ہر رکن کے لئے مشاہرہ مقرر کیا گیا لیکن ان ارکان کے لئے جن کا وطن ہندوستان ہو چھ سو پونڈ سالانہ بطور مزید الاونس دئے جائیں گے تاکہ وہ انگلستان میں خوش حالی سے زندگی بسر کر سکیں۔ اگرچہ دستور میں صراحت کے ساتھ وزیر ہند کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جن معاملوں کو چاہے اپنی صوابدید پر کونسل میں پیش کرے اور جنھیں چاہے نہ پیش کرے اور انکے

متعلق اپنی ذمہ داری پر براہ راست حکومت ہند کو احکام بھیج دے لیکن کونسل کی حیثیت یقینی طور پر وزیر ہند کے تحت قرار دی گئی۔ اور اس کی اہمیت بہ نسبت پیشتر کے کم ہو گئی۔ وزیر ہند اور اس کے دفتر کے اخراجات کی منظوری پارلیمنٹ میں ہوا کرے گی اور جیسا کہ اب تک قاعدہ چلا آتا تھا حکومت ہند کو ان اخراجات سے زیر بار نہیں کیا جائے گا۔ وزیر ہند کے نائب اور کونسل کے ارکان کی تنخواہیں بھی پارلیمنٹ کی منظورہ رقم سے دی جائیں گی۔

وزیر ہند کو ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے نظم ونسق میں دخل دینے کا دستوری حق حاصل ہوگا اور ہندوستان میں امن وامان اور عمدہ انتظام قایم کرنے کے لئے وہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ وزیر ہند کی دخل دہی صرف انتہائی صورتوں میں ہوگی ورنہ جہاں تک ہو سکے گا مقامی حکومتوں کو اپنے نظم ونسق کے معاملوں میں خود مختار چھوڑ دیا جائے گا۔ وزیر ہند کا یہ کام ہوگا کہ حکومت کی اعلیٰ حکمت عملی کا تعین کرے جس کا نفاذ حکومت ہند اور صوبے کی حکومتیں اپنے اپنے عمل کے حلقوں میں کریں گی۔ محصولاتی درآمد کے متعلق اگر حکومت ہند اور لیجسلیٹو اسمبلی متفق ہوں تو دستوری حیثیت سے وزیر ہند کو دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ قانون دستور میں اس کی صراحت موجود ہے کہ وزیر ہند ان مالیاتی انتظاموں کی حفاظت کرے گا جو شہنشاہی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہیں یا جن کے متعلق ملک معظم کی حکومت کوئی معاہدہ کر چکی ہے۔ اسی طرح صوبوں کے نظم ونسق میں اگر مفوضہ امور کے متعلق حکومت اور مقننہ متفق ہوں تو وزیر ہند دخل اندازی کا مجاز نہ ہوگا۔

وزیر ہند کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کے منظور کئے ہوئے مسودات قوانین کو رد کر دے یا بعض مسودوں کو پیش ہونے سے روک دے۔ وزیر ہند کا تعلق ہندوستانی نظم ونسق کے سیاسی پہلو سے رہیگا اس کے فرائض تجارتی ایک ہائی کمشنر کے سپرد کر دئے جائیں گے جس کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ وہ حکومت ہند کے لئے انگلستان میں ضروری اشیا خریدے

اور ہندوستانی تاجروں کے مفاد کی دیکھ بھال کرے۔ جو ہندوستانی طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان جائیں ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوگا۔ ہائی کمشنر اور اس کے عملے کے کل اخراجات کا بار حکومت ہند کے مالیہ پر ہوگا۔ ہائی کمشنر حکومت ہند کی ہدایتوں کے بموجب مصدقہ گماشتہ کے تمام فرائض انگلستان میں انجام دے گا۔ اس کا وہی مرتبہ تسلیم کیا جائے گا جو برطانوی قلمروؤں کے قنصلوں کا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت حکومت ہند کے سرکاری نمایندے کی ہوگی اور اس کے ذریعہ سے حکومت ہند انگلستان کے تمام تجارتی معاملوں کے متعلق معلومات حاصل کرے گی۔

ایوان والیان ریاست

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں اس امر پر بھی غور کیا گیا تھا کہ برطانوی ہند کی سیاسی تبدیلیوں کا دیسی ریاستوں پر کیا اثر ہوگا۔ اس کے ساتھ والیان ریاست کو اس کا اطمینان دلانے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ برطانوی ہند کے دستوری تغیرات سے ان کے حقوق، رعایتیں اور معاہدے متاثر نہیں ہوں گے۔

اس امر کی بھی سرسری طور پر تنقیح کی گئی کہ حکومت ہند اور والیان ریاست کے تعلقات کی نوعیت مختلف زمانوں میں بدلتی رہی ہے۔ برطانوی سیادت اور بالادستی کا اصول مسلمہ حیثیت رکھتا ہے جس میں شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے حکومت ہند نے اپنی مصلحتوں کے موافق دیسی ریاستوں کے ساتھ کبھی مداخلت کبھی عدم مداخلت اور کبھی اتحاد و تعاون کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ دیسی ریاستوں کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت ہند کے ذمہ ہے جو امور خارجی میں ان کی نمایندگی کرنے کی بھی مجاز ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں والیان ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مشترکہ مدافعت میں حکومت ہند کے ساتھ شرکت کریں۔

۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے بعد حکومت ہند کی یہ کوشش رہی کہ والیان ریاست آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست تعلقات نہ پیدا کریں۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آخر سے حکومت ہند کی یہ خواہش ہے کہ والیان ریاست اپنے وسیلوں کی تنظیم کریں اور باقاعدہ شکل

میں حکومت ہند کے معاون اور شریک کار بنیں چنانچہ سب سے پہلے لارڈ لٹن نے ہندوستانی پریوی کونسل قایم کرنے کی تجویز پیش کی جس میں والیان ریاست کو شریک کرنے کا خیال تھا۔ اس ضمن میں بعض والیان ریاست کو "مشیر ملکہ معظمہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس کے بعد لارڈ کرزن نے "مجلس والیان ریاست" کے قایم کرنے کی تجویز کی لیکن چونکہ والیان ریاست اس کی عام حکومت عملی کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے اس لئے یہ تجویز بھی یونہی رہی۔ لارڈ منٹو کی حکومت نے سیاسی اصلاحوں کے متعلق وزیر ہند کو جو سفارشیں بھیجی تھیں ان میں بھی والیان ریاست کی یک "شہنشاہی مشورتی مجلس" کے قیام کی تحریک کی تھی اور یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس تجویز کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ حکومت ہند والیان ریاست کے اندرونی معاملوں میں دخل دینا چاہتی ہے بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت قایم کی جائے جو ان مشترک مسائل پر غور کر سکے جن کا تعلق برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں سے ہے۔ لارڈ منٹو نے سب سے پہلے والیان ریاست سے باقاعدہ مشورہ کرنے کے طریقے کو رائج کیا جس کو اس کے جانشین لارڈ ہارڈنگ کے عہد حکومت میں اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے لارڈ ہارڈنگ کو والیان ریاست سے مشورے کرنے کا موقع ملا اس واسطے کہ اس وقت پورے ہندوستان کے وسیلوں کو دشمن کے خلاف بروئے کار لانے کی ضرورت تھی۔ لارڈ ہارڈنگ نے والیان ریاست کو اس کا بھی موقع دیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے اپنے مشترک مفاد کی حفاظت کے لئے مشورہ کریں لارڈ چیمسفورڈ کے عہد میں یہ قاعدہ بن گیا کہ والیان ریاست یا ان کے نمایندے ہر سال ایک کانفرنس کریں اور ان مسائل پر غور کیا جائے جن کا تعلق والیانِ ریاست سے مجموعی حیثیت سے ہو۔ ان کانفرنسوں میں وہ مسائل بھی بحث میں آئے جن کا تعلق برطانوی ہند اور ریاستوں سے تھا۔ مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے نئی سیاسی اصلاحوں کے سلسلے میں تمام ہندوستان کا دورہ کیا تو اس موقع پر والیان ریاست نے بھی ایک وفد کے ذریعہ اپنے مطالبے پیش کئے۔ اس وفد نے خاص طور سے چار باتوں پر زور دیا (۱) کل

ہندی حکمت عملی کی تشکیل میں والیان ریاست کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی آواز موثر بنا سکیں۔ (۲) ایک ایسی غیر جانبدار عدالت قایم ہونی چاہیئے جہاں اختلافی مسائل پیش کئے جا سکیں جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے درمیان پیدا ہوں کیونکہ ایسے معاملوں میں حکومت ہند فریق بھی ہوتی ہے اور جج بھی۔ (۳) حکومت ہند کا محکمہ سیاسیات بعض اوقات معاہدوں کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کا والیان ریاست کے پاس کوئی علاج نہیں ہے (۱) ایک ایسی مشورتی جماعت قایم ہونی چاہیئے جہاں والیان ریاست اپنے مشترک مفاد کے متعلق آپس میں مشورہ کر سکیں اور جس کے ذریعہ سے کل ہندی امور کے متعلق وہ اپنی رائے حکومت ہند تک پہنچا سکیں۔

مانٹگو چمسفورڈ رپورٹ میں اس امر کی سفارش کی گئی تھی کہ والیان ریاست کو ایک ایسی مشورتی جماعت قایم کرنے کا موقع دینا چاہیئے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مشترک مفاد کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ اس سفارش کے بموجب شاہی اعلان کے ذریعہ ایوان والیان ریاست (چیمبر آف پرنسس) قایم کیا گیا۔ اس کے ارکان کی تعداد ۱۲۰ مقرر کی گئی جن میں سے ۱۰۸ والیان ریاست خود ہونگے اور ۱۲ والیان ریاست کے نمایندے۔ شاہی اعلان میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس ایوان کے قیام سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو والیان ریاست براہ راست حکومت ہند کے ساتھ اپنے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں وہ آیندہ ایسا نہ کر سکیں گے بلکہ معمول کے موافق اس پرانے طریق عمل میں کوئی فرق نہ پیدا ہونا چاہئیے جو اب تک جاری ہے۔ ایوان والیان ریاست کی حیثیت محض مشورتی ہوگی نہ کہ عاملانہ۔ ایوان اس کا مجاز نہ ہوگا کہ وہ کسی ریاست کے اندرونی انتظامی معاملوں یا والئی ریاست کی شخصیت پر بحث کر سکے۔ ایوان کا اجلاس سال میں ایک دفعہ حکومت ہند کے صدر مقام میں ہوا کرے گا جس کی صدارت وائسرائے ہند کرے گا۔ اجلاس ہونے سے پہلے ایجنڈا وائسرائے کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔ ایوان اپنا ایک چانسلر منتخب کرے گا جو وائسرے کی غیر موجودگی میں صدارت کے فرائض ادا کرے گا۔ ایوان

کی ایک مجلس قائمہ ہوگی جو چانسلر کے علاوہ پانچ ارکان پر مشتمل ہوگی اس مجلس کی صدارت بھی چانسلر کے ذمہ ہوگی۔ مجلس قائمہ کے رکنوں کا انتخاب ایوان والیان ریاست کے ارکان میں سے سالانہ ہوا کریگا۔

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے باہمی اتحاد و عمل کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے رپورٹ کے مرتب کرنے والوں کی پیش بینی اور تدبر [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق انکے سامنے کس قدر واضح اور مکمل تصویر تھی جسکے خد و خال اسوقت کچھ دھندلے سے تھے لیکن تھوڑے دنوں میں وہ پوری طرح اجاگر ہونیوالے تھے۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں

"ہندوستان کے مستقبل کا خیال کرتے وقت ہماری نظروں کے سامنے ایک ایسی سیاسی تشکیل آجاتی ہے جس کے خارجی خد و خال "وفاق" سے ملتے جلتے ہیں۔ صوبے آخر خود مختار اکائیاں بن جائیں گے جنھیں مرکزی حکومت اکٹھا رکھے گی اور ان امور کا انتظام کرے گی جو ان سب صوبوں کے لئے مشترک ہوں گے۔ لیکن جو امور برطانوی صوبوں میں مشترک ہیں ان کا بڑی حد تک ریاستوں کے ساتھ بھی تعلق ہوگا۔ مثلاً دفاع، چنگی، مروجہ زر کا مبادلہ، نمک، ریلوے، ٹپہ اور تار۔ حکومت ہند ان امور کی طرف توجہ کرے گی اور ریاستیں اپنی اندرونی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے جو انھیں عزیز ہے مرکزی حکومت کے ساتھ گہرے رابطے پیدا کریں گی اگر وہ ایسا کرنا پسند کریں۔ اگرچہ ہمیں اس میں پس و پیش نہیں کہ اس قسم کے مستقبل کی اس وقت پیشین گوئی کریں لیکن ہماری یہ خواہش ہرگز نہ سمجھی جائے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں خواہ مخواہ جلد بازی سے کام لیا جائے۔ دراصل ہندوستان میں ایسی قوتیں اور موثرات اپنا کام کر رہے ہیں جنھیں مصنوعی محرکات کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے اور ہم اس وقت صرف یہی کر بھی سکتے ہیں کہ مستقبل کی ترقی کی راہ کو صاف کر دیں۔

تیئیسواں باب

سنہ ۱۹۱۹ء کا قانون اصلاحات اور ملک میں عام سیاسی بے چینی

سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون اصلاحات کے نافذ ہونے سے پہلے ہندوستانی مدبر دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک انڈین نیشنل کانگریس کی جماعت تھی جو ان اصلاحوں کو ناکافی اور غیر اطمینان بخش کہتی تھی اور دوسری جماعت اعتدال پسند مدبروں کی تھی جنہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے نیشنل لبرل فیڈریشن کے نام سے اپنی جداگانہ تنظیم کر لی تھی۔ موخر الذکر جماعت اصلاحوں کو قبول کرنے اور ان کے ذریعہ سے اپنے وطن والوں کو فائدہ پہنچانے کے اصول کی قائل تھی اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار تھی۔ اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ جدید دستور کے ذریعہ وہ وزیر ہند اور پارلیمنٹ کے سامنے بہتر طریقے سے اپنے مطالبے پیش کر سکیں گے۔ چنانچہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں میں اس جماعت کے افراد کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا اس واسطے کہ کانگریس نے جدید دستور کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کر لی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں بھی دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح عام انتشار کی کیفیت رونما تھی۔ ایک کروڑ نفوس کے لگ بھگ انفلوئنزا کی نذر ہو گئے۔ سیاسی بے چینی انقلابی رنگ اختیار کرنے لگی اور ۱۹۱۹ء کے آخری زمانے میں پنجاب اور مغربی ہندوستان میں شورش کے آثار پیدا ہونے لگے۔ حکومت ہند نے مسٹر رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے مطبع (پریس) اور تقریر کرنے اور جلسے کرنے کی آزادی پر قیدیں لگائیں اور سیاسی مجرموں کے فیصلے بغیر جیوری کے ججوں کو کرنے کا اختیار دے دیا۔ حکومت ہند نے ان سفارشوں پر عمل کرنے کے لئے قانون کے کئی مسودے منظور کئے جنھیں رولٹ ایکٹس کہتے ہیں۔ ان کے خلاف ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک احتجاج کی صدا بلند کی گئی اور ان قوانین کو منسوخ کرنے پر زور دیا گیا۔ پنجاب میں اضطراب انگیز عنصر کا اثر بڑھنے لگا۔ حکومت نے مارشل لا کا نفاذ کر دیا، اور سیاسی جلسوں اور جلوسوں کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ ان احکام کی خلاف ورزی میں امرتسر کے جلیان والا باغ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا گیا جس کو منتشر کرنے کے لئے جنرل ڈائر نے اپنی فوج کو گولیاں چلانے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر ۳۷۹ آدمیوں کی جانیں ضائع گئیں اور ۱۲۰۸ سخت زخمی ہوئے۔ اس واقعہ سے سارے ہندوستان میں انگریزی عملداری کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ اس واقعہ کو پنجاب کی حکومت نے پسندیدہ نظر سے دیکھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں بعض سرکاری عہدہ داروں نے وہاں کے باشندوں کو ذلیل کرنے کے لئے احکام نافذ کئے جتلایا کہ ہر انگریز کو سلام کرنا ضروری ہے۔ کسی معمولی سی قاعدے کی خلاف ورزی پر کوڑے مارنے کی سزا دی جانے لگی۔[۱]

---

۱ Report of the Hunter Committee, 1920

ان معاملوں کے متعلق پارلیمنٹ میں ہندوستان کے بعض ہمدرد انگریزوں کے توجہ دلانے پر پارلیمنٹ کی طرف سے ہنٹر کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں جنرل ڈائیر کی غلطی کو تسلیم کیا۔ وزیر ہند اور آرمی کونسل نے بھی جنرل ڈائر کی اس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ ہنٹر کمیٹی نے تسلیم کیا کہ پنجاب میں پہلے سے کوئی ایسی باقاعدہ سازش نہ تھی جس کا مقصد انگریزی راج کو قوت سے ختم کر دینا ہو۔[1]

تیسری جنگ افغانستان

ہندوستان کی سیاسی حالت کو پیچیدہ کرنے میں ۱۹۱۹ء کی افغانستان کی تیسری جنگ کا بھی اثر پڑا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد ان کے لڑکوں میں تخت و تاج کے لئے کچھ کشمکش رہی جس میں سب سے چھوٹا لڑکا امیر امان اللہ خاں کامیاب ہوا۔ جنگ عظیم کے دوران میں افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ اپنی دوستی کو برقرار رکھا۔ اب جب کہ ہندوستان میں سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی تو افغانستانی حکومت نے خیال کیا کہ برطانوی حلقۂ اثر سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہونے کا یہ بہترین موقع ہے۔ چنانچہ افغانی فوجوں نے ہندوستان کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ امیر حبیب اللہ خاں کی انگریزوں سے دوستی کو افغانستان کا انتہا پسند طبقہ کمزوری سمجھتا تھا۔ امیر امان اللہ خاں اسی طبقہ کی مدد سے حکمران بنا تھا اور اس کو ہندوستان کی بے چینی کے متعلق جو مبالغہ آمیز خبریں مل رہی تھیں ان کے اثر میں آکر اس جنگ کا آغاز کیا گیا۔ وادیٔ ٹوچی میں انگریزوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اور افغانی فوجوں کی مدد کے لئے محسودی اور وزیری قبائل بھی آمادہ ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کے ہوائی جہازوں سے

---

[1] Report of the Hunter Committee, 1920

سرحدی مقاموں اور جلال آباد اور کابل میں بڑی تباہی پھیلی۔ انگریزی فوجوں نے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ افغانوں نے صلح کی درخواست کی۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں صلح نامہ ہو گیا۔ حکومت ہند اندرونی خلفشار میں ایسی مبتلا تھی کہ وہ بھی حالتوں کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ صلح نامہ کے بموجب افغانستان کو انگریزی حلقہ اثر سے آزاد کر دیا گیا اور حکومت افغانستان کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ خارجی دونوں سے براہ راست اپنے سیاسی تعلقات قایم کرے اور دوسرے ملکوں میں قنصل خانے قایم کرے۔ افغانی حکومت کے پیش نظر اس جنگ سے یہی مقصد تھا جو اس نے حاصل کر لیا۔ حکومت ہند جو امدادی زر دیا کرتی تھی وہ بند کر دیا گیا۔ لیکن افغانستان سے صلح ہو جانے کے بعد بھی قبائلی علاقے میں برابر بے چینی بڑھتی گئی اور انگریزوں کے خلاف مذہبی جوش میں کئی سال تک کمی نہیں آئی۔

خلافت اور ترک موالات اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں خلافت کے مسئلہ کی وجہ سے انگریزی حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ خلافت کی تحریک مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی رہبری میں شروع ہوئی تاکہ حکومت برطانیہ پر زور ڈالا جائے کہ وہ مقامات مقدسہ پر یورپی قوموں کا قبضہ نہ ہونے دے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد سخت انتشار کی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مسٹر ہانٹیگو اور لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے لڑائی کے زمانے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا پورا احترام کریں گے اور ان کے مطالبوں کو تا امکان پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن صلح نامہ سیورے کی رو سے جو ترکوں اور اتحادیوں میں ہوا ترکی کے حصے بخرے کر دئے گئے اور خلیفتہ المسلمین کی حیثیت قسطنطنیہ میں ایک قیدی کی سی رہ گئی۔ اس صلح نامہ کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کی صدا بلند کی اور انھوں نے اپنے مقصدوں کو حاصل کرنے کے لئے گاندھی جی کی ترک موالات (نان کوآپریشن) کی تحریک میں شرکت کی جو انگریزی حکومت

کے خلاف شروع ہو چکی تھی۔ گاندھی جی نے مسلمان قائدوں کے ساتھ مل کر ترک موالات کی تحریک کے اصول مرتب کئے اور کلکتہ کانگریس (سنہ ۱۹۲۰ء) میں حکومت سے عملی تعاون ترک کرنے کا قطعی فیصلہ کیا گیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت کی ملازمت ترک کر دیں۔ طلبہ اسکولوں کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ عدالتوں کا مقاطعہ کیا جائے آخر سیول نافرمانی کے ذریعہ حکومت کو ٹیکس دینے بند کر دئے جائیں اور اس طرح نظم و نسق کو مفلوج کر دیا جائے۔ ان اصول پر عمل کرنے سے ملک کو سوراج حاصل ہو جائے گا جو تحریک کا اصلی مقصد ہے۔ اس تحریک سے ملک کے طول و عرض میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ شروع میں حکومت ہند نے اس تحریک کو روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن جب اس کی زد برطانوی شہنشاہی مفاد پر براہ راست پڑنے لگی تو اس میں حصہ لینے والوں کے خلاف کارروائی شروع کی گئی۔ لارڈ ریڈنگ نے جو سنہ ۱۹۲۱ء میں لارڈ چیمسفورڈ کے جانے کے بعد گورنر جنرل ہو کر آیا تھا ترک موالات کی تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور حالات پر قابو پا لیا۔

یہ تھے سیاسی حالات جب کہ قانون دستور کو نافذ کیا گیا۔ نومبر سنہ ۱۹۲۰ء میں اس قانون کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے انتخابوں میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے اعتدال پسند جماعت کے افراد کو جدید اصلاحوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ صوبوں میں وزیروں کے انتخاب میں گورنروں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اعلیٰ عہدوں کے لئے قابل لوگوں کی کمی نہ تھی لیکن اعتدال پسند جماعت کے وزیروں نے بھی بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ اپنے اختیارات کو اس وقت تک نہیں استعمال کر سکتے جب تک کہ صوبجاتی مالیات کے انتظام میں انھیں عمل دخل حاصل نہ ہو۔ بدقسمتی سے جنگ کے بعد کی کساد بازاری کی وجہ سے مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کی مالی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ لارڈ مسٹن کی صدارت میں مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کے مالی تعلقات کو متعین کرنے کی غرض

سے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی سفارشوں کے مطابق جو تصفیہ ہوا وہ اکثر صوبوں کو ناپسند تھا۔ فصلوں کی خرابی، تجارتی کساد بازاری اور سیاسی تحریک کی روک تھام کے لئے مزید اخراجات کے سبب سے صوبوں کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ ایک طرف تو وزیر اپنے قومی تعمیر کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے دوسرے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے تحت جو سِوِل سروس کے اعلیٰ حکام ہیں ان پر ان کا اثر محدود ہے۔ اس لئے کہ ان حکام کی براہ راست گورنر تک رسائی تھی۔ اس سے اعتدال پسند طبقے میں بھی جو اب تک حکومت کے ساتھ عملی تعاون کر رہا تھا ایک طرح کی بددلی پھیل گئی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی اور صوبوں کی مقننہ کے آئندہ انتخابوں میں کانگریس کے نمایندے شرکت کریں اور مجالس مقننہ میں شریک ہو کر حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈالیں تاکہ دستوری حکومت کا چلنا ناممکن ہو جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی نے حصہ لیا۔ اس زمانے میں برطانوی سیاست میں لیبر پارٹی کو اقتدار نصیب ہو گیا تھا جس سے ہندوستانی وطن پرستوں کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن اپنی پارٹی کی اندرونی حالت اور عملی دشواریوں کے باعث لیبر وزارت ہندوستان کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ سوراج پارٹی نے بنگال اور صوبہ متوسط میں دو عملی کے نظام حکومت کو ناممکن بنا دیا اور گورنروں کو مجبور کیا کہ وہ صوبے کی حکومت کی ذمہ داری کو خود انجام دیں۔

سوراج پارٹی نے فروری سنہ ۱۹۲۴ء میں مرکزی مقننہ میں یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کرائی:۔

"لیجسلیٹو اسمبلی گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ وہ موجودہ قانون حکومت ہند پر پارلیمنٹ سے نظر ثانی کرنے کی درخواست کرے تاکہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم ہو اور جلد سے جلد ایک نمایندہ گول میز کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ اقلیتوں کے مفاد اور حقوق کا پورا

لحاظ اور حفاظت کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے اساسی دستور بنایا جائے اور موجودہ مرکزی مقننہ کو برخاست کرکے یہ دستور اساسی نئی منتخب شدہ مقننہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔ اس کے بعد برطانوی پارلیمنٹ اس اسکیم کو قانونی شکل دے۔"

لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے ۱۹۲۳ء میں سرالیگزنڈر مڈی مین کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ نافذہ اصلاحوں کے متعلق تحقیق کرکے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کے چھ ارکان میں دو ہندوستانی شریک کئے گئے تھے اور صرف اس امر کی تحقیق اس کے ذمہ تھی کہ دوعملی کے نافذ کرنے سے جو دشواریاں پیدا ہوئی ہیں انھیں کس طرح سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کمیٹی نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ دوعملی کے طرز حکومت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ مڈی مین کمیٹی نے کثرت رائے سے سفارش کی کہ گورنر کی عاملہ اور وزیروں میں تمام اہم امور کے متعلق باہمی مشورہ ہونا چاہئے اور گورنر کو چاہئے کہ مفوضہ امور کے متعلق وہ اپنے وزیروں کی رائے سے اختلاف نہ کرے سوائے ایسی حالت کے کہ اقلیت یا خاص طبقوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ اگر کوئی وزیر کسی وجہ سے مستعفی ہونا چاہتا ہے تو جس طرح انگلستان میں ہوتا ہے یہاں بھی وہ مقننہ کے سامنے اپنے مستعفی ہونے کے وجوہ پیش کرے گا۔ ارکان عاملہ اور وزیروں کی مشترک حیثیت کابینہ کی طرح ہونی چاہئے جہاں وہ اپنے محکموں کے اہم معاملے تصفیہ کے لئے پیش کیا کریں۔ چونکہ معتمدوں کی براہ راست گورنر تک رسائی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ گورنر کے سامنے اپنے محکمے کا کوئی معاملہ پیش کریں وزیر متعلقہ کو اس کی نسبت مطلع کردیں اور خاص کر ایسے امور کی وزیر کو ضرور اطلاع دی جائے جن کے متعلق معتمد اور وزیر کی رائے میں اختلاف ہو۔

لارڈ ریڈنگ نے جب ۱۹۲۶ء میں اپنے عہدہ کا جائزہ لارڈ ارون کو دیا تو ملک میں پھر بے چینی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء میں مذکور تھا کہ اس قانون کے نافذ ہونے کے دس سال بعد تحقیقات

کی جائے گی کہ موجودہ قانون میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ کہ ذمہ دار حکومت کے اصول کی کس حد تک توسیع عمل میں آنی چاہئے یا جو اختیارات دئے گئے ہیں انھیں اور محدود کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے ۱۹۲۷ء میں لارڈ اروِن کی حکومت کی سفارش پر ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کی تحقیقات کے لئے سرجان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ یہ کمیشن سات انگریز ارکان پر مشتمل تھا۔ چونکہ کسی ہندوستانی کو اس میں شریک نہیں کیا گیا تھا اس لئے اعتدال پسند طبقے نے بھی کانگریس کے ساتھ ہوکر اس کی مخالفت کا اعلان کر دیا جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو اس کا بائیکاٹ کیا گیا اور ہر جگہ اس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ ہندوستانی رائے عامہ کو موافق کرنے کے لئے صدر کمیشن کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مرکزی مقننہ کے منتخب شدہ ارکان میں سے چار ارکان کو اپنے ساتھ شریک کرے جو برطانوی کمیشن کے ساتھ شہادتیں قلمبند کرکے اپنی رپورٹ الگ پیش کریں۔

اس دوران میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی ایک تقریر میں اس دعوے کا کہ پارلیمنٹ کو ہندوستان کے متعلق دستور بنانے کا اختیار نہیں ہے یہ جواب طنزاً دیا کہ ہندوستانی خود کوئی ایسا دستور کیوں نہیں تیار کرتے جسے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس پر کانگریس نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کو دعوت دی اور پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی اساسی دستور بنانے کیلئے مقرر کی گئی جس میں مختلف سیاسی جماعتوں کے ممتاز ارکان شریک تھے۔ اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی جو نہرو رپورٹ کہلاتی ہے۔ اس رپورٹ میں ہندوستان میں قلمروی طرز کی ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی پرزور سفارش کی گئی۔ ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ مشترک انتخاب کے اصول کو تسلیم کرلینا چاہئے اور مسلمانوں کیلئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں نشستوں کا تعین کر دیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے عام طور پر ان سفارشوں کی مخالفت کی۔ ریاستوں کے متعلق نہرو رپورٹ میں سرولزی اسکاٹ کے خیالات

سے اختلاف کیا گیا جو موصوف نے والیان ریاست کے وکیل کی حیثیت سے پیش کئے تھے۔ وہ خیالات یہ ہیں:-

(۱) تاج اور دیسی ریاستوں کے درمیان بنیادی رشتہ باہمی رضامندی پر مبنی ہے اور برطانیہ نے اسے صاف طور پر تسلیم کیا ہے۔

(۲) تاج اور دیسی ریاستوں کے معاہدے تاج اور والیان ریاست کے درمیان ہوئے ہیں نہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ساتھ۔

(۳) والیان ریاست نے معاہدہ کرتے وقت برطانوی تاج اور پارلیمنٹ پر بھروسا کیا تھا اس لئے تاج ان معاہدوں کی ذمہ داری کو کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ تاج نے بالادست قوت کی حیثیت سے تمام ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔

نہرو کمیٹی نے اس اصول پر اعتراض کیا کہ دیسی ریاستوں کا تعلق براہ راست تاج سے ہے۔ اس کے نزدیک اب تک دیسی ریاستوں کے متعلق تمام معاہدوں کا نفاذ اوران فرائض کی ادائی جو ان معاہدوں کی رو سے عاید ہوتی ہے وزیر ہند کی نام نہاد نگرانی میں حکومت ہند کرتی رہی ہے۔ بعض اختیارات اس ضمن میں کثرت استعمال اور رسم ورواج کی بنا پر حکومت ہند کو حاصل ہو گئے ہیں جو تحریری معاہدوں کی حدوں سے باہر ہیں۔ کوئی والی ریاست حکومت ہند کو نظر انداز کر کے کسی معاملہ کو تاج یا ملک معظمہ کی حکومت کے پاس براہ راست نہیں پیش کر سکتا۔ اب تک والیان ریاست کا تعلق حکومت ہند سے رہا ہے اور انھوں نے اس کے احکام، فیصلوں اور دخل دہی کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور کبھی تاج کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں قایم رکھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے والیان ریاست کے ساتھ ہمیشہ حکومت ہند نے معاملے طے کئے ہیں۔ پھر کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے کہ آئندہ بھی حکومت ہند ہی اگر اسے قلمروی مرتبہ حاصل ہو جائے، ان کے ساتھ معاملہ نہ کر سکے۔ نہرو رپورٹ میں والیان ریاست کو یقین دلایا گیا کہ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ مئی ۱۹۳۰ء میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی۔ رپورٹ کی پہلی جلد میں ہندوستان کے نسلی، معاشری اور سیاسی حالات پر عام تبصرہ ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے حالات انگلستان سے بالکل جداگانہ ہیں اس لئے یہاں برطانوی داروں کی پوری نقل نہیں ہو سکتی۔ رپورٹ کی دوسری جلد میں کمیشن کی سفارشیں درج ہیں۔ ریاستوں کا مسئلہ کمیشن کی حد بندی سے باہر تھا اس لئے اس کی تحقیقات ایک علیحدہ کمیٹی کے لئے چھوڑ دی گئی اور سائمن کمیشن نے صرف برطانوی ہند کے متعلق اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیں۔ مرکزی حکومت کے متعلق کمیشن کی رائے تھی کہ یہاں دوعملی قائم کرنا مفید نہیں بلکہ خطرناک ہوگا۔ جن امور کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے وہ زیادہ تر شہنشاہی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے مرکزی نظم ونسق میں وحدت اور مرکزی عاملہ کا مقننہ سے آزاد رہنا نہایت ضروری ہے۔ دوعملی سے اختیارات تقسیم ہو جائیں گے اور حکمت عملی کی یکسانی نہیں قائم رہ سکتی جیسا کہ صوبجاتی حکومتوں کے گزشتہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے خاص کر گورنر جنرل کو اس انتظام کی بدولت بڑی دشواری پیش آئے گی۔ اگر اس میں اور اس کے شرکائے کار میں اختلافات پیدا ہوں تو مشترکہ ذمہ داری کو ضرر پہنچے گا۔ دوعملی کے طرز حکومت میں اس کا قوی امکان رہے گا کہ وزیر عاملہ کے دوسرے ارکان کی حکمت عملی کو ناپسند کریں لیکن اس کی اندرونی وحدت میں کوئی خلل نہیں پڑنا چاہیے۔ ہندوستان کے سیاسی ارتقا کا بظاہر یہ اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل کے اختیارات بجائے کم ہونے کے زیادہ کرنے ہوں گے۔ خاصکر ہز مجسٹی ملک معظم کے نمایندے کی حیثیت سے اس کو آئندہ بہت سے ایسے فرائض ادا کرنے ہوں گے جو آج کل بہ حیثیت گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل انجام دئے جاتے ہیں مثلاً ریاستوں کے ساتھ آئندہ جو حکومت ہند کے تعلقات کی نوعیت پیدا ہونے والی ہے وہ یقیناً اس کی مقتضی ہوگی کہ گورنر جنرل بہ حیثیت وائسرائے محض رسمی طور پر نہیں بلکہ واقعی اور عملی طور پر حکومت کے اعلیٰ حاکم کی حیثیت سے حصہ لے۔

آئندہ دستوری تشکیل میں گورنر جنرل کی مجلس عاملہ مقننہ کے سامنے اسطرح سے ذمہ دار نہیں ہو سکتی جیسے برطانوی کابینہ دارالعوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ مقننکانہ گورنر جنرل کی عاملہ پر برابر بڑھتا جائے گا دراصل انگلستان اور ہندوستان کے حالات اس قدر مختلف ہیں کہ برطانوی سیاسی روایات کو جوں کا توں ہندوستان میں رائج نہیں کیا جا سکتا جبتک کہ صوبوں میں خود اختیاری کے اصول کا تجربہ نہ ہو جائے۔ ان میں وحدانی (یونی ٹری) طرز کی حکومتیں نہ قایم ہو جائیں اور نظم ونسق کی ایک خاص شکل نہ نکل آئے اس وقت تک مرکزی حکومت میں کسی بنیادی تبدیلی پر بحث نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں کہ مقننہ کی اکثریت کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ عاملہ کو ہر معاملے میں اپنے فیصلے کا پابند بنا لے۔ سائمن رپورٹ میں اس کی سفارش کی گئی ہے کہ مرکزی مقننہ میں منتخب شدہ عنصر کی اکثریت اور اس کے موجودہ اختیارات برقرار رکھے جائیں لیکن بجائے بلا واسطہ انتخاب کے بالواسطہ طریق انتخاب رائج کیا جائے تاکہ مرکزی مقننہ صوبوں کی صحیح نمایندگی کر سکے۔

مرکزی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری دفاع کی ہے۔ برطانوی فوجوں کی مدد کے بغیر حکومت ہند ہندوستان کی بیرونی حملہ آوروں سے مدافعت نہیں کر سکے گی۔ برطانوی فوجوں کو امپیریل گورنمنٹ اپنی ذمہ داری پر ہندوستان بھیجتی ہے اس لئے انھیں ہندوستانی مقننہ کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ان فوجوں کو فوراً ہندوستانی افسروں کے تحت بھی نہیں کیا جا سکتا اس واسطے کہ ابھی ان میں مہارت کی کمی ہے۔ فوج کی افسری کے لئے تجربہ اور خاص روایات درکار ہیں جو رفتہ رفتہ ہی پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان کی افواج کا مقصد ہندوستان کی مدافعت ہے۔ لیکن ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ برطانوی شہنشاہی کے دوسرے حصوں کو ہندوستان کی مدد کرنا پڑے یا ہندوستانی فوجیں برطانوی شہنشاہی کے دوسرے حصے میں جغرافی قربت کے باعث بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان وجود کی بنا پر ہندوستان کی فوجوں کو تاج کے نمایندے (وائسرائے) کے براہ راست

تحت ہونا چاہیئے۔

صوبوں کی حکومت کے متعلق سائمن کمیشن کی سفارش یہ تھی کہ دو عملی کی وجہ سے نظم ونسق میں جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان کے تجربہ کی بناء پر ان کا خاتمہ کرنا بہتر ہوگا۔ صوبوں کے نظم ونسق میں محفوظ امور اور مفوضہ امور کا کوئی فرق باقی نہیں رکھنا چاہیئے۔ اور وحدانی طرز کی حکومت قایم کی جائے۔ وزیروں اور عاملہ کی مشترکہ ذمہ داری کے اصول کو رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تمام محکمے منتخب شدہ وزیروں کے تحت ہوں گے۔ اس ضمن میں اس مسئلہ پر تفصیل بحث کی گئی ہے کہ پولیس اور مالگزاری کے محکمے بھی منتخب شدہ وزیروں کے سپرد کرنا مناسب ہوگا کہ بے اس کے وزیروں کی ذمہ داری برائے نام ہوگی نظم ونسق میں اگر سخت خرابی پیدا ہورہی ہو تو گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرسکے گا۔ یہ اختیارات گورنر کو حاصل ہونے چاہئیں نہ گورنر بہ اجلاس کونسل کو۔ گورنر کو وضع قوانین اور مالیاتی اختیارات حاصل ہونا ضروری ہے جو خاص حالات کے تحت بذریعہ تصدیق (سرٹی فیکیشن) استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

سائمن کمیشن نے حق رائے دہی کی توسیع اور جداگانہ نیابت کے اصول کو تسلیم کیا ہے اس واسطے کہ اقلیتیں اس پر مصر ہیں۔ جب تک اقلیتوں کو اطمینان نہ ہوجائے اس وقت تک اس اصول کو یونہی رہنے دینا چاہیئے۔ اس کے سوا رپورٹ میں صوبوں اور مرکز کے تعلقات، حکومت ہند اور ہوم گورنمنٹ کے تعلقات سول سروس، مالیات ہند اور برما کی علحدگی کے متعلق سفارشیں پیش کی گئی ہیں۔

وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مرکزی مقننہ میں اس کا اعلان کیا کہ ہندوستانی اور برطانوی نمایندوں کی جلد ایک گول میز کانفرنس کی جائے گی جس میں باہمی مشورے سے ہندوستان کے لئے دستور تجویز کیا جائے گا۔ لارڈ اروِن نے اس موقع پر کہا کہ ملک معظم کی حکومت کی جانب سے مجھے اس کی اجازت دی گئی ہے کہ صاف طور سے واضح کردوں کہ ۱۹۱۷ء والے اعلان میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کی فطری انتہا قلمروی مرتبہ کی حکومت ہے۔ اس زمانے میں وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے برطانوی

دولت مشترکہ کے مزدوروں کی کانفرنس میں کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ چند مہینوں کے اندر نہ کہ چند سال ... کے اندر ہماری دولت مشترکہ میں ایک نئی قلمرو کا اضافہ ہونے والا ہے۔ یہ قلمرو ان لوگوں کی ہے جو نسلی اعتبار سے ہم سے جدا ہیں۔ یہ نئی قلمرو ہماری دولت مشترکہ میں مساویانہ حیثیت سے اپنی خودداری کو قایم رکھ سکے گی۔ میری مراد اس نئی قلمرو سے ہندوستان ہے۔"

ان بیانوں سے ہندوستان کے اعتدال پسند مدبروں کو یقین ہو گیا کہ گول میز کانفرنس میں اس پر بحث کی جائے گی کہ ہندوستان کو قلمروی مرتبہ کی حکومت دینی چاہیے۔ لارڈ ارون نے گاندھی جی سے بھی ملاقات کی اور انھیں بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ کانگریس اس صورت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی جب کہ پکا وعدہ کیا جائے کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کو قلمروی مرتبہ کی حکومت دینے کے متعلق دستور تجویز کیا جائے گا۔ لیکن وائسرائے نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کے جواب میں لاہور کانگریس (۱۹۲۹ء) میں ہندوستان کا سیاسی مقصد مکمل آزادی قرار دیا گیا اور سوراج پارٹی کے ارکان مرکزی اور صوبجاتی مقننہ کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے ملک میں سیول نافرمانی کی ابتدا کرنے کی تجویز منظور کی تاکہ حکومت سے اپنے مطالبے منوائے جائیں۔ ملک میں سول نافرمانی کی وجہ سے بدامنی پیدا ہو گئی اور دہشت انگیزی کے بھی مظاہرے ہونے لگے۔ گاندھی جی اور دوسرے سربرآوردہ کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعض مقاموں پر مارشل لا نافذ کیا گیا اور حکومت نے حالات پر پوری طرح قابو پا لیا۔

گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی۔ اس وقت انگلستان میں لیبر پارٹی اقتدار پر تھی جس سے ہندوستانیوں کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے اعتدال پسند

لیڈر، مسلمانوں کے نمایندے اور ریاستوں نے شرکت کی۔ والیان ریاست میں سے بعض نے متحدہ ہند کے نصب العین کو قبول کر لیا اس شرط سے کہ ان کے اختیارات کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت قایم کرنے کی عام طور پر تائید کی گئی جس میں برطانوی صوبے اور ریاستیں شریک ہوں گی یہ بھی بہ اتفاق تسلیم کیا گیا کہ دفاع اور امور خارجہ کا تعلق گورنر جنرل سے رہے گا۔ تحفظات کے متعلق بہت بحث رہی۔ یہ تحفظات تین قسم کے تھے۔

(۱) وہ جو وفاقی حکومت کے اندرونی استحکام اور بیرونی حفاظت کے لئے ضروری ہوں گے

(۲) مالیاتی تحفظات کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ حکومت ہند کے فوجی اخراجات کا اس وقت تک تیقن نہیں ہو سکتا جب تک کہ محصولات لگانے اور مروجہ زر کے متعلق حکومت ہند کو پورے اختیارات حاصل نہ ہوں اور قرضہ لینے کی سہولتیں بہ دست نہ ہوں جن کے لئے وزیر ہند حکومت ہند کی آمدنی کو ضمانت کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔ وہ رقمیں جو برطانوی تعلق کی وجہ سے حکومت ہند کے مالیہ پر گزشتہ زمانے سے واجب الادا ہیں ان کی ادائی کے متعلق کوئی شبہہ نہیں ہونا چاہئے ورنہ ہندوستان کی ساکھ کو بڑا بھاری نقصان ہوگا۔ اس کے علاوہ برطانوی صنعت انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس کے حقوق کی پوری طرح سے حفاظت ضروری ہے۔

(۳) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ گورنر جنرل اور گورنروں کے ذمہ ہوگا۔ اس ضمن میں گورنر جنرل اور گورنروں کو خاص اختیارات ملنے چاہئیں تاکہ حکومت کی مشین میں کہیں رخنہ نہ پڑے اور ملک میں امن و امان رہے۔

پہلی گول میز کانفرنس میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان سے بعض عام اصول طے ہوئے لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک ہندوستان کی سب سے اہم سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس ان عام اصول کو تسلیم نہ کرے اس وقت تک انھیں عملی جامہ پہنانے میں حکومت ہند کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چنانچہ جب پہلی گول میز کانفرنس سے ہندوستانی نمایندے واپس ہوئے تو وائسرائے نے گاندھی جی سے جو جیل میں تھے اس سلسلے میں بات چیت کا خیال ظاہر کیا۔ گاندھی جی کو رہا کردیا گیا اور تقریباً دو ہفتے کی بات چیت کے بعد اروِن گاندھی سمجھوتہ ہوا جس کا متن حکومت ہند نے ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو عام اطلاع کے لئے شائع کردیا۔ اس سمجھوتہ میں طے ہوا کہ سول نافرمانی کی تحریک کو بند کردیا جائے اور تمام سیاسی قیدی چھوڑ دئے جائیں۔ پہلی گول میز کانفرنس میں جو مسائل طے ہوئے ہیں ان پر مزید غور کیا جائے گا۔ تاکہ کانگریس کے نمایندے ان کے متعلق اپنی رائے دے سکیں حکومت ان خصوصی احکام کو واپس لے گی جو سول نافرمانی کے سلسلے میں نافذ کئے گئے تھے اور سول نافرمانی کی تحریک کے تحت جو مقدمے دائر ہونگے وہ اٹھالئے جائیں گے اس شرط سے ان کا تعلق ایسے جرموں سے نہ ہو جن میں تشدد برتا گیا ہے یا تشدد کی ترغیب دی گئی ہے۔ وہ منقولہ املاک جو سول نافرمانی کے سلسلہ میں خصوصی احکام یا قانون فوجداری کے تحت ضبط کرلی گئی ہے واپس کردی جائیں گی۔

غرض کہ اس سمجھوتہ سے کانگریس کے لئے دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کا راستہ صاف ہوگیا۔ گاندھی جی نے کانفرنس میں کانگریس کے واحد نمایندے کی حیثیت سے شرکت کی اور وہاں یہ دعویٰ پیش کیا کہ کانگریس تمام ملک کی نمایندہ جماعت ہے۔ اس دعوے کو اقلیتوں کے نمایندوں نے ماننے سے انکار کیا۔ گاندھی جی نے اپنی تقریروں میں مکمل آزادی اور قلمروی مرتبہ کی حکومت کو ہم معنی الفاظ بتایا اور کہا کہ تحفظات کو کانگریس اس صورت میں قبول کے قابل سمجھے گی جب کہ وہ صراحت کے ساتھ ہندوستان کے مفاد کے لئے ہوں۔ انھوں نے مرکز اور صوبوں میں مکمل ذمہ دار حکومت کا مطالبہ پیش کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس میں انتخاب کے طریقے اور نشستوں کے تعین پر مسلمانوں اور پست اقوام کے نمایندوں نے کانگریس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ جب ہندوستانی نمایندے اس بارہ میں کوئی سمجھوتہ

نہ کر سکے تو ان میں سے بعض نے وزیر اعظم سے تحریری درخواست کی کہ وہ اس باب میں تصفیہ کرے جسے سب تسلیم کریں گے۔ اس فرقہ وارانہ تصفیہ میں جداگانہ فرقہ واری نیابت کے اصول کو تسلیم کیا گیا اور پست اقوام کے لئے خاص طور پر الگ نشستیں جداگانہ انتخاب کے اصول کے مطابق مقرر کی گئیں اس تصفیہ کے ساتھ وزیر اعظم نے اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ اگر مختلف فریق آپس میں کوئی سمجھوتہ کریں تو اس تصفیہ میں ترمیم کی جا سکے گی۔ گاندھی جی کو اس بات پر سخت اعتراض ہوا کہ پست اقوام کو جداگانہ حق انتخاب دیکر ہندو جاتی سے انھیں الگ کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہندو جاتی دو حصوں میں بٹ جائے گی جنھیں پھر آپس میں ملانا ناممکن ہو گا۔ گاندھی جی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ فاقہ کر کے اپنی جان دے دیں گے اگر پست اقوام کے متعلق وزیر اعظم کا تصفیہ نہ بدلا گیا۔ پنڈت مدن موہن مالوی، مسٹر جیکر اور سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے ہندو لیڈروں کے بیچ میں پڑنے سے پست اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر اور گاندھی جی کے درمیان ستمبر ۱۹۳۲ء ایک سمجھوتہ ہو گیا جسے میثاق پونا کہتے ہیں جس کی رو سے پست اقوام کو ہندو جاتی سے جدا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی نشستیں محفوظ کر دی گئیں۔ اس سمجھوتہ کے بموجب پست اقوام کی ہر نشست کے لئے پہلے پست اقوام والے اپنے میں سے چار اشخاص منتخب کریں گے۔ پھر ان میں سے ایک شخص ہندوؤں کے عام انتخاب کے حلقے سے منتخب ہو گا جس کو ہندو اور پست اقوام والے دونو رائے دیں گے۔ اس طرح ظاہر ہے وہی شخص منتخب ہو سکے گا۔ جو ہندوؤں میں بھی مقبول ہو گا۔ وزیر اعظم کے فرقہ واری تصفیہ میں اس سمجھوتے سے جو تبدیلی ہوئی اسے پارلیمنٹ اور حکومت ہند نے مان لیا۔ اس سمجھوتے سے یہ ہوا کہ پست اقوام کے ارکان عام انتخابی حلقہ کی ہر نشست کے لئے اپنے کو پیش کر سکتے تھے اور ان کی نشستیں بھی محفوظ ہو گئیں۔

چوبیسواں باب

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد

تیسری گول میز کانفرنس کا اجلاس دسمبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں ہوا۔ اس کانفرنس میں لیبر پارٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے ارکان شریک نہیں ہوئے۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں تینوں گول میز کانفرنسوں کے مشوروں کے مطابق سرکاری طور پر وہائٹ پیپر شائع ہوا اور پارلیمانی مجلس منتخبہ مقرر کی گئی تاکہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ کی پوری چھان بین کر کے اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے۔ پارلیمانی مجلس منتخبہ میں پارلیمنٹ کی سب پارٹیوں کے نمائندے شریک کئے گئے تھے۔ لیکن قدامت پسند عنصر کو زیادہ قوت حاصل تھی۔ اسی مجلس کی سفارشوں کے بعد مسودہ قانون ہند ۱۹۳۵ء مرتب اور پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں اس کی صراحت کر دی گئی کہ ہندوستان میں تاج اور پارلیمنٹ کا اقتدار اعلیٰ مسلم ہوگا۔ دستور جدید کی کسی دفعہ سے یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہند یا اس کے کسی حصے پر پارلیمنٹ

کے اختیار وضع قوانین کے متعلق کوئی اثر پڑے وفاقی یا صوبجاتی مقننہ کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ کوئی ایسا قانون وضع کریں جس سے تاج شاہی خاندان یا بادشاہ کی جانشینی کس طرح بھی متاثر ہوتی ہو۔ اس قانون میں کل ہندی وفاق (فیڈریشن) کی تشکیل جو پیش کی گئی ہے اس کی بدولت حکومت ہند کو نئی قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اب تک حکومت ہند ایک وحدانی ریونی بڑی حکومت تھی اور صوبجاتی حکومتوں کو جو اختیارات حاصل تھے وہ ماخوذ تھے نہ کہ اصلی۔ صوبوں کو مفوضہ امور کے متعلق جو اختیارات حاصل تھے وہ محدود نوعیت رکھتے تھے۔ اس نئے دستور کی رو سے صوبوں کی حکومتیں اپنے اختیارات بجائے مرکزی حکومت ہند کے تاج اور پارلیمنٹ سے حاصل کریں گی اور جس طرح ان کے اختیارات کی حد بندی ہوگی اسی طرح مرکزی حکومت ہند کے اختیارات کی حد بندی کی جائے گی۔ قانون دستور کے بموجب صوبوں کو وفاق میں شریک ہونا پڑے گا اور وہ دیسی ریاستیں جو چاہیں اپنی مرضی سے وفاق میں مشترک اغراض اور مفاد کے لئے شرکت کریں۔

وفاق کے تین اجزا ہوں گے (۱) گورنروں والے صوبے (۲) چیف کمشنروں والے علاقے اور (۳) ریاستیں۔ ان تینوں اجزا کے ساتھ وفاقی حکومت کے تعلق کی نوعیت مختلف ہوگی۔ گورنروں والے صوبوں کے لئے وفاقی حکومت کے اختیارات محدود ہوں گے لیکن چیف کمشنروں والے علاقوں کے لئے وفاقی حکومت کے اختیارات کی وسعت زیادہ ہوگی۔ صوبوں اور چیف کمشنریوں کے لئے وفاق میں شرکت لازمی ہوگی۔ وفاقی حکومت کو دیسی ریاستوں کے انتظام میں بعض امور پر جو اختیار حاصل ہوگا اس سے وہ تعلقات مطلق متاثر نہ ہوں گے جو دیسی ریاستوں اور تاج کے درمیان اگلے زمانہ سے چلے آتے ہیں۔ اگر کوئی ریاست وفاق میں شریک نہیں ہوگی تو بھی اس کے وہ حقوق اور ذمہ داریاں غیر متاثر رہیں گی جو تاج اور کسی ریاست کے درمیان پہلے سے موجود ہیں۔ ریاستوں کو اختیار ہوگا کہ وفاق میں شریک ہوں یا نہ ہوں۔ ان کے ساتھ وفاقی حکومت کے

تعلق کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہوگی جو صوبوں کے ساتھ ہے اس لئے کہ ان کے اختیارات اصلی ہیں نہ کہ ماخوذ۔ وفاقی حکومت صرف ان امور سے متعلق ان کے معاملوں میں دخل دے سکے گی جن کی صراحت شرکت کی دستاویز میں کردی گئی ہوگی۔

گورنر جنرل ہندوستان میں تاج برطانیہ کا نمایندہ ہوگا۔ وفاقی حکومت کا عاملانہ اقتدار اس کی ذات کے لئے خاص ہوگا۔ اس کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کی صراحت قانون دستور میں موجود ہے اور ان کے علاوہ اس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہوں گے جو براہ راست تاج سے اس کو سپرد کئے جائیں۔ بادشاہ کے دستخط سے اس کو ایک ہدایت نامہ دیا جائے گا جس میں ان اختیارات کی نوعیت، ان کے استعمال اور اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کے متعلق توضیح ہوگی۔ وائسرائے کی حیثیت سے اس کو ان ریاستوں پر جو وفاق میں شریک نہیں ہوئی ہیں بالادستی کے اختیارات حاصل ہوں گے۔ وفاق میں شرکت کرنے والی ریاستوں کے ان انتظامی امور میں جو دستاویز شرکت کے ذریعہ وفاقی حکومت سے متعلق نہیں کئے گئے ہیں وائسرائے بالادست قوت کے نمایندے کی حیثیت سے اسی طرح مداخلت کرسکے گا جس طرح کہ وہ اگلے زمانے سے کرتا رہا ہے چونکہ بالادستی کے اختیارات کا پورا مدار ان روایتوں پر مبنی ہے جو دیسی ریاستوں اور حکومت ہند کے درمیان اگلے زمانہ میں پیدا ہوئیں اس لئے ان کی وضاحت قانون دستور کی حدوں سے باہر رہے گی۔

گورنر جنرل اپنے فرائض اپنی عاملہ (ایگزیکیوٹیو کونسل) کے مشورہ سے انجام دے گا لیکن بعض خاص ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے وہ اپنی مجلس عاملہ کی رائے کے خلاف اپنی صوابدید پر عمل کرسکے گا۔ جب وہ ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو وہ وزیر ہند سے مشورہ کرے گا یا اگر وہ خیال کرے کہ وہ شاہی "ہدایت نامہ" کے مطابق عمل کررہا ہے تو اسے وزیر ہند سے مشورہ کرنے کی حاجت نہ ہوگی۔ اس شاہی "ہدایت نامہ" میں گورنر جنرل

کی خاص ذمہ داریوں کے ابواب جن کی بابت وہ تمامتر اپنی صوابدید پر عمل کرنے کا مجاز ہوگا مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستان کے کسی حصے میں امن عامہ کا قیام
(۲) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ
(۳) وفاقی حکومت کی مالیات کا استحکام اور اس کی ساکھ کا تحفظ
(۴) پبلک سروس (سول سروس، پولیس سروس وغیرہ) کے افراد اور ان کے وارثوں کے حقوق کا تحفظ جو قانون دستور کی رو سے محفوظ کئے گئے ہیں اور ان کے جایز مفاد کی نگرانی۔
(۵) ان کارروائیوں کی روک تھام جن سے برطانوی مال کی درآمد کے خلاف امتیازات یا تعزیر مقصود ہو۔
(۶) دیسی ریاستوں کے حقوق اور والیان ریاست کے اعزاز اور مراتب کا تحفظ۔

وفاقی حکومت کے وہ محکمے جن کے متعلق گورنر جنرل اپنی صوابدید سے فیصلہ کرے گا اور جن کی ذمہ داری اس پر عاید ہوگی مندرجہ ذیل ہیں۔

دفاع، امور خارجہ، مالیات، امور کلیسا اور قبائلی مسائل۔

ان کو مرکزی حکومت کے محفوظہ امور سمجھنا چاہیے جن کے متعلق گورنر جنرل خود اپنے مشیر مقرر کرے گا جن کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہوگی اور وہ گورنر جنرل کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ ان محکموں کے اخراجات جن کی ذمہ داری قانون دستور نے اس پر عاید کی ہے خود منظور کرے۔ وہ اس باب میں مقننہ کا دست نگر نہ ہوگا۔ ان محکموں کے متعلق مقننہ میں بحث اور تنقید ہو سکے گی لیکن گورنر جنرل پر مقننہ کی رائے کی پابندی عاید نہ ہوگی۔

گورنر جنرل اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے خصوصی احکام جاری کرنے کا مجاز ہوگا۔ یہ خصوصی احکام مقننہ کا جلسہ ہونے کے چھ ہفتے بعد تک نافذ رہیں گے اور اگر اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے مقننہ کے دونوں ایوانوں نے مل کر ان کے خلاف قرارداد منظور کر لی تو ان خصوصی احکام کو منسوخ

کرنا ہوگا۔ گورنر جنرل کے خصوصی احکام جب تک نافذ رہیں گے اس وقت تک وہ وہی حکم رکھیں گے جو مقننہ کے منظور کئے ہوئے قوانین کو حاصل ہے۔ یہ خصوصی احکام نہ تو قوانین پارلیمنٹ اور نہ ہائیکورٹوں کے اختیارات کے منافی ہونے چاہئیں۔ گورنر جنرل جب چاہے ان احکام کو واپس لے سکتا ہے اور تاج کو اختیار ہے کہ ان کے نفاذ کو روک دے۔ گورنر جنرل اپنی خاص ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے بھی خصوصی احکام جاری کر سکتا ہے جو ۶ ماہ تک نافذ رہیں گے اور اگر وہ ضرورت سمجھے تو ۶ ماہ کے لئے ان کی مزید توسیع عمل میں آئے گی۔ اگر ۶ ماہ کے بعد پھر ان کی توسیع کی ضرورت ہو تو ان کی منظوری پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے حاصل کی جائے گی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے اور وفاقی حکومت کے ان محکموں سے ان کا اس قدر گہرا تعلق ہے جو دستور کی رو سے محفوظ نہیں ہیں کہ وہ اپنے صوابدید کے موافق مقننہ کی رائے کو جب چاہے نظر انداز کر سکتا ہے[1]۔

گورنر جنرل اس کا بھی مجاز ہوگا کہ خاص حالات میں اپنی ذمہ داری پر قوانین وضع کرے اور ان کی بابت مقننہ کو پیغام سے مطلع کرے۔ اس قسم کا قانون پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری کے لئے پیش کرنا لازمی ہوگا۔ گورنر جنرل کے بنائے ہوئے قوانین وہی حکم رکھیں گے جو وفاقی مقننہ کے منظور کئے ہوئے قوانین۔ اگر دستوری مشین ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو گورنر جنرل بذریعہ اعلان وفاقی حکومت کے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لے گا سوائے وفاقی عدالت کے اختیارات کے۔ اس اعلان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظوری لینا ضروری ہوگا۔ اعلان کے ذریعہ گورنر جنرل تین سال تک حکومت ہند کو چلا سکتا ہے جس کے بعد پارلیمنٹ

[1] قانون دستور ۱۹۳۵ء کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کیتھ کی کتاب A Constitutional History of India. (از ص ۲۰۴ تا ۳۰۲)

نئے انتظامات عمل میں لائے گی۔
گورنر جنرل وفاقی مقننہ کے ارکان میں سے زیادہ سے زیادہ دس وزیر نامزد کرے گا جنکے ذمہ وہ وفاقی حکومت کے مختلف محکمے کرے گا۔ وزیر گورنر جنرل کو مشورہ اور امداد دینگے وہ اسوقت تک اپنے عہدوں پر رہیں گے جب تک کہ گورنر جنرل کی مرضی ہوگی۔ وزیر ان امور سے متعلق گورنر جنرل کو مشورہ دینے کے مجاز نہ ہوں گے جن کی نسبت گورنر جنرل کو قانون دستور کی رو سے اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دستور میں گورنر جنرل اور اس کے وزیروں کے اختیارات کا جو تعین کیا گیا ہے اس کے بموجب مرکزی وفاقی حکومت میں اس طرح کی دوعملی وجود میں آئے گی جیسی کہ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کی رو سے صوبوں کے انتظام میں ظاہر ہوئی تھی۔ گورنر جنرل ان امور محفوظہ کے متعلق اپنے مشیر خود مقرر کرے گا جو اس کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور جو مجلس وزراء کے رکن نہیں ہوں گے۔ لیکن وزراء اور مشیر جب چاہیں آپس میں مشورہ کر سکیں گے۔ مشیر اس وقت بھی اپنی خدمتوں پر رہیں گے جب کہ وزیر مستعفی ہو جائیں گے۔ وفاقی حکومت کے میزانیہ کی سب سے بڑی مد اخراجات (یعنی دفاع کی مد) وزیروں کے اختیار سے باہر ہوگی جس کے باعث ان کے اختیارات محدود اور غیر حقیقی ہو جائیں گے۔

وفاقی مقننہ وفاقی مقننہ تین اجزا پر مشتمل ہوگی (۱) تاج جس کی نیابت گورنر جنرل کرے گا (۲) کونسل آف اسٹیٹ اور (۳) فیڈرل اسمبلی۔

گورنر جنرل اپنی صوابدید پر وقتاً فوقتاً کونسل آف اسٹیٹ اور فیڈرل اسمبلی کے جلسے منعقد کرنے کا اعلان کرے گا۔ وہ ان جلسوں کو بڑی مدت کے لئے ملتوی یا برخاست کرنے کا مجاز ہوگا۔ وزیر گورنر جنرل کے مشیر اور وکیل سرکاری دونوں ایوانوں میں تقریر کر سکیں گے۔ لیکن انھیں رائے دینے کا حق صرف اس ایوان میں حاصل ہوگا جس میں وہ نامزد ہوئے ہوں یا رکن ہوں۔ ہر ایوان اپنا صدر آپ منتخب کرے گا۔

کونسل آف اسٹیٹ ۱۵۶ برطانوی ہند کے نمائندوں اور ۱۰۴ دیسی ریاستوں

کے نمایندوں پر مشتمل ہوگی۔ وہ ایک مستقل جماعت ہوگی جس کے ارکان کی $\frac{1}{3}$ تعداد ہر تیسرے سال منتخب ہوا کرے گی۔ فیڈرل اسمبلی ۲۵۰ برطانوی ہند کے اور ۱۲۵ ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوگی۔ صوبوں کی مقننہ فرقہ واری جداگانہ اصول کے مطابق نمایندے منتخب کرکے فیڈرل اسمبلی کے لئے بھیجے گی ہر فرقہ کے لوگ جنھیں دستور میں جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا ہے فیڈرل اسمبلی کے لئے اپنے نمایندے علٰحدہ منتخب کریں گے۔ ریاستوں کی آبادی کے تناسب سے ان کے نمایندوں کی تعداد فیڈرل اسمبلی کے لئے مقرر ہوگی۔ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے جو بلاواسطہ طریق انتخاب رائج کیا گیا تھا اس کو نظرانداز کرکے جدید دستور میں بالواسطہ طریقہ کو ترجیح دی گئی۔ یہ اس مصلحت سے کیا گیا کہ جدید انتخاب کے حلقے دستور کے بموجب اس قدر وسیع ہو جائیں گے کہ کسی امیدوار کے لئے سب رائے دینے والوں سے براہ راست تعلق قایم کرنا ناممکن ہوگا۔ لیکن عام طور پر دوسرے ملکوں کے جمہوری دستوروں میں اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی ایوان زیرین کے نمایندوں کو عام باشندے براہ راست منتخب کرتے ہیں اور ایوان بالا کے انتخاب میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایوان زیرین میں اگر بلاواسطہ نیابت ہو تو مرکزی حکومت کا عام شہریوں سے براہ راست تعلق قایم ہو جاتا ہے۔

ہر ایوان اپنے جلسوں کے لئے قاعدے بنا سکتا ہے۔ لیکن گورنر جنرل ایوان بالا کے صدر اور ایوان زیرین کے اسپیکر کے مشورے سے ایسے قاعدے اور ضابطے بنائے گا جو ان کارروائیوں پر حاوی ہوں گے جن کے متعلق اس کو خصوصی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے اور جنکا پورا انحصار اسکی صوابدید پر ہے۔ اگر گورنر جنرل خیال کرے کہ مقننہ میں کسی خاص مسودہ قانون کے پیش ہونے سے اس کی کوئی خصوصی ذمہ داری متاثر ہوتی ہے تو وہ اپنے اختیار تمیزی سے اس کو پیش ہونے سے روک سکتا ہے۔ اگر کوئی مسودہ قانون ایک ایوان میں منظور ہو گیا ہو اور دوسرے ایوان میں رد کر دیا جائے یا دونوں ایوانوں میں اس کی ترمیموں کے متعلق اختلاف ہو تو گورنر جنرل دونوں ایوانوں کا مشترکہ جلسہ منعقد کرائے گا

اور کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے گا۔

دونوں ایوانوں کے ارکان کو بھی نظم ونسق کے جملہ مسائل کے متعلق سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کا حق حاصل ہوگا وہ اس امر کے مجاز ہوں گے کہ حکومت کی حکمت عمل پر بحث اور نکتہ چینی کریں۔ ان کی نکتہ چینی قانونی گرفت سے باہر تصور کی جائے گی۔ ارکان اس کے بھی مجاز ہوں گے کہ کسی اہم مسئلہ کے متعلق عامہ کی توجہ کی غرض سے مقننہ کے اجلاس کو ملتوی کرنے کی تجویز پیش کریں۔ سالانہ میزانیہ گورنر جنرل کی جانب سے پہلے فیڈرل اسمبلی میں اور پھر کونسل آف اسٹیٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تمام مالی مطالبے گورنر جنرل کی سفارش کے بعد مقننہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میزانیہ کی بعض مدیں "وفاقی مصارف" پر مشتمل ہوں گی جن کی نسبت فیڈرل اسمبلی میں بحث ہو سکے گی لیکن ان کی منظوری کی ضرورت نہ ہوگی۔ میزانیہ کا تقریباً ۸۰ فیصد حصہ ایسے اجزا پر مشتمل ہوگا جن کے لئے مقننہ کی منظوری کی حاجت نہ ہوگی۔ باقی مطالبے برائے منظوری صرف ۲۰ فیصدی رہ جاتے ہیں جن پر مقننہ کو اختیار رہے گا۔ مقننہ کو کسی مسودہ قانون کے ذریعہ محصول لگانے یا اس میں اضافہ کرنے، قرض لینے یا اس کی ضمانت دینے کا جس سے وفاق کی مالی ذمہ داری متاثر ہوتی ہو یا وفاقی آمدنی میں سے مصارف تجویز کرنے کا اختیار نہ ہوگا بلکہ ان کا انحصار گورنر جنرل کی سفارش پر ہوگا۔ بغیر اس کی سفارش کے کوئی ایسی تجویز جس کا مالیات سے تعلق ہو مقننہ میں منظور نہ ہو سکے گی۔

وفاقی عدالت

مرکزی وفاقی حکومت کی ایک وفاقی عدالت بھی ہوگی جو چھ ججوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کے حدود سماعت تین نوعیت کے ہوں گے۔ (۱) ابتدائی (اوریجنل) (۲) مرافعہ (اپیل) (۳) مشورتی (اڈوائزری) ابتدائی جانب وفاقی عدالت کے حدود سماعت ان مقدموں پر حاوی ہوں گے جو حکومت وفاق صوبوں اور ان ریاستوں کے درمیان جو وفاق میں شریک ہیں اپنے حقوق کے تعین کے متعلق پیدا ہوں۔ اگر کسی ریاست کے متعلق وفاقی عدالت کو فیصلہ کرنا ہے تو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈر ان کونسل یا وفاقی

حکومت کی عاملہ یا مقننہ کے اختیارات کی حدیں معین کرتا ہوں گی جو دستاویز شرکت کی بدولت کسی ریاست کے متعلق مقرر رہوں کسی وفاقی قانون کے کسی ریاست میں نافذ کرنے کے متعلق یا کسی ایسے امر کے متعلق وفاقی عدالت توجیہ پیش کرنے کی مجاز ہو گی جس کی نسبت وفاقی مقننہ وضع قانون کا اختیار رکھتی ہے۔ وفاقی عدالت کسی ایسے مسئلہ پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز ہو گی جو حکومت ہند اور کسی ریاست کے درمیان ایسے معاہدہ سے پیدا ہوا ہو جو وفاق کے قیام کے بعد عمل میں آیا ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس معاہدہ میں اس کی صراحت ہونی چاہئیے کہ وفاقی عدالت کے حدود سماعت اس مسئلہ کے متعلق حاوی ہوں گے۔ لیکن اگر معاہدہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ فلاں فلاں مسائل وفاقی عدالت کی سماعت کے دائرے سے باہر ہیں تو وہ وفاقی عدالت کے سامنے پیش نہ ہوں گے۔

وفاقی عدالت میں برطانوی ہند کے ہائیکورٹوں سے مرافعے کئے جائینگے۔ ہائیکورٹ کی ڈگری یا فیصلے کا مرافعہ اس وقت ممکن ہو گا جب کہ متعلقہ ہائیکورٹ اس امر کی توثیق کرے کہ زیر بحث مقدمہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈر ان کونسل کی توجیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کے مقدموں کا مرافعہ پریوی کونسل میں نہ ہو گا۔ لیکن مقدمہ اس نوعیت کا ہونا چاہیئے جس سے مفاد عامہ وابستہ ہو یا ذاتی معاملہ کی حیثیت سے اس میں ایسے پہلو نکلتے ہوں جو مفاد عامہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے سول مقدمے بھی وفاقی عدالت میں پیش ہو سکیں گے جو وفاقی مقننہ کے کسی منظورہ قانون کے بموجب وفاقی عدالت کی سماعت کے دائرے میں آجائیں۔ وفاقی مقننہ اپنے قانون کے ذریعہ یہ قاعدہ مقرر کر سکتی ہے کہ آئندہ سے سول مقدموں کا مرافعہ بجائے پریوی کونسل کے وفاقی عدالت میں ہو گا۔ اگر ایسی تجویز وفاقی مقننہ میں پیش کی جائے گی تو اسکے پہلے گورنر جنرل سے اس کی نسبت منظوری لینا لازمی ہو گا۔

دستور کی رو سے وفاقی عدالت کو مشاورتی حیثیت بھی حاصل ہے۔ گورنر جنرل اپنی صوابدید پر کسی قانونی مسئلہ کو جو مفاد عامہ سے تعلق رکھتا ہو وفاقی عدالت

کو تحقیق کرنے کے لئے سپرد کرسکتا ہے جو اس کے متعلق اپنی رپورٹ اپنی رائے کے ساتھ پیش کرے گی۔
وفاقی عدالت کو اختیار ہوگا کہ اپنی کارروائیوں کے متعلق قاعدے اور ضابطے بنائے جن کی منظوری گورنر جنرل سے لینا ہوگی۔ وفاقی عدالت کے مصارف کا بار وفاقی حکومت کے مالیہ پر ہوگا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا آرڈان کونسل کی توجیہ کے متعلق وفاقی عدالت یا پریوی کونسل کے فیصلے قطعی ہوں گے جن کا برطانوی ہند اور ان ریاستوں میں جو وفاق میں شریک ہیں نفاذ ہوگا۔

صوبوں کی حکومتیں

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے وفاقی حکومت کی طرح صوبوں کی حکومت کے جملہ اختیارات ملک معظم کی ذات میں مرکوز ہوں گے۔ وہ گورنر کو اپنے خاص دستخط سے اپنا نائب مقرر کرے گا۔ گورنر کے ذمہ گورنر جنرل کی طرح محفوظ امور کا انتظام نہ ہوگا۔ اس پر اپنے صوبے کے مالی استحکام اور ساکھ قایم کرنے کی ذمہ داری بھی نہیں ہوگی جس طرح گورنر جنرل پر وفاقی حکومت کے متعلق ہے۔ گورنر جنرل وفاقی مالیات کے تحفظ کے ضمن میں گورنر سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں خاص حکمت عملی اختیار کرے۔ گورنر وزیروں کو اپنی مرضی سے مقرر کرے گا اور انھیں برطرف کرنے کا مجاز ہوگا۔
صوبوں کا نظم ونسق تین حصوں میں تقسیم ہوسکتا ہے (۱) وہ امور جن کے انجام دینے میں گورنر اپنے وزیروں کے مشورہ کا پابند ہوگا (۲) وہ امور جن میں وہ اپنے وزیروں سے مشورہ لے گا لیکن اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے گا (۳) وہ امور جن میں وہ اپنے اختیار تمیزی سے کرے گا اور ان کے متعلق وزیروں سے مشورہ نہیں کرے گا۔ اس امر کا تعین گورنر کرے گا کہ کوئی خاص مسئلہ ان مذکورہ بالا تینوں شقوں میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نسبت اس کی رائے قطعی ہوگی اور اس پر مزید بحث اور تنقید نہ ہوسکے گی۔ ان امور کے متعلق جن میں گورنر اپنے اختیار تمیزی سے کام کرے گا اس کے لئے لازمی ہوگا کہ پہلے گورنر جنرل سے دریافت کرلے اور اس کی

ہدایت کے مطابق عمل کرے۔

صوبے کے عام نظم و نسق میں گورنر اپنے وزیروں کے مشورے کا پابند ہوگا لیکن جن مسائل میں گورنر کو خصوصی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے ان کے متعلق وہ تنہا اپنی مرضی اور رائے سے عمل کرے گا۔ ان میں اقلیتوں کے حقوق، سرکاری ملازموں اور ان کے وارثوں کے حقوق اور برطانوی تجارت کا تحفظ شامل ہیں۔ سی۔ پی اور برار کے گورنر کا فرض ہوگا کہ وہ اس امر کا خیال رکھے کہ اس کے صوبے کی آمدنی کا معقول حصہ برار پر خرچ کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس کا فرض ہوگا کہ ریاست حیدرآباد کے تجارتی اور معاشی مفاد کو بھی اپنے پیش نظر رکھے۔ صوبہ سرحدی کا گورنر جب قبائلی معاملوں کے انجام دینے میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے گا تو اس کا فرض ہوگا کہ اس کا لحاظ رکھے کہ اس کا کوئی فعل ایسا نہ ہو جو اس ذمہ داری میں خلل پیدا کرے جو گورنر جنرل کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس پر عاید ہوتی ہے۔ گورنر کا فرض ہوگا کہ وہ صوبے کی آبادی کے مختلف فرقوں اور طبقوں میں اس کی ہمت افزائی کرے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق صوبے کی حکومت میں شریک ہوں اور اقلیتوں کی تعداد کا مناسب ملازمتوں میں قایم رہے۔ اگر صوبے میں نقض امن کا اندیشہ ہو یا کوئی سیاسی جماعت حکومت کو درہم برہم کرنے کے درپے ہو تو ایسی حالت میں گورنر امن عامہ کے قایم کرنے کے جملہ فرائض اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اور اپنے اختیار تمیزی سے کام کر سکتا ہے۔ گورنر اپنے اختیار تمیزی سے ایسے قاعدے اور ضابطے بنا سکتا ہے جن کا منشا یہ ہو کہ سیاسی جرموں کے متعلق خفیہ طور پر جو حکومت کو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ بغیر انسپکٹر جنرل پولیس یا پولیس کمشنر کی اجازت کے کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے پائیں۔ خفیہ کے محکمے کا تعلق وفاقی محکمہ خبر رسانی سے ہوگا اور وہ وزارت کے اختیار کے باہر ہوگا۔

گورنر جنرل کی طرح گورنر صوبے میں خصوصی احکام نافذ کرنے کا مجاز ہوگا۔ خصوصی احکام چھ ماہ کی مدت کے لئے ہوں گے لیکن ان کی توسیع مزید چھ ماہ

کے لئے ہو سکے گی۔ وہ اپنی خصوصی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے قانون بنا سکے گا جو گورنری قانون کہلائیں گے۔ لیکن اس کے نافذ کرنے کے لئے گورنر جنرل کی اجازت درکار ہوگی۔ اس کو مقننہ کے منعقد ملتوی اور برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ دستور کے تعطل کی حالت میں گورنر اعلان کے ذریعہ سے نظم ونسق کے تمام عاملانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے گا

صوبوں کی وزارت

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی دفعہ (۱ د) کے بموجب ہر صوبے میں ایک مجلس وزراء ہوگی جس کا فرض ہوگا کہ وہ گورنر کو مشورہ دیا کرے اور اس کے کاموں میں امداد دے سوائے ان امور کے جن میں گورنر اپنے اختیار تمیزی سے کام کرے گا۔ وزیروں کو گورنر مقرر کرے گا اور وہ اس وقت تک مجلس وزراء کی رکنیت پر رہیں گے جب تک کہ گورنر کی مرضی ہوگی۔ مجلس وزراء کی رکنیت حاصل کرتے وقت وہ اس بات کا حلف لیں گے کہ وہ کوئی سرکاری راز فاش نہیں کریں گے۔ وزیروں کی سفارش پر پارلیمانی معتمدین مقرر کیے جائیں گے جو ان کے فرائض کے ادا کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ اگرچہ قانون دستور میں اس امر کی صراحت موجود نہیں ہے کہ گورنر کس جماعت میں سے اپنے وزیر مقرر کرے گا لیکن "شاہی ہدایت نامہ" (انسٹرومنٹ آف انسٹرکشنز) میں اس کی توضیح کی گئی ہے کہ وہ اس سیاسی جماعت میں سے اپنے وزیر مقرر کرے گا جو مقننہ میں اکثریت رکھتی ہو۔ گورنر کا فرض ہوگا کہ وزارت میں اقلیتوں کی نمائندگی کا انتظام کرے۔ اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ آیا وزیر مشترک ذمہ داری کے اصول پر مشورہ دیں گے یا گورنر وزیروں سے علٰحدہ علٰحدہ مشورہ طلب کر سکے گا۔ وزیروں کو حق ہوگا کہ جب چاہیں مقننہ کو خطاب کریں۔ اگر وزیروں کو گورنر کی حکمت عملی سے اصولی اختلاف ہو تو ایسی صورت میں گورنر ان کا استعفا طلب کر سکتا ہے یا اگر وہ چاہے تو انھیں برطرف کر سکتا ہے۔ مقننہ کے برخاست کرنے اور جدید انتخاب کا حق جیسا کہ قلمروی وزیروں کو حاصل ہے ہندوستانی صوبوں کے وزیروں کو نہیں ہوگا بلکہ گورنروں کو حاصل ہوگا جو اپنے اختیار

سے اس حق کو استعمال کر سکیں گے۔

بے شبہہ صوبوں کے وزیروں کو جدید دستور کی رو سے بہ نسبت ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کے زیادہ انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے۔ جدید دستور کے بموجب دوعملی کا خاتمہ کر دیا گیا اور چند اہم امور کے علاوہ صوبہ کا پورا نظم ونسق منتخب شدہ وزیروں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ صوبوں کی وزارت میزانیہ تیار کرے گی۔ اور اپنے اختیار کے اندر اس میں اپنی حکمت عملی کے مطابق رد و بدل کر سکے گی۔ پولیس کا محکمہ بھی عملی طور پر متعلقہ وزیر کے تحت آجائیگا محکمہ خفیہ کے سوا جسکا تعلق انسپکٹر جنرل آف پولیس کے توسط سے گورنر اور مرکزی محکمہ خفیہ سے قایم رہیگا۔ اگر وزارت نے ان مصارف کو اپنے میزانیہ میں نہیں داخل کیا جسکا تعلق گورنر کی خصوصی ذمہ داری سے ہے تو گورنر اپنے حکم سے ان مصارف کو میزانیہ میں داخل کر سکیگا۔ لیکن باوجود گورنر کے آخری اختیارات کے جو مالیات اور وضع قانون کے متعلق اسے حاصل ہیں وزیر اپنے اثر سے صوبوں کے نظم ونسق میں بہت کچھ تبدیلیاں کر سکیں گے۔

صوبوں کی مقننہ

دستور جدید کے بموجب ہر صوبے میں ایک لیجسلیٹو اسمبلی ہوگی لیکن چھ صوبوں (بمبئی، بنگال، مدراس، صوبجات متحدہ بہار اور آسام) میں اس کے ماسوا لیجسلیٹو کونسلیں بھی ہوں گی۔ لیجسلیٹو اسمبلی کی میعاد پانچ سال ہوگی۔ اس مدت کے بعد وہ برخاست کر دی جائے گی اور نئے انتخابات عمل میں آئیں گے۔ صوبوں کی لیجسلیٹو کونسلیں مستقل حیثیت رکھیں گی۔ ہر تیسرے سال انکے ارکان کی ⅓ تعداد مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق علحدہ ہو جائیگی اور نئے ارکان ان کی جگہ منتخب ہونگے۔ لیجسلیٹو اسمبلی کیلئے رائے دہی کا حق پہلے کے مقابلہ میں وسیع کر دیا گیا ہے۔ ہر صوبے کے حق رائے دہی کے قاعدے مختلف ہوں گے۔

صوبوں کی مقننہ ایسے قوانین وضع کرنے کی مجاز نہ ہوگی جن سے بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانیہ کی تجارت اور صنعتی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے علاوہ گورنر کی تنخواہ اور قرض کے مطالبے جو صوبہ کی آمدنی میں سے واجب الادا ہوں اس کے اختیار سے باہر ہوں گے۔

صوبہ کی حکومت کی ضرورتوں کی پابجائی کے لئے مقننہ کو صوبہ کی آمدنی

کی ضمانت پر ہندوستان میں قرض لینے کا اختیار ہوگا۔ بغیر وفاقی حکومت کی اجازت اور منظوری کے کوئی صوبجاتی حکومت ہندوستان کے باہر قرض نہیں لے سکے گی۔ عملی طور پر صوبوں کی حکومتیں وفاقی حکومت ہی سے قرض لیں گی جس کی منظوری گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن وفاقی حکومت کے علاوہ وہ بازار میں بھی چاہیں تو قرض لے سکیں گی۔

صوبجاتی اور مرکزی وفاقی امور کے علاوہ بعض امور ایسے بھی ہیں جنکے متعلق وفاقی اور صوبجاتی دونوں حکومتیں وضع قوانین کی مجاز ہوں گی۔ صوبہ کی حکومتوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے صوبے کی حد تک وفاقی قوانین میں تبدیلی کر سکیں اس شرط سے کہ ان کے متعلق گورنر جنرل سے دریافت کر لیا گیا ہو۔ دستور میں گورنر جنرل پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے کہ اگر وفاقی حکومت کسی ایسے امر کے متعلق وضع قانون کرے جو صوبجاتی فہرست امور میں شامل ہے تو وہ صوبجاتی حکومت سے اس کی بابت مشورہ کرے۔

وزیر ہند اور ہائی کمشنر وزیر ہند بہ اجلاس کونسل کے اختیارات دستوری اعتبار سے برطانوی کابینہ کے تحت ہوں گے۔

گورنر جنرل کا تقرر وزیر اعظم کرے گا۔ دوسرے اعلیٰ عہدوں کے تقررات کے متعلق وزیر ہند وزیر اعظم سے مشورہ کرے گا۔ وزیر ہند کی مجلس کے ارکان کم سے کم ۳ اور زیادہ سے زیادہ ۶ ہوں گے ان میں سے نصف ایسے ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں کم سے کم دس سال تک تاج کی خدمت پر مامور رہ چکے ہوں اور انھیں سرکاری خدمت سے علٰحدہ ہوئے دو سال سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔ ارکان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔ ایک مرتبہ رکنیت پر مقرر ہونے کے بعد دوبارہ اس خدمت پر تقرر نہ ہو سکے گا۔ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ اپنی مجلس کے ارکان سے مجموعی یا انفرادی طور پر مشورہ کرے یا اگر وہ چاہے تو مشورہ نہ کرے۔ اس کو ان کے مشورہ پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا بھی اختیار ہوگا وزیر ہند کا عملہ برٹش سول سروس سے تعلق رکھے گا اور اس کی تنخواہوں وغیرہ کے مصارف کا بار کچھ برطانوی خزانہ پر کچھ حکومت ہند کے خزانہ پر پڑے گا۔

انڈیا آفس پورے طور پر برطانوی حکومت کے تحت سمجھا جائے گا۔ ذیل کی خدمتوں پر وزیر ہند کی جانب سے تقرر عمل میں آئیں گے۔

انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس، انڈین پولیس سروس، کلیسائی عہدہ دار، وزیر ہند امپیریل سروس کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائے گا جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری کے بعد نافذ ہوں گے۔ ان خدمتوں میں اگر کوئی خدمت خالی ہو تو بغیر وزیر ہند کی منظوری کے تین ماہ سے زیادہ خالی نہیں رہ سکتی اور نہ اس پر کوئی تقرر ہو سکتا ہے جب تک کہ وزیر ہند کی جانب سے نہ ہو اور نہ کوئی دوسرا شخص جو کسی دوسری خدمت پر مامور ہو اس خدمت کے فرائض ادا کرنے کے لئے مقرر کیا جا سکتا ہے۔

اب تک ہائی کمشنر کا زیادہ تر غیر سیاسی معاملوں سے تعلق تھا اسلئے کہ سیاسی مسائل انڈیا آفس سے متعلق تھے۔ لیکن بین الاقوامی نوعیت کے اجتماعوں میں ہائی کمشنر حکومت ہند کی نمایندگی کرتا رہا ہے اور ۱۹۳۲ء کی اٹاوہ کانفرنس میں اس نے ہندوستانی وفد کی قیادت کے فرائض ادا کئے تھے۔ جدید دستور کی رو سے حکومت ہند کے بعض تجارتی معاہدوں کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے ہائی کمشنر کا تقرر کرے گا اور اس کی تنخواہ اور خدمت کی دوسری شرطوں کا تعین کرے گا۔ ہائی کمشنر حکومت وفاق کی جانب سے گورنر جنرل کی ہدایتوں کے مطابق انگلستان میں ہندوستانی تجارتی مفاد کی دیکھ بھال کریگا (وفاقی حکومت کے سوا)، ہائی کمشنر صوبوں کی حکومتوں اور ریاستوں کی حکومتوں کے لئے بھی گورنر جنرل کی اجازت سے وہ تمام فرائض ادا کر سکے گا جو وہ وفاقی حکومت کے متعلق انجام دیتا ہے۔

پبلک سروس

ہز مجسٹی بہ اجلاس کونسل کو اختیار رہے گا کہ وفاعی محکمہ کے تقررات کرے۔ وزیر ہند اپنی مجلس کے ارکان کے مشورے سے فوجی محکمہ کے اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائے گا اور ان کی خدمت کی شرطوں کا تعین کرے گا۔ وفاقی محکموں کی مختلف

عہدوں پر گورنر جنرل تقرر کرے گا جو سنٹرل سروس سے متعلق ہوں گی۔ ان میں ریلوے، ڈاک، تار اور جنگی کے محکمے شامل ہوں گے۔ انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس اور انڈین پولیس سروس کے تقررات وزیر ہند کی جانب سے عمل میں آئیں گے اور ان کے متعلق خدمت کی شرطوں کا تعین پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منظوری سے ہوگا۔ صوبوں میں آبپاشی کے محکمے کے اعلیٰ عہدوں پر بھی وزیر ہند اپنی صوابدید سے تقررات کرے گا۔ متذکرہ بالا سروسوں میں اس وقت جو اشخاص شریک ہیں ان کے جملہ حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ اور اس کا بھی انتظام کیا جائے گا کہ آئندہ جو لوگ ان میں شریک ہوں وہ قدیم روایتوں کو برقرار رکھ سکیں۔ جو نئے تقررات ان خدمتوں پر آئندہ کئے جائیں گے ان کے متعلق اس امر کی ضمانت کی جائے گی کہ اگر کوئی خدمت تخفیف کر دی جائے یا سیاسی وجوہ کی بنا پر کسی کو اپنی خدمت سے قبل از وقت سبکدوش ہونا پڑے تو ان لوگوں کو جو ان حالات سے متاثر ہوں گے خاطر خواہ معاوضہ دیا جائے تاکہ ان کا کوئی مالی نقصان نہ ہو۔ کوئی شخص جو متذکرہ بالا خدمتوں میں سے کسی پر فائز ہو وہ اس وقت تک برطرف یا معزول نہیں کیا جا سکے گا جب تک کہ اس کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ وفاقی محکموں کی حد تک گورنر جنرل اور صوبجاتی محکموں کے متعلق گورنر قاعدے اور ضابطے نافذ کرے گا جن کا اطلاق مذکورہ سروسوں کے اشخاص پر ہوگا۔ پراونشل سروسز آل انڈیا سروس کے دوش بدوش صوبوں کے نظم و نسق کو چلائیں گی اور ان کے قابل اور سینیئر ارکان کی مقررہ تعداد کو آل انڈیا سروسوں میں شریک کیا جا سکے گا تاکہ وہ ترقی کی انتہا تک پہنچ سکیں۔

گورنر جنرل ایک وفاقی پبلک سروس کمیشن مقرر کرے گا۔ کمیشن کے نصف ارکان ایسے اشخاص ہونے چاہئیں جو تقرر کے وقت کم سے کم تاج کی خدمت میں دو سال سے ہوں۔ گورنر جنرل کی اجازت سے وفاقی پبلک سروس کمیشن صوبوں کے لئے کام کر سکے گا۔ لیکن معمولاً صوبوں کے لئے علٰحدہ صوبجاتی پبلک سروس کمیشن ہونے چاہئیں جن کے ارکان کا تقرر گورنر کرے گا۔ آپس کے

سمجھوتے سے کئی صوبے مل کر اپنے لئے ایک مشترک کمیشن مقرر کر سکتے ہیں۔ وفاقی پبلک سروس کمیشن کا صدر آیندہ ہندوستان میں کسی سرکاری عہدہ پر مامور نہ ہو سکے گا۔ یہ شرط اس واسطے رکھی گئی ہے تاکہ وہ اپنے فرائض نہایت بے باکی اور غیر جانبداری سے ادا کرے اور چونکہ اس طرح اسے اپنے متعلق کچھ امیدیں نہ ہوں گی اس لئے وہ بے رو و رعایت تمام تقررات کیا کرے گا۔ پبلک سروس کمیشن مختلف محکموں کے متعلق امیدواروں کے امتحان کا انتظام کرے گا اور گورنر جنرل کو مشورہ دے گا کہ تقررات کن اصول کے تحت ہونے چاہئیں۔ مختلف محکموں میں ترقی اور تبادلے کے قاعدے بھی کمیشن کے مشورے سے بننے چاہئیں گے۔ بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے مقننہ میں کوئی ایسا مسودۂ قانون نہیں پیش کیا جا سکے گا جس سے پبلک سروس کمیشن کے فرائض میں تبدیلی ہوتی ہو۔

مرکزی وفاقی اور صوبوں کی حکومتوں کے متعلق قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کا نفاذ ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔ قانون میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ صوبوں کی حکومتوں میں اس کے نافذ ہو جانے کے بعد وفاقی مقننہ کے جملہ فرائض جہاں تک برطانوی ہند کا تعلق ہے موجودہ مرکزی مقننہ ادا کرے گی۔ وفاقی عاملہ کے اختیارات گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو حاصل ہوں گے۔ لیکن گورنر جنرل اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس وقت تک وزیر ہند کے احکام کے پابند ہوں گے جب تک کہ وفاق قایم نہ ہو جائے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس کا مجاز نہ ہوگا کہ وہ حکومت ہند کی ضرورتوں کے لئے انگلستان میں قرض لے سکے۔ ہاں وزیر ہند پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد حکومت ہند کے لئے انگلستان میں جدید صوبجاتی حکومتوں کے قیام اور مرکزی وفاقی حکومت کے قیام سے پہلے قرض لینے کا مجاز ہوگا۔ وفاق قایم ہونے کے پیشتر وفاقی ریلوے کا بورڈ وفاقی پبلک سروس کمیشن اور وفاقی عدالت کا قیام عمل میں آسکے گا۔ ۳ جولائی ۱۹۳۶ء کے آرڈر ان کونسل میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جدید صوبجاتی حکومتوں

کے قیام کا جہاں تک تعلق ہے قانون دستور کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہو جائے گا۔ مرکزی حکومت میں اس کی وجہ سے جو تبدیلیاں عمل میں آئیں گی اور اس کی ذمہ داری کی نوعیت میں جو فرق پیدا ہوگا اس کے متعلق بھی اس درمیانی زمانے کے لئے جب تک کہ وفاق کا قیام عمل میں نہ آئے اس آرڈر ان کونسل میں ہدایت کر دی گئی ہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے جس حصے کا تعلق مرکزی وفاقی حکومت سے تھا نافذ نہیں کیا جا سکا اس واسطے کہ ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے بھی اس کو پسند نہیں کیا۔ لیکن ہر جماعت نے اس ناپسندیدگی کے مختلف اسباب بتلائے۔ کانگریس نے وفاقی اسکیم کو اس لئے نہیں پسند کیا کہ اس کی رو سے مرکزی وفاقی حکومت بالکل غیر ذمہ دار ہوگی اور اس کے نافذ ہونے سے اسی قسم کا طرز حکومت قایم ہوگا جس کا تجربہ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کے بعد صوبوں میں کیا گیا تھا۔ یعنی نظم و نسق سے بعض امور منتخب شدہ وزیروں کے تحت ہوں گے اور بیشتر اہم امور براہ راست گورنر جنرل سے متعلق رہیں گے جو وزیر ہند اور پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس طرح ایک قسم کی دوعملی (ڈیارکی) کا نظام مرکزی حکومت میں رائج ہو جائے گا۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے مطابق گورنر جنرل کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات سونپ دئے گئے ہیں اور حکومت کا عاملانہ اقتدار پوری طرح اس کی ذات میں مرکوز ہوگا۔ اس کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کی صراحت قانون دستور میں موجود ہے اور ان کے علاوہ اس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہوں گے جو براہ راست تاج سے اس کو سپرد کئے گئے ہوں۔ بہ حیثیت وائسرائے اس کو والیان ریاست پر بالادستی کے اختیارات (پیراماؤنٹ سی) حاصل رہیں گے جو دستور کے سے کسی طرح متاثر نہ ہوں گے۔ گورنر جنرل اپنی خاص ذمہ داریوں سے عہدا برا ہونے کے لئے جو پارلیمنٹ کی جانب سے اس کے سپرد کی گئی ہوں وفاقی نظم و نسق کے بیشتر اور نہایت اہم امور میں اپنے اختیار تمیزی کے مطابق عمل کرنے کا مجاز ہوگا۔ مالیات، دفاع اور امور خارجی کے محکمے پوری طرح اس کے

ستحت ہوں گے۔ ان امور کے انجام دینے کے لئے وہ خود اپنے مشیر مقرر کرے گا اور ان کے اخراجات کی منظوری دینے کا مجاز ہوگا۔ اس طرح وفاقی امور کے بہت زیادہ حصے کے متعلق مقننہ کی آواز بے اثر رہے گی۔ گورنر جنرل کے مخصوص ذمہ داریوں کا دائرہ اور ان کے متعلق اس کے اختیارات اس قدر وسیع رکھے گئے ہیں کہ وہ وفاقی حکومت کے تقریباً ہر شعبہ میں اپنے منشا کو من مانے طور پر موثر بنا سکتا ہے۔ وزیر اس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اس طرح مجوزہ وفاقی دستور کے مطابق حکومت کی جو تشکیل عمل میں آئے گی وہ قطعاً غیر ذمہ دار ہوگی۔ ان وجوہ کی بنا پر کانگریس نے وفاقی اسکیم کو عمل میں لانے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگ نے وفاقی اسکیم کو اس لئے ناقابل قبول بتایا کہ اس میں اقلیتوں کی نمایندگی کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔ ریاستوں کے نمایندوں کو ملاکر وفاقی مقننہ میں غیر مسلموں کی تعداد مناسب حد سے بڑھ جائے گی۔ اور چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ ایک عرصے تک ہندوستان اس قسم کے سیاسی شعور سے محروم رہے گا جس کی بدولت سیاسی اور معاشی محرکات انتظامی معاملوں میں فیصلہ کن ثابت ہوں اس لئے ضروری ہے کہ مذہبی اور تمدنی اقلیتوں کو انھیں اصول کی بنا پر اپنے بقا اور حفاظت کا اہتمام کرنا چاہئے جو اس ملک میں عام طور پر برتے جاتے ہیں۔ مسلم لیگ نے یہ خطرہ بھی محسوس کیا کہ چونکہ مرکزی وفاقی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے اس لئے کہیں ان صوبوں کی خود مختاری بے اثر نہ ہو جائے جہاں ان کی اکثریت ہے اور جن کی حکومت میں وہ اپنی مرضی کو مناسب حدوں کے اندر موثر بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ کوئی دستور جو اس کی پوری ضمانت نہ کرے قابل قبول نہیں ہو سکتا اگرچہ اختیارات باقی (ریزیڈوری رائٹس) صوبوں کو حاصل ہوں گے لیکن وفاقی حکومت مختلف طریقوں سے دخل دینے اور اپنی مرضی موثر بنانے کے عذر تلاش کر سکتی ہے۔

غرضکہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے خاص وجوہ اور اسباب کی بنا پر مرکزی وفاقی دستور کو عمل میں لانے اور اس ضمن میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن دستور کے اس حصہ پر جس کا تعلق صوبوں کے انتظام سے تھا دونوں جماعتوں کو اتنی شدت سے اعتراض نہ تھا اس لئے وہ نافذ ہو سکا۔ فیض پور کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس کو آئندہ صوبوں کے انتخاب میں باقاعدہ حصہ لینا چاہئے "تاکہ جدید دستور کے بموجب مقننہ میں جاکر اور حکومت قایم کرکے جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں انھیں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ جنوری اور فروری ۱۹۳۷ء میں جو صوبوں کے انتخابات ہوئے ان میں کانگریس نے ۱۱ صوبوں میں سے ۶ میں (یوپی، بہار، اڑیسہ، سی-پی، مدراس اور بمبئی) میں اکثریت حاصل کرلی۔ صوبۂ سرحدی میں صرف چند کی کمی پوری ہو جانے سے کانگریس کی اکثریت ہو جاتی تھی۔ چنانچہ چند مہینے بعد دوسری سیاسی جماعتوں کے ارکان کی شرکت سے اس صوبہ میں بھی کانگریس کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ بنگال، آسام، پنجاب اور سندھ میں غیر کانگریسی وزارتیں قایم ہوئیں۔ صوبوں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دہلی منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبوں میں عہدے قبول کر لینے چاہئیں۔ اس اجلاس میں قطعی فیصلہ کرنا اس واسطے ضروری تھا کہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے اس حصہ کا نفاذ جو صوبوں کی حکومتوں کے متعلق تھا طے شدہ امر تھا۔ مارچ ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتہ میں حسب دستور گورنروں نے کانگریس پارٹی کے لیڈروں کو وزارتیں قایم کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کی قرارداد کے بموجب گورنروں کے خصوصی اختیارات کے متعلق اطمینان حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن گورنروں نے اس کا یہ جواب دیا کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے گورنر اپنے خصوصی اختیارات کے متعلق مطلوبہ وعدہ نہیں کر سکتے کہ وہ انھیں استعمال نہ کریں گے۔ دستور جدید اور ہدایتوں کی دستاویزوں کے بموجب خصوصی اختیارات کے استعمال اور اقلیتوں کے

مفاد کے تحفظ کی بابت ان پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر گورنر خود بھی ان اختیارات سے دست بردار ہونا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ گورنروں کو خاص ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جن میں اقلیتوں کے جائیز حقوق کا تحفظ بھی شامل ہے۔ جب تک اس قسم کی ذمہ داریاں ان پر عاید ہیں ان کو مختلف موقعوں پر اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرنا پڑیگا۔ اگر گورنر اس قسم کا وعدہ کریں جیسا کہ کانگریس نے طلب کیا ہے تو وہ اپنی صوابدید پر عمل کرنے کے مجاز نہیں رہیں گے پس چھ صوبوں کی کانگریس پارٹی کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ چونکہ گورنر انھیں اطمینان دلانے سے انکار کرتے ہیں اس لئے وہ وزارتیں قبول کرنے سے معذور ہیں۔ وزیر ہند لارڈ زیٹلینڈ نے ۸ ر اپریل کو پارلیمنٹ میں جو بیان دیا اس میں صراحت کر دی کہ اگر کانگریس صوبوں میں وزارتیں قایم کرنے کو تیار نہیں ہے تو اقلیتوں کی وزارتیں قایم کر دی جائیں گی۔ چنانچہ کانگریسی لیڈروں کے انکار پر گورنروں نے اقلیتوں کی عارضی وزارتیں قایم کریں۔ بہت دنوں تک یہ قانونی بحث جاری رہی کہ آیا گورنر اس کے مجاز ہیں یا نہیں کہ اس قسم کی عارضی وزارتیں قایم کریں۔ حکومت کے حامیوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگلستان کی گزشتہ صدی کی تاریخ میں عارضی وزارتوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ چونکہ کانگریس نے باوجود اکثریت رکھنے کے وزارتیں قایم کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لئے ان صوبوں کے گورنروں کے پاس اب کوئی چارۂ کار اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ وہ ملک معظم کی حکومت کو چلانے کے لئے اقلیتوں کی عارضی وزارتوں کی تشکیل کریں۔ اس قسم کے غیر معمولی حالات میں گورنروں کو اپنے وزیروں کے انتخاب میں کافی آزادی حاصل ہونی چاہئے تاکہ حکومت کی مشین کو چلایا جا سکے۔ اس کے برخلاف کانگریس کے حامیوں نے یہ ثابت کیا کہ موجودہ عارضی وزارتیں ناجائز اور خلاف قانون ہیں۔ کانگریس کے قانون و دستور کے ماہروں کا یہ دعویٰ تھا کہ گورنر دستور جدید کی دفعوں سے تجاوز کئے بغیر مجوزہ وعدے کر سکتے ہیں لیکن اقلیتوں کے نمایندوں میں سے

عارضی وزارت قایم کرنا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ اس واسطے کہ گورنر کی ہدایتی دستاویز کی دفعہ (۸) میں اس کی صراحت کردی گئی ہے کہ وزارت کی تشکیل گورنر اس شخص کے مشورے سے کرے گا جو مقننہ میں اکثریت رکھنے والی جماعت کا لیڈر ہو۔ قانون دستور جب پارلیمنٹ میں زیر بحث تھا اس وقت صوبجاتی آزادی کی جو تصویر دکھائی گئی تھی وہ موجودہ حقیقت سے بالکل مختلف تھی۔ قیام امن واماں کی ذمہ داری جو گورنر کے سپرد کی گئی ہے وہ اس قدر وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ وہ وضع قوانین کے حق پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اس طرح گورنر کی حیثیت بجائے دستوری صدر عاملہ کے حقیقی صدر عاملہ کی ہو جاتی ہے جو پارلیمنٹ کے منشاء کے خلاف ہے۔

غرضکہ اس دوران میں کانگریس اور حکومت کے سیاسی تعلق میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کے ارباب حل وعقد نے اپنے لب ولہجہ کو بدلنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند نے اپنی تقریر میں اور لارڈ لن لتھگو وائسرائے ہند نے اپنے طولانی بیان میں صاف طور پر کہا کہ منتخب شدہ وزیروں کی آزادی عمل میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ بھی کہا کہ انڈین سیول سروس کے ارکان جیسا کہ گزشتہ تین مہینے کے تجربے سے ثابت ہو گیا ہے نئے دستور کے تحت اسی طرح اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں جس طرح وہ صوبوں کی پرانی حکومت کے اصول کار کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ اگر کوئی گورنر اپنے وزیروں کے مشورے پر عمل نہیں کرے گا تو وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا کرے گا۔ ایسی صورت میں وزیر اس کے مجاز ہوں گے کہ وہ بذریعہ اعلان اس کا اظہار کردیں کہ فلاں معاملہ میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور یہ کہ انھوں نے گورنر کو اس کے خلاف عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ معمولاً گورنر تمام معاملوں میں جن میں اقلیتوں اور انڈین سیول سروس کے معاملے بھی شامل ہیں وزیروں کے مشورے کے مطابق عمل کرے گا۔ اپنی خصوصی ذمہ داریوں کے علاوہ نظم ونسق کے کسی اور معاملے میں گورنر وزیروں کے مشورے

کے بغیر عمل نہیں کرے گا۔ وزیروں کی ذمہ داری اپنی مقننہ کے روبرو رہے گی نہ کہ پارلیمنٹ کے سامنے۔

وائسرائے کے اس بیان میں سمجھوتے اور صلح کا جو انداز اختیار کیا گیا تھا اسکا کانگریسی حلقوں میں اچھا اثر ہوا۔ چنانچہ ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کے بموجب یہ طے پایا کہ کانگریس اپنے تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے ان اختیارات کو استعمال کرے جو دستور کی رو سے صوبوں کی حکومتوں کو حاصل ہوئے ہیں تاکہ عوام کی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ کانگریس نے جدید دستور کو قابل اطمینان قرار دے کر قبول کر لیا ہے۔

کانگریس کی طرح مسلم لیگ نے بھی مرکزی وفاقی دستور کو غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے صوبوں کے انتخابات کی مہم میں پورا حصہ لیا اس لئے کہ اس کو خوف تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کی سیاسی حیثیت متاثر ہوگی۔ فیض پور کانگریس میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ کانگریس کو چاہئے کہ مسلم عوام میں اپنا اثر بڑھائے۔ اس کو مسلم لیگ نے اپنے لئے مہلک تصور کیا اور اس کے خلاف سخت رد عمل رونما ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ملک کے ہر گوشہ سے نمائندوں نے شرکت کی اور نہایت اہم اور دور رس تجویزیں منظور کیں۔ سب سے زیادہ اہم تجویز یہ تھی کہ مسلم لیگ کا اصلی مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی قرار دیا جائے۔ جہاں تک نصب العین اور مسلک کا تعلق ہے مسلم لیگ کانگریس کے بہت قریب آگئی لیکن عملی طور پر ان دونوں سیاسی اداروں کی دوری اور کشیدگی برابر بڑھتی رہی۔ مسلم لیگ کا اثر ملک کے ہر گوشہ کے مسلمانوں پر پڑا اور مسلم عوام کے ساتھ اس کا ربط وضبط پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ قوی ہو گیا۔ انتخابات کے بعد لیگ نے کانگریس سے مخلوط وزارتیں قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا لیکن اس ضمن میں کوئی مفاہمت کی صورت نہ نکل سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشیدگی میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ کانگریسی صوبوں کے انتظام کے متعلق

لیگ نے یہ اعتراض کیا کہ وہاں مسلمانوں کے حقوق کی دیکھ بھال نہیں کی جارہی ہے اور اسی قسم کا اعتراض کانگریس کی طرف سے ان صوبوں کے انتظام پر کیا گیا جہاں مسلم لیگ کی وزارتیں قایم تھیں مسلم لیگ نے اپنی تمام شکایتوں کو جو کانگریسی حکومت کے خلاف تھیں ایک رپورٹ میں مرتب کیا جسے پیر پور رپورٹ کہتے ہیں۔ اس دوران میں مسٹر جناح صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس مسٹر سوباش چندر بوس اور گاندھی جی سے کئی مرتبہ مصالحت کی گفتگو ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ اس کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت سمجھا جائے جسے کانگریس ماننے کو تیار نہ تھی اس واسطے کہ قوم پرست مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کانگریس میں شریک تھی۔ اب تک مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ بہ حیثیت ایک اقلیت کے کر رہی تھی لیکن مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے یہ اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور انھیں حق خود ارادیت حاصل ہے۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک علیحدہ مملکت قایم کرنے کا تصور دن بدن نشو و نما پاتا گیا۔ ان صوبوں میں سندھ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، مغربی منطقہ میں اور بنگال اور آسام مشرقی منطقہ میں شامل ہیں۔

۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے پر وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو نے کانگریس اور مسلم لیگ اور دوسری اقلیتوں کے لیڈروں کو مشورے کے لئے طلب کیا۔ اس وقت پھر کانگریس اور مسلم لیگ کی مصالحت کا سوال اٹھا۔ وائسرائے کی دعوت پر گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مسٹر جناح میں مصالحت کے متعلق بات چیت ہوئی لیکن اصلی بات مبہم رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مقاصد جنگ کو وضاحت سے بیان کرے تاکہ معلوم ہو کہ جنگ کے بعد ہندوستانیوں کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی۔ آیا ہندوستان اسی طرح محکوم رہیگا جیسا کہ اب ہے۔ کیا ہندوستانیوں کو جنگ کے ختم ہونے پر آزادی حاصل ہوگی یا نہیں

وائسرائے اور وزیر ہند نے اس ضمن میں یہ تو تسلیم کر لیا کہ قلمروی مرتبہ کی حکومت ہندوستان کا سیاسی نصب العین ہے لیکن یہ وعدہ نہیں کیا کہ جنگ کے ختم پر اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ کانگریس نے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر آٹھوں صوبوں کی وزارتوں کو استعفا دینے کا حکم دے دیا۔ ان وزارتوں کے مستعفی ہونے پر سوائے آسام کے جہاں متبادل وزارت قایم ہوگئی باقی سات صوبوں میں گورنروں نے قانون حکومت ہند کی دفعہ (۹۳) کے تحت صوبوں کے انتظام اور وضع قانون کے جملہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تاکہ صوبوں کا انتظام چلایا جا سکے۔ یہ تعطل کی حالت دوران جنگ میں قایم رہی ۱۹۴۲ء میں سر اسٹافرڈ کرپس ملک معظم کی حکومت کی جانب سے ہندوستان آئے اور انھوں نے تعطل کو توڑنے کے لئے ایک سیاسی پیش کش پیش کیا اس میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وعدہ کیا گیا کہ جنگ ختم ہونے پر ایک دستور ساز مجلس کو ہندوستان کا دستور بنانے کا کام سپرد کیا جائے گا اور ہندوستان میں ایک آزاد یونین قایم ہوگا جس میں ریاستیں بھی صوبوں کے ساتھ شریک ہوں گی۔ اگر ہندوستان چاہے تو سلطنت برطانیہ سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق کر سکتا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ ان تمام امور پر حاوی ہوگا جن کے ذریعہ ہندوستانیوں کو مکمل ذمہ داری سپرد کی جا سکے۔ ہندوستان کو اس کا حق بھی حاصل ہو جائے گا کہ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قایم کر سکے لیکن دوران جنگ کے لئے کرپس نے جو تجویز پیش کی اس کے بموجب جنگ کا انتظام حکومت ہند کے موجودہ محکموں ہی کے سپرد رہے گا کیونکہ دستوری تبدیلیوں سے اس میں ابتری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اقلیت کے مسئلہ پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور کرپس کا پیشکش رد کر دیا گیا۔ کانگریس کو اندیشہ تھا کہ کرپس کی تجویزوں کی رو سے صوبوں کو یونین سے الگ ہونے کا حق ہو جاتا ہے اور مسلم لیگ کو خدشہ

تھا کہ تجویزوں میں اتنی حد بندیاں ہیں کہ صوبے یونین سے الگ نہیں ہو سکیں گے اور ان کی خود ارادیت مرکزی اثرات کی وجہ سے بہت کمزور ہو جائے گی غرضکہ تعطل کی حالت ان تجویزوں کے بعد بھی برقرار رہی۔

ریاستیں اور وفاق

برطانوی بالادست قوت (پیراماؤنٹ پاور) نے مخصوص معاہدوں کے تحت ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمے لی۔ برطانوی بالادست قوت کا اثر مختلف ریاستوں میں مختلف نوعیت کا ہے جو ان روایتوں کے تابع ہے جو پچھلے ڈیڑھ سو سال میں حکومت ہند اور ان کے درمیان قایم ہو گئی ہیں۔ رسم و رواج کی بناء پر حکومت ہند نے ریاستوں کے متعلق بعض خاص اختیارات حاصل کر لئے ہیں جو تحریری معاہدوں کی حدوں سے باہر ہیں لیکن رسم کے لحاظ سے موثر ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء تک ریاستوں کا تعلق حکومت ہند سے رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت ہند کی تشکیل مختلف زمانوں میں بدلتی رہی لیکن باوجود ان تبدیلیوں کے حکومت ہند کے احکام، فیصلوں اور مداخلت کو بالادست قوت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ گول میز کانفرنسوں کے موقع پر ریاستوں نے وفاق میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی تھی اس شرط سے کہ ان کے تاریخی حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد بالادست قوت یا حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی من مانی دخل دہی کی کچھ روک تھام ہو سکے گی لیکن انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ بالادست قوت کی دخل دہی کے اختیارات بدستور برقرار رکھے جائیں گے اور ان کے علاوہ اندیشہ ہے کہ وفاقی حکومت کا اقتدار بھی بعض امور کے متعلق قایم ہو جائے گا۔ پھر اس کے علاوہ برطانوی ہند کی جمہوری تحریکوں کی طرف سے بدظنی کے باعث والیان ریاست نے صاف طور پر اس کا اظہار کر دیا کہ وہ انفرادی طور پر جس دستاویز شرکت (انسٹرومنٹ آف اکسیشن) کے ذریعہ وفاق میں شریک ہوں گے اس کی نوعیت ایک معاہدہ کی سی ہونی چاہئے تاکہ وہ اس میں اپنے حقوق کے

تحفظ کی پوری طرح وضاحت کردیں اور ان کی حیثیت اور اختیارات کے متعلق آئندہ کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ والیان ریاست کے حقوق اور مراتب کا تحفظ کریگا۔ اس کا فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ وفاقی حکومت کے وزیروں کا کوئی فعل یا وفاقی مقننہ کا منظور کیا ہوا کوئی قانون ریاستوں کے ان حقوق کو متاثر تو نہیں کرتا جو انھیں معاہدوں اور عہد ناموں کے ذریعہ حاصل ہیں لیکن مرکزی مقننہ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ دستاویز شرکت کے دائرے کے اندر کسی ریاست سے متعلق قانون سازی کرے۔ اگر وفاقی مقننہ کا بنایا ہوا کوئی قانون کسی ریاست کے باقی اختیارات کو جو اسے حاصل ہیں متاثر کرتا ہو یا والی ریاست کے حقوق اس سے متاثر ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں گورنر جنرل اپنی خصوصی ذمہ داریوں کے تحت اس کے حقوق کا تحفظ کرے گا۔ اگر گورنر جنرل یہ دیکھے کہ کسی ریاست میں وفاقی قوانین کا نفاذ جس کارکردگی کے ساتھ ہونا چاہئے ویسا نہیں ہو رہا ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ والی ریاست کو مناسب ہدایات دے۔ اگر دستاویز شرکت کی توجیہ کے سلسلہ میں وفاقی حکومت اور کسی ریاست کے درمیان اختلاف ہو تو اس کا تصفیہ وفاقی عدالت کرے گی۔ وفاقی حکومت کو یہ اختیار ہوگا کہ ریاستوں میں ریاست کی عاملہ اور عہدہ داروں کے ذریعہ سے وفاقی قوانین کا نفاذ کرائے یا اگر وہ چاہے تو متعلقہ ریاست میں اپنے حکام مقرر کردے۔ وفاقی مقننہ اپنے اختیارات وضع قانون کسی ریاست میں اس حد بندی کے مطابق استعمال کرسکے گی جس کی صراحت دستاویز شرکت میں کردی گئی ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی ریاست سکہ سازی اور کرنسی کو وفاقی حکومت کے سپرد نہ کرے تو وفاقی مقننہ وفاقی کرنسی اور سکہ سازی کو اس ریاست کی حد تک رواج دینے پر اصرار نہ کرے گی، لیکن وفاق کے دوسرے اجزا کو بھی اس بات پر مجبور نہیں کرسکے گی کہ ریاست مذکور کے سکہ یا کرنسی کو اپنے یہاں رائج کریں۔

یہ صحیح ہے کہ اگر وفاقی مقننہ ریاستوں میں ایسے قوانین کو نافذ کرنا چاہے جن کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جو دستاویز شرکت میں درج ہیں تو ایسی صورت میں متعلقہ ریاست اس معاملہ کو وفاقی عدالت میں پیش کرنے کی مجاز ہوگی۔ لیکن اگر وفاقی عدالت ریاست کے اس دعوے کو ناواجب قرار دے تو ریاست کچھ نہیں کرسکے گی۔ چنانچہ ایوان والیان ریاست اور وزیروں کی کمیٹی نے ملک معظم کی حکومت کو اس جانب متوجہ کیا اور مطالبہ کیا کہ وفاقی مقننہ کے اختیار وضع قانون کی اس طرح سے حد بندی کی جائے کہ وہ ایسے امور کے متعلق کوئی قانون سازی نہ کرسکے جس کے لئے دستاویز شرکت کی رو سے وہ مجاز نہیں ہے۔

وفاقی عدالت کو ریاستوں سے متعلق مرافعہ کے جو اختیارات ہیں ان کے بموجب اگر وہ کوئی فیصلہ صادر کرے تو ریاست کے حکمران سے اس کی تعمیل کی درخواست کرے گی۔ اگر کوئی والی ریاست اس فیصلہ کی تعمیل سے انکار کردے تو اس کی صراحت نہیں کی گئی کہ ایسی صورت میں وفاقی عدالت کیا چارہ کار اختیار کرے گی۔ وفاقی عدالت کو ریاستوں کے ہائیکورٹوں پر بھی کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا۔ ریاستوں کے ہائیکورٹوں کا رتبہ وہی ہوگا جیسے کسی آزاد غیر ملک کی اعلیٰ عدالت کا ہوتا ہے[1]۔

قانون دستور میں وفاقی حکومت کے اخراجات کی پابجائی کے لئے جو آمدنی کے ذریعے خاص کئے گئے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا براہ راست اثر ریاستوں کی آمدنی پر بھی پڑے گا۔ وفاقی حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ کروڑگری کا محصول ہے۔ دراصل سوائے ٹراونکور کوچین اور ساحلی ریاستوں کے باقی سب ریاستیں بالواسطہ مرکزی حکومت کو کروڑگری ادا کررہی ہیں۔ چنانچہ پچھلے چند سال سے ریاستوں نے یہ مطالبہ شروع کردیا ہے کہ انھیں کروڑگری کی آمدنی کا ایک حصہ واپس ملنا چاہئے اور

[1] Vardarajan, The Indian States and the Federation, p. 233

ٹلر کمیٹی نے بھی اس دعوے کو حق بجانب بتلایا۔ ساحل ریاستوں میں کچھ ایسی ہیں جنھوں نے بندرگاہیں بنانے پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی ہیں اور اب تک وہ درآمد پر اسی طرح محصول لگانے کی مجاز رہی ہیں جس طرح حکومت ہند درآمد پر محصول لگاتی ہے۔ ان حقوق کا احترام ضروری ہے جو اس ضمن میں معاہدوں کے ذریعہ ریاستوں کو حاصل ہوئے ہیں۔

کروڑگیری کے علاوہ نمک اور تمباکو پر بھی بعض ریاستیں محصول لگانے کا حق رکھتی ہیں۔ یہ دونوں محصول وفاقی حکومت کے لئے خاص کئے گئے ہیں ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند نے شکر اور دیاسلائی پر جب محصول (اکسائز) لگائے تو ریاستوں سے اس ضمن میں ایک الگ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے ریاستوں کو ان کی حدود میں ان اشیاء کے صرف کی مناسبت سے رقم واپس کرنا تجویز ہوا۔ لیکن قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب اکسائیس کی جو تقسیم اجزا کے درمیان ہوگی اس کا تعین وفاقی مقننہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے[1]۔

کارپوریشن ٹیکس اور زائد محصول آمدنی بھی وفاقی مالیات کے ذریعوں میں شامل ہیں۔ کارپوریشن ٹیکس وفاق قایم ہونے کے دس سال بعد ان ریاستوں میں جو وفاق میں شریک ہوگئی ہیں اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح برطانوی صوبوں میں ان ٹیکسوں کی وصولی کا یہ طریقہ تجویز کیا گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ مرکزی حکومت انھیں براہ راست وصول کرے خود ریاستیں معینہ رقم کو مرکزی خزانہ میں داخل کر دیا کریں گی محصول آمدنی کی رقم کو مرکزی حکومت صوبوں پر تقسیم کر دیا کرے گی لیکن ریاستوں کو اس حصے سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بالی ریاستوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دستاویز شرکت کے ذریعہ بعض وفاقی محصولوں سے استثنا حاصل کرسکتی ہیں کیونکہ بے اس کے ان کے لئے ناممکن ہوگا کہ اپنے بجٹ کو متوازن رکھ سکیں۔ اگر کسی ریاست کو اس بات کا پوری طرح

[1] Vardarajan, The Indian States and the Federation, p 115

اطمینان نہ ہو کہ جو محصول وفاقی حکومت نے شخصیتوں (کارپوریشنز) پر لگایا ہے وہ انصاف سے دور ہے تو وہ اس معاملہ کو وفاقی عدالت میں پیش کرنے کی مجاز ہوگی اور اس کے متعلق وفاقی عدالت کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے گا۔

جو ریاستیں وفاق میں شریک ہوں گی ان میں سے اگر کوئی حکومت ہند کو اس کی بالادستی کے سبب سے خراج کی رقم ادا کرتی ہوگی تو وفاق کے قیام کے بعد ۲۰ سال تک وفاقی حکومت اس سے کچھ وصول نہیں کرے گی۔ اگر کسی ریاست نے فوجی خدمت کے عوض حکومت ہند کو کچھ علاقے حوالے کئے ہیں تو ان کے معاوضہ میں وفاقی حکومت اس ریاست کو کچھ رقم ادا کر سکتی ہے۔ لیکن خراج سے دست کشی یا ریاستوں کو کسی رقم کی مستقل ادائی اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک کہ وفاقی حکومت مالی اعتبار سے اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ صوبوں کو آمدنی کے محصول (انکم ٹیکس) میں سے ان کا مقررہ حصہ رسدی نہ دینے لگے۔ ریاستوں کی شرکت کی دستاویز کا میں اس قسم کے تمام مسائل کا تعین کر دیا جائے گا جن کے مطابق وفاقی حکومت اور ریاستوں کے تعلقات تشکیل پائیں گے۔

قانون دستور کی رو سے وفاق اس وقت تک قایم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ریاستوں کی کافی تعداد اس میں شریک ہونے پر راضی نہ ہو جائے جن کے تحت ہندوستان کی کل ریاستوں کی آبادی کا نصف ہو۔ اور وفاقی ایوان بالا کی نصف نشستیں جو ریاستوں کے لئے خاص کی گئی ہیں سیر نہ جائیں۔ ریاستوں کو وفاقی اسمبلی میں (۳۷۵) میں سے (۱۲۵) نشستیں اور کونسل آف اسٹیٹ میں (۲۶۰) میں سے ۱۰۴ نشستیں حاصل ہوں گی اسطرح ان کی نمایندگی ایوان بالا میں ۴۰ فی صدی اور ایوان زیریں میں تقریباً ۳۳ فی صدی رہے گی۔ ریاست حیدرآباد کو اس کی آبادی رقبہ اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے دونوں ایوانوں میں دوسری ریاستوں سے زیادہ نمایندگی کا حق دیا گیا۔ چنانچہ ایوان بالا میں پانچ اور ایوان زیرین میں اس کے سولہ

نمایندے ہوں گے۔ وفاقی مقننہ میں جب ایسے معاملے پیش ہوں جن کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہو تو ریاستوں کے نمایندوں سے توقع کی جائے گی کہ وہ بحث میں حصہ نہ لیں۔

حکومت ہند کو تاریخی طور پر پہلے سے جو بالادستی کے حقوق حاصل ہیں وہ برقرار رہیں گے۔ وفاقی حکومت کا حکم ریاستیں صرف ان معاملوں میں مانیں گی جنھیں مشترک اغراض کے تحت انھوں نے وفاق کے حوالہ کر دیا ہوگا لیکن اگر وفاقی حکومت اور کسی ریاست کی حکومت میں اختلاف ہوگا تو وفاقی عدالت اس کے متعلق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ کے متعلق وفاقی حکومت دخل دینا یا قانون بنانا چاہتی ہے جس پر متعلقہ ریاست کو اعتراض ہے تو معاملہ وفاقی عدالت میں پیش کیا جا سکے گا جس کا فیصلہ قطعی تصور ہوگا۔

پچیسواں باب

برطانوی عہد میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی حالت

کسی ملک کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کا مدار اس تعلیمی نظام پر ہوتا ہے جو اس ملک میں رائج ہو۔ انگریزی عملداری کے قایم ہونے سے پہلے ہندوستان میں دو قسم کے تعلیمی نظام تھے۔ ایک ہندوؤں کا اور دوسرا مسلمانوں کا۔ لیکن ان کے علاوہ ایسے مدرسے بھی تھے جن میں ہندو اور مسلمان ساتھ ملکر ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چونکہ سرکاری زبان فارسی تھی اس واسطے ان مدرسوں میں اس زبان کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا اور دفتری ضرورتوں کے مدنظر انشا کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انگریزی حکومت نے شروع میں ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ سنہ ۱۸۳۳ء کے قانون منشور کے منظور ہونے کے بعد میکالے نے اس ضمن میں ایک یادداشت تیار کی جسے حکومت ہند نے قبول کرلیا۔ اس یادداشت کے بموجب مشرقی علوم کی سرپرستی کے بجائے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی ترقی پر حکومت نے اپنی آمدنی کا نہایت کم حصہ خرچ

کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میکالے کا خیال تھا کہ انگریزی زبان ہی کے ذریعے ہندوستانیوں کی ذہنی ترقی ممکن ہوگی۔

اگرچہ ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کو رائج ہوئے سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے لیکن انگریزی زبان ملک کی قومی زبان نہ بن سکی جیمز مل نے میکالے کی یادداشت پر تنقید کرتے ہوئے جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس نے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو جو یہ توجہ دلائی تھی کہ ہندوستانیوں کے اصول تعلیم کو یکایک اس طرح بدل دینے سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ ہندوستانی نوجوانوں پر انگریزی تہذیب و تمدن کا ہلکا سا اوپری رنگ چڑھ جائے گا جس کا کوئی گہرا اثر ان کی سیرت پر نہ ہوگا۔ اور انگریزی زبان کو حقیقی علوم کی تحصیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ملازمت حاصل کرنے کا ایک وسیلہ بنایا جائے گا چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے انگریزی علوم کی تحصیل اس ملک میں عام طور پر اسی واسطے کی گئی کہ اس کے ذریعے سے رزق کا دروازہ کھلتا تھا اور دنیاوی ترقی کے اسباب فراہم ہوتے تھے۔ باوجود اس امر کے کہ انگریزی حکومت نے اپنے وسیع اور موثر وسیلے انگریزی زبان کی ترویج کے لئے استعمال کئے لیکن پھر بھی پورے ملک میں صرف تھوڑے سے لوگ اس قابل ہو سکے کہ وہ اس زبان میں اپنے خیالات بے تکلف ادا کرسکیں۔ عوام اس زبان سے قطعیً ناواقف رہے۔ میکالے کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ عوام کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتوں کی تکمیل کرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرصے تک انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنے آپ کو ایک بالاتر مخلوق سمجھتے تھے اور جس طرح ملک میں اور بہت سی ذاتیں تھیں اسی طرح انگریزی تعلیم یافتوں کی ایک ذات بن گئی جو عوام سے کسی قسم کے ربط و تعلق کو اپنے لئے ذلت سمجھتی تھی۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں جو یونیورسیٹیاں قایم ہوئیں وہ لندن یونیورسٹی کے نمونے کی

تھیں جن کا مقصد امتحان لینا تھا نہ کہ طلبہ کی تربیت اور ان کی سیرت کی تشکیل۔ پھر پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسیٹیاں بھی اسی اصول پر قایم ہوئیں ۱۹۱۸ء کے سیڈلر کمیشن نے اس تعلیمی نظام کو مضر بتلایا اور امتحان لینے والی یونیورسیٹیوں کے بجائے ایسی یونیورسیٹیاں قایم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جہاں طلبا، ایک قسم کی اجتماعی زندگی خاص فضا میں بسر کرسکیں اور اقامتی زندگی ان کی خاص خصوصیت ہو۔ چنانچہ علیگڈھ، بنارس اور عثمانیہ یونیورسٹی اسی اصول پر قایم کی گئیں جن میں امتحان کے ساتھ تربیت کا بھی پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دہلی، آگرہ، لکھنؤ، ڈھاکہ، میسور، آندھرا، اناملے اور ٹراونکور میں یونیورسیٹیاں کھل جانے سے پچھلے پچیس تیس سال میں اعلیٰ تعلیم نے ملک میں بہت کافی ترقی کی ہے۔

سر چارلس وڈ کے ۱۸۵۴ء کے مراسلہ کے بعد ہندوستان میں ہر صوبہ میں ایک محکمۂ تعلیم قایم کر دیا گیا تھا جس کے ذمہ تعلیم کی مقامی ضرورتوں کی پابجائی قرار پایا تھا۔ صوبوں کے محکمۂ تعلیمات کے تحت وسطانی اور تحتانی تعلیم کو ترقی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اکثر صوبوں میں بلدیات اور دسٹرکٹ بورڈوں کے تحت رکھی گئی۔ صوبوں کی حکومت ان کی مالی امداد کرتی تھی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام کو ابتدائی تعلیم دینے کا فرض حکومت نے جس طرح چاہئے تھا اس طرح پورا نہیں کیا۔ چنانچہ آج بھی ڈیڑھ سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد ملک میں تقریباً دس فی صدی لوگ ایسے ہیں جو پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ابتدائی تعلیم کے رواج پر خاص توجہ کی گئی ہے تاکہ قوم سے جہالت کو دور کیا جائے اور عوام کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا کے معاملوں کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں اور اپنی روٹی آپ کما سکیں۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں سب سے بڑا اور سب سے اہم تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جہاں اردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید اور مشرقی

و مغربی علوم و فنون کو اس طور سے ملایا جائے کہ موجودہ تعلیمی انتظام کے نقائص دور ہو جائیں اور قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی اور نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام جاری ہو سکے۔ اگرچہ تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی ہے تاکہ مغربی علوم و فنون کے چمنستانوں سے خوشہ چینی ممکن ہو۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان کو جان بوجھ کر اس واسطے تعلیمی ذریعہ قرار دیا گیا کہ یہ زبان ایک مشترک ورثہ ہے جو ملکی بھائیوں کو اپنے بزرگوں سے ملا ہے اور جو بقول سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کی ناقابل تقسیم ہے۔ تعلیمی نفسیات کے ماہروں کے ہاں یہ امر مسلم ہے کہ کسی قوم کی اخلاقی اور ذہنی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ قوم خود اپنی مادری زبان کو حصول تعلیم کا ذریعہ نہ بنائے۔ بحمد اللہ کہ جامعہ عثمانیہ کا تجربہ امید سے زیادہ کامیاب رہا۔ اور اب یہ ایک تجربہ کی حد سے گزر کر ایک حقیقت حاضر بن گیا ہے جس کے اثرات کو اس کے مخالف بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ گزشتہ پچیس سال میں اس جامعہ کے فرزندوں نے علم و فن کے مختلف شعبوں میں جو شہرت اور ناموری پائی ہے وہ ان تعلیمی اصول کے صحیح ہونے کی ضمانت ہے جو اس جامعہ میں رائج کیے گئے ہیں۔ ان اصول کی کامیابی کی ایک اور بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں آج ان کی پیروی کی جا رہی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ انگریزی حکومت کے توسط سے ہندوستان میں یورپ کے جدید خیالات کا گہرا اثر پڑنا شروع ہوا جس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ انگریزی تعلیم کے باعث ہندوستانیوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں جو عرصے سے آب بستہ کی طرح تھی نئی نئی لہریں اٹھنے لگیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں بنگال میں راجا رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنا ڈالی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندو جاتی کی بری رسموں

کو ترک کیا جائے اور یورپ کے جدید معاشرتی اور تمدنی خیالات کو قبول کر لیا جائے اور انھیں اپنی زندگی میں اس طرح سمو یا جائے کہ وہ بالکل فطری معلوم ہونے لگیں۔ اس تحریک سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بنگال اور شمالی ہند کے ہندوؤں میں معاشرتی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ ذات پات اور چھوت چھات کی سختی پہلے کے مقابلے میں کم ہونے لگی اور پست طبقوں کے انسانی حقوق کو تسلیم کیا جانے لگا۔ پست طبقوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنی اہمیت اور حیثیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں پست اقوام کے رائے دینے والوں کی تعداد کافی بڑھا دی گئی ہے جس کے سبب سے ان کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سیاسی حقوق ملنے سے انھیں دوسرے طبقوں کے برابر ہوتے میں مدد ملے گی۔ اور آہستہ آہستہ ان میں سے افلاس اور جہالت دور ہو جائے گی۔ ان کی آبادی کا اندازہ پورے ملک میں چھ کروڑ کے قریب کیا گیا ہے۔ ان کی زندگی سدھرنے سے پورے ملک کو فائدہ ہوگا اور جوں جوں ان کا معیار حیات بلند ہوتا جائے گا اور ان میں تعلیم کی اشاعت ہوگی اسی قدر ملک کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائیگی۔ یہ مثل ان کے ضمن میں صادق آتی ہے کہ کسی زنجیر کی مضبوطی کا معیار اس کی سب سے کمزور کڑی ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے پست طبقوں کی جتنی ترقی ہوگی اتنی ہی ملک کی مجموعی ترقی میں مدد ملے گی۔

مسلمانوں میں سر سید احمد خاں نے انیسویں صدی عیسوی کے آخری تیس سالوں میں اسی قسم کی تحریک شروع کی تھی جیسی راجا رام موہن رائے نے کچھ عرصہ پہلے ہندوؤں میں کی تھی۔ اس تحریک کا بھی یہ مقصد تھا کہ مسلمان مغربی تعلیم و تمدن سے پورا فائدہ اٹھائیں اور ۱۸۵۷ء کے بڑے ہنگامے کے بعد جو عام پستی ان پر چھا گئی تھی اس کو دور کریں۔ اگر وہ مغربی تعلیم و تمدن کے اصول سیکھنے میں ملک کے دوسرے جتھوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے تو ان کا مستقبل نہایت تاریک ہوگا۔ پہلے پہل مسلمانوں کے پرانے خیال والے طبقے نے سر سید احمد خاں کی تحریک کی سخت مخالفت کی۔

لیکن آہستہ آہستہ ان کی اصلاحی تحریک کا اثر ہوا اور مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ ابتدا میں انگریزی تعلیم کی طرف اس لئے توجہ کی گئی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ملک کے دوسرے جتھوں کے مقابلہ میں پیچھے نہ رہیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد انگریزی تعلیم کے اثر سے ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کے اثر سے قومیت کا احساس پیدا ہوا تھا۔

غرض کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تعلیم پھیلنے سے بیداری آزاد خیالی اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یورپ کے تمدن کی اصل میں بنیاد یہی تنقید ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستانی اپنی قدیم معاشری رسموں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو گئے تاکہ زندگی کی ترقی میں رکاوٹ باقی نہ رہے۔ مگر اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ہر بات میں یورپ کی نقل اور تقلید کرنے لگا اور اپنے تمدن و تہذیب پر بھروسا باقی نہ رہا۔ لیکن اس قسم کے خیالات زیادہ دونوں تک باقی نہیں رہے۔ بہت جلد ہندوستان کے سمجھ والوں نے محسوس کر لیا کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی نقل سے ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ہر گروہ میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مغربی علوم و فنون حاصل کرنے اور اپنی معاشری اصلاح کرنے کے ساتھ اپنی تہذیب و تمدن پر بھروسا کرنے کی تعلیم دی۔ غرض کہ اہل ہند میں اب ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے جو مغربی تمدن کی بعض خوبیاں ماننے کے باوجود اپنی ہر چیز اور اپنی ہر رسم کو حقیر اور برا نہیں خیال کرتا اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ اس کو اس کا احساس ہے کہ کسی قوم کی تاریخ ہی اس کے اجتماعی وجود کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ تاریخ محض واقعات اور حوادث کا بے معنی انبار نہیں بلکہ وہ وسیلہ ہے اجتماعی شعور اور سیرت کو خوبی کرنے کا۔ تاریخ کے لگاتار تغیر اور تخلیق سے انسانی اداروں کی وحدتیں وجود میں آتی ہیں۔ اور پھر یہ بدل کر دوسری صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کی وحدت بھی برقرار رہتی ہے اور برابر تغیر بھی ہوتا رہتا

ہے جو زندگی کی خاص خصوصیت ہے۔ زندگی اپنی ضرورتوں کے مطابق
اپنے مستقل رہنے والے اور تغیر پذیر عنصروں میں ملاوٹ کرتی رہتی ہے
انفرادی ذہن کی طرح ایک اجتماعی ذہن بھی ہوتا ہے جو اپنے ساتھ ماضی
وابستہ رکھتا ہے اور جس کی جلو میں قومی روایتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔
انسان اپنے عملوں اور کوششوں کے معیار کو اخلاقی حیثیت سے بلند
کرلینے کے لئے انھیں روایتوں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یہ سانچہ تاریخ
ہے جس کی بدولت عمل کو وقار اور قدر نصیب ہوتی ہے۔ اپنی تاریخ اور
روایتوں کا دامن چھوڑ کر کوئی قوم اعلیٰ قسم کی زندگی نہیں بسر کرسکتی۔

انگریزی تعلیم کے ذریعہ اہل ہند مغربی تمدن کے اصول سے واقف
ہوئے۔ مغربی تمدن کی بنا تنقید پر قایم ہے جو سائنس کی روح ہے۔ سائنس
کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے وسیلوں کو ترقی دینا اور فطرت کے چھپے
ہوئے بھید معلوم کرتا ہے گزشتہ چار سو برس میں یورپ والوں نے مشاہدہ
و تجربے سے مظاہر فطرت کا کھوج لگایا اور اپنی ایجاد و تسخیر سے کائنات
کے گوشہ گوشہ پر اپنا سکہ بٹھایا۔ سائنس یا علم فطرت شعوری یا غیر شعوری طور
پر اس جماعت کو قوت عطا کرتی ہے جو اسکے قوانین پر قابو رکھتا ہو۔ مغرب والوں
کا غلبہ اور تصرف محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں وہی بنیادی
اسباب کارفرما ہیں جن کے باعث دوسرے تمدنوں نے تاریخ میں فضیلت
حاصل کی۔ سائنس کی استقرائی تحقیق سے یورپ والوں نے قوت و تصرف
حاصل کیا اور وہ ایک تجربے سے دوسرے تجربے تک پہنچے۔ مشاہدہ اور
تجربہ کے ذریعہ ایجاد و تسخیر کی بے پناہ قوتیں سوتے سے جاگ اٹھیں۔ اور
انسان کی ان سب رکاوٹوں کو ایک ایک کرکے دور کیا جو اس کے لئے
سنگ راہ بنی کھڑی تھیں اور جن کی وجہ سے اشیا کے تعلقات میں عدم
آہنگی پیدا ہوتی تھی۔ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندوستانی یورپ کی جدید
سائنس کے اصول سے آشنا ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی کمزوری
اور نامرادی سائنس سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ چنانچہ سائنس کی تعلیم

کی طرف توجہ کی گئی۔ لیکن جتنی توجہ کرنی چاہیے تھی اتنی نہیں ہوئی اس لئے کہ حکومت کی پالیسی یہ نہیں تھی کہ ہندوستانی سائنس پڑھ کر اپنے ملک کی صنعت وحرفت کو ترقی دیں بلکہ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ اسے سستے داموں کلرک ملجائیں جو انتظام کی مشین چلانے میں مدد دے سکیں۔ لیکن اب کچھ عرصے سے ہندوستانیوں نے یہ بات محسوس کرلی ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ سائنس کے اصول عام طور پر زراعت اور صنعت وحرفت اور عملی زندگی کے دوسرے شعبوں میں استعمال کئے جائیں۔ پچھلے سالوں میں ہندوستان میں بعض نامور سائنسداں پیدا ہوئے جن کے نام اس ملک کے باہر بھی عزت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ سر جگدیش چندر بوس، سر سی وی رامن، مگنا تھ سہا اور کرشنن کے نام اس ضمن میں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

جدید تعلیم کے اثر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں کافی ترقی ہوئی۔ گزشتہ زمانے میں ہندوؤں کا ادب اور آرٹ ایک خاص ڈھرے پر چل رہا تھا اور اس میں بمقابلہ ذاتی اپج کے رسم ورواج اور تقلید پر زور دیا جاتا تھا مغربی تصنیفوں کے اثر سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں نئے نئے طرز خیال رواج پا رہے ہیں۔ سب سے پہلے بنگالی ادب نے مغربی اثر کو قبول کیا۔ رابندرا ناتھ ٹیگور نے اپنی نظموں، ناٹکوں اور مضامین سے بنگالی زبان کو مالا مال کردیا۔ ان کی تصنیفوں کے ترجمے دنیا کی اکثر ترقی یافتہ زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ اردو مصنفوں میں رتن ناتھ سرشار، خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی اور شمس العلما آزاد نے زبان کو بڑی ترقی دی اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ زندگی کے سنجیدہ موضوعوں کے متعلق خیالات ادا کرسکے۔ اکبر الہ آبادی اور اقبال نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دئے۔ اقبال نے اپنی شاعری کو ایسے بلند خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا کہ اس کی مثال دوسری زبانوں میں کم ملے گی۔ ٹیگور اور اقبال کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ دوسری دیسی

زبانوں میں بھی پچھلے پچاس سالوں میں اعلیٰ درجے کے ادیب، شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی اپنی مقامی زبانوں کی بڑی خدمت کی اور اس طرح عوام تک اعلیٰ خیالات پہنچائے۔

دیسی زبانوں کی ترقی میں اخباروں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ انگریزی حکومت نے شروع ہی سے دیسی زبانوں کے اخباروں پر بندشیں عائد کیں تاکہ وہ سیاسی خیالات کی اشاعت نہ کریں لیکن لبرل خیالات کے زیر اثر آہستہ آہستہ یہ بندشیں باقی نہیں رہیں۔ اس وقت ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہزاروں اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ بعض رسالے نہایت بلند پایہ ہیں جن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ہندوستانیوں کے بہترین دل و دماغ اپنی مادری زبانوں کو ترقی دینے کی جانب متوجہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت ہے کہ ادب کے علاوہ علوم و فنون پر بھی دیسی زبانوں میں بلند معیار کے رسالے شائع ہوں کہ بغیر اس کے کسی زبان کی ترقی ادھوری رہتی ہے۔

عہد جدید میں ہندوستانیوں نے فنون لطیفہ میں بھی کافی ترقی کی ہے فن تعمیر میں انیسویں صدی میں انگریزی طرزوں کی نقال کے سبب سے جو بد مذاقی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو رہی ہے۔ فن تعمیر کے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندوستانیوں نے پرانی طرزوں کو تو چھوڑ دیا ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسی طرز نہیں نکالی جو ان کی زندگی اور موجودہ حالات کی آئینہ دار کہی جا سکے اور جس کی بدولت زندگی کے جدید تقاضوں کی تکمیل ہو۔ لیکن یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ چاہے ہماری جدید عمارتوں کے طرز میں اگلے زمانے کی عمارتوں کے طرز کی تازگی اور قوت نہ ہو لیکن ان میں حفظان صحت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور جدید ضرورتوں کے لحاظ سے آرام کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ ابھی ہندوستانیوں کو فن تعمیر میں اپنا قومی طرز دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے جو حکومت کے محکمۂ تعمیرات کے بے جان اور بے کیف طرز سے یقیناً مختلف ہوگا اور جس میں ان کی زندگی کی نئی ضرورتوں اور حسن تناسب دونوں کا

پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ مصوری میں پچھلے دنوں اچھی خاصی ترقی ہوئی ہے اور اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی روایتوں کی رمزوایما کے ذریعہ ترجمانی کی جارہی ہے۔ اب اعلی تعلیم یافتہ لوگ اپنے گھروں کو ادنی درجے کی یورپ کی چھپی ہوئی تصویروں سے آراستہ کرنا برا سمجھنے لگے ہیں۔ اجنتہ اور مغل آرٹ کی طرف پھر نگاہیں پلٹ رہی ہیں اور قدیم استادوں کی رنگ آمیزیوں کے جلوے نظروں میں سمارہے ہیں۔ نندلال بوس اور چغتائی کی تصویریں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس ملک سے باہر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہیں۔

ملک کی مادی خوش حالی کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کی برطانوی عہد کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو ساتھ ہی افلاس اور غربت کا بھیانک سماں سامنے آجاتا ہے۔ عہد مغلیہ میں مختلف صدیوں میں یورپ سے جو سیاح اس ملک میں آئے انھوں نے یہاں کی دولت، زرخیزی اور خوش حالی کے ذکر میں اپنے سفرناموں کے صفحے سیاہ کئے ہیں پھر آخر یہ سب دولت اور تمول عہد برطانیہ میں کیوں غائب ہوگیا؟ اس سوال کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس ملک پر ایسی حکومت چھاگئی جس کے پیش نظر محض نفع کمانا تھا۔ یہ حکومت ان تاجروں کی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں لگائے ہوئے اپنے سرمایہ پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ کہ وہ اس نفع کو اس ملک میں نہیں بلکہ انگلستان میں خرچ کرتے تھے۔ شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستانیوں کی اخلاقی اور ذہنی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ارباب بست وکشاد بس ایک خواہش رکھتے تھے اور وہ یہ تھی کہ جہاں تک ہوسکے ان کے سالانہ منافع کی فیصد شرح میں اضافہ ہو۔ انگریزی تجارت کے نفع کمانے کا راز یہ تھا کہ ہندوستان سے جہاں تک ہوسکے سستے داموں کی خام اشیا برآمد کی جائیں اور مصنوعات کی درآمد کی جائے۔ اس طرح نہایت سائنٹفک اور منظم طریقے سے ملک میں نفع کمانے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان

کا دنیا کے سب سے مفلس ملکوں میں شمار ہونے لگا۔

ہندوستان میں انسانی اور معاشی وسیلوں کی کمی نہیں ہے۔ زمین کی زرخیزی کی دور دور دھوم ہے لیکن باوجود اس کے خدا کی وہ مخلوق جو اس زمین پر بستی ہے اس کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہیں۔ یورپ کے گاؤں میں جن مکانوں میں جانوروں کو رکھتے ہیں ان کی حالت یقیناً ان مکانوں سے کہیں بہتر ہے جن میں ہندوستانیوں کا زیادہ حصہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں سائنٹفک ترقی اور مشینوں کے ایجاد سے زبردست صنعتی انقلاب ہوا۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل میں جو غیر معمولی تبدیلی ہوئی اس کی وجہ سے ساری دنیا ایک منڈی بن گئی معاشی قوتیں اب ایک دو ملک کو نہیں بلکہ براعظموں کو اپنے اثرات میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان بھی ان عالمگیر معاشی قوتوں کی زد میں آیا اور انگریزی قوم اس کا وسیلہ بنی۔ برطانوی سیادت کو اس ملک میں قایم ہونے اور حکمرانی کا ڈول ڈالتے ہوئے کم و بیش ایک صدی لگ گئی۔ اس عرصہ میں جدید معاشی قوتیں چپکے چپکے اپنا کام کرتی رہیں۔ اور ان کا اثر برطانوی حکومت کی جلو میں خوب مستحکم ہو گیا۔ پھر سڑکوں ریلوں اور جہازرانی کی سہولتوں کے باعث ہندوستان کی خام اشیا، یورپ کی منڈیوں سے قریب آگئیں اور یورپ کی پیداوار اور مبادلہ کے طریقے کی ہندوستانی صنعت و تجارت میں بھی کارفرمائی ہونے لگی۔ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ہندوستان کی خارجی تجارت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعمیرات (پی۔ ڈبلو۔ ڈی) قایم کر کے سڑکوں اور ریلوں کے قایم کرنے کی جانب خاص توجہ کی تاکہ ہندوستان کی خام اشیا، آسانی سے بندرگاہوں تک پہنچ سکیں جہاں سے انھیں لاد لاد کر انگلستان کے کارخانوں تک پہنچایا جا سکے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں انگلستان میں نئے کارخانے بڑی تعداد میں قایم ہو گئے جن کے منافع کا انحصار

اس امر پر تھا کہ وہ خام اشیاء کو زیادہ سے زیادہ مصنوعات کی شکل میں بدل دیں۔

انگریزی عملداری قایم ہونے کے پہلے ہندوستان کی مصنوعات یورپ جایا کرتی تھیں اور خشکی کے راستے سے ہندوستان کا مال ایشیا کے تمام ملکوں میں پہنچتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور ریشمی کپڑوں کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاکموں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے کپڑے کی صنعت کو ختم کیا تاکہ انگریزی کارخانوں کے سامان کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ اب انگلستان میں بجائے ہندوستانی کپڑے کے ہندوستانی روئی کی قدر کی جانے لگی۔ روئی کو ہندوستان سے لے جاکر اور کپڑا بناکر اس کو ہندوستان میں من مانے داموں بیچا جانے لگا۔ روئی کی مانگ بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ہند اور بمبئی کے علاقوں میں کاشتکاروں نے غلہ بونے کے بجائے وسیع پیمانہ پر روئی کی کاشت شروع کر دی ہندوستان کے دور افتادہ گاؤں میں کاشت کرنے والے دیہاتی نے یہ پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ مقامی حالات کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا اثر اس کی روایتی زرعی معیشت پر پڑ سکتا ہے۔ اب گویا ہندوستان تجارت کے عالمگیر اثرات سے آہستہ آہستہ متاثر ہو رہا تھا۔ ہندوستانی صنعتیں حکمرانوں کی غیر ہمدردانہ پالیسی اور اپنے روایتی طریق پیدائش کی کمزوری کے سبب سے مغربی صنعت کے آگے ہار مان چکی تھیں جو اعلیٰ پیمانہ اور سائنٹفک اصول پر منظم ہو چکی تھی۔ ہندوستانی صنعت کی کس مپرسی کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ دیسی درباروں اور امیروں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریزی عملداری کے قایم ہونے کے بعد تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا جو نیا طبقہ وجود میں آیا اس کا ذوق بہت کچھ انگریزی اثرات سے متاثر تھا۔ اس کی قدروں کا معیار بہت پست تھا۔ وہ دیسی صنعت کی عمدہ اشیاء کو چھوڑ کر انگلستان کی بنی ہوئی ادنیٰ چیزوں پر ریجھتا تھا اس واسطے کہ انگریز آقاؤں کو خوش کرنا ہر طرح ضروری تھا۔ جب ہندوستانی صنعت کی خود اپنے ملک میں قدر نہ رہی

تو صنعت کاروں اور کاریگروں نے بھی زراعت کی طرف توجہ کی کہ روٹی ملنے کا لے دے کر یہی ایک سہارا رہ گیا تھا۔ غرضکہ انگریزی صنعت کو ایک پورا براعظم اپنی مصنوعات کی نکاسی کے لئے مل گیا۔ حکومت کی سرپرستی میں ایسٹ انڈیا کمپنی [illegible] کر خوب نفع کمایا اور انگلستان کی دولت میں بے شمار اضافہ ہوا ۱۸۵۷ء کی شورش عظیمہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا لیکن اس شورش کے حادثوں نے ہندوستانیوں کو اپنے حکمرانوں کے سامنے اور بھی زیادہ بے بس کر دیا۔ کمپنی کی بجائے تاج کی حکومت آئی تو بھی انھوں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ہندوستانی اس زمانے میں ایک طرح کے اخلاقی خلا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا رواج بڑھ رہا تھا لیکن نئے تعلیم یافتہ طبقے نے اپنی قدروں کی دنیا اب تک تعمیر نہیں کی تھی۔ مذہب اور روایتوں کے بندھن ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ ان کی جگہ لینے کے لئے اور زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے کوئی اصول حیات مرتب نہیں ہوئے تھے جس سے اخلاقی اور روحانی ڈھارس ملے۔ بہت دنوں بعد انیسویں صدی کے آخر میں اس خلا میں کمی پیدا ہوئی اور قومیت کی تحریک نے جنم لیا۔ لیکن پہلے پہل قومیت فکر وعمل کے لئے محرک نہیں بنی تھی۔ کچھ تعجب نہیں کہ ان حالات میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے حکمرانوں کی ہدایت اور رہبری کے محتاج تھے۔ چنانچہ معاشی زندگی میں بھی حکومت ہی کے اشارہ پر سب کچھ ہوتا نظر آتا ہے۔ شورش عظیمہ کے بعد تاج برطانیہ کی حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اگلی ایک صدی میں دیسی صنعتوں کی بربادی سے ہندوستانیوں کو جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی اس طور پر ہونی چاہئے کہ زراعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے انگلستان کے مفاد کو کسی طرح بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا اس واسطے کہ انگلستان سے مقابلہ مصنوعات کے ضمن ہی میں ہو سکتا تھا۔ لیکن خام اشیا اگر اچھی اور بہتات میں ملیں تو اس سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اگر ضمنی طور پر ہندوستان کے کسان کا بھی تھوڑا بہت نفع ہو جائے تو کیا ڈر

ہے۔ اگر اس کی حالت بہتر ہوگی تو لگان بڑھانا ممکن ہوگا جو حکومت ہند کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ خاص طور پر دکن کے روئی کی کاشت کرنے والوں نے اس نئی پالیسی سے فائدہ اٹھایا۔ روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے تجربہ گاہیں اور فارم قایم کئے گئے۔ سڑکوں اور ریلوں کا جال ان علاقوں میں بچھا دیا گیا جہاں روئی کی کاشت ہوئی تھی تاکہ بمبئی کی بندرگاہ تک سامان کے پہنچنے میں سہولت ہو۔ بعد میں عام کسانوں کو ملک کے ہر حصے میں کچھ سہولتیں فراہم کرنے کا حکومت نے فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں حکومت ہند نے "اگری کلچر اسٹس لونس ایکٹ" منظور کیا تاکہ ضرورت مند کسانوں کو برائے نام سود پر قرضہ دیا جائے اور لگان کی رقم کے ساتھ کئی قسطوں میں اس رقم کو وصول کیا جائے۔ لیکن کسانوں کی مصیبتوں کا علاج گورنمنٹ فارم قایم کرنے یا تقاوی کے طریقے کو رواج دینے سے ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ ملک کے پورے نظام معیشت کو بدلا جائے جس کے لئے انگریزی حکومت آج تک تیار نہ ہوسکی اس واسطے کہ وہ متوسط طبقہ کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی جو برابر اس کی پشت دپناہ رہا ہے۔

سائنس نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ لیکن اب اسوقت ہندوستان میں ریلوے لائنوں کی مجموعی پیمایش تقریباً ۴۵ ہزار میل ہے اور ملک کے تمام بڑے بڑے شہر ان سے منسلک ہوگئے ہیں ابتدا میں انگریز سرمایہ داروں نے ریلوے کی کمپنیاں قایم کیں لیکن پھر حکومت ہند نے ان کمپنیوں کو خرید لیا اور خود ریلوے قایم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریلوں کی توسیع سے قومی مدافعت کی سہولتوں اور عام نظم ونسق کی کارکردگی میں اضافہ ہوا۔ معاشی اعتبار سے یہ فائدہ ہوا کہ پورے ملک میں قیمتوں کی یکسانی ہوگئی۔ زراعت جو مدتوں سے خارجی اثرات سے بے تعلق تھی ریلوے کے ذریعہ عالمگیر معاشی قوتوں سے ہم آہنگ ہوگئی۔ ممکن ہے ایک غیر ہمدرد بدیسی حکومت نے اس وسیلہ کو نفع کمانے کے لئے استعمال کیا ہو لیکن ایک قومی حکومت

اس ذریعہ سے ملک کی خوش حالی بڑھانے کا کام لے سکتی ہے۔ قومی تجارت کے علاوہ بین الاقوامی تجارت کا دارومدار ریلوں کی وسعت پر ہے لیکن ہندوستان کی ریلیں ملک کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں۔ اس کمی کا اندازہ دوسرے ملکوں سے مقابلہ ہی سے ممکن ہے۔ مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں سو مربع میل میں ۲۰ء۸ میل ریلوے لائن موجود ہے اور ہندوستان میں سو مربع میل میں صرف ۲ء۲ میل ریلوے لائن ہے۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان ایک براعظم ہے۔ اس ملک کی مادی ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ رسل ورسائل کی سہولتوں کی زیادتی ہو۔ سڑکوں اور ریلوں ہی کے ذریعہ دیہاتی علاقوں کا شہروں سے اتصال کیا جاسکتا ہے تاکہ ملک کی پیدائش دولت کے وسیلوں کو ترقی ہو۔

دنیا کے اکثر دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی صنعتوں کے مرکز جو گزشتہ پچاس سال میں خود ہندوستانیوں کی کوششوں کی بدولت قائم ہوئے ہیں شہروں میں واقع ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ جاپان کی صنعتوں کی طرح ہندوستان میں عدم مرکزیت کی پالیسی اختیار کی جائے تاکہ پورے ملک میں خوش حالی پھیلے۔ گھریلو صنعتوں کی ترقی سے یہ ممکن ہے کہ زراعت اور صنعت میں توازن قایم رہے اور پیدایش دولت کے یہ دونوں وسیلے ایک دوسرے کے حریف نہ بن جائیں۔ گھریلو صنعتوں کے ذریعہ صنعت اور زراعت میں توازن قایم کرکے قومی دولت کی تقسیم میں مساوات کا اصول سامنے رہنا چاہیے تاکہ یہ نہ ہو کہ امیروں کی دولت بڑھے اور غریبوں کی مفلسی۔ اعلیٰ صنعتوں کے ساتھ اگر گھریلو صنعتوں کی ترقی ہو تو ملک کی دولت میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہی حصہ دار نہ بنیں گے بلکہ چھوٹے سرمایہ والے بھی استفادہ کرسکیں گے اسطرح یہ ممکن ہوگا کہ بڑے بڑے صنعتی شہروں میں زیادہ آبادی ہو جانے سے جو معاشری اور دوسری بیسیوں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ پیدا نہ ہوں گی اور پورے ملک کے معاشی وسیلوں کو حرکت میں لایا جاسکے گا۔

جیسا کہ ابھی اوپر بتلایا گیا ہے انگریزی عملداری میں ہندوستان کی تجارت

کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ملک سے خام اشیا برآمد کی جائیں اور مصنوعات کی درآمد ہو۔ ہندوستان کی بیرونی تجارت کو ۱۸۶۹ء کے بعد سے بڑی ترقی ہوئی اس لئے کہ نہر سوئیز کے کھل جانے سے یہ ملک انگلستان کی منڈیوں سے کئی ہزار میل قریب آگیا۔ تجارت کی یہ ترقی گزشتہ سو سال میں برابر جاری رہی ہے چنانچہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً ۵۶ کروڑ روپیے کی برآمد ہوئی اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کے پانچ سالوں میں ۳۵۴ کروڑ روپیے کی برآمد ہوئی اور اسی عرصہ میں ۲۵۱ کروڑ روپیے کی درآمد ہوئی۔ ہندوستان کی تجارت انیسویں صدی کے آخر تک زیادہ تر انگلستان ہی سے تھی لیکن بیسویں صدی کے شروع میں امریکہ جرمنی اور جاپان سے بھی وسیع پیمانے پر بیرونی تجارت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

ہندوستان کی قومی آمدنی باوجود رسل و رسائل کی سہولتوں اور بیرونی تجارت کی ترقی کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کا پیدائش دولت کا معیار پست اور جو کچھ بھی دولت ملک میں موجود ہے اس کی تقسیم ناقص ہے۔ دولت کا بڑا حصہ تھوڑے سے طبقہ کے پاس محدود ہے۔ اور جو تھوڑی سی دولت باقی رہ جاتی ہے اس سے آبادی کا بڑا حصہ گزر بسر کرتا ہے۔ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی دولت کے مقابلے میں ہندوستان کا افلاس اور زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ مثلاً جاپان میں فی کس سالانہ آمدنی کا اوسطاً ۲۷۱ روپیے ہے۔ جرمنی میں ۶۳۴ روپیے، فرانس میں ۹۳۶ روپیے، انگلستان میں ۱۰۹۲ روپیے اور ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۰۵۳ روپیے۔ برخلاف ان ملکوں کے ہندوستان کی فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط صرف ۸۲ روپیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالباً افریقہ کے چند ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے کسی دوسرے ملک کا اتنا پست معیار حیات نہیں جتنا کہ ہندوستان کے لوگوں کا ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت کپڑے کی صنعت ہے۔ سودیشی تحریک کی وجہ سے اس صنعت نے خوب ترقی کی۔ اس صنعت

کے مرکز بمبئی، احمد آباد، ناگپور اور شولاپور ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے بعد یہ صنعت غیر معمولی طور پر بڑھی اور پھیلی۔ ۱۹۲۷ء کے بعد جاپان کے مقابلہ کی وجہ سے دیسی کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے کو تامین (پروٹکشن) حاصل ہے۔ ۱۹۳۷ء میں سارے ہندوستان میں کپڑے بنانے کے کارخانوں (ملوں) کی تعداد ۳۷۰ تھی۔ اس صنعت کا پورا سرمایہ ہندوستانیوں کا ہے اور اس کا انتظام بھی پورے طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کپڑے کے بعد سن (جوٹ) کی صنعت نے بنگال میں خوب ترقی کی۔ اس کے سو کارخانے ہیں لیکن اس صنعت کا سرمایہ اور انتظام زیادہ تر انگریز سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی جمشید پور میں قایم ہوئی۔ اس صنعت کو بھی باہر کے ملکوں کے مقابلہ میں ۱۹۲۴ء سے تامین (پروٹکشن) حاصل ہے۔ ٹاٹا کے اس کارخانے نے ملک کی لوہے اور فولاد کی ضرورتوں کو بڑی حد تک مہیا کر دیا ہے لیکن ہندوستان کے سے وسیع ملک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ابھی ایسے لوہے اور فولاد کے کئی کارخانے قایم کرنے ہوں گے۔ کوئی ملک اس وقت تک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ ہر قسم کی مشینیں خود نہ بنانے لگے اور اس ضمن میں دوسروں کا دست نگر نہ رہے۔

ہندوستان کی دوسری صنعتیں جنھوں نے پچھلے پچیس سال میں اچھی خاصی ترقی کی ہے یہ ہیں چمڑا، کاغذ، شکر، دیا سلائی اور سیمنٹ۔ ۱۹۲۱ء کے مالیاتی کمیشن کی سفارش پر تامین کے ذریعہ سے ان سب صنعتوں کو بیرونی ملکوں کے مقابلہ سے بچایا گیا ہے۔ کیونکہ بے اس کے ان کا پنپنا مشکل تھا۔ محصولوں کو مقرر کرنے کے لئے حکومت ہند نے ایک ٹیرف بورڈ قایم کر دیا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ ملکی صنعتوں کی ترقی کے متعلق حکومت کو وقتاً فوقتاً مشورہ دیتا رہے اور انھیں دوسرے ملکوں کے مقابلے سے بچانے کی تدبیریں کرتا رہے۔ لیکن تامین (پروٹکشن)

کے علاوہ صنعتوں کی ترقی کے لئے بنک کاری (بنکنگ) اور مارکٹنگ کی اعلیٰ پایہ کی تعلیم درکار ہے جس کی ہندوستان میں بہت کمی محسوس کی گئی ہے اس کی بھی ضرورت ہے کہ ٹیکنیکل تعلیم عام کی جائے تاکہ لوگوں میں پیدائش دولت کی عملی صلاحیتیں ترقی پائیں۔

غرضکہ اخلاقی اور مادی نقطۂ نظر سے ہندوستان نے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود اچھی خاصی ترقی کی ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی اس دستوری اور سیاسی ترقی سے بھی مطمئن نہیں ہیں جو پچھلے پچاس برس میں ہوئی ہے۔ وہ دنیا کی نظروں میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سیاسی بیداری کے ابتدائی زمانے میں وہ اس بات کو اہمیت دیتے تھے کہ انھیں بھی حکومت کے نظم و نسق میں برابر کا شریک بنایا جائے۔ لیکن اب ان کی اقدار (ویلوز) اور طرز فکر میں زبردست تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ اب اپنے ملک کو بالکل خود مختار دیکھنا چاہتے ہیں جس طرح کہ دنیا کے دوسرے آزاد ملک ہیں۔ وہ اب ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے لئے آمادہ ہیں جو آزادی کی وجہ سے انھیں اٹھانا پڑے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اب بغیر کسی دوسری قوم کے سہارے کے وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ زندگی کی دشواریوں سے بچنے والی قوموں کا یہ مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی آزاد اور موثر اکائی کو کھو دیتی ہے۔ لیکن جو قوم زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو وہ اپنی زندگی کے اندرونی جوش سے نئے نئے حالات سے بخوبی مطابقت کر سکتی ہے اور اپنے مستقبل کو اپنے ماضی کی طرح شاندار بنا سکتی ہے۔ ہندوستانی اب اس کے لئے تیار ہو چکے ہیں کہ آزادی کی فضا میں جو بھی دشواریاں پیش آئیں ان سے عہدہ برا ہوں اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کی طرح دنیا میں ایسا باعزت مقام حاصل کریں جس کے وہ مستحق ہیں۔

تمت

اشاریہ

تاریخ ہند

عہد جدید

(ا)

(پ)

(ڈ)

(ش)

(ص)

(ط)

ع

غ

(ف)

(ق)

گ

ل

م

ن

(ھ)

صحت نامہ

تاریخ ہند

عہد جدید

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۵۳	۱۴	نفع اندازی	نفع اندوزی	۲۳۱	۹	اسٹیونس	اسٹیونسن
۶۳	۱۲	کی	کیں	۲۵۱	۱	جودپور	جودھپور
۶۵	۱۲	گی	کی	۲۵۳	۲۴	لارڈ ولزی	لارڈ ولزلی
۶۹	۱۹	لا	لا	۲۵۶	۱۹	جے کوبتز	جے کوبز
۷۷	۲۱	یہ دولت	بدولت	۲۵۸	۲۵	اڈمیرل رینبر	اڈمیرل رینیر
۸۳	۲۰	امارشیس	مارشیس	۲۶۲	۱۰	کارنولس	کارنوالس
۱۰۶	۲	لکھا	لکھی	۲۶۹	۷	دوآنہ	دوآبہ
۱۳۰	۱۰	مصسبت	مصیبت	۲۶۹	۱۳	تراس	تراش
۱۳۶	۱۴	بیچ	بیچ	۲۷۷	۱۶	بٹاویہ	بٹاویہ
۱۳۱	۵	مرہٹے	مرہٹے	۳۲۰	۱۵	راجپوتانہ	راجپوتانہ
۱۴۳	۱۰	سرجان لنڈے	سرجان لنڈسے	۳۷۷	۲	جن کوجی سندھیا	جنکوجی سندھیا
۱۹۳	۱۵	سالٹ	سالسٹ	۳۸۹	۵	لفٹنٹ ایدورن	لفٹنٹ ایڈورڈ
۲۰۳، ۲۰۳، ۲۰۴	۱۶، ۱۴، ۱۷			۳۰۳	۱۴	تن	متن
	۲۴	مھاوجی	مادہو جی	۳۲۹	۱۰	بارشمیں	مارشمین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۴۵۲ ۴۵۳	۷ ۱۳	سر ہنری رالنس (۱۸۲۹ء تا ۱۷۷۷ء)	سر ہنری لارنس (۱۸۲۹ء تا ۱۸۴۲ء)	۴۹۷ •	۱۷ •	طبیب جی •	طیّب جی •

تمّت